www.KitaboSunnat.com
اُردو اِملا
رشید حسن خاں
مجلسِ ترقّیِ ادب کلب روڈ، لاہور

رشید حسن خاں

مجلسِ ترقّیِ اَدب ○ ۲۔کلب روڈ، لاہور

فون : ۶۳۶۸۲۱۸، ۶۳۶۴۸۲۴، ۶۳۷۰۹۹۰ (۰۴۲)

فیکس: ۶۳۶۸۲۱۷(۰۴۲)۔ای میل: majlis_ta@yahoo.com

اُردو اِملا۔ از رشید حسن خاں

اشاعتِ اوّل (پاکستان): مئی ۲۰۰۷ء / جمادی الاوّل ۱۴۲۸ھ۔ تعداد: ۱۱۰۰

رشید حسن خاں
اُردو اِملا / از رشید حسن خاں
لاہور، مجلسِ ترقّیِ ادب۔ مئی ۲۰۰۷ء / جمادی الاوّل ۱۴۲۸ھ
اشاعتِ اوّل۔ تعداد: ۱۱۰۰۔ ۷۲۰ ص
قیمت: ۳۰۰ روپے

ناشر : شہزاد احمد
ناظمِ مجلسِ ترقّیِ اَدب، لاہور
اہتمامِ اشاعت : اشرف جاوید
مطبع : ایس بی پرنٹرز، ڈیوس روڈ، لاہور
قیمت : ۳۰۰ روپے

☆☆☆☆☆☆☆

یہ کتاب محکمہ اطلاعات و ثقافت و امورِ نوجوانان، حکومتِ پنجاب کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم)

کے نام

طبعِ تو داد سرخطِ مشقِ سخن بما
گوئی براتِ نور زخاور گرفتہ ایم (غالب)
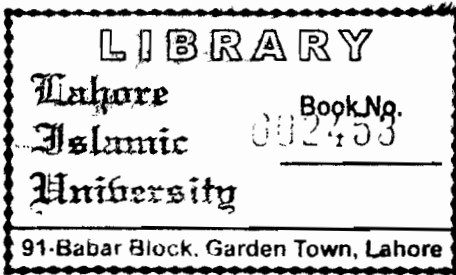
پیش لفظ

زندہ قومیں اپنی زبان کی حفاظت اور تزئین ایک مسلسل شعوری عمل کے طور پر کرتی ہیں۔ زبان کے اصول و قواعد کا مطالعہ اور تحقیق زندہ اور باوقار قوموں کی حیات کے لیے اُتنا ہی ضروری ہے جتنا زندگی گزارنے کے لیے نظم و ضبط اور ضابطۂ حیات لازم ہے۔ اُردو کی بقا و ترقی کے لیے اس کے اصول و ضوابط اور معیارات پر تحقیق کر کے اس کے نتائج سے حامیان و اہالیانِ اُردو کو مستفید کرنا نہ صرف وقت کی ضرورت ہے بلکہ اُردو زبان کے حق میں نیک فال بھی ہے۔

رشید حسن خاں کی پیش نظر کتاب ''اُردو املا'' انھی خصوصیات کی حامل ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے، جو اب مرحوم ہو چکے ہیں؛ تحقیق اور تلاش کے بعد اُردو زبان میں الفاظ کی املا کے اصول اور قواعد واضح کیے ہیں تاکہ اُردو داں طبقہ اُردو زبان کے صحیح خدوخال سے آگاہی حاصل کر سکے اور اس کی تاریخ اور روایت کو مدِ نظر رکھ کر اس کے استعمال میں معیارات کی پیروی کر سکے۔

جیسا کہ رشید صاحب نے بھی اپنے مقدمے میں لکھا ہے، اُردو اِملا کے قواعد منضبط صورت میں اس سے پہلے شرح و بسط کے ساتھ پیش نہیں کیے گئے۔

رشید صاحب نے اُردو اِملا کی معیار بندی کا احساس کر کے سب سے پہلے اس جہت میں تحقیق کا ڈول ڈالا۔ انہوں نے اُردو اِملا کے سلسلے میں اپنی تحقیقات کا آغاز ۱۹۶۲ء میں کیا اور بارہ تیرہ برس کی تحقیق اور ریاضت کے بعد اپنی تحقیق و تجزیے کے نتائج اُردو اِملا کی صورت میں منضبط کرنے میں کامیاب ہوئے۔

اُردو زبان میں الفاظ کے املا کی معیار بندی اور تحقیق پر رشید حسن خاں کی یہ کتاب شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور محققین، علما، قارئین اور طلبہ نے اس سے کما حقہ، استفادہ کیا۔ اپنی افادیت اور مقبولیت کے سبب یہ کتاب بھارت کے سرکاری محکمۂ اشاعت سے دوبار شائع ہوچکی ہے۔ مصنف نے پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت کے حقوق جناب ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کو تفویض کر دیے تھے، سو ان کے تعاون اور اجازت سے مجلس ترقی ادب یہ کتاب پاکستان میں پہلی مرتبہ شائع کر رہی ہے۔ امید ہے کہ پاکستانی اہل علم، قارئین اور طلبہ اب آسانی کے ساتھ اس اہم ترین کتاب سے استفادہ کر سکیں گے۔

شہزاد احمد

(ناشر)

فہرست

ابتدائیہ

"ہر زبان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے املا کے قاعدے منضبط ہوں اور اُن قاعدوں کی بنیاد، صحیح اصول پر ہو۔ اگر قاعدے معیّن نہ ہوں تو زبان کی یک رنگی اور یک سانی کو سخت صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوگا؛ اور اُردو ابھی تک اِس قسم کے خطرے میں ہے۔ عربی، فارسی، انگریزی؛ غرض ہر شایستہ زبان میں جو قاعدے مقرر ہیں، ہر لکھنے والا اُن کی پوری پوری پابندی کرتا ہے؛ مگر اُردو والے اپنے تئیں ہر قید سے آزاد سمجھتے ہیں۔ املا کی خرابی یا بے ضابطگی کی صورتیں جب کسی متمدّن قوم کو پیش آئیں، تو اُس زبان کے زبان دانوں نے فوراً اُس خرابی یا بے ضابطگی کی اصلاح کی۔ ترقی کرنے والی قومیں اِس زمانے میں بھی اپنی زبان کے لفظوں کی لکھاوٹ میں ضروری ترمیم اور مناسب اصلاح کرتی رہتی ہیں۔ عام طور پر اصلاح کی ضرورت اِس لیے پڑتی ہے کہ ایک لکھنے والا، اپنی رائے کو دخل دے کر، ایک غلط راہ اختیار کرتا ہے؛ اور دوسرے، بغیر تحقیق کیے ہوئے، اُس غلطی کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ جہاں کسی غلطی کی تکرار ہوئی، یا وہ کتابوں اور اخباروں میں راہ پاگئی؛ عوام کے لیے یہ ایک بہت بڑی سند ہوگئی کہ فلاں لفظ ایک کتاب میں یا کسی اخبار میں یوں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ بڑی مشکل یہ ہوتی

ہے کہ اُن لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو صحت اور اصول پر نظر رکھتے ہیں
بڑا گروہ، مقلدوں یا عادت کے بندوں کا ہوتا ہے، اور تدارک یا اصلاح کی
ذمّے داری اہلِ تحقیق پر عائد کی جاتی ہے۔ پس ایسی خرابیوں کا انسداد اِس طرح
ہو سکتا ہے کہ علمی انجمنیں اپنے فرض کا احساس کرکے، نہ صرف قاعدے بنائیں،
بل کہ ہر ممکن ذریعے سے اُنھیں عمل میں لانے کی کوشش کریں "۔

[ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم)]

اُردو میں قواعدِ زبان کے جن اہم مسائل کی طرف کم توجہ کی گئی ہے، اُن میں املا کے مسائل کو فہرست میں سب سے اوپر رکھا جا سکتا ہے۔ جس طرح یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس لفظ کو بول رہے ہیں، اُس کا مفہوم کیا ہے؛ اُسی طرح یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جس لفظ کو لکھنا چاہتے ہیں، اُس کی صحیح صورت کیا ہے۔ بل کہ صورت کے علم کی اہمیت زیادہ ہے اور اِس کی دو وجہیں ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ مادری زبان کی تعلیم کے شروع ہی میں طالب علم کی نظر، یاد داشت اور قلم؛ پہلے لفظوں کی صورتوں سے شناسا ہوتے ہیں۔ ضرورت بھی اِسی کی ہوتی ہے، کیوں کہ ابتدائی نصاب میں شامل عام لفظوں کے معنی مطلب تو وہ جانتا ہی ہے؛ اِس منزل پر وہ صرف صورت نویسی کو سیکھتا ہے۔ آگے چل کر جب خاص خاص لفظوں کے معانی و مفاہیم کو ذہن نشیں کرانے کی نوبت آتی ہے تو اُس وقت تک وہ صورت شناسی کے مرحلے سے گزر چکا ہوتا ہے؛ یعنی رسمِ خط کے مطابق لفظوں کے لکھنے کا جو طریقہ ہے، وہ اُسے سیکھ چکا ہوتا ہے، اور روشِ خط، حرفوں کے جوڑ پیوند، نشست؛ اِن سب بنیادی امور کی تکمیل ہو چکی ہوتی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مادری زبان کی تعلیم کے آغاز ہی میں بنیادی

حیثیت الفاظ کے املا کی ہے۔
دوسری وجہ یہ ہے کہ معانی و مفاہیم میں کثرت کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ ایک لفظ کے ایک سے زیادہ معنی ہو سکتے ہیں، معانی کی تعداد سے کہیں زیادہ مفاہیم اُس سے وابستہ ہو سکتے ہیں، اور کسی بھی مرحلے پر اُن میں ٹھہراو والی کیفیت پیدا نہیں ہو پاتی؛ مگر ایک لفظ کی صورت ایک ہی ہوتی ہے۔ یہ شرط نہیں لگائی جا سکتی کہ بولنے والے کو لفظ کے سب معنی معلوم ہونا چاہییں، البتہ لکھنے والے کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ لفظ کی صورت کا صحیح طور پر علم رکھتا ہو ــــ جس قدر معانی آج ایک لفظ سے نسبت رکھتے ہیں، بہ خوبی ممکن ہے کہ اُن کی تعداد میں کل اضافہ ہو جائے۔ نئے معانی، پُرانے معانی کو بے دخل بھی کرتے رہتے ہیں؛ یہ سب کچھ ہوتا ہے، مگر لفظوں کا املا اِس طرح نہیں بدلتا۔ اکثر لفظ تو املائی تغیرات سے محفوظ ہی رہتے ہیں، جن لفظوں میں املائی تغیّرات راہ پاتے ہیں، تو اُن کی شکلیں کچھ زیادہ نہیں ہوتیں؛ مگر اِس سلسلے میں دو امور قابلِ لحاظ ہیں: ایک تو یہ کہ ایسے لفظوں کی آخری صورت بہ ہر طور متعیّن ہو جاتی ہے، یا ہو چکی ہوتی ہے، اور ابتدائی سطح پر طالب علم اُسی متعیّن صورت کی مشق کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسے لفظ جن میں املائی تغیّرات واقع ہوئے ہوں؛ آخر میں مستقل حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ عموماً اہم تغیّرات، زبان کے ابتدائی ادوار میں صورت پذیر ہوتے ہیں۔ پھر ایک زمانہ ایسا آتا ہے جب ارتقاے زبان کا عمل ایک سطح پر اور ایک خاص انداز پر آ جاتا ہے؛ اُس وقت تک املائی تغیّرات کی شکلیں الگ الگ متعیّن ہو چکی ہوتی ہیں۔ اِن میں سے رائج اشکال کو "مروّج املا" مانا جاتا ہے اور اُس کا علم طالب علم کے لیے

لازم ہے۔ اب رہے قدیم املائی تغیّرات؛ وہ لُغت نویس اور تدوین کا کام کرنے والوں کے دائرۂ کار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اِن اُمور کی بِنا پر، یہ نہایت ضروری بات ہے کہ شروع ہی سے طالب علم صحیح املا لکھنا سیکھے۔

رسمِ خط: "کسی زبان کو لکھنے کی معیاری صورت" کا نام ہے۔ اور "رسمِ خط کے مطابق، صحت سے لکھنے" کا نام املا ہے۔ بہت سی بحثیں ایسی ہوئیں جو دراصل املا کے مسائل سے تعلق رکھتی تھیں، مگر وہ رسمِ خط کے عنوان سے شروع ہوئیں اور اِس کے برعکس بھی ہوا۔ اِس خلطِ مبحث نے بھی املا کے مسائل کی واقعی اہمیت کو نمایاں نہیں ہونے دیا۔ کس لفظ کو کن حروف سے مرکّب ہونا چاہیے، یا لفظ میں اُن کی ترتیب کیا ہونا چاہیے؛ یہ مسئلہ رسمِ خط کا نہیں ہے۔ یا یہ کہ کون سے حروفِ تہجّی ختم کر دیے جائیں، یا کسی خاص آواز کے لیے کسی نئی علامت کا اضافہ کیا جائے، یہ بھی املا کے متعلّقات ہیں۔ فرض کر لیجیے کہ آپ نے اُردو کے حروفِ تہجّی میں سے آٹھ حرف نکال دیے، یا پانچ نئے حرف، یا چار نئی علامتیں بڑھا دیں؛ مگر اِس سے رسمِ خط کی صورت تو نہیں بدلی! لفظوں کو لکھنے میں یا پڑھنے میں کبھی کوئی مشکل پیش آئی تو یہ کہا گیا کہ اُردو کے رسمِ خط میں اصلاح کی ضرورت ہے، اور اِس بنیادی بات کو فراموش کر دیا گیا کہ اصلاح، املا میں ہو سکتی ہے، رسمِ خط میں نہیں۔ وہ یا تو رہے گا، یا نہیں رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رسمِ خط میں تغیّر ہو سکتا ہے؛

اصلاح نہیں ہوتی۔ رسمِ خط میں صورت اور روش کی بنیادی حیثیت ہے؛ جب اِن میں کلیتاً تبدیلی ہو جائے گی، تب یہ کہا جائے گا کہ رسمِ خط بدل گیا۔ اُردو کی عبارت کو، اُس کے معروف رسمِ خط میں لکھنے کے بجائے، رومن اسکرپٹ میں لکھیے، تو کہا جائے گا کہ اُردو، ایک دوسرے رسمِ خط میں لکھی گئی ہے۔ تُرکی میں رومن اندازِ تحریر کو اختیار کرلیا گیا ہے؛ تو اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ تُرکی زبان کا رسمِ خط بدل گیا ہے۔ سندھی زبان، عربی رسمِ خط میں لکھی جاتی رہی ہے؛ اُس کو ناگری لپی میں لکھیے تو کہا جائے گا کہ سندھی کا رسمِ خط بدل گیا۔ اِس کے برخلاف، بعض علامتوں یا شکلوں میں کسی طرح کی اصلاح کیجیے، تو وہ اُس زبان کے املا میں اصلاح مانی جائے گی، نہ کہ رسمِ خط میں۔ اب سے کچھ پہلے ہندی میں بعض ماتراؤں وغیرہ کا نئے انداز سے تعین کیا گیا تھا؛ تو یہ ہندی کے املا میں اصلاح و ترمیم کا عمل جاری ہوا تھا، ہندی کا رسمِ خط نہیں بدلا تھا؛ کسی نے اِس کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔

ایک خلطِ مبحث یہ بھی ہوا کہ اصلاح اور تغیّر کے الفاظ کو، مرادف لفظوں کے طور پر استعمال کیا گیا؛ حالاں کہ ان میں باہم بہت فرق ہے۔ املائی تغیّرات، تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی وہ زبان کے عملِ ارتقا کے مختلف مرحلوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ تغیّر، نافذ نہیں کیا جاتا ہے؛ آہستہ آہستہ خود بخود کار

آیا کرتا ہے ۔ میں ایک دو مثالوں سے اپنے مفہوم کو واضح کرنا چاہوں گا :
انیسویں صدی اور اُس سے پہلے کے متعدد مخطوطوں میں لفظ "ماں" (بمعنیِ مادر) نون کے بغیر ملتا ہے ۔ یہی صورت لفظ "دونوں" کی ہے (: "ما" اور "دونو")۔ اُس زمانے میں اور اُس سے پہلے بھی "نیں" (بہ معنی "نے") اور "سیں" (بہ معنی "سے") مستعمل تھے ۔ "ترڑپھنا" تو بہت بعد تک مستعمل رہا ۔ اب اِن لفظوں کی صورتیں بدل گئی ہیں ۔ یہ تغیّر ہے ، جو ارتقاے زبان کے عمل کی نشان دہی کر رہا ہے ۔
اصلاح ، اِس سے مختلف عمل ہے ۔ مثلاً انجمن ترقیِ اردو نے ایک زمانے میں یہ طے کیا تھا کہ عربی کے وہ لفظ جن کے آخر میں "ي" لکھی جاتی ہے ، مگر پڑھنے میں الف آتا ہے ؛ اُن کو اُردو میں الف ہی سے لکھنا چاہیے ، جیسے : ادنا ، اعلا ، منقّا وغیرہ (عربی کے مطابق : اعلی ، ادنی ، منقّی)۔ انجمن نے اپنی مطبوعات میں اِس پر عمل بھی کیا تھا ۔ یہ اصلاح ہے ۔ اصلاح نافذ کی جاتی ہے ، جب کہ تغیّر رونما ہوا کرتا ہے ۔ دونوں کے اسباب بالکل مختلف ہوتے ہیں ۔ تغیّر کا تعلّق اصلاً ارتقاے زبان کے مختلف مراحل سے ہوتا ہے ، اگرچہ آخری درجے میں اُس کا تعلّق املا سے ہو جایا کرتا ہے ۔ اصلاح کا تعلّق اصلاً املا سے ہوتا ہے ۔

اصلاح اور تغیّر میں جس طرح خلطِ مبحث ہوا تھا ، اُسی طرح اصلاح اور صحّت کے الفاظ میں بھی تشابہ لگا ۔ یہ دونوں لفظ بھی عمل اور مقاصد دونوں کے لحاظ سے مختلف ہیں ۔ اصلاح کا مقصد یہ ہوگا کہ کسی کمی کو دور کیا جائے ، یا یہ کہ مزید آسانی فراہم کی جائے ۔ صحت سے مراد یہ لی جائے گی کہ کسی وجہ سے کوئی غلطی راہ پا گئی ہے ، اُس کو دور کرکے ، مسلّمہ انداز کو واپس لایا جائے ۔ یہ عین ممکن ہے کہ کچھ لفظ بالکل صحیح ہوں ، لیکن مزید آسانی یا یک سانی کی خاطر ، اُن میں اصلاح کی جائے ۔ جیسے یہی " اعلا " کا الف سے لکھا جانا ، کہ اصل مقصد یہ تھا کہ اُردو میں ایسے سب لفظوں کو ، اُردو کے

عام اندازِ نگارش کے مطابق، ایک ہی طرح لکھا جائے اور خواہ مخواہ کی ایک غیر ضروری صورت نویسی سے بچا جائے۔ یہ بات نہیں تھی کہ "اعلیٰ" یا "ادنیٰ" بہ جائے خود غلط ہوں اور اِس طرح اُن کی تصحیح کی گئی ہو۔ غلطی کی صحت ہوگی؛ اُسے اصلاح نہیں کہا جائے گا۔

صحتِ املا کا دائرہ وسیع ہے۔ جن لفظوں میں کسی طرح کی غلط نگاری راہ پا گئی ہے؛ اُن کو صحت کے دائرے میں واپس لانا، اِس کا خاص مقصد ہے۔ جیسے "بھروسا" کو "بھروسہ" لکھنا یا "معمّا" کو "معمّہ" لکھنا یا "بارہ" کو "بارا" لکھنا۔ یہ کہا جائے گا کہ "بھروسا" اور "معمّا" صحیح املا ہے، اور "معمّہ" اور "بارا" غلط املا ہے۔ "اژدحام"، "اژدہام"، "ازدہام"؛ یہ سب غلط صورتیں ہیں۔ لفظ کی صحیح صورت ہے: "ازدحام"۔ "آذر" (نام)، "ذکریا"، "ذخّار"؛ یہ سب لفظ ذال کے بجائے، زے سے صحیح ہیں، یعنی: "آزر"، "زخّار"، "زکریا"۔ اِن سب لفظوں میں کسی بھی زمانے میں کسی قسم کا تغیّر نہیں ہوا ہے، محض ناواقفیت نے غلط نویسی کے پھیر میں ڈالا ہے۔

اِس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بعض لفظوں کو بعض خاص لوگوں نے ایک خاص طرح سے صحیح مانا، حالاں کہ اصلاً وہ اُس طرح صحیح نہیں تھے۔ مثلاً مرزا غالبؔ، فارسی میں وجودِ ذال کے قائل نہیں تھے، اور اِس بنا پر وہ "گزشتن" اور "پزیرفتن" وغیرہ کو صحیح سمجھتے تھے۔ مرزا صاحب کا یہ خیال صحیح نہیں تھا۔ یہ بھی غلطی تھی، لیکن یہاں اِس غلطی کی نوعیت مختلف ہے۔ (اِس کی مفصّل بحث "تدوین اور املا" کے ذیل میں آئے گی) لیکن اِس ضمن میں دل چسپ صورت یہ پیدا ہوئی کہ "گزارش" (بہ معنیِ عرض داشت) کو ذال سے لکھا جانے لگا، یعنی: گذارش۔ اور "گذشتہ" کو زے سے لکھنے لگے ہیں: گزشتہ۔ جب کہ اِن کی صحیح صورت "گزارش" اور

"گذشتہ" ہے۔ اِس امتیاز کو واپس لانا بھی صحتِ املا میں شامل ہے۔
یا جیسے ایک زمانے تک یاے معروف و مجہول میں امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ کاف گاف کے مرکزوں کی بھی تفریق ملحوظ نہیں رہتی تھی۔ ہاے ملفوظ و ہاے مخلوط میں بھی بے امتیازی روا رکھی جاتی تھی۔ آخرِ لفظ میں ایک فالتو ہاے مختفی کا اضافہ کر دیا جاتا تھا، جیسے: "ہاتھ" کو "ہاتھہ" لکھنا یا "کہ" کو "کہہ" لکھنا۔ شوشوں میں بھی گڑبڑ ہوتی تھی، جیسے "صبا" کو "صبا" لکھنا، یا "تنقید" کی جگہ "تنقید" لکھنا۔ اِسی طرح کی اور بہت سی باتیں۔ آج تحریر میں ایسی سب چیزوں کا شمار غلطیوں میں کیا جائے گا، اور صحیح صورت کو لازم قرار دیا جائے گا؛ یہ بھی صحتِ املا ہے۔
ایک صورت اور بھی ہے، اور اُس کا تعلّق معیار بندی سے ہے۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں جن کی ایک سے زیادہ صورتیں لُغات میں ملتی ہیں اور یہ صراحت نہیں ملتی کہ اُن میں سے اب مرجّح صورت کون سی ہے۔ اِس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اب تک ایسے سب الفاظ کا اِس لحاظ سے جائزہ لیا ہی نہیں گیا ہے اور اِس ضروری کام کے نہ ہونے سے، عدمِ تعیّن کی نمود ہوئی، جس سے انتشار کو بڑھاوا ملا۔ اِس کے علاوہ ایک صورت دبستانی اختلافات کی بھی ہے۔ جیسے اہلِ دہلی "مصالح" لکھا کرتے تھے اور لکھنؤ کے لُغت نگاروں نے اِس لفظ کا املا "مسالا" مانا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن میں سے کسی صورت کو غلط تو کہا نہیں جا سکتا، مگر دبستانی اختلاف سے قطعِ نظر کرکے، یہ فیصلہ کرنا ہی ہوگا کہ اِن دونوں صورتوں میں سے اب کس صورت کو مرجّح قرار دیا جائے۔ ایسے الفاظ کے سلسلے میں ترجیح کا تعیّن ضروری ہے اور اِس کو بھی صحتِ املا کی ایک دوسری صورت قرار دیا جائے گا۔

اِس بات سے اتفاق کیا جائے گا کہ جو نقش شروع شروع میں تکرار کے ساتھ بچّے کے سامنے آتے رہتے ہیں، وہ اُس کے ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں۔ اگر ابتدائی درسی کتابوں میں لفظوں کے اجزا کا، اُن کی ترتیب کا اور وصل و فصل کی مختلف صورتوں کا بالکل صحیح صحیح تعین نہیں کیا گیا ہے؛ اِس صورت میں ابتدائی مشقیں، غلط نویسی کی مشقیں بن کر رہ جائیں گی۔

اِس کے بعد ہی وہ دور شروع ہو جاتا ہے جب نقل کرنے اور املا لکھانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ لفظوں کی صورت نویسی کی عادت پڑے اور لفظوں کی صورتیں ذہن میں اپنے نقش کو درست کرتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ کتاب میں جو لفظ جس طرح لکھا ہوگا، طالب علم اُسی طرح لکھنا سیکھے گا۔ یہ ابتدائی مشقیں، لفظوں کی صورتوں کو پتھر کے نقش کی طرح ذہن کے سادہ و صاف ورق پر ثبت کر دیا کرتی ہیں۔ آگے چل کر یہ علم بھی ہو کہ فلاں لفظ کی صحیح صورت یہ ہے، تب بھی اکثر و بیشتر عادت کے طور پر قلم سے وہی اوّلین صورت بنتی ہے اور ایسا بالکل غیر ارادی طور پر ہوتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ طالب علم صحیح املا لکھنا سیکھے، تو یہ لازم ہوگا کہ ساری نصابی کتابوں میں، ایک لفظ کا ایک ہی املا ہو، اور یہ املا وہ ہو جس کو قطعی طور پر صحیح املا کہا جاسکے۔ یہ نہ ہو کہ ایک کتاب میں "گانو" چھپا ہوا ہو اور دوسری کتاب میں "گاؤں" لکھا ہوا ہو۔ یا ایک صفحے پر "لیے" نظر آئے اور دوسرے صفحے پر "لئے" ہو اور کہیں "لیئے" بھی لکھا ہوا ہو۔

جس طرح کتاب میں چھپے ہوئے لفظوں کا املا صحیح ہونا چاہیے، اُسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اُس کتاب کو پڑھانے والا، یعنی نقل اور املا کی مشق کرانے والا اُستاد بھی اُس صحّت سے پوری طرح باخبر ہو۔ اگر ہم ایسا نہیں ہوسکا تو

کے بغیر، ساری افادیت ہَوا ہو جائے گی۔ یعنی جب اُستاد کا قلم کاپی، تختی (یا تختۂ سیاہ) پر اصلاح کرتا ہے، یا خود کچھ لکھتا ہے؛ اُس وقت اُس کے قلم سے بھی وہی متعین صورتیں بننا چاہییے، ورنہ افادیت کے بجائے، انتشار کی تبلیغ ہوگی۔ مثلاً جس شخص نے کتاب مرتب کی ہے، اُس نے ایک لفظ کو اُس طرح لکھا جس طرح اُس کے اُستاد نے اُس کو سکھایا تھا۔ طالب علم نے اِسی کے مطابق اُس لفظ کو اپنی کاپی میں لکھا۔ اُستاد نے جب اصلاح کی، یا خود تختۂ سیاہ پر اُس لفظ کو لکھا، تو املا مختلف ہوگیا اور یہ وہ املا تھا جو اِس اُستاد نے اپنے اُستاد سے سیکھا تھا۔ محض مثال کے طور پر عرض کروں کہ کسی کتاب میں لفظ "منھدی" اِس طرح لکھا ہوا تھا کہ پہلے مٓ، پھر نٓ، پھر ہ، پھر دالٓ اور یٓ (منّھدی)۔ طالب علم کی آنکھ نے اِس لفظ کا یہی املا دیکھا، سبق کی تکرار کے دوران بار بار اُس کی نظر اِس نقش کو اِسی ترتیب کے ساتھ یادداشت کے صفحے پر لکھتی رہی (صحیح املا بھی یہی ہے)؛ مگر اُستاد نے جب کاپی پر اصلاح کی، یا خود بلیک بورڈ پر لکھا تو پہلے مٓ بنایا، پھر ہاے ہوّز بنائی، پھر نونٓ کو شامل کیا اور اِس کے بعد دالٓ اور یاے معروف کو لکھا (مہندی)۔ اور اِس کی وجہ یہ تھی کہ اُنھوں نے اپنے زمانے میں اِس لفظ کو اِسی طرح لکھنا سیکھا تھا، اب قلم بے اختیار اُسی ترتیب کی تکرار کرتا ہے۔ وہ بچّہ تو خیر کیا کہتا، اُس کا ذہن اُلجھے گا، زبان تو کُھلنے سے رہی؛ مگر اُس کی جگہ کوئی سمجھ دار بالغ طالب علم ہوا، یا کوئی غیر ملکی طالب علم ہوا جو زبان کی ابتدائی باتیں سیکھ کر، سمجھ کر آیا ہے اور جو اسپیلنگ کی اہمیّت سے واقف ہے؛ وہ اُستاد سے اُلجھے گا اور مشکل یہ ہوگی کہ اُستاد بھی کوئی فیصلہ کُن بات نہیں کہہ پائے گا۔

مقصود یہ ہے کہ جب تک صحتِ املا کے قاعدوں کی طرف توجّہ نہیں کی جائے گی، اور الفاظ کی معیار بندی نہیں کی جائے گی؛ اُس وقت تک ابتدائی درسی کتابیں صحیح طور پر مکمّل نہیں ہو سکتیں اور عدمِ تعیّن، بے پروائی یا ناواقفیّت نے املا میں جس انتشار کو پھیلا رکھا ہے؛ اُس کا خاتمہ نہیں ہوگا۔

لُغت، استناد کا اہم ترین ذریعہ ہوتا ہے؛ آج اگر کسی لُغت کو مرتّب کیا جائے تو سب سے پہلا مسئلہ وہاں بھی یہی ہوگا کہ لفظوں کا املا کیا ہو؛ کیوں کہ حروف کے تعیّن کی نسبت ہی سے لُغت میں لفظوں کی فصلیں قائم کی جاتی ہیں۔ انگریزی کے کسی لفظ میں کچھ شبہہ ہو، لُغت اُٹھا کر دیکھ لیجیے، فوراً قطعیّت کے ساتھ معلوم ہو جائے گا کہ وہ کن حروف سے مرکّب ہے اور اُن حروف کی ترتیب کیا ہے۔ اُردو لُغات میں آپ کو یہ کرشمہ بھی نظر آئے گا کہ الفاظ کے معانی تو لازماً صاحبِ لُغت کے متعیّن کیے ہوئے ہوں گے، مگر بہت سے الفاظ کا املا کبھی تو مرتّب کا متعیّن کیا ہوا ہوگا اور کبھی کاتب کا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بعض جگہ کاپیوں کی تصحیح کرنے والے بزرگ کی پسندیدگی کا کرشمہ ہو۔ اِس کے علاوہ، املا میں عدمِ تعیّن نے جو پریشان کُن رنگا رنگی پیدا کر رکھی ہے، اُس کے اثر سے ایک ہی لفظ دو لُغات میں دو طرح بھی مل جائے گا۔ اب پڑھنے والا الجھتا رہے۔ میں دو مثالوں سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا:

(۱) نور اللّغات میں لفظ "منہدی" کے ذیل میں مؤلف نے صراحت کر دی ہے کہ اِس لفظ میں ہاے ہوّز سے پہلے نون لکھنا چاہیے، مگر فرہنگِ آصفیہ میں، یہ لفظ "میم مع نون" کی فصل میں بھی مل جائے گا اور "میم مع

ہائے ہوّز" کی فصل میں بھی ۔ اب اگر ایک شخص نے نوراللغات کو دیکھا ہے، وہ تو "منہدی" کو صحیح سمجھے گا ۔ اور دوسرے نے اگر آصفیہ میں "میم مع نون" کی فصل کو پہلے دیکھا ہے تو وہ بھی "منہدی" کو درست مانے گا ، لیکن اُس نے اگر پہلے "میم مع ہائے ہوّز" کی فصل دیکھ لی ہے ، تو وہ "مہندی" کو صحیح سمجھے گا ۔

(۲) لفظ "پھُوار" کا املا کیا ہوگا؟ نوراللغات میں "پھوار" لکھ کر ، لکھا ہے کہ بیش تر فصحا کی زبانوں پر "پھوہار" ہے۔ یہ تو خیر دو مستقل لفظ ہوئے۔ نفائس اللغات میں اِس کا املا "پھآر" ملتا ہے ۔ نفس اللغۃ میں "پھہار" لکھا ہوا ہے ۔ اور فرہنگِ آصفیہ میں اِس کی چار صورتیں نظر آتی ہیں : "پھآر، پھوآر ، پھہار ، پھوہار" ۔ اور ترک و اختیار یا ترجیح کی کچھ صراحت نہیں کی گئی ہے ۔ اب یہی ہوگا کہ جس شخص کو جو لغت پہلے مل جائے گا ، وہ اُسی کے مطبوعہ اندراج کے مطابق اِس لفظ کو صحیح سمجھے گا ۔ سوال یہ ہے کہ ابتدائی نصابی کتابوں میں اِس لفظ کا کون سا املا اختیار کیا جائے گا ؟ یہ معمولی سوال نہیں ۔

اردو میں اِس املائی انتشار کی کئی وجہیں ہیں ، اِن میں سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ املا کو ایک منفرد اور مستقل موضوع کی حیثیت سے نہیں دیکھا گیا۔ خلطِ مبحث کے طفیل ، املا کے مسائل ، رسمِ خط کی بحثوں میں اُلجھتے گئے اور توجّہ کا رخ دوسری طرف پھر گیا ۔ یہ بھی اِسی کا نتیجہ ہے کہ اب تک اِس کا مفصّل جائزہ نہیں لیا گیا کہ لفظوں کی صورتیں کس کس طرح بدلتی رہی ہیں اور اب کون سی صورت ، مستعمل صورت کا حکم رکھتی ہے ۔ انتشار کی حکومت یہاں تک پہنچی ہے کہ ہم کبھی "مجگو" کبھی "مجکو"

کبھی اِس کو علاحدہ (مجھ کو) لکھتے ہیں اور کبھی ملا کر (مجھکو)۔ "لیے" کو کبھی یؔ سے لکھتے ہیں، کبھی ہمزہ سے اور کبھی دونوں کو جمع کر دیتے ہیں (لیے، لئے، لیئے)۔ "پتا" کو کبھی الف سے لکھتے ہیں اور کبھی ہاے مختفی کے ساتھ (پتا، پتہ)۔ "پانو" میں کبھی واو سے پہلے نونِ غنہ لکھتے ہیں، کبھی واو پر ہمزہ لگا کر، اُس کے آخر میں بھی نونِ غنہ لکھتے ہیں، کبھی "پانا" کے فعل کی طرح درمیانی نونِ غنہ کے بغیر لکھتے ہیں (پانو، پانوں، پاؤں)۔ "گزرنا" کو کبھی ذال سے لکھتے ہیں، کبھی زے سے (گذرنا، گزرنا)۔ اضافت کی صورت میں، کبھی آخرِ لفظ میں آنے والی یؔ یا یے پر ہمزہ لگاتے ہیں، جیسے: "زندگیٔ جاوید" یا "رائے عالی"۔ اور کبھی صرف یؔ کو مکسور ماننے پر اکتفا کرلیتے ہیں، یعنی: "زندگیِ جاوید" اور "راے عالی"۔ اِس طرح کی اور بیسیوں صورتیں ہیں۔ اِس سے اتفاق کیا جائے گا کہ کسی بھی زبان کے لیے یہ کچھ فخر کی بات نہیں کہ معمولی معمولی الفاظ کا املا متعیّن نہ ہو اور یہ کہ املا کے مفصّل قاعدے منضبط نہ ہوں۔

املا کی تعریف:

"املا دراصل، لفظوں میں صحیح صحیح حرفوں کے استعمال کا نام ہے اور جو طریقہ اِن حرفوں کے لکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، وہ "رسمِ خط" کہلاتا ہے"۔ اِس بات کو اختصار کے ساتھ یوں بھی کہا گیا ہے کہ املا "لفظوں کی صحیح تصویر کھینچنا" ہے۔ لُغت کی کتابوں میں املا کی تعریف عموماً ایک جملے میں کی گئی ہے: "رسمِ خط کے مطابق صحت سے لکھنا"۔ اِس میں لفظِ "صحت" کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اصولاً یہ تعریفات درست ہیں، مگر اردو میں املا کے جو

مسائل ہیں، اُن کی وسعت اور عدمِ تعین کے پھیلائے ہوئے انتشار کے پیشِ نظر یہ تعریفیں مختصر بل کہ مبہم معلوم ہوتی ہیں۔حرف جب بھی ملا کر لکھے جائیں گے، تو اُن کی شکلیں بدلتی رہیں گی؛ اِس لیے اُردو املا میں، کسی لفظ میں شامل حروف کی ترتیب، صورت اور اُن کے جوڑوں کی بنیادی اہمیت ہے۔ اردو میں سالم حرف کم آتے ہیں، زیادہ حرفوں کو توڑ کر اور ملا کر لکھا جاتا ہے؛ ایک حرف سے جب دوسرا حرف ملا کر لکھا جاتا ہے تو مختلف حرفوں کے ساتھ ملنے، اور لفظ کے شروع، درمیان یا آخر میں آنے کے لحاظ سے، اُن ٹکڑوں کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اِس لحاظ سے مناسب یہ ہوگا کہ املا کی اِس طرح تعریف کی جائے کہ وہ اِن سب پر حاوی ہو۔ یہ تعریف اِس طرح کی جا سکتی ہے:

اُردو کے رسمِ خط کے مطابق، لفظ میں حرفوں کی ترتیب کا تعین، ترتیب کے لحاظ سے اُس لفظ میں شامل حروف کی صورت اور حرفوں کے جوڑ کا متعارف طریقہ؛ اِن سب کے مجموعے کا نام املا ہے۔

لفظ "منہدی" میں نون کہاں پر آئے گا؟ لفظ "گھر" میں دوچشمی ہ (ھ) لکھی جائے گی یا کَھنی دار؟ "جودت" اور "معجزہ" میں حرفِ جیم کی صورت کیا ہوگی؟ یہ سب املا کے مسائل ہیں، اور اِس تعریف میں شامل ہیں۔

الفاظ کی صورت نویسی کا تعلق املا سے ہے؛ اِس صورت نویسی میں، مستعمل روشِ خط کو صورت نویسی کی بنیاد مانا جائے گا، اور اُسی روش کے تعینات کے مطابق حرفوں کے جوڑ پیوند کی مختلف شکلوں کی معیار بندی کی جائے گی۔ چوں کہ اردو میں تحریر کی حد تک مسلّمہ طور پر خطِ نستعلیق کی روش برتی جاتی

ہے ؛ اِس لیے حرفوں کے جوڑ اور لفظوں کی مجموعی صورت نگاری کے لیے اِسی روش کو بنیاد مانا جائے گا ۔

لُغت میں لفظوں کے اجزا کے ساتھ ساتھ ، اُن کی ترتیب کا بھی تعیّن کیا جاتا ہے ؛ چوں کہ املا ، لُغت کے اِنھی تعیّنات کی صورت نگاری کا نام ہے ؛ اِس لیے لفظ میں حرفوں کا تعیّن اور ترتیب بھی خود بہ خود املا کے دائرے میں آجاتی ہے ۔ لفظِ صورت نویسی ، اِن سب پر حاوی ہے ۔

اِس سلسلے کی بحث کو ذرا دیر کے لیے روک کر ، ایک ضمنی بات کہنا چاہتا ہوں : جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ، خطِ نستعلیق کو بنیاد بناکر ، حرفوں کے جوڑ بند کی حد تک اِس روشِ خط کی پیروی کی جائے گی ، اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ خطِ نسخ اور خطِ شکستہ کا تعلّق عام تحریر سے مطلق نہیں ۔ بچّہ شروع میں صرف نستعلیق کی روش سیکھتا ہے اور ایک مدّت تک وہ اُسی کو برتتا ہے ، قلم کی تحریر میں تو آخر تک صرف یہی روش برقرار رہتی ہے ؛ اِس لیے ابتدائی اور بنیادی اہمیّت اِسی خط کی مانی گئی ہے ۔ ٹائپ سے سابقہ ذرا بعد میں پڑتا ہے ، مگر قلم کا اُس سے کبھی سابقہ نہیں پڑتا ، صرف آنکھوں تک اُس کی رسائی رہتی ہے ۔ شروع میں جب طالب علم کو لکھنا سکھایا جائے گا — یعنی وہ صحیح اور حقیقی وقت ، جب کہ وہ املا سیکھتا ہے ؛ تو اُس وقت صرف نستعلیق کی روش اُس کو سکھائی جاتی ہے اور یہی صورت آیندہ بھی رہے گی ۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ نسخ اور نستعلیق میں ، ترتیبِ حروف کا فرق نہیں ہوتا ۔ چوں کہ یہ دو مختلف روشیں ہیں ، اِس لیے حرفوں کے جوڑ میں اور اُن کی صورت میں کچھ فرق نمایاں رہتا ہے اور یہ ایسا فرق ہے کہ

نگاہیں بہت جلد اُس سے متعارف اور مانوس ہو جاتی ہیں، کسی طرح کی اُلجھن پیدا نہیں ہوتی۔ قلم برابر نستعلیق کی روش پر چلتا رہتا ہے اور نظر برابر نسخ کی عبارت کو پڑھتی رہتی ہے۔ ہندستان میں اب تک نسخ کا تعلّق مشین سے ہے اور نستعلیق کا تعلّق ہاتھ سے ہے، اور بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا کہ یہ فرق اِسی طرح برقرار رہے گا۔ نسخ کتنا ہی مقبول ہو جائے، مگر وہ رہے گا مشین کے پاس، اور سیسے کے ڈھلے ہوئے ٹکڑوں کی صورت میں۔ اور ہاتھ اور قلم کے کام نستعلیق ہی آتا رہے گا۔ یہاں پر یہ "جملۂ معترضہ" ختم ہوا۔

املا کا تعلّق اصلاً مفرد لفظوں سے ہے؛ اِس لحاظ سے، مرکّب لفظوں کے متعلّق یہ کہنا کہ اُن کو کس طرح لکھا جائے؛ بہ ظاہر زائد بات معلوم ہوتی ہے، لیکن مرکّبات کی کچھ صورتیں ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے اِس "زائد بات" کو کہنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ایک زمانے میں دو لفظوں کو، کسی اور طرح لکھا جاتا تھا، آج دوسری طرح لکھا جاتا ہے؛ یہ ایسے لفظ ہیں کہ اُن کو اگر پُرانے طریقے کے مطابق اب لکھا جائے تو نظر فوراً تنبیہ کرے گی کہ یہ صورت ٹھیک نہیں۔ جیسے بہ پہلے "اُن نے" اور "اُس سے" کو "اُننے"، "اُننے" اور "اُسے" بھی لکھا جاتا تھا، اِسی طرح "ماننا" اور "بننا" کو "مانا" اور "بنا" بھی لکھتے تھے (وغیرہ)۔ آج اگر کوئی شخص اِس طرح لکھ دے تو یہ لفظ محلِّ نظر معلوم ہوں گے۔ اِس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ مرکّبات کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس میں اجزا کی صورت نویسی، صحّت وعدمِ صحّت سے لازمی تعلّق رکھتی ہے۔

اِسی طرح دو یا زیادہ لفظوں کو ملا کر لکھنے میں تکلّف نہیں کیا جاتا تھا۔

انجمن ترقیِ اُردو نے اور باتوں کے علاوہ، یہ قاعدہ بھی بنایا تھا کہ امکان کی حد تک لفظوں کو الگ الگ لکھنا چاہیے۔ صاحبِ نظر لوگوں نے اِس قاعدے کو تسلیم کیا اور برتا بھی۔ اب گویا مرکّب لفظوں کا الگ الگ لکھا جانا، صحّت سے قریں سمجھا جاتا ہے ـــــ اِس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مرکّبات کے طریقِ تحریر کو بھی املا کی بحث میں شامل سمجھنا چاہیے۔

اِس بحث کے بعد، یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ حرکات یا علامات، نفسِ املا میں شامل نہیں۔ اِس کی مفصّل بحث "اعراب، علامات، رموزِ اوقاف" کے تحت آئے گی۔ اِسی طرح رموزِ اوقاف بھی املا میں شامل نہیں۔ صحّتِ عبارت کی غرض سے، یا پڑھنے والوں کی آسانی کی خاطر یہ ضروری ہو سکتے ہیں، ہوتے بھی ہیں، خصوصاً نظم میں؛ مگر لفظوں کی صورت نویسی سے اِن کو لازمی تعلّق نہیں۔ البتہ صحّتِ کلام کے اسباب و وسائل میں اِن کو شمار کیا جائے گا، اور اِس لحاظ سے اِن کی اہمیّت بہت زیادہ ہے۔

تنوین کے اعراب (جن کو اُردو کے لحاظ سے علامات کے ذیل میں رکھا گیا ہے)، الفِ ممدودہ کا مد، اور تشدید؛ یہ تینوں اجزا شاملِ املا ہیں۔ "اعراب و علامات" کے ذیل میں اِن سے متعلّق تفصیلات ملیں گی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر خطّاطی اور رسمِ خط سے متعلّق بعض باتوں کی وضاحت کردی جائے۔

اُردو میں نسخ، نستعلیق اور شکستہ کا رواج رہا ہے۔ اِس فرق کے ساتھ کہ خطِّ شکستہ عام طور پر پُرانے دفتروں میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اِس کی تشکیل بھی فرقی ... سے پہلے

تک مکتبوں میں خطِ شکستہ کی ایک آدھ ابتدائی کتاب بھی شاملِ درس ہوتی تھی۔ مقصد یہ نہیں ہوتا تھا کہ اِس خط کا لکھنا سکھایا جائے ، اصل مقصد یہ ہوتا تھا کہ اِس کا پڑھنا آجائے۔ اور خطوں کی طرح ، شروع میں اِس کا انداز بھی متعیّن کیا گیا تھا ، لیکن رفتہ رفتہ یہ خط ، دوسرے خطوں کے برخلاف ، باضابطگی سے زیادہ قریب نہیں رہ پایا ، خاص طور سے تھانوں اور کچہریوں میں کچھ سے کچھ بن گیا۔ اِس کی روش اب بھی دیکھنے میں آجاتی ہے۔ عوامی زبان میں اِسے "گھسیٹ" کہنے لگے۔ بہ ہر صورت، اب اِس کا چلن محدود بل کہ محدود تر ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ عام طور پر تحریریں اِس طرح لکھی جاتی ہیں کہ اُن میں اصل روش تو نستعلیق کی ہوتی ہے ، ہاں کبھی کبھی بعض کششیں شکستہ کی سی بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

خوش نویسی نے خطِ نستعلیق کو معراجِ کمال عطا کی۔ لیتھو ، آفسٹ یا بلاک کی چھپائی میں اب اِسی "عروس الخطوط" کا چلن ہے۔ ٹائپ کے لیے خطِ نسخ مناسب تھا ، اُسی کو اختیار کیا گیا۔ نستعلیق ٹائپ بھی بنا تھا، ایک زمانے میں کتابیں بھی اُس نستعلیق ٹائپ میں چھپی تھیں ، لیکن اِس صنعتی تضاد کو دیر تک نہیں نبھایا جا سکا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ٹائپ کے لیے نسخ اور لیتھو وغیرہ کے لیے نستعلیق کا رواج ہے۔ بچّوں کو مدرسوں ، مکتبوں اور اسکولوں میں نستعلیق ہی میں لکھنا سکھایا جاتا ہے۔

خطّاطی ایک مستقل فن تھا ، جس نے مصوّری کے انداز پر فروغ پایا۔ تزئینی خطوط کی مختلف قسموں نے اُس کو نقّاشی کی رنگا رنگی سے اور قریب کر دیا۔

خطِ طغرا، خطِ گلزار، خطِ غبار وغیرہ اِسی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ــــ کہنا یہ ہے کہ نستعلیق ہو یا نسخ اور شکستہ ہو یا طغرا؛ یہ سب خط کی قسمیں ہیں۔ آرایشی خط، رسمِ خط کے ذیل میں آنے کے بجائے، فنِ خطّاطی کے دائرے میں آتے ہیں۔ رہے نستعلیق، نسخ اور شکستہ؛ یہ بھی خطّاطی ہی کے خاندان سے تعلّق رکھتے ہیں، لیکن اِس بنا پر کہ عام تحریر میں اِن کا چلن رہا ہے اور اِن سے آرایش کا نہیں، تحریر کا کام لیا گیا ہے؛ اِس لیے یہ اُردو کے متعارف اندازِ تحریر کی تین قسمیں ہیں، اُس فرق کے ساتھ جو اِن سے نسبت رکھتا ہے۔ اِس طرح اِن تین خطوں کو، رسمِ خط سے قریب کا تعلّق رہا اور باقی خطوں کو دُور کی نسبت رہی، یہاں تک کہ وہ ایک مستقل فن یعنی خطّاطی کے ایسے اجزا قرار پائے جو بجائے خود ایک الگ صنف کی حیثیت سے مشخّص ہوئے۔ نستعلیق، خطّاطی کے کمال کا شاہ کار ہے، لیکن تحریر میں مستقل استعمال ہونے سے اُس کی افادی حیثیت روشن ہوئی اور اب وہ اردو املا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ نمایندہ موضوع ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ ہر خط کا اپنا انداز ہے، جس کے ضابطے مقرّر ہیں؛ مگر یہ املا نہیں، اندازِ نگارش ہے، جس کا مقصود ہی مختلف ہے۔ کہنا یہ ہے کہ خطّاطی کے مباحث کو، رسمِ خط اور املا کے مباحث میں آمیز نہیں کرنا چاہیے۔

املا کی صحّت اور اصلاح بہت ضروری ہے، اِس سے شاید ہی کوئی انکار کرسکے۔ اِس بات کو بھی تسلیم کیا جائے گا کہ املا کے قواعد منضبط کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اِسی کے ساتھ ساتھ اِس بات کو بھی مان لینا چاہیے کہ املا میں کسی بھی قسم کی انقلابی تبدیلیوں کی گنجایش نہیں، اور اِس کا واضح طور پر

اعلان ہونا چاہیے۔

اصلاحِ املا کے سلسلے میں مختلف حضرات نے اپنے مضامین میں بعض انقلابی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ یہ تجویزیں بہت سنجیدگی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ اِن لوگوں کے خلوص اور دل سوزی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اِن سب کی خواہش یہی تھی کہ اُردو املا کو آسان بنایا جائے۔ ایسے مضامین کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ فروعی اصلاحات کے علاوہ، خاص زور دو باتوں پر تھا: ایک تو یہ کہ اُردو میں ایک آواز کے لیے ایک ہی حرف ہونا چاہیے، یعنی ہم آواز حرفوں میں سے ایک حرف کو رکھ لیا جائے اور باقی کو اردو کے حروفِ تہجی سے خارج کر دیا جائے۔ مثلاً س، ث، ص؛ اِن تین حرفوں میں سے ایک س کو باقی رکھا جائے اور باقی دونوں حرفوں کو مرحوم فرض کر لیا جائے۔ دوسری اہم تجویز یہ تھی کہ جو حرف پڑھنے میں نہیں آتے، اُن کو لکھا بھی نہ جائے، جیسے: بالکل، کہ اِس کو "بلکل" یا "بل کل" لکھا جانا چاہیے، اِسی طرح مثلاً "خوش" کو "خش" لکھا جائے۔

یہ دونوں تجویزیں، اصلاح کے بجائے، تبدیلی کا حکم رکھتی ہیں۔ اِن تجویزوں کو پیش کرنے والے نہایت درجہ مخلص ہیں، مگر اِس ذیل میں دو واقعی اہم مسائل کو نظر انداز کر دیا گیا: پہلی بات تو یہ کہ اِن تبدیلیوں کو نافذ کون کرے گا؟ اور قبول کون کرے گا؟ اصلاح اور صحت کی جس طرح گنجایش ہوتی ہے، تبدیلی کی اُس طرح گنجایش نہیں ہوتی۔ یہ دو بالکل مختلف عمل ہیں۔ نفاذ کا سوال، اہم ترین سوال ہے۔ بڑی سے بڑی تبدیلی کی بات کی جا سکتی ہے، مگر یہ دیکھنا بھی لازم ہوگا کہ اُس کو نافذ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر نافذ نہیں کیا جا سکتا تو پھر اِس طرح کی تجاویز سے، اِس کے سوا کہ انتشار

اور اُلجھن میں اضافہ ہو، اور کچھ حاصل نہیں۔ انقلابی تجاویز سے ذہن بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ نیا پن اچانک ذہن پر چھاپا مارتا ہے۔ دوسروں کو کیوں کہوں اور کیا کہوں، میں خود ایک زمانے میں اِس طرح کی پسندیدگی کے پھیر میں آچکا ہوں۔ خدا جنّت نصیب کرے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کو، جن کی فہمایش اور تعلیم نے، اُس "جہادِ کم نظری" کے پیچ و خم سے نجات دلائی۔ زبان کے معاملے میں انقلابی تجاویز عموماً ساتھ نہیں دے پاتیں اور یہ بات کچھ ہندستان ہی سے یا اُردو ہی سے مخصوص نہیں۔ ہاں کہیں کوئی ایسی مطلق العنان حکومت ہو جو زبان کو اُس کے سارے متعلّقات کے ساتھ "نیشنلائز" کر ڈالے، اور حکومت کی مشینری اُس انقلاب کو بہ روے کار لے آئے؛ یہ دوسری بات ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہندستان میں فی الوقت یہ صورت نہیں ہے اور بہ ظاہر یہ مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ مستقبلِ قریب میں بھی یہاں اِس انداز کی "صاحبی" یا "نادر شاہی" پیدا ہو سکے؛ تو پھر اِس املائی انقلاب کو کون لائے گا؟ ــــ اِس کے سوا، موجودہ حالات کے پیشِ نظر، اُردو والوں کے پاس جو محدود وسائل ہیں، وہ سب اِسی "نیک کام" کے لیے کیوں وقف کر دیے جائیں، جب کہ معلوم ہے کہ اِس بیل کو منڈھے چڑھنا نہیں۔

دوسری بات یہ کہ دنیا کی کوئی زبان، تحریری سطح پر، اِس حد تک سائنٹفک نہیں کہ اُس میں کوئی خامی ہی نہ ہو۔ یہ قول کسی عامی کا نہیں، زبان کے ماہروں کا ہے۔ انگریزی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس میں اِس طرح کے ستر عیب نکالے جا سکتے ہیں۔ زبان ہو، رسمِ خط ہو یا املا؛ اِن کا حال کیلنڈر کا سا نہیں ہوتا کہ آج فرض کر لیں کہ تاریخ ختم ہو گئی، ایک قدم و ترقی

اُلٹ دیا اور سب کچھ بدل گیا۔ سیکڑوں سال میں جو نقش مرتسم ہوتے ہیں، اُن کو ایک دن میں نہ مٹایا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے۔

یہاں پر ایک یہ مختصر سی بات بھی کہنا چاہوں گا کہ علمی اور سائنسی حقیقتوں کے علاوہ، رواج اور روایت کی بنائی ہوئی حقیقتیں بھی ہوا کرتی ہیں؛ بہت سے مواقع اور مقامات ایسے ہیں جہاں سائنسی صداقت اور علمی حقیقت پسندی کو، روایت کی تراشیدہ اور پروردہ حقیقتوں کا احترام کرنا پڑتا ہے اور اِس مجبوری کا بھی ابھی تک کوئی علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے۔

اِس طرح کی انقلابی تجاویز پیش کرنے والوں میں سے بعض لوگ اِس خیال یا دوسروں کے اعتراض سے بھی متاثر تھے کہ اُردو کے املا میں ساری خرابیاں ہم آواز حرفوں اور زائد حرفوں کی پیدا کی ہوئی ہیں؛ یہ نکل جائیں تو اُردو کو سب لوگ پڑھنے لگیں گے۔ مگر یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ اِس کے سوا کہ ایسی تجاویز ناقابلِ عمل ہیں؛ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ آپ جب کسی زبان کو سیکھنا چاہیں گے تو تفہیمِ زبان کے پورے آداب کے ساتھ اُس کو سیکھنے پر مجبور ہیں اور ایسی کوئی زبان نہیں جس میں کچھ نہ کچھ مشکلیں یا اُلجھنیں نہ ہوں۔ یہ مشکلیں زبان کے رگ ریشے میں اِس طرح پیوست ہو چکی ہوتی ہیں کہ اُن کو زبان سے الگ نہیں کیا جا سکتا؛ اِس لیے کہ زمانۂ دراز کے پیہم عملِ ارتقا کے وسیلے سے، اُن مختلف اجزا کے عناصر زبان میں جذب ہو گئے ہیں۔ کہیں اوپر سے اُن کا جوڑ نہیں لگایا گیا تھا کہ آسانی سے اُن کو اُدھیڑ پھینکا جائے۔

اِس طرح کی تجاویز سے فائدہ تو کچھ ہوا نہیں ، ہو بھی نہیں سکتا تھا؛ البتہ نقصان یہ ہوا کہ صحتِ املا اور اصلاحِ املا کے حقیقی مسائل کی طرف سے توجہ ہٹ گئی ۔ یہ بڑا نقصان تھا ۔ جو توجہ املا کے قواعد مرتب کرنے پر صرف ہوتی ، وہ اِس کارِ فضول کی نذر ہوکر رہ گئی ۔ اُردو املا میں کس بلا کا انتشار اور غلط نگاری ہے ! اِس کی طرف توجہ کم سے کم مبذول ہو پائی ۔

بہ ہر صورت ، ہم کو دو باتیں صاف طور پر مان لینا چاہیے : ایک تو یہ کہ اُردو کے رسم خط کو نہیں بدلا جا سکتا ، اور دوسری یہ کہ اُس کے املا میں کسی بھی نوع کی انقلابی تجاویز کو بھی شامل نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ دونوں باتیں ناقابلِ عمل ہیں ۔ یہاں علمی صداقت سے بحث نہیں ، عملی سچائی کا معاملہ ہے ۔ اِسی کے ساتھ ، اِس بات کو بھی واضح طور پر ماننا چاہیے کہ اُردو املا میں غلط نگاری نے بہت کچھ راہ پائی ہے ، اور عدمِ تعیّن نے انتشار کو پھیلا رکھا ہے ۔ اِس سلسلے میں اِس کی ضرورت ہے کہ ایسے الفاظ کا مفصّل جائزہ لیا جائے اور ضابطوں کا تعیّن کیا جائے ۔ دوسری بات یہ ہے کہ املا کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے دیکھا جائے اور اِسی حیثیت سے اُس کے مفصّل ضابطے مرتب کیے جائیں ۔

صحتِ املا کے اہم مسئلے کی طرف وقتاً فوقتاً مختلف حضرات نے توجہ کی ، مگر اکثر یہ ہوا کہ اُس کے ساتھ ایسی تجاویز کو بھی منسلک کر دیا گیا جو قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھیں ، اور کبھی املا کی بحث ، رسم خط کی بحث میں اُلجھ گئی ۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ جستہ جستہ باتیں کہی گئیں ، ایک مستقل موضوع کی حیثیت سے تفصیل کے ساتھ اُس کے سارے متعلقات کا احاطہ کرنے

کی کوشش نہیں کی گئی۔ اِس وجہ سے املا کی ساری خرابیوں کا پورا پورا اندازہ عام طور پر نہیں ہو پایا۔ یہ بات نہیں کہ اِس موضوع کی طرف توجہ ہی نہ کی گئی ہو۔ اب سے بہت پہلے یعنی ۱۹۰۵ء میں، مولانا احسن مارہروی مرحوم نے صحتِ املا کے قاعدوں کی طرف توجہ کی تھی اور رسالۂ فصیح الملک میں کچھ اہم تجاویز کو پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفا خاں نے اپنی کتاب علمی نقوش میں تفصیل کے ساتھ مولانائے مرحوم کی اِن خدمات کا ذکر کیا ہے، اور اُن تجاویز کو نقل کیا ہے۔ اُن کی عبارت یہ ہے:

[مئی ۱۹۰۵ء کے رسالۂ فصیح الملک میں مولانا احسن مارہروی مرحوم نے املا پر بہت زور دیا... اُنھوں نے خصوصاً اِن باتوں پر زور دیا:

دیکھیے، دیجیے، اِس لیے، وغیرہ میں، یے سے پہلے ہمزہ نہ لکھا جائے۔

ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں ہاے مختفی نہ ہو، بل کہ الف ہو جیسے:

پتا، بھروسا، سامنا، دھوکا، کلیجا، مہینا، ٹھیکا وغیرہ۔

اِسی طرح حلوا، معما، تمغا، چلیپا، ناشتا وغیرہ میں خواہ مخواہ ہ نہ لکھی جائے۔

جس لفظ کے آخر میں ہ آئے تو فاعلیّت، مفعولیّت اور اضافت کی حالت میں اُسے یے لکھا جائے۔ جیسے: "کسی زمانے میں"۔ اِسی طرح، حالتِ ترکیبی یعنی عطف و اضافت میں بھی عربی فارسی الفاظ اُسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں۔ مثلاً: "لب و لہجے میں"، "مجھدے بازی میں" وغیرہ۔.....

نون کے متعلق لکھتے ہیں:

" نون کا تلفّظ اردو میں دو طرح ہے۔ جو نون آخرِ لفظ میں ظاہر کر کے

پڑھا جائے ، وہ نقطے دار ہوگا ، جیسے : جان ، تان ۔ اور جو اِس طرح ظاہر نہ ہو ، اُس میں نقطہ نہ ہوگا ، جیسے : یہاں ، کہار ۔ درمیانِ لفظ میں اگر نون بالاظہار ہو تو اُس پر معمولاً صرف نقطہ ہوگا ، جیسے : تنکا ۔ اور اگر بہ اعلان نہ ہو ، تو اس پر نقطے کے بجائے ، یہ نشان (۷) الٹا جزم ہوگا ، جیسے : تانبا "

اِسی طرح ہاے مخلوط کے متعلّق لکھتے ہیں :

" ہمارے نزدیک صرف وہی ھ جو ہجّوں میں اپنے اوّل و آخر حروف سے ملے ، جیسے : بھی ، بھان ؛ اُس کی کتابت دوچشمی ھ سے ہوگی ۔ باقی ہر لفظ میں ایک ایک شوشے سے لکھی جائے گی ، جیسے : کہیں ، جگہ ، ہو وغیرہ "۔

اِسی رسالے میں مولانا لکھتے ہیں کہ :

" جو الفاظ الگ الگ لکھے جانے میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے ، اور جن کی ترکیب بھی جداگانہ ہے ، اکثر جدا جدا لکھے جائیں گے ، جیسے : آئیں گے ، ہوں گے ، جس کی ، آپس میں ، غرض کہ ، بل کہ ، کیوں کہ ، علاحدہ ، حال آں کہ ، چناں چہ ، چوں کہ ، کون سی ، اس واسطے کہ ، دل چسپ ، دل کش ، ہم سر ، کم یاب ، دست یاب ، خوب صورت وغیرہ "]

یہ تجاویز ناتمام اور مختصر سہی ، مگر نہایت درجہ اہم ہیں اور اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانائے مرحوم کے ذہن میں اِس موضوع کی اہمیّت کا احساس موجود تھا ؛ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اِس طرف کماحقّہٗ توجّہ نہیں کر سکے ۔ اِس زمانے میں ڈاکٹر عبدالستّار صدیقی مرحوم واحد شخص تھے جنھوں نے اِس موضوع کا ، مستقل موضوع کی حیثیت سے مطالعہ کیا اور اِس پر لوگوں

کی توجہ اِس طرف مبذول کرائی ۔ رسالۂ ہندستانی ، رسالۂ اردو ، رسالۂ معیار (پٹنہ) میں اُن کے نہایت اہم مضامین محفوظ ہیں ۔ اِن مضامین کے علاوہ مختلف کتابوں کے تبصروں اور مقدّموں میں بھی وہ اِن مسائل کا بار بار ذکر کرتے رہے ۔ اِن میں مقدّمۂ کُلّیاتِ ولی ، مقدّمۂ خطوطِ غالب (مرتّبۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم) تبصرۂ مکاتیبِ غالب (مرتّبۂ عرشی صاحب) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ اِس کے علاوہ ، بہت سے خطوں میں اُنھوں نے املا کے مسائل و اغلاط کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ۔ نقطے ، شوشے ، حرفوں کے جوڑ ، حروف کی ترتیب ، حروف کا تعیّن ؛ غرض اِن سب باتوں کی طرف وہ زندگی بھر لوگوں کو متوجہ کرتے رہے ۔ اُن کی مختلف تحریروں نے واقعتاً بہت سے لوگوں کے ذہن میں اِس موضوع کی اہمیّت کا احساس پیدا کیا ۔ انجمن ترقّیِ اُردو نے اصلاحِ املا کی تجاویز کو جس انداز سے مرتّب کیا تھا (جن کا ذکر آئے گا) اور جس طرح اِس موضوع کو اہمیّت دی تھی ؛ اُس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کاوشوں کو بہت زیادہ دخل تھا ۔

مجھے سب سے پہلے مرحوم ہی کے مضامین سے املا کے مسائل سے دل چسپی پیدا ہوئی ۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں میں نے یہ طے کیا کہ اِس موضوع کی طرف باقاعدہ توجہ کرنا چاہیے ۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے میں نے یہ کوشش کی کہ مختلف رسالوں اور کتابوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے ، اُس کو دیکھا جائے ۔ مطالعے کے دوران میں اندازہ ہوا کہ یہ موضوع واقعتاً وسیع ہے اور قاعدوں کے مرتّب نہ ہونے سے انتشار اور غلط نویسی جس قدر پھیل چکی ہے ، اُس کا احاطہ کرنا کچھ آسان نہیں ۔ میں نے سب سے پہلے انجمن ترقّیِ اردو (مرحوم) کی اُن تجاویزِ اصلاحِ املا کو سامنے رکھا ،

جو ۱۹۴۴ء کے رسالۂ اردو میں شائع ہوئی تھیں۔ یہ دراصل اُس اصلاحِ املا کمیٹی کی رپورٹ ہے، جو ۱۹۴۳ء میں مقرر کی گئی تھی۔ اِن تجاویز کو میں نے اپنے کام کی بنیاد بنایا۔ یہ تجاویز مختصر اور ناتمام ہیں۔ اِن میں صرف چند اُمور سے بحث کی گئی ہے اور وہ بھی اختصار کے ساتھ، اِس کے باوجود، اِن تجاویز کی حیثیت بنیادی ہے۔ اِسی کے ساتھ میں نے ڈاکٹر صدّیقی مرحوم کی مختلف تحریروں کو جمع کیا اور اِس طرح ابتدائی کام کا خاکا سا بن گیا۔

اِس سلسلے میں میں نے صدّیقی صاحب مرحوم کی خدمت میں ایک عریضہ پیش کیا۔ یہ دسمبر ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ مجھے اِس سے پہلے نہ تو کبھی مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا اور نہ کبھی خط لکھنے کا اتّفاق ہوا تھا۔ موصوف نے بزرگانہ شفقت کے ساتھ جواب لکھا اور اِس موضوع کے انتخاب پر جس طرح مبارک باد دی اور جن الفاظ میں مدد کا وعدہ کیا؛ اُس سے ہمّت بندھی اور حوصلہ بڑھا۔

اِس کے بعد میں نے کئی بار بہت سے سوالات لکھ کر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بھیجے اور مرحوم نے ضعیفی کے باوجود، نہایت مفصّل جوابات دیے۔ مثلاً ان میں کا ایک خط، مکتوبہ ۷، مارچ ۱۹۶۱ء، باریک قلم سے لکھے ہوئے، فل اسکیپ سائز کے ۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اِس خط کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے: "آپ کو بہت انتظار کھینچنا پڑا جس کا افسوس ہے، لیکن میں مجبور تھا۔ یہ کوشش بھی ضروری تھی کہ بات تشنہ نہ رہے"۔ ایک اور طویل خط کے آخر میں لکھا ہے: "یہ خط کئی دن ہوئے شروع کیا تھا۔ آج ختم ہوا (۲۸، مئی ۱۹۶۱ء)"۔ آج جب اِن خطوں کو دیکھتا ہوں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ خطوں کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مکتوب نگار چاہتا ہو کہ

کسی نہ کسی طرح ساری معلومات مکتوب الیہ تک پہنچا دی جائے۔ ایک بات پوچھی، اُس کے جواب کے ساتھ، کئی اور ضمنی باتوں کو بھی لکھ دیا، اجمال کے ساتھ نہیں، خوب سمجھا سمجھا کر، جس طرح سامنے بیٹھے ہوئے شاگرد کو سبق پڑھایا جارہا ہو۔ دوسروں تک اِس شفقت کے ساتھ، اور ایک فریضہ سمجھ کر، علم پہنچانے کا یہ جذبہ واقعی کم یاب ہے۔ میں نے اِس جذبے اور اِس انداز کے اب تک تین بزرگ دیکھے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ جو کچھ اُن کو معلوم ہے، وہ سب کو معلوم ہو جائے اور جن کی شفقت کے سایے میں چھوٹے بڑے سب کو یک ساں بار ملتا ہے۔ اِن میں سے ایک تو صدیقی صاحب مرحوم تھے۔ دوسرے دو بزرگ، قاضی عبدالودود صاحب اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مدظلہم العالی) ہیں۔ ایسے ہی بزرگوں کے سامنے عقیدت کے سر جھک جاتے ہیں اور روح زانو ہو جاتی ہے۔

صدیقی صاحب مرحوم کے لکھے ہوئے جوابات کے علاوہ، میں نے مرحوم کے خطوں کو بار بار اِس نگاہ سے بھی دیکھا کہ حرفوں کے جوڑ، شوشے، نقطے، کششیں اور رموزِ اوقاف؛ اِن سب کو بھی نگاہ میں بسا لیا جائے اور اِس سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔

خوش بختی سے قاضی عبدالودود صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی ایک طویل نزین تحریر کو تفصیل کے ساتھ مجھے بار بار پڑھنے کا موقع ملا۔ قاضی صاحب قبلہ نے قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ کے نام سے غالب کے رسائلِ نثر کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جو چھپ چکا ہے۔ موصوف نے ازراہِ شفقتِ خاص اِس مجموعے کی کاپیاں پڑھنے کا کام شروع میں میرے سپرد کیا تھا۔ اِس کتاب کا مکمل مسودہ قاضی صاحب نے اپنے قلم سے لکھا تھا۔ جو لوگ

قاضی صاحب سے واقف ہیں، وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ موصوف املا پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ اِس مسوّدے کو دیکھ کر، میں نے یہ بھی سیکھا کہ جس کتاب کو مرتّب کیا جائے، اُس کا مسوّدہ مرتّب کو اپنے ہاتھ سے لکھنا چاہیے، ناقِل یا ٹائپ مشین کو درمیان میں نہیں لانا چاہیے؛ کیوں کہ اِس صورت میں مختصّاتِ املا برقرار نہیں رہ سکتے۔ یہ نہایت اہم بات ہے۔ اِس مسوّدے کو بار بار پڑھنا پڑا اور ہر بار میں نے مختلف الفاظ کے طریقِ نگارش اور رموزِ اوقاف کو غور سے دیکھا۔ اِس طرح بھی بہت سی باتیں سمجھ میں آئیں اور اتّفاق و اختلاف کی کچھ نیرنگیوں کا بھی اندازہ ہوا۔

اِسی دوران میں لغت نامۂ دہخدا کا چالیسواں حصّہ ہاتھ آیا، جس میں "املای فارسی" کے عنوان سے آقاے احمد بہمنیار کا ایک مفصّل اور گراں ارز مقالہ شامل ہے۔ اِس میں بعض اور مضامین بھی کام کے ہیں۔ اِس سے فارسی املا کے بہت سے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملی اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ املا کی جن مشکلوں کے ہم شکوہ سنج ہیں، فارسی والے بھی اُنھی مسائل سے دو چار ہیں اور یہ کہ عدمِ تعیّن اور غلط نگاری کے اثرات فارسی میں بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اِس سے بھی مجھے اپنے کام میں بہت مدد ملی۔

مخدومی مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے دو پُر از معلومات مقالے املاے فارسی سے متعلّق نظر سے گزرے۔ ایک مقالہ بہ عنوانِ "امیر خسرو کا فارسی تلفّظ" مجلّۂ فکر و نظر (علی گڑھ) کے شمارۂ ۴۵-۴۶ میں شائع ہوا ہے اور دوسرا طویل مقالہ: "فارسی کا ہندستانی لہجہ" ارمغانِ مالک (جلدِ اوّل) میں شامل ہے۔ یہ دونوں مقالے بلند پایہ ہیں، اور املا کے کئی اہم مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ فکر و نظر کے اِسی شمارے میں ڈاکٹر نذیر احمد صاحب

کا بھی ایک اہم مقالہ ہائے مختفی سے متعلق مسائل پر شائع ہوا ہے ،
اِس کا عنوان ہے :" ہائے مختفی اور اُس سے متعلق دستوری و املائی مسائل"۔
اِن مقالوں سے بھی مجھے متعدد اُمور کو سمجھنے میں بیش قیمت مدد ملی اور
کئی اُلجھی ہوئی باتیں سلجھ گئیں ۔
میں نے یہ کوشش کی ہے کہ جہاں تک نظر اور معلومات ساتھ دے، املا
کے مسائل کا احاطہ کیا جائے اور اُلجھے ہوئے مسائل کو اُن کے حال پر نہ
چھوڑ دیا جائے ۔ غلطیوں کی تصحیح کی جائے ، اصلاحات کو صحیح طور پر
شامل کیا جائے، عدمِ تعیّن کے پھیلائے ہوئے انتشار اور دو رنگی کو ختم کیا
جائے ، اِس طرح پر کہ ایسے الفاظ کے املا کی معیار بندی کی جائے اور
مرجّح صورتوں کا تعیّن کیا جائے ۔ اِس بات کو بہ طورِ خاص ملحوظ رکھّا گیا
ہے کہ کسی قسم کی جدّت طرازی کو دخل نہ دیا جائے ۔ املا کے مسائل پر مختصراً
بہت کچھ لکھا جا چکا ہے ؛ اِس ذخیرے میں سے مستند اور قابلِ قبول تحریروں
اور تجویزوں کو بنیاد بنایا جائے اور اِنھی تحریروں اور تجویزوں کی مدد سے
قاعدے مرتّب کیے جائیں ، اور اِنھی کی روشنی میں ، دوسرے الفاظ کو
قیاس کے دائرے میں لایا جائے ۔ ایسی کوئی بات نہ کہی جائے جو مسلّمات
کے خلاف ہو ۔ یہ اہتمام کیا جائے کہ جہاں تک ممکن ہو ، حوالے ضرور
دیے جائیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے ، وہ کوئی نئی بات
یا انفرادی اپج نہیں ، اور اِس طرح اِس تحریر کے وزن و وقار میں اضافہ ہو
اور قبولِ عام کے لیے راستہ ہموار ہو جائے ۔ اِس سلسلے میں مختلف اہم لُغات
کے اندراجات کو بھی پیشِ نظر رکھّا گیا ہے اور اِس کے لیے اور لُغات کے
علاوہ ، فرہنگ آصفیہ اور نور اللّغات کی آٹھوں جلدوں کی از اوّل تا آخر

ورق گردانی کی گئی ہے۔ اِن کے علاوہ متعدّد اساتذہ کے مکاتیب اور رسائل اور قواعدِ صرف و نحو کی بعض کتابوں کو بھی پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اِس سرمایے کے علاوہ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، جناب حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے متعدّد مقالوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ مجلّہ اردو نامہ (کراچی) کے متعدّد شماروں میں املا سے متعلق مضامین شائع ہوئے ہیں، اِس کے اکثر شمارے پیشِ نظر رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ بزرگوں کی رہ نمائی اور دوستوں کی ہمّت افزائی ساتھ نہ ہوتی تو اِس صبر آزما کام کا انجام تک پہنچنا مشکل تھا۔

طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ مختلف مسائل کو، حروفِ تہجّی کے تحت منضبط کیا گیا ہے۔ فہرستِ مضامین سے بہت کچھ تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔ آخر میں ضروری الفاظ پر مشتمل ایک فہرست بہ ترتیبِ حروفِ تہجّی بھی شامل کردی گئی ہے، اِس کی مدد سے بہت سے لفظوں کو تلاش کرنے میں آسانی ہوگی۔

حروف کے بعد، دوسرے ضروری مسائل کو، مختلف عنوانات کے تحت لکھا گیا ہے۔ ایک مستقل باب املاے فارسی سے متعلّق ہے۔ فارسی املا کے مسائل بھی ہماری خصوصی توجّہ کے مستحق ہیں اور اُن کی طرف بھی کماحقہٗ توجّہ نہیں کی گئی ہے۔ یہ باب دو فصلوں میں منقسم ہے: پہلی فصل میں فارسی کے ہندستانی اور کلاسیکی لہجے کی نسبت سے یاے معروف و مجہول، واوِ معروف و مجہول اور نونِ غنّہ کے مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور دوسری فصل میں فارسی املا کے عام قاعدوں پر بحث کی گئی ہے۔

آخر میں "تدوینِ متن اور املا" اور "لُغت اور املا" کے عنوان سے دو اجزا

شامل کیے گئے ہیں۔ اِن کی اہمیّت اور ضرورت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ اِن موضوعات سے تعلقِ خاطر رکھتے ہیں، اُن کو اندازہ ہوگا کہ یہ موضوعات، اپنی اہمیّت کے باوجود، مستقل موضوع کی حیثیت سے اب تک محرومِ توجّہ رہے ہیں۔

جگہ جگہ کچھ مثالیہ اشعار یا فقرے بھی ملیں گے۔ اِس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صرف خاص خاص الفاظ کے ذیل میں مثالوں کو لایا جائے۔ اکثر جگہ اِن مثالوں سے استناد مقصود نہیں بل کہ محلِّ استعمال کو نمایاں کرنا مقصود ہے۔ گویا اِن مثالوں کی حیثیت، وضاحتِ قول کی سی ہے۔

نوراللغات اور فرہنگِ آصفیہ کا جگہ جگہ نام آیا ہے؛ اوّل الذکر کے لیے اکثر جگہ "نور" اور ثانی الذکر کے لیے "آصفیہ" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر کہیں "سرمایہ" اور "نفس" آئے، تو اُن سے مراد سرمایۂ زبانِ اردو اور نفس اللّغۃ سے ہوگی۔ اوّل الذکر جلالؔ کا لُغت ہے اور آخر الذکر میر علی اوسط رشکؔ کا۔ اِسی طرح "نفائس" سے مراد ہوگی نفائس اللّغات سے۔ امیراللّغات، نفس اللّغۃ، نوراللّغات اور فرہنگِ آصفیہ کی اوّلین اشاعتوں سے کام لیا گیا ہے۔ نفائس اللّغات کی اشاعتِ ۱۲۸۱ھ (مطبعِ مصطفائی) پیشِ نظر ہے۔

یہ کام آہستہ آہستہ ہو رہا تھا، اُس آہستگی کے ساتھ جس کو کبھی تعطّل کے نام سے بھی موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر اِس کا امکان تھا کہ یہی صورت برقرار رہتی اور تکمیل کی نوبت ابھی نہ آ پاتی۔ اب جو وہ منتشر اوراق، اِس کتاب کی صورت میں مرتّب ہوکر، طباعت کی نذر

ہو رہے ہیں؛ تو اِس میں دراصل محبِ مکرم شہباز حسین صاحب کے پیہم تقاضوں کو دخل ہے۔ اُن کے پُر خلوص تقاضوں سے اُس تعطل نے شکست پائی اور یہ کتاب اِس انداز سے شائع ہو رہی ہے۔ میں شہباز صاحب کی عنایتوں کا معترف ہوں اور منّت پذیر۔ میرے عزیز دوست ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اُن کی نوازشوں کا بہ طورِ خاص شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر صدیق الرحمان قدوائی، شعبۂ اردو کے مخلص ساتھیوں میں سے ہیں؛ قدوائی صاحب کی پُر خلوص ہمت افزائی سے کام کرنے کا حوصلہ بڑھتا رہا اور اُن کے مشوروں سے روشنی ملتی رہی۔ ڈاکٹر نورالحسن انصاری (استادِ شعبۂ فارسی، دہلی یونی ورسٹی) کے مشوروں سے بھی میں نے استفادہ کیا ہے۔ اُن کی دوستانہ نوازشوں سے مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب شمشیر بہادر سنگھ، شعبۂ اردو کے رفیقوں میں شامل ہیں؛ میں نے موصوف سے بہت سی باتوں میں مشورہ کیا ہے؛ اُن کی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنا واجبات سے ہے۔ یہ کتاب، ترقیِ اردو بورڈ کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل ہے اور اِس کام کو بھی شہباز صاحب ہی نے انجام دیا ہے، یہ کھکیڑ تو میرے بس کی تھی ہی نہیں۔

اِس کتاب کا انتساب ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی مرحوم کے نام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف مجھے حاصل نہیں ہو سکا، مگر خطوں کے ذریعے میں نے اُن سے اُسی طرح استفادہ کیا ہے، جس طرح شاگرد، اُستاد کے سامنے زانوے ادب تہ کرکے سبق پڑھتا ہے؛ اِسی بِنا پر میں مرحوم کو اُستاد مانتا ہوں۔ اور املا کے موضوع پر تو وہ اپنے زمانے میں اُستادِ کُل کی حیثیت رکھتے ہی تھے؛ ایسے اُستاد جن کا کوئی شریک و سہیم نہیں تھا۔ مرحوم

زندگی بھر صحیح املا لکھنے کی تبلیغ کرتے رہے اور مضامین، تبصروں اور خطوں کے ذریعے سے، معلومات کے فیض کو عام کرتے رہے۔ اِس انتساب کے واسطے سے، مرحوم کی اُس فیض بخشی کے اعتراف کی سعادت حاصل کرنا مقصود ہے۔

عزیزِ مکرم مخمور سعیدی صاحب نے کتابت اور طباعت کی نگرانی کی ہے۔ کتاب اگر صحیح چھپی ہے، تو اِس میں مخمور صاحب کی دیدہ ریزی کو دخل ہے۔ اُن کی پُرخلوص توجہ شامل نہ ہوتی تو کتاب کا اِس طرح چھپنا مشکل تھا۔ مخمور صاحب کی حیثیت برادرِ عزیز کی سی ہے، اُن کا شکریہ کیا ادا کروں۔ اس بے کراں اور بے اماں شہرِ دہلی میں، اُن کا خلوص، میرے لیے ہمیشہ وجہِ تسکین رہا ہے، اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

ترقّیِ اردو بورڈ نے املا کے سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس کے صدر ڈاکٹر عابد حسین صاحب تھے۔ مجھے مسرت ہے کہ اُس کمیٹی نے اِس کتاب کے مسوّدے کو منظور کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بزرگانہ شفقت اِس دوران میں میرے شاملِ حال رہی۔ یہ اعتراف ضروری ہے کہ موصوف کی نوازشوں اور مشوروں سے بہت کچھ مدد ملی ہے۔

رشید حسن خاں
شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی

۷، جولائی ۱۹۷۳ء

الف

الف ، واو ، یَ ؛ اِن تین حرفوں کو "حروفِ علّت" کہا جاتا ہے ۔ باقی حرف "حروفِ صحیح" کہلاتے ہیں ۔ اِس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ اِن تینوں حرفوں کے کردار میں "دُہراپن" پایا جاتا ہے ، اور وہ اِس طرح کہ جب یہ متحرک ہوتے ہیں ، اُس وقت "حروفِ صحیح" کی طرح حرکات (زبر، زیر، پیش) کو قبول کرتے ہیں ، اور یہ اِن کے کردار کا ایک رُخ ہوتا ہے ، جیسے : اَب ، وَطن ، یَم ۔ اِن لفظوں میں الف ، واو ، یَ کا وہی عمل ہے جو دوسرے حروف کا ہوتا ہے ۔ ہاں، جب یہ ساکن ہوں گے ، تب اِن کے کردار کا دوسرا رُخ نمایاں ہوگا اور اُس صورت میں یہ "حروفِ علّت" ہوں گے — جیسے : بڑا ، بوُٹ ، پیٹ ۔

الف جب لفظ کے شروع میں آتا ہے تو متحرک[1] ہوتا ہے ، جیسے : اَب ۔

---

[1] عربی میں الف کی متحرک صورت کو ہمزہ کہا جاتا ہے اور اِسی لیے "تامّل" اور "متاثر" جیسے لفظوں کو عربی میں "تأمل" اور "متأثر" لکھا گیا ہے ۔ اردو میں الف اور ہمزہ دو مستقل (بقیہ حاشیہ ص ۴۴ پر)

لفظ کے درمیان میں بھی کبھی متحرّک ہوتا ہے، جیسے : تأمّل۔ لفظ کے آخر میں یا لفظ کے کسی منفصل جُز کے آخر میں جب یہ آتا ہے، تو ساکن ہوتا ہے، جیسے : جانا، کتاب۔

الف کی دو قسمیں بتائی گئی ہیں : (۱) الفِ ممدودہ، یعنی وہ الف جس پر مد ہو، جیسے : آب، آتش، آنا، آریا۔ یہ الف، مد کی علامت کے ساتھ، دو الف کے برابر ہوتا ہے، اِسی لیے عروض میں الفِ ممدودہ کو، دو حرفوں کے برابر مانا جاتا ہے، جیسے : آب، بروزنِ فاع۔ (۲) الفِ مقصورہ، وہ

مگر ہم آواز حرف ہیں، اِس لیے الف خواہ متحرک ہو خواہ ساکن، ہر صورت میں الف ہے اور اِسی لیے اُردو میں "تأمّل" یا "جرأت" نہیں لکھنا چاہیے۔ ایک آواز کے لیے ایک حرف؛ اِس اصول کی بنا پر، ایک ہی آواز کے لیے، ہمزہ اور الف کو یک جا نہیں کیا جائے گا۔

الف و ہمزہ کی اِس عربی تقسیم نے، فارسی میں بھی راہ پائی ہے اور بعض کتابوں میں، متحرّک صورت کو ہمزہ سے، اور ساکن صورت کو الف سے موسوم کیا گیا ہے۔ مثلاً برہانِ قاطع میں، بابِ الف کی ہر فصل کے عنوان میں، حرفِ اوّل کو "ہمزہ" لکھا گیا ہے ۔ الف مع بائے ابجد کی فصل کا عنوان ہے : "بیانِ دوم در ہمزہ با بائے ابجد"۔ اِس کے بعد : "بیانِ سوم در ہمزہ با بائے فارسی"۔ اور "بیانِ چہارم در ہمزہ با تائے قرشت" وغیرہ۔ اِس کے بعد "ب مع الف" کا آغاز اِس طرح ہوتا ہے : "بیانِ اوّل در بائے ابجد با الف"۔ یہاں چوں کہ الف ساکن ہے، اِس لیے اُسے الف سے موسوم کیا گیا ہے۔

الف ہے جس پر مد نہ ہو، جیسے: اَب۔
لفظ کے آخر میں جب الف آتا ہے تو ساکن ہوتا ہے، جیسے: بھروسا، آشکارا۔
مگر عربی کے کچھ لفظوں کو لکھنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اُن کے آخر میں الف کے بجائے، یؔ لکھی جاتی ہے مگر پڑھنے میں الف آتا ہے، جیسے: اعلیٰ، ادنیٰ۔
اِس یؔ پر اکثر ایک چھوٹا سا الف بھی (نشان کے طور پر) بنا دیا جاتا ہے، جیسے: عیسیٰ، صغریٰ، معلّیٰ۔
یہ عربی کا طریقۂ کتابت تھا کہ لفظ کے آخر میں الف کی جگہ، یؔ لکھی جائے، مگر اُس لفظ کو پڑھا اِس طرح جائے جیسے اُس کے آخر میں الف لکھا گیا ہے۔ فارسی و اُردو، دونوں زبانوں میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں؛ اِس لیے یہ ناگزیر تھا کہ ایسے لفظوں میں تبدیلی راہ پائے، اور یہ ہوا۔ فارسی میں، ایسے متعدّد لفظ، تلفّظ کے مطابق، الف سے لکھے جانے لگے، جیسے: ماجرا، معمّا، دعوا، مدّعا، مدّعا علیہ، معرّا، مقتضا، ہُدا، مولا، وغیرہ۔ (آج اگر کوئی شخص "ماجرا" کو اصل کے مطابق "ماجریٰ" لکھے تو بڑی عجیب بات معلوم ہوگی)۔
فارسی کے بعض لُغات میں صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ یؔ کی جگہ الف کا اضافہ، فارسی والوں کا تصرّف ہے۔ یا یہ کہ ایسے بعض الفاظ کی دونوں صورتوں کو لکھا گیا ہے، مفہوم اُس کا بھی یہی ہے۔ غیاث سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں: (۱) لفظ "مولیٰ" کے ذیل میں لکھا ہے: "و فارسیاں گاہے بہ الف نویسند"۔ (۲) لفظ "سلمیٰ" کے تحت لکھا ہے: "و ایں اسم را گاہے بہ الف ہم می نویسند"۔ (۳) مندرجۂ ذیل الفاظ کی دونوں صورتوں کو درج کیا گیا ہے: ہیولیٰ، ہیولا ــ ہُدیٰ، ہُدا ــ مقتدیٰ، مقتدا۔

اُردو لُغات میں بھی یہی صورت ہے کہ کچھ لفظوں کو صرف "ی" سے لکھا گیا ہے، بعض لفظوں کو صرف الف کے ساتھ لکھا گیا ہے؛ اور کئی جگہ یہ صراحت ملتی ہے کہ دونوں صورتیں ٹھیک ہیں ــــــ بل کہ نور میں جس طرح وضاحت کی گئی ہے، اُس سے تو یہ متبادر ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک ایسے الفاظ میں یٰ لکھنا، عربی رسمِ خط سے مخصوص ہے۔ مثلاً:

(۱) "مدعا، عربی میں مدعیٰ"۔ (مدعا علیہ کو صرف الف سے لکھا ہے)۔

(۲) "ہُدا، عربی میں ہُدیٰ"۔ (۳) "معرّا، عربی معرّیٰ"۔ (۴) "مربّا، ع: مربّیٰ"۔ (۵) "ماوا، عربی ماویٰ"۔ (۶) "مجلّا، عربی مجلّیٰ"۔ (۷) "مصفّا، عربی مصفّیٰ"۔ (۸) "مقتضا، عربی مقتضیٰ"۔ (۹) "مقتدا، مقتدیٰ"۔

(۱۰) "مصلّا، مصلّیٰ"۔ (۱۱) لفظ "مولا" کو الف سے لکھ کر لکھا ہے:

"عربی رسم الخط میں مولیٰ ہے"۔

اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولّف کی رائے میں اِن الفاظ کو الف کے ساتھ لکھنا، اُردو املا کے مطابق ہوگا اور یٰ کے ساتھ لکھنا، عربی رسمِ خط کے مطابق ہوگا۔ مگر ایسے اور بہت سے لفظوں کو صرف یٰ سے لکھا ہے، حالاں کہ اُن کے اِس اصول کے مطابق، ایسے سبھی لفظوں کو ایک ہی فہرست میں آنا چاہیے تھا۔

آصفیہ میں بعض لفظوں کو صرف الف سے لکھا گیا ہے، جیسے: تولّا، ماوا، مجلّا، معمّا۔ اور بعض کو دونوں طرح لکھا گیا ہے، جیسے: مربّا، مربّیٰ۔ مصلّا، مصلّیٰ۔ معلّا، معلّیٰ۔ قُوا، قوِیٰ۔ لیلا، لیلیٰ۔ نصارا، نصاریٰ۔ ہیولا، ہیولیٰ۔

لفظ "مولا" کے ذیل میں یہ صراحت ملتی ہے:

"مولا، مولیٰ: اگرچہ یہ لفظ عربی رسم الخط کے موافق یاے تحتانی کے ساتھ لکھنا چاہیے، مگر فارسی والوں نے، ماجرا کی طرح، اِسے بھی الف سے

لکھنا جائز رکھا ہے اور انھیں کی تقلید پر اُردو والے بھی اشعار و عبارات میں اِسی طرح لکھنے لگے ہیں، پس اِس کا املا دونوں طرح جائز ہے"۔

غرض، اُردو لُغت نویسوں نے، فارسی والوں کی طرح بھی اور اُن کی تقلید میں بھی، ایسے متعدّد لفظوں کو دونوں طرح جائز رکھا ہے اور بعض لفظوں کو رواجِ عام کی بنا پر، الف کے ساتھ مرجّح سمجھا ہے۔

اُوپر جو اندراجات پیش کیے گئے ہیں، اُن سے یہ اندازہ ضرور ہوا ہوگا کہ ایسے الفاظ کے سلسلے میں ایک طرح کا تذبذب شاملِ حال رہا ہے۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ بعض لفظوں کو الف سے لکھ دیا گیا، بعض کو دونوں طرح لکھا گیا، اور بعض کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو یہ لفظ عربی کے تھے، جو مقدّس زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور اِس کے ساتھ ساتھ اِن میں سے بہت سے لفظ قرآنِ پاک میں بھی آئے ہیں، اور وہاں اِن کا املا عموماً ی سے ملتا ہے، احادیث و تفسیر کی کتابوں میں بھی یہی املا ملتا ہے؛ اِس بنا پر اِس کو ایک طرح کا ترکِ ادب سمجھا گیا کہ ایسے لفظوں کی صورتوں کو یک سر بدل دیا جائے، مگر مشکل یہ تھی کہ فارسی میں یہ روش عام ہو چکی تھی اور فارسی کے اثر سے اُردو میں بھی ایسے کئی لفظ اپنے کو بدل چکے تھے یا کم سے کم دونوں صورتوں میں لکھے جانے لگے تھے، اِس لیے اِن مروّج صورتوں کو اختیار کرنا بھی ناگزیر تھا؛ یہی وجہ ہے کہ کچھ لفظ ایک طرح سے لکھے گئے اور کچھ دوسری طرح، کوئی اصول نہیں بن سکا۔ اِس تذبذب کے پیچھے یہی جذباتی کشاکش کارفرما تھی۔

اِس میں اِس کا اضافہ اور کر لیجیے کہ ایک مدّت تک اردو قواعد کو، فارسی

و عربی کا ضمیمہ سمجھا جاتا رہا اور اِس اندازِ فکر کا اثر پڑنا بھی ضروری تھا۔ صرف و نحو، تلفّظ، املا، عروض؛ سب میں اِس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔

انجمن ترقّیِ اردو کی مقرّر کی ہوئی کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط نے یہ تجویز کیا تھا کہ ایسے سب لفظوں کو الف سے لکھنا چاہیے، اور اِس طرح پہلی بار ایسے سب لفظوں کو ایک قاعدے کے دائرے میں لایا گیا۔ اصلاحِ رسمِ خط کی کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا کہ:

"عربی میں جو لفظ الفِ مقصورہ سے لکھے جاتے ہیں، اُردو میں وہ معمولی الف سے لکھے جائیں اور اُن کی تفصیل یہ ہے: اعلیٰ، ادنیٰ، اَولیٰ، علیٰ حالہٖ، علیٰ حدہ، مولیٰ، مولٰینا، معلّیٰ، مصلیٰ، معنیٰ، مجلیٰ، مربیٰ، معریٰ، مدعیٰ علیہ وغیرہ۔

اِن میں سے بہت سے لفظ اردو (اور فارسی) میں معمولی الف سے لکھے جاتے ہیں۔ جیسے: مربّا، معرا، مصلّا، معمّا، منقّا، تقاضا، تماشا، تمنّا، تبرّا، تولّا۔ کچھ لفظ دونوں طرح لکھے جاتے ہیں، جیسے: مولا (یا مولیٰ)، مولانا (یا مولٰینا)، معلّا، مدعا علیہ۔ کچھ ایسے ہیں کہ ایک زمانے میں سیدھے الف سے لکھے جاتے تھے، مگر لوگوں نے چھت کی اور وہ پھر الفِ مقصورہ سے لکھے جانے لگے، جیسے: اعلا، ادنا، اَولا۔

"علیٰ حِدَۃٍ" دو لفظ ہیں (اور عربی میں کبھی ملا کر نہیں لکھے جاتے) مگر اُردو والے اِن کو ملا کر لکھتے ہیں "علٰحدہ" یا "علیحدہ"۔ بہتر ہے کہ "علاحدہ" لکھا جائے۔ اِن سب لفظوں کو یوں لکھنا

چاہیے : ادنا ، اعلا ، اَولا ، اوُلا ، مولا ، مولانا ، مدّعا علیہ ، متوفّا ، مستثنا ، صلِّ علا ، مجلّا ، معمّا ، مربّا ، علاحدہ ۔

ناموں کو بھی یوں لکھ سکتے ہیں : عیسا ، موسا ، مصطفا ، مرتضا ، کِسرا ، صُغرا ، کُبرا وغیرہ "۔

[رودادِ کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط ۔ رسالۂ اُردو ، جنوری ۱۹۴۴ء ، ص ۱۱۵]

اصلاحِ رسمِ خط کمیٹی کی اِس تجویز کو ، اردو کانفرنس میں ، اِن واضح اور دو ٹوک الفاظ میں منظور کیا گیا :

"عربی ناموں اور عام الفاظ میں الفِ مقصورہ کی بجائے ، پورا الف لکھا جائے ۔ جیسے : ابراہیم ، سلیمان ، حیات ، رِبا اور اعلا ، ادنا ، مولانا وغیرہ "۔

[تجاویزِ اصلاحِ رسمِ خط کمیٹی ، منظور کردۂ اردو کانفرنس (ناگ پور)
رسالۂ اردو ، جنوری ۱۹۴۴ء ، ص ۱۱۷]

اِس کے ساتھ ساتھ انجمن نے اپنی مطبوعات میں اِس قاعدے کی پابندی کرنے کی بھی کوشش کی تھی ، اِس وجہ سے اِس املا کو فروغ ہوا اور ایسے بہت سے لفظ سیدھی طرح الف سے لکھے جانے لگے ۔ انجمن نے کس طرح اِس کی پابندی کی تھی ، اِس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں ۔ اِس وقت اتّفاق سے میرے سامنے رسالۂ اردو کا ۱۹۴۴ء کا فائل ہے ، میں نے اِس کے دو شماروں کے چار صفحے اِس کے لیے منتخب کیے ہیں :

ص ۳۴۷ پر چار جگہ " اعلا " ملتا ہے اور ایک جگہ " رومۃ الکبرا "۔
ص ۳۸۵ پر ایک جگہ " وُسطا " ہے ۔ ص ۵۱۶ پر " حتاکہ " ، اور
ص ۵۳۴ پر دو جگہ " دعوا " ملتا ہے ۔

انجمن کی تجویز کے مطابق ، اب یہ بات قطعی طور پر طے شدہ سمجھی جانا چاہیے کہ ایسے سب لفظوں میں الف لکھا جائے گا ۔ زیادہ استعمال ہونے والے لفظ یہ ہیں :

ادنا ، اعلا ، اعما ، اقصا ، اَولا ، اوُلا ، بُشرا ، تعالا ، تقوا ، تولّا ، ثَرا (تحت الثرا) حتا (حتاکہ) ، حُسنا ، خُنثا ، دعوا ، سلما ، سلوا ، (من وسلوا) شوُرا (مجلسِ شوُرا) صُغرا ، طوبا ، طوُلا (یدِ طوُلا) عُقبا ، عزّا (لات وعزّا) عُظما ، عیسا ، فتوا ، قوُا ، کُبرا ، کِسرا ، لَیلا ، ماجرا ، ماوا ، متبنّا ، مثنّا ، مجتبا ، مُحشّا ، مُجلّا ، مُخلّا ، مدّعا ، مُربّا ، مرتضا ، مستثنا ، مُسمّا ، مصطفا ، مصفّا ، مصلّا ، معرّا ، معلّا ، معمّا ، مقفّا ، منادا ، منقّا ، مولا ، موسا ، نصارا ، وُسطا ، (مشرقِ وُسطا) ، ہُدا (شمس الہدا) ، ہیولا ، یحیا ۔

اِس فہرست کے تین لفظ : عیسا ، موسا ، یحیا : خاص نام ہیں ۔ یہ بھی کسی تکلّف کے بغیر الف سے لکھے جا سکتے ہیں ۔ "عیسائی" اور "موسائی"[1] تو مستعمل ہی ہیں ۔ عیسا ، موسا ، یحیا کے اوپر ؑ کا نشان (برائے علیہ السّلام) امتیاز کے لیے کافی ہے ۔ یہی صورت دو صفاتی ناموں مصطفا اور مجتبا

---

[1] موسائیوں کو طور کے جلوے سے کم نہیں جو دل لگی ہے اُس بتِ روشن ضمیر کی رشک ۔ مقدمۂ نفس اللغۃ

"عیسائیوں میں اور موسائیوں میں اور ہنود میں ، کہیں عالمِ آخرت میں پُل کے وجود کا پتا نہیں ہے" (غالب ، قاطعِ برہان و رسائلِ متعلّقہ ، ص ۲۲۲)

کی ہے ، " مطبعِ مصطفائی " اور " مجتبائی پریس " ہم سب نے پڑھا ہوگا۔ مرتضیٰ کو بھی اِسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے ۔ پھر بھی اگر کچھ لوگ کسی وجہ سے ، " عیسیٰ ، موسیٰ ، یحییٰ " لکھنے پر اصرار کریں تو اِس پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے ۔ ہاں ، یہ بھی عرض کر دوں کہ فارسی میں بھی اب یہی رجحان ہے کہ اِس قبیل کے سب الفاظ کو الف ہی سے لکھنا[1] چاہیے ۔

فائدہ :

اِس قاعدے کے ذیل میں بعض باتوں کی وضاحت ضروری ہے :
اصل کے لحاظ سے اِن لفظوں کے آخر میں یؔ ہے ، یہ تو صورت تھی کتابت کی ، مگر تلفظ میں اُس یؔ کو الف فرض کر لیا جاتا تھا ۔ تلفظ اور کتابت کے اِس اختلاف کا یہ نتیجہ ہونا ہی تھا کہ ایسے کچھ لفظوں میں مکتوبی اور

---

[1] " در عربی الفِ بسیاری از اسمہای مقصور بصورت یاء کتابت و بصدای الف تلفظ میشود ، مانند یحیی ، موسی ، مبتلی ، اعلی ۔ در فارسی اینگونہ کلمات را باید مطابق با تلفظ یعنی بصورت الف کتابت کرد ، مانند : مبتلا ، ہوا ، مولا ، فتوا ، مصطفا ، موسا ، عیسا ، مرتضا وغیرہ ۔
ازین قاعدہ ہم میتوان اسمہا و لقب ہای خاص را کہ بیاء اشتہار یافتہ است از قبیل موسی ، عیسی ، مصطفی ، مستثنا و در نوشتن آنہا ہر دو وجہ را جایز شمرد (موسی و موسا ، عیسی و عیسا ، مصطفی و مصطفا) لیکن بہتر آنست کہ قاعدہ را بطور اطراد مجرا داریم و چیزی را ازان استثنا نکنیم "۔
[املای فارسی ، لغت نامۂ دہخدا ، جلد ۴۰ ، ص ۱۷۲]

ملفوظی دونوں صورتوں کا فائدہ اٹھایا جائے ۔ یا یوں کہیے کہ دونوں صورتیں اپنے اپنے خواص کو مختلف مقامات پر نمایاں کریں ۔ اور ایسا ہوا ، اور اس طرح کہ کتابت کی رعایت سے ، ایسے لفظوں کو ، اضافت کی صورت میں اُن لفظوں کی طرح بھی استعمال کیا گیا جن کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے ۔ یعنی جس طرح زندگی کو اضافت کی صورت میں "زندگیِ" لکھا جائے گا ، جیسے : زندگیِ جاوید ؛ اُسی طرح لیلی ، موسی ، عیسی ، دعوی جیسے کئی لفظوں کو اِسی طرح لکھا گیا ۔ جیسے : دعویِ مہروفا ، لیلیِ شب ، موسیِ عمراں ، عیسیِ مریم ۔ اور اِسی طرح تسلّی ، باقی ، جیسے لفظوں کے ساتھ اُن کو ہم قافیہ کرنا بھی روا رکھا گیا ۔ اِس موقع پر بعض مثالیں پیش کرنا مناسب ہوگا ، تاکہ وضاحت کی تکمیل ہو سکے :

دہر میں نقشِ وفا ، وجہِ تسلّیِ نہ ہوا	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنیِ نہ ہوا	
دل ، گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی	گر نفس ، جادۂ سر منزلِ تقویِ نہ ہوا	
مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ	ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیِ نہ ہوا	غالبؔ
شوخیِ اظہار ، غیر از وحشتِ مجنوں نہیں	لیلیِ معنی ، اسدؔ ، محمل نشینِ راز ہے	"
بے تابیِ یادِ دوست ، ہم رنگِ تسلّیِ ہے	موجِ تپشِ مجنوں ، محمل کشِ لیلیِ ہے	"
عیسیِ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف	درد آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف	"
خرابِ نالۂ بلبل ، شہیدِ خندۂ گل	ہنوز دعویِ تمکین و بیمِ رسوائی	"
جب تلک فتویِ برجیس نہ ہو ، کیا مقدور	کہ کوئی کام کرے یہ فلکِ ناہموار	مومنؔ
عرضِ نازِ شوخیِ دنداں ، برائے خندہ ہے	دعویِ جمعیّتِ احباب ، جائے خندہ ہے	غالبؔ
لیلیِ شب کھولتی ہے آ کے جب زلفِ رسا	دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کی صدا	اقبالؔ
میں شاہِ خراساں کے غلاموں میں ہوں انشاؔ	مصروف رہے موسیِ و ہاروں مرے آگے	انشاؔ

یہ تو مکتوبی صورت کی رعایت تھی۔ ملفوظی صورت یہ تھی کہ آخری حرف الف مانا جاتا تھا اور اِس رعایت سے ایسے لفظوں کو، اُن لفظوں کی طرح بھی استعمال کیا گیا جن کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ جیسے: دعوائے اتقا، لیلائے شب، فتوائے جہاں داری۔ اور اُن الفاظ کے ساتھ ہم قافیہ بھی کیا گیا جن کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ جیسے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی　　مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم، غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بہ سر　　کب تک خیالِ طرۂ لیلا کرے کوئی　　غالب

دی لطفِ ہوا نے بہ جنوں طرفہ نزاکت　　تا آبلہ دعوائے تنک پیرہنی ہے　　"

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنون کو　　اِتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو　　اکبر

یہ قاعدہ ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے، اُن کے آگے "ئی" کا لاحقہ شامل کرکے، اسمِ منسوب اور اسمِ مصدر بنا لیے جاتے ہیں۔ جیسے رعنا سے رعنائی اور گدا سے گدائی ـــــ جن لفظوں کے آخر میں ی ہوتی ہے، تو اُس سے پہلے و کا اضافہ کرکے، اسمِ منسوب بنا لیتے ہیں۔ جیسے: دہلی سے دہلوی، اور بستی سے بستوی ـــــ اِن دونوں قاعدوں نے، زیرِ بحث الفاظ میں بھی اِسی طرح راہ پائی اور جس طرح عام قاعدے کے مطابق بہت سے مرکّب اُس طرح بنتے ہیں، اُسی طرح متعدد زیرِ بحث الفاظ بھی ایسے مرکّبات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ مثلاً مصطفائی، مصطفوی۔ مرتضائی، مرتضوی۔ عیسائی، عیسوی۔ موسائی، موسوی؛ اِسی طرح بنے ہیں۔ اور یہ ثبوت ہے اِس کا کہ زیرِ بحث الفاظ

میں املا اور تلفظ، دونوں نے اپنے اپنے اثرات کو نمایاں کیا ہے۔
اِس کی صراحت کر دی جائے کہ راضی اور تسلّی جیسے لفظوں کے قافیے میں عیسیٰ اور لیلیٰ جیسے لفظوں کو لانا، ذرا پُرانی بات ہے، بہت پُرانی نہ سہی۔ بہ ہر حال، اور متروکات کے ساتھ، یہ تقفیہ بھی متروک سا ہو کر رہ گیا ہے اور اب عام طور پر ایسے قوافی دیکھنے میں نہیں آتے۔
ہر صورت میں، جہاں جہاں ایسی صورت ہو گی (متقدّمین کے یہاں یا اِس زمانے کے کسی شخص کے یہاں) تو وہاں ایسے الفاظ کو بہ یاے معروف لکھا جائے گا اور پڑھا بھی اِسی طرح جائے گا۔
ہاں، اِن الفاظ کی دوسری صورت، کہ اضافت کے ساتھ بہ یاے معروف استعمال کیا جائے، (جیسے: دعویِ دل، عیسیِ مریم وغیرہ) یہ اب بھی رائج ہے اور رہنا چاہیے۔ وہ لفظ جو اِس طرح مرکّب ہوتے ہیں، کچھ زیادہ نہیں۔ ایسے مقامات پر، ایسے الفاظ کی کتابت میں یہ اصول ملحوظ رکھا جائے گا کہ جب یہ لفظ اِس طرح مضاف یا موصوف ہوں گے، تب اِن کو یِ کے ساتھ لکھا جائے گا اور یِ پر حسبِ معمول اضافت کا زیر لگایا جائے گا۔
یہاں پر ایک اہم بات قابلِ توجہ ہے کہ اِن دونوں صورتوں میں، املا اور تلفّظ میں ہم آہنگی رہتی ہے۔ "عیسیِ دوراں" میں اگر عیسیِ میں یِ لکھی گئی ہے تو اُس کو الف کی طرح نہیں پڑھا جاتا، بل کہ جس طرح "فدویِ خاص" میں یِ مکسور ہے، اُسی طرح "عیسیِ مریم" اور "لیلیِ محمل نشیں" میں وہ مکسور ہے ـــــ یا اگر "تسلّی" کا قافیہ "عیسیٰ" اور "تقویٰ" ہے تو یہاں بھی تلفّظ اور کتابت میں ہم آہنگی

ہے۔ اِس اعتبار سے، یہ ایسا استثنا ہے جس سے اصل قاعدہ کسی طرح مجروح نہیں ہوتا۔

ہاں، یہ تصرّف کہ ایسے الفاظ کو کتابت کی رعایت سے بہ یاے معروف بھی استعمال کرلیا جائے، فارسی میں ہوچکا تھا، اردو میں اُسی کی پیروی کی گئی ہے۔ صاحبِ غیاث نے لفظ تقوی کے ذیل میں لکھا ہے:

"تقوی: بہ فتحِ اول و فتحِ واو، و در استعمالِ فارسیاں گاہے بہ کسرِ واو نیز مستعمل۔ دریں جا ایں لفظ براے رعایتِ رسم الخط نوشتہ شد..."

الف کے ذیل میں لکھا ہے:

"بیست و دوم، الفِ مجہول الاصل: و ایں را نیز بہ یا نویسند۔ گاہے فارسیاں ایں الف را بہ اعتبارِ صورتِ کتابت، یا خوانند، چوں: موسیٰ و عیسیٰ"۔

یہ لفظ جب کسی مرکّب کا جزوِ آخر ہوں گے، تب بھی اِن کو الف کے ساتھ لکھا جائے گا، خواہ وہ مرکّب بہ ترکیبِ عربی ہو یا بہ قاعدۂ فارسی۔ جیسے:

مجلسِ شوُرا، تحت الثّرا، من و سلوا، رومت الکبرا، مشرقِ وُسطا، مسجدِ اقصا، علّیِ مرتضا، محمّدِ مصطفا، احمدِ مجتبا، یدِطوُلا، جنّتُ الماوا، ابوالاعلا، نورالہدا، بدرالدّجا، شمسُ الہدا، شمس الضحیٰا، اردوے معلّا، اعلا و ادنا۔

درجِ ذیل الفاظ، اور معانی کے علاوہ، ناموں کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ یہ لفظ خواہ بہ طورِ نام آئیں یا کسی اور معنی میں، ہر صورت میں

اِن کو الف ہی سے لکھا جائے گا :

بُشرا ، سلما ، حُسنا ، صُغرا ، کُبرا ، لَیلا ، مُثنّا ، مصطفا ، مجتبا ، مرتضا ، ہُدا ، عیسا ، موسا ، یحیٰا ۔

اِس قاعدے کے ذیل میں بعض ضمنی باتیں بھی ذکر کیے جانے کے قابل ہیں :

(۱) شکوہ ، بہ معنیِ شکایت ، دراصل عربی کا لفظ ہے اور عربی میں اِس کا املا " شکویٰ " ہے ۔ فارسی والوں نے جو بہت سے تصرّفات عربی لفظوں میں کیے ہیں ، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اِس لفظ کو " شکوہ " بنا لیا ۔ غالباً یوں ہوا ہوگا کہ قاعدے کے مطابق شروع میں " عیسیِ دوراں " کی طرح مثلاً " شکویِ غم " لکھا گیا ہوگا ؛ ہوتے ہوتے ، یِ ، ہ سے بدل گئی اور " شکوۂ غم " وغیرہ لکھے جانے لگے ۔ یہ تصرّف اِسی طرح کا ہوا جس طرح عربی کے تمنّیِ اور تماشیِ (بہ یاے معروف) فارسی میں تمنّا اور تماشا بن گئے ۔ اُردو میں بھی اب اِس لفظ کا یہی املا رائج ہے ۔

اِس صراحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ صاحبِ آصفیہ نے " شکوا " الف کے ساتھ لکھ کر ، لکھا ہے کہ اِس کا صحیح املا " شکویٰ " ہے ۔ اور پھر " شکوہ " کو بھی درج کیا ہے ۔ اِس مبہم اندراج سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اصل بات یوں ہے کہ عربی میں " شکویٰ " ہے ۔ اور فارسی و اُردو میں " شکوہ " مستعمل ہے ۔ اور " شکوا " نہ فارسی میں ہے نہ اُردو میں ــــــ صاحبِ آصفیہ نے غالباً غیاث کے ایک اندراج سے دھوکا کھایا ۔ صاحبِ غیاث نے " شکویٰ " لکھا ہے اور اِس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ :

"و شکوه به ہاے ہوّز نوشتن خطاست" لیکن اُن کا یہ قول صحیح نہیں۔ بہارِ عجم میں "شکوہ" اور اِس کے متعدّد مرکبات موجود ہیں۔ شوق نیموی نے لکھا ہے :

"شکوه، دراصل شکوی بروزنِ دعویٰ بود۔ فارسیاں الف را بہ ہا بدل کردند۔ وانچہ صاحبِ غیاث اللغات نوشتہ کہ شکوہ بہ ہا نوشتن خطاست، اعتبار را نشاید"

(ازاحۃ الاغلاط)

مولّفِ نور نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے کہ وضاحت کر دی ہے :

"شکوہ، بالکسر و فتحِ دوم، عربی میں شکوی، بالفتح بروزنِ دعویٰ ..... فارسیوں نے آخر میں ہ اضافہ کرلی"۔

ہاں، فارسی مطبوعات میں "شکوہ" اور "شکوی" دونوں صورتیں ملتی ہیں مگر اضافت کی صورت میں عموماً "شکوۂ" ملتا ہے۔

(۲) یہ بات اصول کے طور پر مان لینا چاہیے کہ عربی کے مکمل ٹکڑے، جملے، عبارتیں؛ یہ سب اجزا جب اُردو میں منقول ہوں گے تو اُن کو عربی کے اجزا مان کر، عربی کے طریقۂ کتابت کے مطابق[1] لکھا جائے گا۔

---

[1] فارسی میں بھی اِسی خیال کا اظہار کیا جا رہا ہے :

"جملہ ہای کامل عربی کہ در محاورات فارسی بکار میرود از قبیل "رحمہ اللہ" "دام بقاؤہ" "زیدت شوکتہ"، غفر اللہ لہ، خلد اللہ ملکہ، اَلعاقلُ تکفیہِ الاشارۃ"، (بقیہ حاشیہ ص ۵۸ پر)

اِس اصول کے تحت ، مذکورۂ بالا قاعدے کے ذیل میں ، ایسے تین لفظ آتے ہیں جو عربی ترکیبوں کے ساتھ لکھے جاتے ہیں ۔ یہ ترکیبیں اور اِن کا استعمال دونوں محدود ہیں ۔ خاص خاص لوگوں کے سوا ، عام لوگ اُن کو استعمال نہیں کرتے ۔ ایسے مقامات پر اُن کی اصل صورت کو برقرار رکھا جائے گا ، اِس بنا پر کہ اُردو میں اُن ٹکڑوں کی حیثیت ، عربی سے منقول اجزا کی سی ہوگی ۔ جو لوگ سادہ و صاف زبان لکھنا پسند کریں گے ، اُن کی عبارت ایسے ٹکڑوں سے محفوظ ہی رہے گی ۔ یہ تین لفظ ہیں : عَلَیٰ ، حتّیٰ ، اِلیٰ ۔ یہ بات خاص طور سے خاطر نشاں رہنا چاہیے کہ یہ تینوں لفظ ، مرکّبات کا جُزوِ اوّل ہوتے ہیں ، جُزوِ آخر نہیں ۔ اِن سے مرکّب کچھ اجزا یہ ہیں :

عَلیٰ حالہٖ ، عَلَی الرَّغم ، عَلَی الصَّباح ، عَلَی العُموم ، عَلَی الخُصوص ، عَلَی الحِساب ، عَلَی الِاطلاق ، عَلَی التَّرتیب ، عَلَی الِاتّصال ، عَلَی الِاعلان ، عَلَی التَّواتُر ، عَلَی الدَّوام ، عَلیٰ ھٰذا لقیاس ، عَلیٰ رووس الاشہاد ، عَلیٰ سبیلِ التَّعیّن ، عَلیٰ وَجہِ البصیرت ، عَلیٰ وَجہ الکمال ، حتَّی الامکان ، حتَّی الوسع ، حتَّی المقدور

باید از ہر جہت مطابق رسم الخط عربی نوشتہ شود ۔
مثلاً : "علیہ رحمۃ اللہ " را بتاءِ کوچک نویسند نہ (بہ) تاءِ کشیدہ ، و در نوشتن " دامَ بقاؤہ " ، " متعنا اللہ ببقائہ " ، " ادام اللہ بقاءہ " قاعدۂ کتابت ہمزہ را در عربی متبع دانند "۔

[املای فارسی ۔ لغت نامۂ دہخدا ، جلدِ چہلم ، ص ۱۴۴]

اِلَی الآنْ ، اِلَی اللہ ۔

اِن سب اجزا کو اِسی طرح لکھا جائے گا ۔ البتّہ اِس کا خیال ضرور رکھنا چاہیے کہ اِس طرح کے اجزا عبارت میں نہ آئیں اور یہ کچھ مشکل نہیں ۔مثلاً "حَتَّی المقدور" یا "حَتَّی الامکان" کی جگہ آسانی سے امکان بھر ، مقدور بھر جیسے لفظ آ سکتے ہیں ۔ "حَتَّی المقدور" میں پہلا جُزء "حَتَّی" ہے ، یہ لفظ فارسی کے "کہ" کے ساتھ بھی آیا کرتا ہے : حتّاکہ ، یہاں عربی ترکیب نہیں رہی ، اِس کو الف سے لکھنا چاہیے ۔ رسالۂ اردو سے "حتّاکہ" کا املا اوپر نقل کیا جا چکا ہے ۔

لفظ "اعلیٰ" کبھی کبھی عربی کے دُعائیہ جملے میں آیا کرتا ہے ، جیسے : "اعلَی اللہ مقامہ" ۔ یہ خالص عربی عبارت ہے ، اِس کو عربی ہی کی طرح لکھا جائے گا ۔ یہی حکم ایسے اور الفاظ کا بھی ہوگا ۔

عربی کا ایک جملہ ہے : مَضٰی ما مَضٰی (گزرا سو گزرا) ۔ کبھی کبھار اِس کا پیوند بھی اردو کی عبارت میں دیکھنے میں آجاتا ہے ، اِس کا رواج نہیں ، اِس کو بھی عربی کا ٹکڑا سمجھ کر ، عربی ہی کے مطابق لکھنا چاہیے ۔

(۳) "بدرالدّجیٰ" ، "نورالہدیٰ" ، "شمس الہدیٰ" ، "شمس الضّحیٰ" بہ طور نام کے اردو میں مستعمل ہیں ۔ اِن کو اگر بدرالدّجا ، نورالہدا ، شمس الہدا ، شمس الضّحا لکھا جائے تو کوئی ہرج واقع نہیں ہوگا ۔ مجتبا ، مرتضا ، مصطفا ، عیسا اور موسا کی طرح اِن کو بھی الف ہی سے لکھنا چاہیے ۔ "شاہِ ہُدا" اور "تحت الثّرا" تو لکھے ہی جاتے ہیں ۔

(۴) مولانا اور علاحدہ ، اِن دو لفظوں کو بعض حضرات "مولیٰنا" اور "علیٰحدہ" بھی لکھا کرتے ہیں ۔ آصفیہ میں بھی "علیٰحدہ" اور "علیٰحدگی" لکھے ہوئے ہیں اور یہی صورت نور میں ہے ۔ صاحبِ نور نے صراحت بھی کی ہے :
"علیٰحدہ ۔ ع ، علیٰ حدۃٍ ۔ علیٰ ، اوپر ۔ حدۃٍ ، تنہا ہونا "۔
اِن تینوں لفظوں کو اب صرف الف کے ساتھ لکھنا چاہیے ، یعنی :
مولانا ، علاحدہ ، علاحدگی ۔

۲

کچھ لفظ عربی کے طریقِ املا ، بل کہ صحیح معنی میں قرآن کے املا کے مطابق ، الف کے بغیر لکھے جاتے ہیں ، لیکن پڑھنے میں الف آتا ہے ، جیسے : رحمٰن ، شیطٰن ، صلوٰۃ ، اسمٰعیل ۔ خود عربی میں یہ لفظ الف کے ساتھ بھی لکھے جاتے ہیں ۔ اُردو میں ، اِن میں سے زیادہ لفظ عام طور پر مع الف لکھے جاتے ہیں ۔
انجمن نے یہ تجویز کیا تھا کہ ایسے سب لفظوں کو الف کے ساتھ لکھا جائے۔[1] فارسی والوں کا بھی اب یہی خیال ہے ۔ عام طور پر استعمال ہونے والے

---

[1] " وہ عربی لفظ (یا نام) ، جو خود عربی میں دو طرح لکھے جاتے ہیں ، اُن کی اُس دکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے ، جو اردو لکھاوٹ کے مطابق یا اُس سے قریب ہے ۔ اور ان کی تفصیل یہ ہے :
ا ۔ ابرٰہیم ، ابراہیم ۔ سلیمٰن ، سلیمان ۔ لقمٰن ، لقمان ۔ شیطٰن ، شیطان ۔
اردو میں صرف دوسری طرح لکھے جاتے ہیں ، یعنی ابراہیم ، سلیمان ، لقمان ،
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

لفظ یہ ہیں :

رحمان ، سلیمان ، اسحاق ، اسماعیل ، ابراہیم ، لقمان ، حیات ، نجات ، صلات ، زکات ، مشکات ، ربا ۔

شیطان اور اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔

۲ ۔ اسمٰعیل ، اسماعیل ۔ رحمٰن ، رحمان ۔ اردو میں بھی دونوں طرح ؛ مگر اِن کو بھی صرف دوسری طرح (اسماعیل ، رحمان) لکھنا چاہیے ۔

۳ ۔ حیٰوۃ ، حیاۃ ، نجٰوۃ ، نجاۃ ۔ ربٰو ، ربا ۔ منٰوۃ ، مناۃ ۔ اردو میں حیات ، نجات ، ربا ، منات لکھتے ہیں اور اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔

۴ ۔ زکٰوۃ ، زکاۃ ۔ صلٰوۃ ، صلاۃ ۔ مشکٰوۃ ، مشکات ۔ اُردو میں : زکات ، صلات ، مشکات لکھنا چاہیے ۔

فائدہ : عربی میں اِن لفظوں کی پہلی لکھاوٹ بہت پُرانی ہے اور جب قرآن کا متن پہلے پہل لکھا گیا تو یہ لکھاوٹ اختیار کی گئی ۔ اُس کے بعد اِس کو بدلنا پسند نہیں کیا گیا ۔ اور اب تک ہر حرف اُسی پُرانی صورت اور ہیئت میں موجود ہے ۔ مگر جب عربی میں کتابت کے اصول مقرر کیے گئے تو یہ لفظ ، پورے الف سے لکھے گئے اور ماسوا قرآن کے ، عربی کتابوں میں اکثر و بیشتر پورے الف والی لکھاوٹ پائی جاتی ہے ، یہاں تک کہ بڑی مستند کتابوں میں جب قرآن کی آیتیں نقل ہوئی ہیں اور اُن میں ایسے لفظ آگئے ہیں تو بھی پورے الف سے لکھے گئے ہیں ۔"

(رودادِ کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط ۔ اردو ، جنوری ۱۹۴۴ء ، ص ۱۱۳، ۱۱۴)

لے " کلمات اسماعیل و ابراہیم و اسحاق و رحمان و نظائر آن کہ مطابق بعضی از (بقیہ حاشیہ ص ۶۲)

المنجد میں "صلاۃ" اور "صلوۃ" دونوں صورتیں ملتی ہیں: "اَلصَّلاۃُ اَوِالصّلوۃ بالواوِ"۔ اور زکات، الف سے لکھا ہوا ہے: "الزکاۃ"۔

اُردو کے لغت نگاروں کا رویّہ اِس سلسلے میں عجیب سا رہا ہے، کہ بعض لفظوں کو صرف ایک طرح لکھا ہے اور بعض کو مطلقاً دوسری طرح۔ مثلاً صاحبِ نوّر نے سلیمان، شیطان، لقمان، نجات، حیات؛ اِن سب کو الف کے ساتھ لکھا ہے، اور رحمان کے ذیل میں لکھا ہے: "اِس کا املا بدونِ الف صحیح ہے"۔ اِسی طرح "صلوۃ" کے تحت لکھا ہے: "تلفّظ صلات، املا صلوٰۃ"۔

رسم الخط ہای عربی مخصوصاً رسم الخط قرآن مجید بحذف الف نوشتہ میشود (اسمعیل ابرہیم، اسحق، رحمن) باید باالف نوشتہ شود تا مکتوب مطابق ملفوظ باشد۔ و تنہا لفظ "اللہ" و "الہ" ازاین قاعدہ مستثنا است" "کلمات "صلوۃ، زکوۃ، حیوۃ، مشکوۃ، توریۃ" را باید بہمان قسم کہ تلفّظ میشود یعنی بالف و تاء کشیدہ نوشت (صلات، زکات، حیات، مشکات، تورات) درعربی ہم این قسم کلمات بہ الف و تاء نوشتہ میشود و بواو نوشتن آنہا رسم الخط مخصوص بقرآن مجید است کہ عرب آنرا خاص قرآن شمردہ و بکار بردن آنرا درکتابت معمول و عادی ترک کردہ اند، لیکن برخی از فارسی نویسان رسم الخط مطابق با تلفّظ را متروک و رسم الخط قرآنی را معمول داشتہ اند و میدارند"۔

[املای فارسی۔ لغت نامۂ دہخدا، جلد ۴۰، ص ۱۶۳]

بے جا نہ ہوگا اگر یہاں پر وضاحت کردی جائے کہ قرآن میں بہت سے لفظوں کا املا خاص طور پر ہے جس کو "قرآنی املا" کہنا چاہیے۔ اِس املا میں کسی طرح کا تصرّف روا نہیں سمجھا جاتا اور یہ ٹھیک بھی ہے۔ میں سورۂ توبہ سے بعض الفاظ کا املا نقل کرتا ہوں :

سمٰوٰت ، ھٰرون ، یوم القیٰمۃ ، اصحٰب الصّراط ، جنّٰت ، درجٰت ، صٰلحٰت ، طیّبٰت ، اَنْہٰر ۔

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآنی املا ایک خاص حیثیت رکھتا ہے ، مگر عام تحریر میں اُس کی پابندی لازم نہیں ، ہو بھی نہیں سکتی ۔ عربی کی عام کتابوں میں ، اِن میں سے اور اِن کی طرح کے بہت سے لفظ الف کے ساتھ ملتے ہیں ۔ اُردو میں ایسے لفظوں کو ، تلفّظ کے مطابق الف سے لکھنا چاہیے ۔ ایک اہم لفظ ہے "یاسین" ، جو عام طور پر مستعمل ہے ۔ یہ قرآنِ پاک کی ایک سورت کا بھی نام ہے ۔ اِس لفظ کے املا میں اچھا خاصا خلفشار دیکھنے میں آتا ہے ۔ نور میں "یاسین" لکھ کر ، لکھا ہے کہ اِس کا عربی املا "یٰسین" ہے ۔ آصفیہ میں اِس سے زیادہ پریشان کن صورت ہے ، مولّف نے "یاسین" لکھ کر ، لکھا ہے کہ : "یٰسین ، یٰس نیز رسمِ خط درست نہیں"۔ صراح کا جو نسخہ پیشِ نظر ہے ، اُس میں "یٰسٓ" چھپا ہوا ہے ۔ قرآنِ پاک میں اِس کا املا "یٰسٓ" ہے ۔

اُردو میں اب اِس کا املا "یاسین" ماننا چاہیے ۔

استثنا کی گنجایش اکثر قاعدوں میں ہوتی ہے اور ضرورت بھی ؛ دو چار خاص لفظ مستثنیات کی فہرست میں شامل کیے جا سکتے ہیں ، مگر عام قاعدہ یہی رہے گا ۔ مستثنا لفظوں کی فہرست یہ ہے :

(الف) لفظ "الٰہ" کو مستثنا قرار دینا چاہیے۔ اِس لفظ کا یہی املا رائج ہے اور یہی برقرار رہے گا۔ الٰہ آباد، بارِالٰہ[1]، الٰہ العالمین جیسے لفظ برابر استعمال میں آتے رہتے ہیں۔

اِسی سے "الٰہی" بنتا ہے اور یہ لفظ بہ کثرت مستعمل ہے، اِس کا بھی یہی املا باقی رہے گا۔ یہی صورت "الٰہیات[2]" کی ہوگی۔

(ب) لفظ "اللہ" کی کتابت اُردو میں ایک خاص طرح ہوتی ہے کہ دوسرے لام کی جگہ ایک شوشہ سا بنا دیا جاتا ہے، اِس لفظ کی یہی رائج اور متعارف صورت ٹھیک ہے اور اِس کو اِسی طرح لکھنا چاہیے۔

جب اِس کے آگے یاے نسبت بڑھا دیتے ہیں، اُس صورت میں دونوں لام صاف صاف لکھے جاتے ہیں، اور اُس دوسرے لام پر الف کا نشان بنا دیا جاتا ہے، جسے عوام "کھڑا زبر" بھی کہتے ہیں، جیسے: ولی اللٰہی تحریک، معجزۂ یداللٰہی۔ یا جیسے غالبؔ کے یہ شعر:

منصورِ فرقۂ علی اللٰہیاں منم   آوازۂ "انا اسد اللہ" بر افگنم

غالب نام آورم، نام و نشانم مپرس   ہم اسد اللٰہم و ہم اسد اللٰہیم

---

[1] یا بارِ الٰہ! مصطفا کا صدقہ   اولادِ بتول و مرتضا کا صدقہ

(انشا: کلامِ انشا ص ۲۸۲)

[2] ریاضی اور طبیعی سے ماحصل یہ ہے   الٰہیات سے تا فہم کو نہ ہو اعراض

(انشا: کلامِ انشا ص ۱۱۱)

(ج) قرآن کی ایک سورت کا نام "طٰہٰ" ہے۔ قرآن میں اِس کا یہی املا ہے۔
کم سہی، مگر بہ طور نام کے یہ مستعمل ضرور ہے۔ نعتیہ اشعار و عبارات میں
بھی یہ لفظ آیا کرتا ہے، جیسے:

سفینہ نوح کا ہیں اہلِ بیتِ سرورِ طٰہٰ   مگر نوح اِس سفینے پر تمھاری ذات ہے شاہا

یہ شعر نور سے ماخوذ ہے۔ "الٰہ" کی طرح اِس لفظ کو بھی مستثنا مانا جائے گا۔

(د) اب ایک لفظ "لہٰذا" رہ جاتا ہے۔ یہ لفظ بہ کثرت مستعمل ہے۔ اِس لفظ کی بھی اِسی صورت کو صحیح مان لینا چاہیے۔ "لہٰذا" اور "معہٰذا" یہ دو لفظ اِسی طرح اب تک لکھے جاتے رہے ہیں، اِس لیے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔

اب مستثنا لفظ یہ ہوئے:

الٰہ، (الٰہی، الٰہیات) اللہ، لہٰذا، (معہٰذا)، طٰہٰ۔

۳

کچھ لفظ احتیاط اور توجہ کے خاص طور پر طلب گار ہیں، مثلاً:

اَنَا اُلحق — یہ عربی کا ٹکڑا ہے مگر اُردو میں مستعمل ہے۔ اِس مرکب میں دو الف یک جا ہیں، ایک لفظ "انا" کے آخر میں، اور دوسرا لفظ "الحق" کے شروع میں۔ بے احتیاطی کے سبب سے کبھی "انالحق" لکھ دیا جاتا ہے۔ لفظ "انا" کے بعد ترکیب کا الف لام آئے گا، تو ہمیشہ دو الف یک جا ہوں گے، جیسے: انا الحق، انا المعبود، انا البحر۔ غالب کا شعر یاد آیا:

دلِ ہر قطرہ، ہے سازِ اَنَا اُلبَحر
ہم اُس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا!

عربی کا ایک جملہ ہے : فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَارْ ۔ یہ عبارت، کبھی کسی مضمون کے عنوان کے طور پر بھی استعمال میں آتی ہے، کبھی صرف پہلا جُز "فاعتبروا" استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس میں واو کے بعد ایک الف بھی ہے، جو تلفّظ میں نہیں آتا مگر لکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اِس الف کو نہیں لکھا جاتا، یہ ٹھیک نہیں، الف کا لکھنا ضروری ہے۔ یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسے "عبداللطیف" کو "عبدالطیف" بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

عربی کا ایک اور لفظ ہے: "طَرِقُوا"۔ اِس کے معنی ہیں: راہ دو۔ شاہی سواری کے آگے نقیب "طرقوا طرقوا" کی آواز لگاتے تھے۔ اردو کی مثنویوں اور نثری داستانوں میں یہ لفظ، شاہی سواری کے تزک و احتشام کے بیان میں ملتا ہے۔ اِس میں بھی آخر میں الف ہے اور اِس کا لکھنا بھی ضروری ہے۔

"بارات" اور "داوات"، اِن دو لفظوں کو بعض لوگ اِسی طرح لکھا کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ اِن کی صحیح صورت "برات" اور "دوات" ہے۔ یہ ویسی ہی غلطی ہے جیسے "دُکان" کو "دوکان" لکھ دیا جاتا ہے۔

۴

عربی و فارسی اور ترکی کے کچھ لفظوں کے آخر میں الف ہے، مگر لوگ اُن کے آخر میں ہ لکھ دیا کرتے ہیں، جیسے:

معمہ، تماشہ، شوربہ، خُرمہ، ، چُغہ، تمغہ، حلوہ، مُربّہ،
سقّہ، مچلکہ، شفیعہ، بقایہ، عاشورہ، قورمہ، ناشتہ،

ملغوبہ ، الغوزہ ۔

اِن لفظوں کی یہ لکھاوٹ ٹھیک نہیں ؛ اِن سب کے آخر میں الف لکھنا چاہیے ، یعنی :

الغوزا ، الجبرا ، بقایا ، تماشا ، تقاضا ، تمغا ، چغا ، حلوا ، خُرما ، سقا ، شفیعا[1] ، شوربا ، عاشورا ، طغرا ، کوکا ، قورما ، معمّا ، ملغوبا ، مچلکا ، ناشتا ، مربّا ۔

معمّا کا لفظ تو خاص طور سے معمّے باز رسالوں کی وجہ سے مسخ ہوکر "معمّہ" بنا ہے ۔ "کوکا" ترکی لفظ ہے ۔ آصفیہ میں رنگین کی ریختی کے دو شعر منقول ہیں ، ردیف "کوکا" ہے ۔

آشکارا اور خارا ، یہ دو لفظ ایسے ہیں جو قدیم فارسی میں "آشکارہ" اور "خارہ" کی صورت میں بھی ملتے ہیں ، مگر یہ املا ، "آشکارا" اور "خارا" کے مقابلے میں کم ملتا ہے اور اب اِن دونوں لفظوں کو عام طور پر الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے ۔ اُردو میں دونوں لفظوں کو صرف الف کے ساتھ لکھنا چاہیے ، یعنی : آشکارا ، خارا ۔

۵

"طالب" کی جمع "طَلَبَہ" ہے ، تلامذہ کے معنی میں (صراح ، المنجد) ۔ اِسی

---

[1] یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ "شفیعا" ایک قسم کا خط ہے ، جسے ملّا شفیعا نے ایجاد کیا تھا ، اِس لیے "خطِ شفیعا" مشہور ہوا ۔ اِسے "شفیعہ" یا "شفیہ" لکھنا غلط ہے ۔"
[ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) ، ہندستانی ، جنوری ۱۹۳۱ء ۔]

طرح "صوفی" کی جمع "صوفیہ" ہے (المنجد)۔ اِن کو "طلبا" یا "صوفیا" لکھنا ٹھیک نہیں ۔ عربی کا ایک اور لفظ ہے "طلیب" ، اُس کی جمع "طلباء" آتی ہے ، مگر شاگردوں کے معنی میں "طلبہ" ہے ۔ صاحبِ آصفیہ نے طلبا اور طلبہ ، دونوں کو طالب کی جمع لکھا ہے ۔ یہ درست نہیں ۔ نور کے مؤلف نے صحیح طور پر صراحت کردی ہے کہ : "طلبہ ..... اِس جگہ طلباء ، بروزنِ امراء ، غلط ہے "ـــــ البتّہ عزیز کی جمع اعزّہ بھی ہے اور اعزّاء بھی ، جسے اُردو میں ہمزہ کے بغیر "اعزّا" لکھتے ہیں ۔

دوا کی جمع "ادویہ" ہے ۔ اِس کو "ادویا" لکھنا صحیح نہیں ۔

۶

کچھ لفظ ایسے بھی ہیں جو ایک معنی میں الف سے اور ایک معنی میں ہ سے صحیح ہیں ۔ اِس معنوی امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ ایسے کچھ الفاظ یہ ہیں :

آسیا : چکّی ۔ آسیہ : فرعون کی بی بی کا نام ۔

اَبلا : جوان عورت ۔ اِسی سے "ابلا پری" بنا ہے ۔ جاؔن صاحب:

گُل کھاتے ہو یہاں ، ہے بنارس میں گل بدن * ابلا پری کا اپنی یہ تم کو خیال ہے

یہ شعر نورؔ سے ماخوذ ہے ۔ ایک دوسرا لفظ ہے : ابلَہ ، جس کے معنی ہیں : احمق ، سادہ لوح ، جس کو طنز کی راہ سے "جنّتی" بھی کہتے ہیں ۔

پارا : جسے فارسی میں سیماب کہتے ہیں ـــــ پارہ : ٹکڑا ۔

پلّا : جس سے "پلّے دار" بنتا ہے ۔ نیز ٹوپی کا ایک بازو ، فاصلہ ، وغیرہ ـــــ پلّہ : درجہ ، مرتبہ وغیرہ ، جیسے : ہم پلّہ ۔ ہاں ، پلّا ایک

تیسرا لفظ ہے۔

چارا : جانوروں کی خوراک کے کام آتا ہے ــــ چارہ : تدبیر۔

خاصا : جیسے اچھا خاصا ــــ خاصہ : وہ نفیس چیز جو بادشاہوں اور اُمرا و وُزرا کے لائق ہو۔ شاہی دسترخوان کا کھانا۔ ایک خاص قسم کا سفید کپڑا (لٹھا)۔ اِن سب معنوں میں یہ فارسی ہے ــ خاصّہ، صاد مشدّد، یہ عربی کا لفظ ہے، معنی معروف ہیں، جیسے : زہر کا خاصّہ۔

دانا : عقل مند، جاننے والا ــــ دانہ : جیسے آب و دانہ۔

سایا : ایک معروف پوشاک ــــ سایہ : جیسے دیوار کا سایہ۔

شیوا : فصیح و بلیغ۔ اِسی سے "شیوا بیان" بنتا ہے ــــ شیوہ : ناز و کرشمہ، طرز و روش وغیرہ ـ "بتِ ہزار شیوہ" میں یہی "شیوہ" ہے۔

زَہرا : حضرت فاطمہؓ کا لقب ہے (عربی میں : زَہراء) ــــ زُہرہ کے کئی معنی ہیں، ایک مشہور ستارے کا نام بھی ہے۔ یہ بھی عربی کا لفظ ہے۔

فارسی کا ایک لفظ ہے : زَہرہ، اِس کے معنی ہیں : پِتّا۔ مجازاً : دلیری و ہمت ـ لُغات میں عام طور پر تلفّظ اور املا کے اختلاف کی صراحت کردی گئی ہے، صرف نور میں فارسی لفظ زَہرہ کے ایک معنی "لقب حضرت فاطمہ کا" لکھے ہوئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ــ حضرت فاطمہ کا لقب زَہرا ہے۔

غُلّا : غلیل سے جس کا تعلّق ہے۔ آنکھ میں بھی یہی ہوتا ہے ــ

غلّہ : جسے کھاتے ہیں ۔

کلّا : کونپل ، یا کرم کلّا ـــــ کُلّہ : جبڑا یا رخسار ۔

لالا : روشن ، چمک دار ، موتی کی صفت جیسے : لولوے لالا ۔ غلام ـــــ لالہ : مشہور پھول ، جس کو دیکھ کر شاعروں کو اپنے دل کا داغ یاد آجایا کرتا ہے ـــــ لالا جی ، لالا صاحب یا جیسے لالا کرم چند ؛ یہ لالا بھی الف سے لکھا جائے گا ۔

میانا : ایک طرح کی پالکی ـــــ میانہ : جیسے ، میانہ روی ، میانہ قد ۔

نالا : ندی نالا ـــــ نالہ : نالہ و فریاد ۔

نا : تاکید کے لیے ، جیسے : جاؤ نا ، کھاؤ نا ۔ دیکھو نا وہ کیا کر رہے ہیں ۔ یا جیسے : ہم نہ کہتے تھے ، اب دیکھو ، روپے مل گئے نا ۔ ـــــ نہ : نفی کے لیے : نہ کرو ، نہ جاؤ ۔ نا ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتا ہے ۔

ایک لفظ ہے اَش اَش ۔ اش اش کرنا یا اش اش کر اُٹھنا ، اِسی سے بنتے ہیں ، جیسے ایک مستزاد کا یہ مصرع :

تصویر تری دیکھ کے اے رشکِ مسیحا ؛ سب کرتے ہیں اش اش

یا جیسے ناسخ کا یہ شعر :

ہم سفر وہ ہے جس پہ جی غش ہے
دشتِ غربت ، مقام اش اش ہے

اِس کو ع سے "عش عش" لکھنا درست نہیں ۔

۱؎ آصفیہ ، نور ، امیر اللغات ، سرمایۂ زبانِ اردو ؛ ان (بقیہ ص ۷۱ پر)

لالؔ : اِس کے کئی معنی ہیں ، ایک خاص رنگ کے علاوہ ، ایک چھوٹے سے خوب صورت پرندے کو بھی کہتے ہیں ۔ بیٹے اور لڑکے کے معنی بھی

سب لُغات میں صراحت کردی گئی ہے کہ صحیح لفظ " اش اش " ہے ۔ بہ طورِ مثال، جلالؔ کے لُغت کی عبارت نقل کی جاتی ہے :

" اش اش : دونوں الف مفتوح ، دونوں شین منقوط ، ایک کلمہ ہے کہ شادمانی اور وجد کے معنی پر بولا جاتا ہے ۔ اور یہ محاورہ اہلِ اُردو کا ہے ، فارسی عربی میں کہیں نہیں پایا جاتا ، البتہ عربی میں " اشاش " بروزنِ تلاش ، " شادمانی و وجد کردن " کے معنی پر پایا جاتا ہے ، کما فی الصراحؔ ۔ پس کیا عجب ہے کہ یہی اِس کی اصل ہو۔

پس جو لوگ اِس کلمے کو ، بجاے دُو الف ، دُو عینِ مہملہ سے لکھتے ہیں ؛ مولّفِ ہیچ مداں کے نزدیک خطا پر ہیں "۔

[سرمایۂ زبانِ اُردو]

کُلیاتِ ناسخؔ کی اشاعتِ اوّل (مطبعِ محمدی ، سالِ طبع : ۱۲۵۸ھ) میں ایک شعر یوں چھپا ہوا ہے :

" ہم سفر وہ ہے ، جس پہ جی غش ہے   دشتِ غربت ، مقامِ عش عش ہے "

لیکن اِس کے غلط نامے میں اِس غلطی کی تصحیح کردی گئی ہے اور اِس کو " اش اش " بتایا گیا ہے ۔ اشاعتِ ثانی (۱۲۶۲ھ) میں اِس شعر میں " اش اش " ہی چھپا ہے۔ جن لوگوں نے اشاعتِ اوّل کا غلط نامہ نہیں دیکھا ، اُنھوں نے یہ سمجھا کہ ناسخؔ کے یہاں " عش عش " ہے ، اور یہیں سے اِس غلط فہمی کو فروغ ہوا ۔

دیتا ہے، جیسے : میرے لال ۔ یہ کہا گیا ہے کہ ایک خاص قیمتی پتھر اور رنگ کے معنی میں، یہ فارسی و ہندی میں مشترک ہے اور یہ کہ لعل اسی لال کی معرّب صورت ہے ۔ (برہانِ قاطع ۔ بہارِ عجم ۔ غیاث) ۔

اردو میں عام طور سے قیمتی پتھر کے معنی میں "لعل" لکھتے ہیں، مگر "لال" بھی استعمال کیا گیا ہے :

گلے کا ہار تعشق ہے گورے گالوں کا ۔۔۔ گلی میں یار کی میلا ہے پھول والوں کا

مٹائی موتیوں کی آب اُس کے دانتوں نے ۔۔۔ اُڑا دیا لبِ رنگیں نے رنگ لالوں کا

(بحر لکھنوی ۔ ریاض البحر، ص ۱۴)

اِس غزل کے قوافی میں ہر جگہ الفِ تاسیس کا التزام ہے ۔

مناسب یہ ہے کہ اب معروف قیمتی پتھر کے معنی میں صرف لعل لکھا جائے ۔

ناموں کے ساتھ بھی یہ لفظ آتا ہے ؛ جب ناموں کے ساتھ آئے تو اِس کو لازماً لال (مع الف) لکھنا چاہیے ۔ جیسے : موتی لال، جواہر لال، ہیرا لال، پنّا لال، لال بہادر، لال سنگھ، لال شاہ، لال محمد ۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ لالو الف ہی سے لکھا جاتا ہے اور یہ اِسی لال کی بدلی ہوئی صورت ہے ۔

رنگ اور پرندے کے معنی میں تو ہے ہی الف سے (لال رنگ ۔ لالی : یہ لفظ نام کے طور بھی آتا ہے ۔ اور : لال اُڑ گئے) ۔ معروف پتھر کے معنی میں اِس کو دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے (لال ۔ لعل) مگر اب تک اِس معنی میں زیادہ ترع سے لکھا جاتا رہا ہے ، خاص طور سے مرکّب صورت میں، جیسے : لبِ لعل، لبِ لعلیں، لعلِ لب، لعل و گہر؛ میرا خیال ہے کہ یہ امتیاز مناسب رہے گا ۔ لبِ لال اور لبِ لعل، لبِ لالیں

اور لبِ لعلیں میں واضح طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ معنوی امتیاز کے لیے "لبِ لعل" اور "لال رنگ" لکھنا بہتر ہے۔
مختصر یہ کہ رنگ، معروف پرندے اور ناموں کے جُز کے طور پر لال لکھا جانا چاہیے۔ اور معروف پتھر کے معنی میں لعل۔

ابیر، عبیر:
ابیر، ہندی کا لفظ ہے، اِس کے معنی ہیں: "ابرک کا بُرادہ جو ہولی کے دن ہندو آپس میں ایک دوسرے پر چھڑکتے ہیں" (آصفیہ)
ایک اور لفظ ہے عبیر، یہ عربی ہے، اِس کے معنی ہیں: "ایک خوش بو دار سفوف یا بُرادہ (پوڈر) جو مشک، گلاب، صندل وغیرہ سے مرکّب ہوکر تیّار ہوتا ہے اور کپڑوں پر چھڑکا جاتا ہے..." (آصفیہ)۔
دونوں لفظ اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں، مگر گلال کے ساتھ ابیر کا لفظ آئے گا۔ برق کا شعر ہے:

اُس کے حضور ابیر ہوا رنگِ یاسمن
رنگت گلوں کی بن گئی مُبکا گلال کا

برق کا یہ شعر کئی لغات میں ملتا ہے۔ میں نے امیر اللغات سے نقل کیا ہے۔ ایسے مقامات پر ہمیشہ "ابیر" لکھنا چاہیے۔ یا جیسے یہ مصرع: وہ جسمِ نازنیں ہے ابیر و گُلال کا۔ یہاں "عبیر و گلال" لکھنا درست[1] نہیں ہوگا۔

---

[1] جلالؔ نے لفظ ابیر کے ذیل میں صراحت کردی ہے کہ: (بقیہ حاشیہ ص ۷۴، پر)

ایسے مرکّب لفظ اُردو میں اچھی خاصی تعداد میں مستعمل ہیں جنھوں نے ، عربی قاعدے کے مطابق ، " الف لام " کے ساتھ ترکیب پائی ہے ، جیسے : فی الحال ، بالکل ، بالفعل ، اناالحق ، ملک الموت ، صدیق الرحمان ، عظیم الشان ، شجاع الدولہ ، شفاء الملک وغیرہ ۔

ایسے مرکّبات کی دو صورتیں ہوتی ہیں : کچھ مرکّبات میں الف اور لام دونوں تلفظ میں نہیں آتے ، جیسے : عظیم الشان [عظیمُ ۔ ال ۔ شان] بالتّرتیب [بِ ۔ ال ۔ ترتیب] ۔ اور کچھ مرکّبات میں صرف الف تلفّظ سے خارج رہتا ہے ، لام شاملِ تلفّظ ہوجاتا ہے ، جیسے : ملکُ الموت [ملکُ ۔ الُ ۔ موت] ، بالکل [بِ ۔ الُ ۔ کُل] ۔

قواعد نویسوں نے تقسیم اِس طرح کی ہے کہ الف لام کی ترکیب کے لحاظ سے حروفِ تہجّی کی دو قسمیں ہیں : حروفِ قمری ، یعنی وہ حروف جن سے پہلے اگر " الف لام " آتا ہے ، تو لام ، شاملِ تلفّظ رہتا ہے ۔ ایسے حروف یہ ہیں : ب ، ج ، ح ، خ ، ع ، غ ، ف ، ق ، ک ، م ، و ، ہ ، ی ۔ اور حروفِ شمسی ، وہ حرف کہ اُن کے اوّل جب " الف لام " آتا ہے ، تو لام شاملِ تلفّظ نہیں ہوتا ، یہ حرف ہیں : ت ، ث ، د ، ذ ، ر ، ز ، س ، ش ، ص ، ض ، ط ، ظ ، ل ، ن ۔

" اور اِس لفظ کو بجائے الف ، عینِ مہملہ سے لکھنا ، مولّف کے عندیے میں غلط ہے ، اس لیے کہ یہ لُغت ہندی ہے "۔ (سرمایۂ زبانِ اردو)

اردو املا میں اِس " الف لام " کو لازماً لکھا جائے گا ۔ ترکیب کا یہ طریقہ اِس قدر کثیر مرکّبات میں شامل ہے کہ اِس کو ختم نہیں کیا جا سکتا اور اب یہ طریقہ ، فارسی کے طریقہ ہاے ترکیب کی طرح ، اردو کا جُز ہے ۔ ایسے مرکّبات کو اُن کی مروّج اور متعارف صورت کے مطابق ہی لکھا جائے گا ۔ چوں کہ ایسے مرکّبات متعارف حیثیت رکھتے ہیں ، اِس لیے اُن پر زبر زیر لگانے کی چنداں ضرورت نہیں ، مگر نصابی کتابوں میں الفؔ سے پہلے والے حرف پر حرکت لگانا مناسب ہوگا اور لامؔ اگر ساکن ہو تو اُس پر جزم بھی لگایا جائے ، جیسے : بِالْفعل۔ لامؔ اگر تلفّظ میں شامل نہ ہو ، تو اُس کے بعد آنے والے حرف پر تشدید لگائی جائے ۔ جیسے : وَالشَّمس ، بِالتّرتیب ۔ لامؔ کے بعد والے حرف پر تشدید ، اور الفؔ سے پہلے والے حرف پر اُس کی حرکت؛ یہ دو چیزیں اِس بات کے اظہار کے لیے کافی ہوں گی کہ یہاں الفؔ لامؔ " خاموش حروف " کی حیثیت رکھتے ہیں اور شاملِ تلفّظ نہیں ۔ یہ طریقِ املا ، ابتدائی درجوں کی کتابوں میں لازماً اختیار کرنا چاہیے ۔

الفِ ممدودہ

الفِ ممدودہ کے متعلق یہ لکھا جا چکا ہے کہ یہ دو الف کے برابر ہوتا ہے۔ کتابت میں الف کے اوپر مد کی علامت، اِسی دوسرے الف کی نشانی ہے۔ متعدد پُرانی مطبوعہ اور خطی کتابوں میں الفِ ممدودہ کے لیے، دو الف لکھے ہوئے[1] ملتے ہیں، جیسے: اآب، اآتش وغیرہ۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک کی چھپی ہوئی کئی کتابوں میں یہ صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً نول کشور پریس سے چھپی ہوئی دو کتابیں اِس وقت میرے سامنے ہیں، ایک بہارِ عجم اور دوسری برہانِ قاطع، جو بالترتیب ۱۸۷۹ء اور ۱۸۸۸ء کی مطبوعہ ہیں۔ دونوں میں بابِ الفِ ممدودہ میں لُغات

---

[1] شیرانی صاحب نے لکھا ہے کہ گجرات میں، بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں "الفِ ممدودہ، دو الف کی شکل میں لکھا جاتا تھا"۔

(مقدمۂ پنجاب میں اردو، ص ح ط۔ اشاعتِ اوّل)

کو دِوّ الف کے ساتھ لکھا گیا ہے، یعنی : اآتش ، اآتون ، اآختن وغیرہ۔
یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ اِس کا تعلّق کرشمۂ کتابت سے نہیں ہے اور اِس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ برہانِ قاطع میں ، مولّف نے عربی کے مطابق ، پہلے متحرّک الف کو ، ہمزہ کے نام سے موسوم کیا ہے اور دوسرے ساکن الف کو ، الف لکھا ہے ۔ "گفتارِ اوّل" کا عنوان اِس طرح شروع ہوتا ہے : "گفتارِ اوّل از کتابِ برہانِ قاطع ، در حرفِ ہمزہ با حروفِ تہجّی ..." ۔ اور اِس کے بعد "بیانِ اوّل در ہمزہ با الف" ہے ، اور اِس طرح مثلاً "اآب" میں پہلا حرف ہمزہ ہے اور دوسرا حرف الف ہے ۔ اصل یہ ہے کہ اِس سلسلے میں صاحبِ برہان نے جہانگیری کی تقلید کی ہے ۔ فرہنگِ جہانگیری کے مولّف نے ، مقدّمۂ لُغت میں لکھا ہے :

"چوں علمائے فارس الفِ ممدودہ را دو الف اعتبار میکنند ، در فصلِ الف ، از بابِ الف ، ہر الفے کہ در اوّلِ او الفِ ممدودہ بود ، نوشتم و دِوّ الف رقم کردم ، چہ لغتے کہ حرفِ اوّل و ثانیِ آں الف باشد ، مطلقاً نیافتم"
(مقدّمۂ فرہنگِ جہانگیری)

اِس اندازِ کتابت کو اب پُرانی چیز سمجھا جائے گا اور اب اِس کی پیروی نہیں کی جائے گی [البتّہ اِن کتابوں میں یہی املا اختیار کیا جائے گا] ۔ اب مسلّمہ اندازِ کتابت اِسی کو سمجھا جائے گا کہ الفِ ممدودہ کے لیے ، الف کو مع مد لکھا جائے ، جیسے : آب ، آتش ۔
یہاں پر یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ قواعدِ تاریخ گوئی کے

لحاظ سے الفِ ممدودہ کا ایک عدد لیا جاتا ہے ، اِس دلیل کے ساتھ کہ کتابت میں ایک ہی حرف ہے اور اعدادِ تاریخ کی بِنا کتابت پر ہے ۔ اِس لیے یہ خیال رکھا جائے گا کہ اگر کسی قدیم تحریر میں الفِ ممدودہ کے لیے دو الف لکھے گئے ہیں تو یہ دیکھ لیا جائے گا کہ یہاں اعدادِ تاریخ کا کچھ جھگڑا تو نہیں ۔ فرض کر لیجیے کہ کسی مصنّف نے "آ" کو "اا" مان کر ، دو عدد مراد لیے ہیں (اور اِس صورت میں دو عدد مراد لینا جائز ہوگا) تو اُس مقام پر لازماً دو الف لکھے جائیں گے ۔ البتّہ اِس کی صراحت کر دی جائے گی ۔ بعض تاریخوں میں اِس کی مثال ملتی ہے کہ الفِ ممدودہ کو دو الف مان کر ، دو عدد مراد لیے گئے ہیں ۔ ایسی تاریخوں پر اعتراض کیا گیا ہے ، اور اعتراض کی بِنا "آ" پر ہے ، اگر اِس کو (فارسی لُغات کے اندراجات کی بِنا پر) "اا" لکھا جائے تو کوئی اعتراض واقع نہیں[1] ہوگا ۔

---

[1] امیر مینائی نے ، الفِ ممدودہ کے ذیل میں ، امیر اللغات میں لکھا ہے :

"اور بعض مورخین نے خال خال جو اِس الف کے دو عدد لیے ہیں (جیسے اِس تاریخِ رحلتِ سید نورالحسن خاں بلگرامی میں ، جو ۱۲۰۹ ہجری میں واقع ہوئی ، الفِ آغاز کے دو عدد لیے گئے ہیں ، ع : نوشت خامہ کہ "آغاز بود ماہِ صیام" ۔) یہ مشرب ضعیف اور ضرورتِ تاریخ اِس کا منشا ہے "۔

اِس قبیل کی اور مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں ۔ اِس سلسلے میں مجھے

عروض کی شریعت میں الفِ ممدودہ کو دو آوازوں، یا یوں کہیے کہ دو حرفوں کے برابر مانا جاتا ہے، یعنی : آ، بر وزنِ فع ۔
کچھ مرکّبات ایسے ہیں جن میں جزوِ آخر کا پہلا حرف "آ" تھا، مگر کسی نہ کسی وجہ سے اِن لفظوں میں سے ایک الف کی آواز غائب ہوچکی ہے، جیسے : برفاب، سیلاب، تیزاب، زہراب، خوناب، خوشامد، برامدا وغیرہ ؛ ایسے الفاظ کو اِسی طرح لکھا جائے گا، یعنی مد کے بغیر۔ اِن میں ترکیبی صورت نمایاں نہیں رہی ہے ۔
اِس کے برخلاف، جہاں ترکیبی صورت برقرار اور واضح ہو، وہاں الف پر مد لازماً لکھا جائے گا، خواہ پڑھنے میں ایک ہی الف آئے، جیسے : جہان آباد، گرد آلود، عہدہ برآ، دل آویز، دل آرا، جہان آرا، دل آرام، خمار آلود، جہان آفریں، خاک آلودہ وغیرہ ۔ اِسی طرح درآمد اور برآمد کو بھی الفِ ممدودہ کے ساتھ لکھا جائے گا ۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ایسے اکثر مرکّبات میں آخری جُز، فارسی کا کوئی فعل ہے ۔
ایسے بعض مرکّبات میں اشتباہ اِس لیے پیدا ہوگیا کہ اُن کو ملا کر لکھا جانے

یہ عرض کرنا ہے کہ اِس مصرعے میں "آغاز" کو "اغاز" لکھنا چاہیے تھا، تاکہ دو اعداد کے لیے، مکتوبی صورت کی بِنا متعیّن کی جا سکے۔ ایسے اور مقامات پر بھی، جہاں یہ "مشربِ ضعیف" اختیار کیا گیا ہو، یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ الفِ ممدودہ کو "آ" کی صورت میں لکھنے کے بجائے "اا" کی صورت میں لکھا جائے گا، لُغات کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، ورنہ "آ" کے دو عدد لیے ہی نہیں جاسکتے کیوں کہ تاریخ کی بِنا، کتابت پر ہے ۔

لگا۔ لامؔ اور الفؔ کو جب ملا کر لکھا جائے گا (لا)، تب یہ اشتباہ عموماً نمایاں ہو جائے گا، کیوں کہ اِس صورت میں اِس "لا" پر مد لگانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ تلفظ، اِس واہمے میں مبتلا کر دیا کرتا ہے کہ "لا" کافی ہے۔ جیسے: "دلاویز، دلارام، دلازار"۔ یہ کتابت ٹھیک نہیں، اِن کو لازماً الگ الگ لکھا جائے گا اور الفؔ پر مد لکھا جائے گا۔ تلفّظ میں ایک الفؔ کبھی ساقط بھی ہو جائے گا اور اُس کی حیثیت اُس صورت میں الفِ وصل کی سی ہوگی، مگر اُس الفؔ کو لکھا ضرور جائے گا اور یہ اِس لیے ہے کہ ایسے مرکّبات میں ترکیبی صورت برقرار اور نمایاں ہے اور الفؔ پر مد نہ لکھنے کی صورت میں التباس کا احتمال زیادہ ہے۔ پڑھنے میں آسؔ، آنؔ، آبؔ، وغیرہ کا الفؔ، الفِ وصل بن کر اکثر ساقط ہو جایا کرتا ہے، مگر اُس کو لکھا ضرور جاتا ہے اور یہ اِسی لیے ہے کہ لفظوں کی صورت (بالکل غیر ضروری طور پر) اِس طرح نہ بدل جائے کہ التباس کے لیے جگہ بن جائے اور غیر ضروری طور پر خلفشار پیدا ہو۔

الف اور ہائے مختفی

ہائے مختفی ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتی ہے اور اِس کو فارسی اور عربی لفظوں سے مخصوص بتایا گیا ہے ، جیسے : کعبہ ، شگفتہ ۔ ہندی ، انگریزی یا دوسری زبانوں کے لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے ، جیسے : بھروسا ، کمرا ، گملا ، پتا ، تانگا ۔ لغت کی کتابوں میں بڑی حد تک اِس کی پابندی بھی کی گئی ہے ، مگر عام تحریروں اور کتابوں میں اِس کی طرف توجہ نہیں کی جاتی ۔ اب حال یہ ہوگیا ہے کہ جو شخص جس لفظ کو جس طرح چاہتا ہے ، لکھ دیتا ہے ۔ کاتب صاحبان نے اِس کے فروغ میں سب سے زیادہ حصّہ لیا ہے ۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے اپنے ایک گراں قدر مقالے میں (مشمولۂ رسالۂ ہندستانی ، جنوری ۱۹۳۱ء) اِس قاعدے کو وضاحت کے ساتھ لکھا ہے ۔ بعض کتابوں کے مقدمے یا تبصرے میں بھی اِس طرف توجہ مبذول کرائی ہے ۔ میں پہلے اُس مقالے سے ضروری اقتباس

پیش کرتا ہوں۔ اقتباس طویل ہے، مگر اُس کی اہمیت کے مدِ نظر، اُس کو پیش کرنا ازبس ضروری ہے:

"جہاں تک تلفظ سے بحث ہے، اردو میں مختفی ہ کا وجود نہیں ہے، بل کہ مختفی ہ، فارسی کی چیز ہے، اردو ہندی کے لفظوں میں نہیں آسکتی، لفظ کی ابتدا یا بیچ میں نہیں آتی، آخر ہی میں آسکتی ہے۔

اردو اور ہندی کی طرح، فارسی کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ لفظ کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے..... جب عربی لفظ اختیار کیے گئے تو فکر ہوئی کہ اخیر حرف کی حرکت کو، جو تلفظ میں آتی ہے، تحریر میں کس طرح نمایاں کریں۔ تدبیر یہ ٹھہری کہ ایک ہ اخیر میں لکھیے اور اُس کو زبر کی طرح پڑھیے، ہ کی آواز اِس میں نام کو نہ ہو؛ اِس لیے اِس کا نام مختفی پڑ گیا، اور اِس کے مقابلے میں اصلی ہ کو ملفوظ کہنے لگے۔ یاد رہے کہ یہ سب کچھ فارسی میں ہوا، عربی میں اِن دونوں اصلاحوں کا کہیں ذکر نہیں آتا۔

ایک بات اور بھی اِس سلسلے میں بیان کرنے کے لائق ہے، وہ یہ کہ، فارسی والوں نے جب عربی کے بہت سارے لفظ اپنی زبان میں لیے تو اُن میں سے کسی کسی میں تصرّف بھی کیا، اُنھی میں سے ایک تصرّف یہاں بیان کیا جاتا ہے:

عربوں کے یہاں ایک حرف ہے جو بعضے اسموں کے آخر میں آتا ہے، شکل اُس کی ہ کی ہے، مگر معمولاً اُسے ت پڑھتے

ہیں ، اس لیے اُس پر دو نقطے لگا دیتے ہیں (ۃ)۔ جب اس گول ۃ والا کوئی لفظ کسی جملے کے آخر میں آ پڑتا ہے اور آواز ٹوٹتی ہے، تو اُسے ملفوظ ہ کا سا تلفظ ملتا ہے ، اور اُس سے پہلے زبر بھی ہوتا ہے ..... ایرانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ چیز اُن کی مختفی ہ سے بہت ملتی جلتی ہے ، اکثر صورتوں میں اُسے مختفی ہ کی طرح بولنا شروع کر دیا ، اور کہیں اُسے ت قرار دے کر ، اسے اُسی طور سے بولنے لگے اور لکھنے لگے ۔ عزّۃ ، درجۃ ، جنّۃ وغیرہ کو ، عزّت ، خدمت ، جنّت بنا دیا ، اور درجۃ ، مدرسۃ وغیرہ کو ، درجہ ، مدرسہ ۔ کہیں کہیں لفظ کو دونوں سانچوں میں ڈھال لیا ، جیسے : اجازہ اور اجازت ، ارادہ اور ارادت ، افاقہ اور افاقت ۔ اِن لفظوں میں جہاں جہاں ۃ ، ہ ہوگئی ، وہاں ہ مختفی[1] ہی قرار پائی ۔ یہ مفرّس لفظ فارسی سے اردو میں آئے تو یہاں بھی اُن کا تلفّظ وہی رہا جو فارسی والوں نے اختیار کیا تھا ۔

---

[1] یہی بات احمد بہمنیار نے " املای فارسی " میں لکھی ہے :

" تاءِ زاید را کہ در آخر برخی از اسمہای عربی مستعمل در فارسی است مطابق تلفظ باید کتابت کرد ، بدین معنی کہ اگر بصدای تاء تلفّظ میشود ، کشیدہ نویسند با دو نقطہ ، مانند : رافت ، رحمت ، تضات ، دوات ، جہت ۔ و اگر بصدای ہاءِ ملیّن تلفظ میشود ،

(بقیۃ حاشیہ ص ۸۴ پر)

اِس طرح اردو میں مختفی ہ ، فارسی اور عربی لفظوں کے ساتھ مخصوص ہے ۔ مگر اِس ہ کی اصلیت کو لوگوں نے بھلا دیا اور خود اپنی تحریر کے لیے کوئی ہنجار قائم نہ کیا ، نتیجہ یہ ہوا کہ بدمذاقی پھیلی

بشکل ہمان ہا نویسند بی نقط ، مانند : مکہ ، مدینہ ، فاطمہ ، جدہ ، علی العجالہ ۔

البتہ در اینجا بی مناسبت نیست کہ خاطر آقایان معظم را بموضوعیکہ از ذوق لطیف وحسن تصرّف ایرانیانؒ درکلمات فارسی حکایت میکند متوجہ سازم ، و آن چنانست کہ عربہا تاء زاید اینگونہ اسمہارا اگر برآن وقف و سکوت کنند ، چون ہاء ساکن بعد از فتحہ ، و در غیر این حالت چون تاء تلفظ میکنند مثلاً رحمت و رفعت را در حال وقف رحمہ و رفعہ و در حالات دیگر رحمة و نعمة تلفظ میکنند ۔ فارسی زبانان از این دو تلفظ استفادۂ لطیفی کردہ و برخی از اسمہای عربی راکہ مختوم بتاء زاید است ، در دو معنی بکار بردہ و ہر معنی را بتلفظی اختصاص دادہ اند ، مثلاً مراجعت را بمعنی بازگشت از مکان و مراجعہ را بمعنی رجوع باشخاص و اشیا مخصوص ساختہ اند ۔ و ہم چنین ارادت را بمعنی اخلاص و محبّت ، و ارادہ رابمعنی خواستن و قصد کردن ، اقامت را بمعنی ماندن و توقف کردن ، واقامہ رابمعنی برپای داشتن تخصیص کردہ اند ۔ و بر این قیاس است نوبت بمعنی دفعہ و بار ، و نوبہ بمعنی تب مخصوص ، رسالت بمعنی پیغام وپیام بردن و رسالہ

(بقیۂ حاشیہ ص ۸۵ پر)

اور ٹھیٹ اردو لفظوں میں بھی لوگ مختفی ہ لکھنے لگے ۔ ہندی کے دیوناگری خط میں تو ایک آ ہے اور اُس کا نمایندہ اردو میں سوا الف کے ، اور کوئی حرف ہو ہی نہیں سکتا ۔ ہندی لفظ تو ایک طرف رہے ، طُرّہ یہ کہ وہ عربی فارسی لفظ بھی جن کے آخر میں الف ہے ، ہ سے لکھے جاتے ہیں ۔ یہ املا سراسر غلط ہے ـــ قاعدہ اِس کا یوں ہے :

ہندی لفظ ہو تو الف سے لکھا جائے (سوا بعض مقاموں کے ناموں کے ، جیسے : آگرہ ، کلکتہ ، پٹنہ ۔ کس واسطے کہ یہ نام ہیں اور ہمیشہ اِسی طرح لکھے جاتے ہیں) ۔ مقاموں کے ناموں کے سوا جتنے لفظ ہیں ، اُن کو الف ہی سے لکھنا چاہیے ۔ جیسے : اِکّا ..... ۔ یاد رہے کہ مذکّر صفتیں بھی الف ہی سے صحیح ہیں ، جیسے : چُلبلا ..... ۔

اِسی طرح وہ لفظ بھی جو یورپ کی زبانوں سے آئے ہیں ، جیسے :

بمعنی کتاب و نامہ ، و ہدایت بمعنی راہ نمودن و کفایت بمعنی بسندہ بودن وہدایہ و کفایہ نام دو کتاب ۔ آیت بمعنی نشان و علامت و آیہ بمعنی قطعہ یی از قرآن مجید ۔

و خود این حُسن تصرّف و لطف استفادہ یکی از موجبات وضع این قاعدۂ املایی است کہ تاءِ آخر این کلمات باید مطابق تلفظ نوشتہ شود "۔

(لغت نامۂ دہخدا ، جلد ۔۔ ، ص ۱۶۲)

پلا رتمغا وغیرہ کے معنوں میں) ، ڈراما ، فرما ، کمرا ، مارکا .....
یہی حال اُن لفظوں کا ہے جو فارسی عربی سے نکلے تو ہیں ،
مگر خود اُن زبانوں میں اُن کا وجود اِس ہیئت میں نہیں ہے ،
جیسے : بدلا ، بے فکرا ، نودولتا ، کبابیا ، خاصا ... بعضا ...
امسالا ، ملیدا ... دسپنا وغیرہ ۔
اُن لفظوں کے آخر میں بھی الف لکھنا چاہیے جو ایک اردو اور
ایک فارسی یا عربی جز سے بنتے ہیں ، جیسے : ڈیڑھ خما ، ... تماہا ،
چھماہا ، پچرنگا ، سترنگا وغیرہ ۔
اِسی سے ایک کُلیہ ہاتھ آیا کہ جب کسی اور زبان کا لفظ اردو میں
دوسرے معنی اور اُسی کے ساتھ دوسرا تلفّظ اختیار کرلے تو اُس
کا املا ، ٹھیٹ اردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیے "۔

مکاتیبِ غالب ، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی پر تبصرہ کرتے
ہوئے لکھا :

" اردو لفظوں کے املا ، خاص کر الف اور مختفی ہ اور ی اور
ہمزہ کی کتابت میں احتیاط نہیں برتی گئی ہے .... ایک
آدھ جگہ " پتا " مگر اکثر " پتہ " دیکھا گیا ..... جن لفظوں کی
اصل فارسی یا عربی نہیں ، اُن میں مختفی ہ نہیں آسکتی ،
الف ہونا چاہیے "

(ہندستانی ، جولائی ۱۹۳۸ء)

خطوطِ غالب، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد (مرحوم) کے مقدمے میں لکھا ہے:

"بعضے فارسی لفظوں کے اخیر میں جو مختفی ہ ہوتی ہے، محض ایک حرکت ہے۔ بعضے عربی لفظوں کے آخر میں بھی ہ ہوتی ہے۔ یہ اگرچہ مختفی ہ نہیں، مگر اِس کی آواز وقفے کی صورت میں بہت ہلکی ہوتی ہے۔ فارسی والے اِس ہلکی ہ کو اپنی مختفی ہ سے بہت مشابہ پاکر، اِسے بھی فارسی مختفی) ہ کی طرح ادا کرنے لگے۔ اردو میں ایسی ہ کا تلفّظ، مقدار میں ایک حرکت سے زیادہ (یعنی الف کے برابر) ہوتا ہے، اِس لیے کہ اردو زبان میں لفظ کے آخر میں حرکت محال ہے اور ہر لفظ کا اخیر حرف ساکن ہوتا ہے، البتہ لکھنے میں، فارسی لفظوں کو، فارسی کے تتبع میں، اردو والے بھی اُسی طرح رہنے دیتے تھے۔ غلط نویسوں نے اِس بات کو سمجھا نہیں اور ہندستانی لفظوں میں بھی، جب جی چاہا، الف کی جگہ ہ لکھ دی، یہاں تک کہ بہت سے لوگ "دھبّا" کو "دھبہ" اور "کونا" کو "کونہ" اور "پتا" کو "پتہ" وغیرہ لکھنے لگے۔ اور اب یہ سراسر غلط لکھاوٹ بہت پھیل گئی ہے"۔

فارسی میں ہندی کے عام لفظ، فارسی کے انداز پر، اکثر ہاے مختفی سے لکھے جاتے تھے۔ غالباً سب سے پہلے عہدِ عالم گیر میں اِس طرف توجہ کی گئی ہے۔ شیرانی صاحب نے لکھا ہے:

"اُردو کا آخری الف لاحقہ، بہ تقلیدِ فارسی ہ کی شکل میں

لکھا جاتا تھا، مثلاً: لہسوڑہ، چونہ، سہرہ، سہجنہ، ہیرہ۔ اِسی طرح مالوہ، بنگالہ، اور بگلانہ وغیرہ۔

عالم گیر کے عہد میں فضائل خاں کے عرض کرنے پر، کہ ہندی رسم الخط میں اسم و کلمے کے آخر میں ہ نہیں آیا کرتی، بل کہ الف ہوتا ہے..... اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جائے؛ عالم گیر نے یہ تجویز پسند کی اور حکم دے دیا کہ آیندہ ایسے الفاظ الف کے ساتھ لکھے جائیں۔ یعنی مالوہ کو مالوا، بنگالہ کو بنگالا، وَقِس علیٰ ھٰذا۔

اِس فرمان کی تعمیل نہ صرف شاہی دفاتر اور ٹکسالوں میں ہوئی بل کہ اردو خواں لوگوں نے بھی یہی املا اختیار کر لیا، اور آیندہ لہسوڑا، چونا، سہرا، سہجنا اور ہیرا لکھا جانے لگا"

[پنجاب میں اردو، مقدمہ، ص ح ط۔ اشاعتِ اوّل]

مآثرالامرا سے اصل عبارت بھی نقل کی جاتی ہے، فضائل خاں میر ہادی کے متعلق لکھا ہے:

"برسایِ طبع و شکرفِ معلومات ذو فنونِ روزگار و یکتای زمانہ بود..... ہنگامے کہ دارالانشا بدو تفویض یافت، روزے بعرض رسانید کہ در زبانِ ہندی و رسم الخطِ آں آخرِ ہیچ کلمہ حرفِ ہا نیامدہ، و الف اگرچہ در آں حروف محسوب است (کہ دریں زبان قطعاً متروک اند) مگر عوضِ آں و عین و ہمزہ، کہ حرفے داوند در اولِ کلمہ می آرند و وسط و آخر۔ امّا

ازآں جملہ دوازدہ اعراب (کہ وضع کردہ اند) مدارِ ترکیبِ حروف برآں گذاشتہ، یکے را بہ اسمِ کانا نامند و آخرِ لفظ آرند، آں بہ صورت و مخرجِ الف است۔ ابتدای اسلام اربابِ ترجمہ و فارسی نویساں از روی سہو الفِ کذایی را ہا کردہ، مثلِ بنگالا و مالوا را، بنگالہ می نویسند۔ بادشاہِ ہمہ داں (کہ بہ ہندی آشنا بود) پسندیدہ، بہ اہلِ دفاتر حکم شد کہ امثالِ ایں الفاظ را بہ الف می نوشتہ باشند"۔

[مآثر الامراء، طبعِ کلکتہ، جلدِ سوم، ص ۴۰]

اردو کے لغت نویسوں نے اِس قاعدے کی صراحت تو نہیں کی ہے، مگر ہندی و انگریزی کے اکثر لفظوں کو لغات میں الف ہی سے لکھا ہے، اِس سے اُن کی رائے کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

جلالؔ نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث مفید الشعرا میں حرفِ آخر کی رعایت سے الفاظ کی فصلیں قائم کی ہیں، اور ہندی کے لفظوں کو عموماً الف کی فصل میں لکھا ہے۔ امیرؔ مینائی کے لغت امیر اللغات میں بھی ہندی الفاظ ہر جگہ الف کے ساتھ ملتے ہیں۔

یہاں اِس کی صراحت کی ضرورت ہے کہ یہ طرزِ عمل "اکثر" الفاظ پر حاوی ہے، البتہ بعض مقامات پر اِس کے خلاف بھی ہوا ہے، جیسے آصفیہ میں "دوپٹہ" ہے جب کہ نور میں صحیح طور پر "دوپٹا" ہے۔ یا نور میں "چوراہا" تو الف سے ہے اور "چوحدہ" کو ہ سے لکھا گیا ہے، حالاں کہ "چوراہا" کے قیاس پر "چوحدا" ہونا چاہیے تھا۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق (مرحوم) نے قواعدِ اردو میں اِس قاعدے

کو مجمل طور پر مگر صراحتاً لکھا ہے :

" جن الفاظ کے آخر میں ایسی ہ ہوتی ہے جو الف کی آواز دیتی ہے ، وہ فارسی یا عربی ہوتے ہیں ، جیسے : بندہ ، دیوانہ ، پنجہ ، دانہ ، درجہ ، جلسہ وغیرہ ۔ ہندی لفظوں کو الف ہی سے لکھنا چاہیے ، لیکن رسمِ خط کی وجہ سے بعض نام ہ ہی سے لکھے جانے لگے ہیں ، جیسے آگرہ ، کلکتہ وغیرہ "

(قواعدِ اردو ، طبعِ چہارم ، ص ۴۵)

مولانا احسن مارہروی نے لکھا ہے :

" ہندی الاصل الفاظ کے آخر میں ہائے مختفی نہ ہو ، بل کہ الف ہو ، جیسے : پتا ، بھروسا ، سامنا ، دھوکا ، کلیجا ، مہینا ، ٹھیکا وغیرہ "۔ (علمی نقوش ، ص ۱۴۲)

(۱)

چوں کہ ایسے الفاظ میں غلط نگاری بہت راہ پا گئی ہے ، اِس لیے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لفظوں کی مفصّل فہرست مرتّب کی جائے جن کے آخر میں الف آنا چاہیے ۔ اِن میں سے اکثر لفظ غلط نویسی کا نشانہ بنتے ہیں ۔ یہ فہرست مکمّل نہیں ، مگر اِس کی کوشش کی گئی ہے کہ جن لفظوں میں غلط نویسی کا کرشمہ زیادہ شامل رہتا ہے ، اُن کو ضرور شامل کرلیا جائے ۔

آرا ، آریا ، آلا (زخم کے لیے) آلھا ، آنولا ، آدا (کھار کا) اُپلا ، اُتارا ، اُتاولا ، اٹالا ، اٹھا ، اٹھوانسا ، اُجالا ، اُچکا ، اُجھا ،

اَدلا (بے ریشہ گوشت) ، اَدھنّا ، ادھیلا ، اڈّا ، اِکّا (زیور ، تاش کا پتّا ، ایک سواری) اکلوتا ، اکھاڑا ، اَنْترا ، اَندرسا ، انڈا ، انگارا ، انگوچھا ، انگوٹھا ، انگرکھا ، انگیا ، اَنّا ، آنا (رقم ، جیسے ایک آنا) اپلا ، اُولا ، اُوکھلا (جگہ کا نام) ، ایکا ۔

باٹا (جوتوں کی کمپنی) ، باجا ، باجرا ، بادلا (ایک قسم کا زری کا قیمتی کپڑا ۔ سونے چاندی کے تار) ، باڑا (جیسے امام باڑا ، قصائی باڑا ، باڑا ہندو راؤ) بالا (کان میں پہننے کا) بال خورا ، بالشتیا ، بالکا ، بانا ، بانسا ، بانکا ، باؤلا ، باوٹا ، ببیتا ، بُتّا ، بتاسا یا بتاشا ، بتسما ، بتھوا ، بَٹّا ، بٹوا ، بٹوارا ، بجرا ، بچا (کلمۂ حقارت) بچارا ، بچپنا ، بچکانا ، بِچھوا (پیر کا زیور) ، بچھونا ، بچھیا ، بدلا ، بدھاوا ، بدھنا ، برامدا ، برتا ، بَرچھا ، برگا ، بَرما ، برو ٹھا ، برہا ، بریٹھا ، بڑا ، بُڑھاپا ، بَزریا (بازار کی تصغیر) بسترا ، بِسوا ، بسولا ، بسیرا ، بَغیا ، بغچیا ، بفا ، بُکٹا ، بکسا ، بکسوا ، بکلا ، بکوٹا ، بگلا ، بگولا ، بَلّا ، بِلّا ، بلا بوغما ، بُلاوا ، بُلبُلا ، بَلوا ، بلوٹا ، بِلوریا ، بما ، بنجارا ، بُندا ، بنگلا ، بنگلیا ، بنولا ، بَنیا ، بوُتا ، بوٹا ، بوچا ، بودا ، بوجھا ، بلورا ، بوُرا ، بَونا ، بھالا ، بھانجا ، بھبوکا ، بھپارا ، بھپکا ، بھتّا ، بُھتنا ، بھتیجا ، بھٹا ، بُھٹا ، بھٹیارا ، بُھجیا ، بِھشتا ، بُھرتا ، بِھنا ، بھروسا ، بھوسا ، بھیجا ، بھجنگا ، بُھنگا ، بھنڈارا ، بھگتیا ، بھگونا (ایک برتن) ، بھینسا بیگھا ، بیالا ، بیلا ، بیڑا ، بیرڑا ، بیٹھکا ۔

پاکھا، پارا (سیماب)، پالنا، (بچے کا جھولا) پانسا، پپوٹا، پپیتا، پپیہا، پتا، پتا، پتا، پتا، پتلا، پتنگا، پتیلا، پٹا، پٹا، پٹاخا، پٹارا، پٹرا، پٹکا، پٹوا، پٹھا، پٹھا، پٹھیا، پٹلا، پٹیلا، پچارا، پرا (جیسے حسینوں کا پرا)، پراٹھا، پرتا، پرسا، (پرسا دینا)، پرتلا، پرجا، پرکھا، پرنالا، پروتا، پریکھا، پریوا، پڑاقا، پڑیا، پڑیا، پسندا، پسنگا، پسینا، پکوڑا، پکھا، پگھا، پگلا، پگیا، پلا، پلا، پلڑا، پلنڈا، پلیا، پنا، پنڈا، پنڈا، پنڈارا، پنکھا، پنکھیا، پنگوڑا، پوا، پوپلا، پوتا، پوترا، پوٹا، پوجا، پودا، پولا، پونڈا، پونگا، پہاڑا، پھاوڑا، پھاہا، پھٹا، پھرا، پھرا، پھرہرا، پھرڑیا، پھسکڑا، پھلکا، پھلیندا، پھندنا، پھندا، پھنکا، پھوا، پھوڑا، پہیا، پھیپھڑا، پھینٹا، پیپا، پیتابا، پیترا، پیٹا، پیٹھا، پیڑا، پیسا[1]، پیندا، پیچاما۔

تارا، تاشا، تاگا، تالا، تال مکھانا، تانا (تانا بانا)، تانبا، تانتا، تانتیا، تانگا، تپسیا، تتلا، تتمبا، تدیا، ترارا، تڑاخا، تڑاقا، تڑکا، تسلا، تکا، تکلا، تکیا (جیسے شاہ صاحب کا تکیا)، تلا، تلنگا، تلوا، تلیا، تمنچا، تنکا، توا، توبڑا، توتا، تؤتیا، توڑا، تولیا، تونبا، تھاپا (جیسے رنجیت سنگھ

---

[1] "اپنی گانٹھ نہ ہو پیسا، تو پرایا آسرا کیسا" (امیر اللغات)

تھاپا) تھالا ، تھانا (روپیس کا)، تھوا ، تیا پانچا ، تیجا ، تیلیا ، تینڈوا ، تیہا ۔

ٹاپا ، ٹانڈا ، ٹانکا ، ٹپا ، ٹپکا ، ٹپونچیا ، ٹخنا (پیر کا) ، ٹچا ، ٹڈا ، ٹرّا ، ٹرّا ، ٹکا ، ٹکیا ، ٹلوا ، ٹما ، ٹنٹا ، ٹنڈا ، ٹوپا ، ٹوٹا ، ٹوٹکا ، ٹوکرا ، ٹونا (جادو ٹونا) ، ٹولا (جیسے اہیر ٹولا ، گوجر ٹولا) ، ٹونٹا (بانس کا ٹکڑا یا ڈنڈا) ، ٹھپا ، ٹھڈا ، ٹھرّا ، ٹھستا ، ٹھسکا ، ٹھکانا ، ٹھلوا ، ٹہنا ، ٹھباکا ، ٹھنگنا ، ٹھوکا ، ٹھیا ، ٹھیکا ، ٹھیکرا ، ٹھیلا ، ٹھینگا ، ٹپکا ، ٹیکرا ، ٹیلا ، ٹینٹوا ۔

جالا ، جانگیا ، جبڑا ، جتھا ، جٹا ، جڑوا ، جگرا (ہمت ، حوصلہ) جُلاہا ، جَلاپا ، جلیبا ، جمال گوٹا ، جمگھٹا ، جموگا ، جنگلا ، جوا ، جُوا ، جوتا ، جوڑا ، جوڑا ، جوگا ، جھابا ، جھالا ، جھانسا ، جھبا ، جھٹکا ، جھرنا ، جھروکا ، جھکولا ، جھگڑا ، جھماکا ، جھمکا ، جھنّا ، جھن جھنا ، جھنڈا ، جھنڈولا ، جھمیلا ، جھوّا ، جھونکا ، جھولا ، جھولا ، جھونپڑا ، جھونٹا ، جھپنگا ۔

چادرا ، چارا (جانوروں کی خوراک) ، چالا ، چانٹا ، چاندا ، چاولا (جیسے امرناتھ چاولا) ، چبلا ، چبوترا ، چپا (چار انگل زمین ، ذراسی جگہ) ، چپٹا ، چپوٹا ، چتا ، چٹاخا ، چٹخارا ، چٹکا ،

چُٹکلا ، چِٹھا ، چُٹیا ، چِتا ، چِچیرا ، چچیَنڈا ، چَڈا ، چَڈھا ، چرائنا ، چرچا ، چرسا ، چَرکا ، چرواہا ، چَسکا ، چُسنا ، چَکّا ، چکارا ، چکتّا ، چَکلا (چوڑا چکلا ، طوائفوں کا چکلا ۔ علاقہ) ، چِکما ، چِکوا ، چُکوتا ، چکوترا ، چلاّ (انڈے وغیرہ کا) ، چمپا ، چِمٹا ، چمڑا ، چموٹا ، چَنا ، چَندا ، چُندھا ، چَندیا ، چوچلا ، چَوکا ، چُولا ، چوُلھا ، چوُنا ، چونڈا ، چَونسا (آم کی قسم) ، چونگا ، چوہا ، چَوہرا ، چھاتا ، چھاپا ، چھالا ، چھالیا ، چھپاکا ، چَھتّا ، چَھجاّ ، چُھچھا ، چَھترا ، چُھرا ، چَہکا ، چھکاّ ، چھکڑا ، چہلا ، چَھلاّ ، چھلاوا ، چَھنّا ، چھینٹا ، چُھوارا ، چھوکرا ، چَھیلا ، چھینکا ، چیتا ، چیرا ، چَیلا ، چِیلا ، چیونٹا ۔

خاکا ، خرّاٹا ، خرچا ، خوجا ، خون خرابا ، خَیلا ، خُستا ۔

داتا ، دادرا ، دُبدھا ، دَتّا ، (جیسے ہر نراین دتا) دردرا ، دریبا ، دسہرا ، دوپٹاّ ، دوڑا ، دغدغا ، (روشن ، چمکتا ہوا) ، دُکھڑا ، دگلا ، دیگچیا ، دُلارا ، دِلاسا ، دلیا ، دُنکا (دانہ دلکا) ، دنگا ، دوالا ، دُوسا (ایک قسم کا مدراسی پراٹھا) ، دوغلا ، دولھا ، دَونا ، دوُنا ، دونگڑا ، دھارا ، دھاڑا ، دھاگا ، دھاوا ، دَھبّا ، دھبلا ، دھتا ، دھتورا ، دھچکا ، دُھرا ، دَہریا ، دھڑکا ، دَھڑا ، دھڑاکا ، دُھستا ، دھکاّ ، دھکڑا ، دَہلا ، دھماکا ، دھموکا ، دھندا ، دھندلکا ، دَھنیا ، دُھنیا ، دھوکا ، دَھونسا ، دھیلا ، دیا ،

دیوتا ۔

ڈاکا ، ڈاکیا ، ڈکوٹا ، ڈالا ، ڈانڈا ، ڈبا ، ڈبیا ، ڈراما ، ڈربا ، ڈلا ، ڈلیا ، ڈنکا ، ڈوریا ، ڈولا ، ڈونگا ، ڈھابا ، ڈھاٹا ، ڈھانچا ، ڈھکوسلا ، ڈھکنا ، ڈھلکا ، ڈھنڈورا ، ڈھیلا ، ڈھٹا ، ڈنڈا ، ڈیرا ۔

راجا ، رائتا ، رجواڑا ، ردا ، رتا ، رسمسا ، رسیا ، رسیلا ، رکشا ، رگیلا ، رمنا ، رنڈاپا ، رنڈسالا ، روڑا ، رونا ، رونگٹا ، ریلا ، روپا ، روپیا ۔

زنانا ، زنخا ، زردا (میٹھے چاول یا کھانے کا تمباکو) ، زہرا ۔

ساجھا ، سالا ، ساکھا ، سانڈا ، سانولا ، سایا (ایک پوشاک) سپنا ، سپاٹا ، ستا ، ستھورا ، سروتا ، سرخا ، سرکنڈا ، سفیدا ، سلفا ، سلما ، سلونا ، سکسینا (جیسے جگدیش سہاے سکسینا) ، سمدھیانا ، سمجھوتا ، سموسا ، سنپولا ، سنپولیا ، سنپیرا ، سنترا ، سندیسا ، سنکھیا ، سنگھاڑا ، سوتا ، سوٹا ، سہرا ، سیکڑا ۔

شالا (جیسے پاٹھ شالا ، دھرم شالا ، مدھ شالا) ، شستابا ،

شدّا (علم)، شترّاٹا، شلوکا، شلیتا، شکارا، شکرپارا، شوالا،
شہدا۔

صافا (سر پر باندھنے کا)۔ غبارا، غچّا، غلّا، غنڈا، غچّا کا۔

فرما، فرّاٹا، فتلا۔

کاکا، کاما، کانسا، کپّا، کتارا، کتھا، کٹارا، کٹورا، کٹڑا (جیسے
نیل کا کٹڑا یا کٹڑا مول چند)، کٹہرا، کٹھلا، کٹپلا، کجرا، کچرا،
کچلا، کچوکا، کچھوا، کچھواہا (جیسے رام سنگھ کچھواہا) کرارا، کرچھا،
کرکرا، کرکرا، کرگھا، کرم کلّا، کریا، کریلا، کرونڈا، کڑا، کڑاکا،
کڑکا، کسالا، کلّا (کوپل)، کلسا، ککرونڈا، کلھیا، کلیجا، کمبوڈیا،
(ملک کا نام)، کمیلا، کنّا، کنٹھا، کنجا، کنجڑا، کندا، کندھا،
کنڈا، کنڈرا، کنکوّا، کنگلا، کنگنا، کنگھا، کمرا، کنھیّا، کوٹھا،
کورا، کوڑا، کوڑیالا، کولا یا کوئلا، کوٗلا، کوکا کولا، کونڈا، کوندا،
کونا، کھاتا، کھاجا، کھانچا، کھتّا، کھارا، کھتّا (بڑی کھاٹ)،
کھٹارا، کھٹاکا، کھٹکا، کھٹولا، کھٹیا، کھجلا، کھرا، کھرنجا،
کھرونچا، کہروا، کھریرا، کھسرا (چھوٹی چیچک)، کھلونا، کھمبا،
کھنّا (جیسے رام چند کھنّا)، کھنڈانا، کھونٹا، کھونچا، کھویا،
کھیرا، کھیڑا (جیسے باون کھیڑا)، کیتھا، کیچوا، کیکڑا، کیلا،
کیما، کیموڑا

گارا ، گالا ، گانجا ، گپھا ، گتا ، گتکا ، گٹا ، گٹا ، گٹکا ، گٹھا ، گٹھریا ، گٹھیا ، گجرا ، گجریا ، گجھیا ، گچھا ، گدا ، گدا ، گداکا ، گدکا ، گدلا ، گدیلا ، گڈا ، گرجا ، گردنا ، گرگا ، گرگیا ، گریا ، گڑمبا ، گڑیا ، گڑھیا ، گزارا ، گلگلا ، گلہرا ، گمڑا ، گملا ، گنا ، گنٹھیلا ، گنٹھا ، گنجا ، گندا ، گنڈا ، گنیا ، گھپلا ، گھتیلا ، گھٹنا ، گھروندا ، گھستا ، گھسیارا ، گہنا ، گھٹنا ، گھوڑا ، گھونسا ، گھونسلا ، گوٹا ، گوڈا ، گورکھا ، گولا ، گول گپا ، گولچا ، گوندا ، گونگا ، گیندا ، گینڈا ، گیگلا ۔

لاسا ، لاکھا ، لالا (جیسے لالا رام لال) ، لاڈلا ، لاما ، لپکا ، لترا ، لٹرا ، لٹکا ، لٹھا ، لٹیا ، لٹورا ، لچا ، لچکا ، لچھا ، لداوا ، لڑاکا ، لس تگا ، لسلسا ، لسوڑا ، لفنگا ، لقندرا ، لکھوٹا ، لکھٹا ، لگا ، لمبوترا ، لنجا ، لنڈورا ، لنکا ، لنگوٹا ، لوکا ، لولا ، لوبیا ، لوٹا ، لنہگا ۔

مارکا (جیسے شیر مارکا) ، مالا ، مانجھا ، مانکا یا مَیکا ، مٹکا ، مٹھوسا ، منجھولا ، مچیرا ، مرمرا ، مرغا ، مرہٹا ، مسالا ، مسٹنڈا ، مکھڑا ، ملیدا ، ملپنا (ایک کپڑا) ملغوبا ، ملگجا ، ملبا ، ممولا ، ممیرا ، منجھلا ، منکا ، مورچا (لڑائی کا) ، مونگا ، موپلا ، موگرا ، موکھلا ، مہتا (جیسے اشوک مہتا) مہتیا ، مہوبا ، مہینا ، میاتا ، میلا ، میلا ، مینا ۔

ناتا (رشتہ ناتا)، ناڑا، ناکا (سوئی کا ناکا، معروف جانور)،
ناگا، نالا (ندی نالا)، نائکا، نخرا، نرخرا، نشیلا، نصیبا،
نقشا، نفرا، نکتوڑا، نکٹا، نکما، نکوا، نُکیلا، نِگوڑا، نمدا،
نوچندا، نیوتا، نہٹا، نہتا، نہلا، نیولا۔

وکٹوریا (معروف نام۔ ایک قسم کی سواری)۔ ہپا، ہتا، ہتوڑا،
ہٹیلا، ہریالا، ہرجا (ہرجا خرچا)، ہرنوٹا، ہُڑکا، ہجڑا، ہُچکا،
ہچکولا، ہلا، ہلکورا، ہُمکارا، ہنڈا، ہِنڈولا، ہنسیا، ہُولا،
ہوکا، ہمالا، ہیا۔

۲

جن فارسی عربی لفظوں نے اردو میں کوئی نیا روپ دھار لیا ہے؛
ایسے سب لفظوں کو الف ہی سے لکھا جائے گا، جیسے:
نقشا، نصیبا، خاکا، خرچا، ہرجا، بعضا، بدلا، نشیلا، نفرا،
بال خورا، بغیا، اکا، بزریا، بسترا، پسندا، پُرسا، جگرا،
چادرا، خوجا، زنخا، زردا، زنانا، رِشتابا، غُبارا، شُہدا،
وغیرہ، کہ یہ سب اردو کی ایجادات میں سے ہیں۔

۳

بہت سے مرکبات اِس طرح بنے ہیں کہ اُن کا ایک جُز فارسی یا عربی
ہے، مگر اُس کی صورت ذرا بدل سی گئی ہے، جیسے: اُٹھائی گیرا،
تراہا، نونگا وغیرہ؛ اِن سب کو بھی الف سے لکھا جائے گا۔
ایسے مرکب بھی ہیں جن کے دونوں جُز فارسی یا عربی کے ہیں، مگر اردو

کے سانچے میں ڈھل کے نکلے ہیں، جیسے : صبح خیزیا، ہرجا خرچا، خون خرابا وغیرہ ؛ یہ بھی الف کے ساتھ لکھے جائیں گے ۔
ایسے لفظ تو الف سے لکھے ہی جائیں گے جن کے دونوں جُز نہ عربی کے ہیں نہ فارسی کے، جیسے : ست نجا، چومکھا وغیرہ ۔
ایسے مختلف قسم کے مرکّب لفظوں کی مختصر سی فہرست یہ ہے، اِنھی پر ایسے اور لفظوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے :

آبخورا[1]، اُٹھائی گیرا، ادلا بدلا، امام باڑا، اتا پتا، اکہرا، اک تارا، اک درا، اک منزلا، اِکّا دُکّا، اک پیچا، اٹھوانسا، بھڑکیلا، بے سُرا، بُزدلا، بھائی چارا، بے تُکا، بے ڈھنگا، بدقوما، بے پیرا، بے اُستادا، بے اصولا، بے سَرا (سردار کے بغیر) بے صبرا، بے فکرا، بے گھرا، بے مرشدا، بے وارثا، بے سُرا، بارہ ماسا، بھڑ بھونجا، بھڑ بھڑیا، بڑ پُھٹّا، بھیڑ بھڑکّا، بڑ دتّا، بے غرضا، بارہ سنگھا ۔

پاٹھ شالا، پچ گُنا، پچ رنگا، پچ گوشیا، پچ محلا، پن شاخا، پھول کٹارا، پن پُھٹّا، پن سیرا، تہرا، ترپولیا، تُھڑ دلا، تماہا، ترِاہا، تِسالا، تِسرکا، تِکونا، تِکُنیا، تِگُنّا، تِمنزلا، تِکڑا، تِگنا، تِلڑا، ترپھلا، تھکا ماندا ۔

ٹکڑ گدا، جوشیلا، جیب کترا، چھماہا، چوگوشیا، چوراہا، چوطرفا، چت کبرا، چھل بٹّا، چومکھا، چوکڑا، چوکھٹا، چوہٹّا، چوہرا، چوبارا،

---

[1] "بعد خے کے واو مجہول، بعد رے کے الف" (جلال، سرمایۂ زبانِ اردو، تحت آبخورہ)

چوماسا، چوپلا، چورستا، چولڑا، چومحلا، چومنزلا، چوکھنٹا، چوبغلا،
چوپہلا، چوپہیا، چوتالا، چوگھڑا، چوحدّا، چوپارا، چھ فٹا۔
دوپلکا، دوخما، دوپٹّا، دورُخا، دونسلا، دوغلا، دومُنہا، دومنزلا،
دومحلا، دودھارا، دُم کٹا، دولڑا، دورنگا، دوفٹا، دوپہریا،
دورگا، دوسیرا، دوفصلا۔
ست رنگا، ست نجا، ست پلا، شکرپارا، شیخی خورا، شکرخورا،
صبح خیزیا، غُل غپاڑا۔
کن میلیا، کن سُرا، کم ہمّتا، کم دلا، کبابیا، کل سِرا، کل مُنّہا،
کل جِبھا، کڑواکسیلا، کُلاّ شجرا، کپڑا لتّا، کٹ بدّیا، کُٹناپا۔
گول گپّا، گل مچھا، گھس کھدا۔ لمبوترا، لم ٹنگا، لم ڈورا۔
مرگ چھالا، مدھ شالا، مربھکّا، میل خورا۔ ناشکرا، ندیدا،
نگنا، نمہا، نَودولتا، نوسکھیا، نوگزا، نونگا، نولکھا، نمک پارا،
وارا نیارا، ہالاڈولا، ہرجا خرچا۔

اِس طرح کے مرکّبات کے سلسلے میں ایک خاص بات ضرور پیشِ نظر
رہنا چاہیے:
موٴلفینِ آصفیہ و نور کا عام انداز (مستثنیات سے قطعِ نظر) یہ ہے کہ وہ
ایسے مرکّبات کو، جن کے دونوں جُز فارسی یا عربی ہیں، اور وہ فارسی
میں اِسی طرح مستعمل ہیں؛ اُسی طرح لکھتے ہیں جس طرح وہ فارسی
میں استعمال کیے جاتے ہیں اور اُس کے واسطے سے اُردو میں رائج ہیں،
جیسے: دوغزلہ، دوگونہ؛ یہی صحیح طریقہ ہے۔

ایسے مرکّبات جن کا صرف ایک جز فارسی یا عربی ہے ، مگر وہ اُس طرح اصل زبانوں میں نہیں آتا ؛ ایسے مرکّبات کو وہ گویا اُردو قرار دے کر ، اردو کے قاعدے کے مطابق ، الف سے لکھتے ہیں ۔ مثلاً آصفیہ و نور میں "دو سالہ" کو تو ہ سے لکھا گیا ہے ، اور " تِسالا "کو الف سے لکھا گیا ہے ۔ " دو سالہ " فارسی اور اردو دونوں میں اِسی طرح مستعمل ہے ، اِس لیے وہ اُسی طرح رہا اور " تِسالا " میں بھی اگرچہ آخری جُز وہی ہے جو " دوسالہ " میں ہے ، مگر چوں کہ " تِسالا " فارسی سے تعلق نہیں رکھتا ، اِس لیے اِس کو اردو قرار دے کر ، الف سے لکھا گیا ہے ۔

" دو ماہہ " نور میں ہ سے لکھا ہوا ہے اور ٹھیک ہے ۔ " تماہا " اُس میں موجود نہیں ، مگر مذکورۂ بالا طریقِ کار کی بِنا پر اُس کو الف سے لکھا جائے گا ، کیوں کہ اردو نژاد ہے ۔ اِسی قیاس پر چوراہا ، چوطرفا ، چوحدّا ، چومنزلا ، پیچ محلا ، دو محلا ، دو رخا ، دو منزلا ؛ سب کے آخر میں الف آئے گا ، کیوں کہ یہ سب اردو میں بنے ہیں ۔ "پنج گوشہ" اور "چہار گوشہ" کو فارسی کے مطابق ہ سے لکھا جائے گا اور "چوگوشیا" کو الف سے لکھا جائے گا ۔ " دودلہ " فارسی مرکّب ہے ، اِس کے آخر میں ہ ہے ، مگر " بُزدلا " کو الف سے لکھا جائے گا ۔ اِسی طرح " بدقوما " ، "شکرخورا" وغیرہ کے آخر میں الف آئے گا ۔ ڈاکٹر صدّیقی مرحوم کے الفاظ میں :

> " اِسی سے ایک کُلیّہ ہاتھ آیا کہ جب کسی اندزبان کا لفظ ، اردو میں دوسرے معنی اور اِس کے ساتھ دوسرا تلفّظ اختیار کرلے

تو اُس کا املا ٹھیٹ اُردو لفظوں کی طرح ہونا چاہیے "۔

اِس کے مطابق اب اصول یہ قرار پایا کہ جن مرکّبات کا صرف ایک جُز فارسی یا عربی کا ہے، اُن کو اردو مرکّب مان کر، الف سے لکھا جائے گا۔

اِسی طرح یہ قاعدہ بھی بنا کہ جن مرکّبات کے دونوں جُز فارسی عربی کے ہوں، مگر کسی ایک جُز، یا دونوں اجزا میں کوئی ایسی تبدیلی ہوگئی ہو جو اردو سے مخصوص ہو؛ تو اُس کو بھی اردو مرکّب مان کر، الف کے ساتھ لکھا جائے گا۔ جیسے: صبح خیزیا، دومنزلا، نودولتا، پچ رنگا، بُزدلا، ناشکرا، دورُخا وغیرہ۔

اصول اور قاعدہ تو یہ تھا، مگر اِس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک بات کہنا چاہتا ہوں:

ایسے مرکّبات جن کی ایک صورت فارسی میں ہے اور دوسری صورت اردو میں ہے؛ یہ عین ممکن ہے کہ اُن فارسی مرکّبات کو بھی، اردو مرکّبات کے قیاس پر، الف کے ساتھ لکھا جائے، جیسے: "تِسالا" اور "چورستا" کے قیاس پر "دو سالا" اور "دو رستا"، قلم سے نکل جائے۔ یا "بزدلا" کے قیاس پر "دو دلا"، لکھ دیا جائے ـــــ ایسی صورتوں میں اِن مرکّبات کی اِس لکھاوٹ کو کُلّیتاً غلط نہیں کہہ دینا چاہیے۔ ایسے مرکّبات، جن میں اِس طرح کا اشتباہ ہوسکتا ہے، اُن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ اگر یہ چند مرکّبات اردو کے چلن کے دائرے میں آجائیں تو یہ کچھ بے جا نہ ہوگا۔ "دوشالا" اور "دوشاخا" جیسے مرکّبات سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے موقعے پر ہمیں سیّد انشا کا یہ

قول یاد رکھنا چاہیے :

"پیالا ، ستارا : یہ پیالہ اور ستارہ تھے ۔ تمام فارسی لفظوں
کے آخر کی ہ ، اردو میں الف سے بدل جاتی ہے "۔

(ترجمۂ دریائے لطافت ، ص ۲۵۶)

اِس قول پر پوری طرح تو عمل نہیں کیا جا سکتا ، لیکن کچھ لفظ اگر خود بہ خود اِس دائرے میں آ جائیں اور قیاس کا جواز بھی شاملِ حال ہو ، تو اُن کو خوشی کے ساتھ قبول کر لینا چاہیے ۔ یہ عرض کردوں کہ میری رائے میں ایسا ہوگا ضرور ، خواہ اِس کا دائرہ محدود رہے ـــــ ڈاکٹر صدّیقی مرحوم کا یہ قول ہماری خاص توجہ کا مستحق ہے :

" اردو کا خاص حرف الف ہے ، اور ہر موقع پر ہمیں اپنے کام میں لانا چاہیے ، سوائے چند فارسی اور عربی لفظوں کے ، جن کا املا ہ سے ہے (اور اُس ہ کی آواز الف کی سی ہے) اب جن عربی اور فارسی لفظوں کے آخر میں ہ ہے ، اُن کے آخر میں بھی ہم بعض حالتوں میں ہ کی جگہ الف لکھتے ہیں ۔ اُن میں سے ایک حالت اوپر بیان ہو چکی ، دو تین حالتیں اور بھی ہیں :

(۱) جب قافیے میں مختفی ہ ، الف کے مقابل ہو تو اُس مختفی ہ کو الف سے بدل دینا چاہیے ، جیسے :

تغافل ہائے بے جا کا گِلا کیا

(۲) ایسے لفظوں میں جو اردو میں گھل مل گئے ہیں اور اُن کی غیریت محسوس نہیں ہوتی ، ہ کی جگہ الف لکھنا جائز ہے ،

جیسے : مزہ کی جگہ مزا۔
(۳) ایسے الفاظ جن میں اردو والوں نے کوئی تصرف کر لیا ہو،
جیسے : دوماہا "۔

(ہندستانی، جنوری ۱۹۳۱ء)

ایک اور جگہ یہی بات لکھی ہے :
"جن لفظوں کی اصل فارسی یا عربی نہیں، اُن میں مختفی ہ نہیں آسکتی، الف ہونا چاہیے۔ بل کہ فارسی کے لفظ بھی جب اردو کے محاورے میں آئیں تو الف سے لکھنا چاہیے"۔
(تبصرۂ مکاتیبِ غالب، ہندستانی، جولائی ۱۹۳۸ء)

اِس طرح کے تصرف کی بہت سی مثالیں ہیں۔ ایک دل چسپ مثال "تولا ماشا" ہے۔ آصفیہ، نور، سرمایہ میں اِس کو اردو مرکب بتایا گیا ہے اور دونوں لفظوں کو الف سے لکھا گیا ہے، اِس کے معنی ہیں : تلوّنِ مزاج، مریض کا مزاج جو دم بھر میں کچھ ہو جائے دم بھر میں کچھ۔
"لتّہ" فارسی میں مستعمل ہے، مگر "کپڑا لتّا" میں اِس کو الف سے لکھا جاتا ہے۔ نور میں بھی اِس کو الف سے لکھا گیا ہے۔ یہی صورت شکر پارا، نمک پارا، تھکا ماندا جیسے مرکبات کی ہے۔ جلال نے سرمایہ میں آب خورا کے ذیل میں خاص طور سے یہ صراحت کی ہے : "بعد خے کے واوِ مجہول، بعد رے کے الف"۔ جلال نے "دانا پانی" لکھا ہے (سرمایہ)۔ "لقلقا" جن معنوں میں اردو میں مستعمل ہے، اُن کے لحاظ سے اگر اِس کو "لقلقہ" کے بجائے "لقلقا" لکھا جائے تو کچھ بے جا

نہ ہوگا۔ ماندہ فارسی کا لفظ ہے، "باقی ماندہ" میں یہی ہے، مگر "تھکا ماندا" میں یہ اردو نژاد ہے۔ نور میں پہلے اختلافِ معنی کے لحاظ سے "ماندا" لکھا گیا ہے اور پھر "ماندہ"۔ "تھکا ماندا" کو الف سے لکھا گیا ہے۔

آصفیہ میں تکّا کو الف سے لکھا گیا ہے اور اُس کے آگے قوسین میں لکھا ہے: (ف، تکّہ)۔ اِس کے بعد "تکّا بوٹی" لکھا ہے۔ اِس کا مطلب یہی ہُوا نا کہ مولّف کی رائے میں فارسی میں "تکّہ" ہے اور اردو میں "تکّا"! اور اِسی لحاظ سے "تکّا بوٹی" کو اردو مرکب مانا ہے۔

"جمع" عربی کا لفظ ہے، فارسی اردو میں اِسی طرح مستعمل ہے، مگر "جما جتھا" کو نور میں الف سے لکھا گیا ہے اور یہ اِسی لحاظ سے ہے کہ ترکیبی صورت میں یہ اردو ہے۔

اِس قبیل کے تصرّفات اور تغیّرات ہوتے ہی رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ بس ضرورت اِس کی ہے کہ انتشار نہ پھیلے اور چیزیں ترتیب اور تعیّن کی شیرازہ بندی میں سماتی رہیں۔

۴

کچھ شہروں کے نام ہ سے لکھے جاتے ہیں، جیسے: پٹنہ، کلکتہ، امروہہ، آگرہ۔ اِن کے متعلق ڈاکٹر صدّیقی کی رائے اوپر نقل کی جا چکی ہے کہ اِن خاص ناموں کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے "کس واسطے کہ یہ نام ہیں اور ہمیشہ اِسی طرح لکھے جاتے ہیں"۔ نفس میں "آگرا" لکھا ہوا ہے۔ مناسب یہی ہے کہ فی الحال اِن ناموں کی متعارف صورت

کو برقرار رہنے دیا جائے ، اِس ترمیم کے ساتھ کہ متعارف اور خاص خاص ناموں کو چھوڑ کر ، بہت سے چھوٹے چھوٹے غیر معروف یا کم معروف جو نام ہیں، یا مستقبل میں جن کا اضافہ ہو گا ، اُن سب کو الف ہی سے لکھا جائے ، جیسے : پلکھوا ، بنتھرا ، نگریا ، دھمورا ، بھٹورا ، سردھنا وغیرہ ۔

۵

استثنا کی ایک اور صورت بھی ہے ۔ یہ صورت اگرچہ بہت کم لفظوں میں پائی جاتی ہے ، مگر بہ ہر حال پائی جاتی ہے ؛ اِس لیے اِس کو بھی شامل کرنا ضروری ہے ۔

ہندی کے واسطے سے چند لفظ ایسے بھی آئے ہیں ، جن میں آخری آواز میں واضح طور پر قصر پایا جاتا ہے اور ایسی صورت ہے کہ اِن لفظوں کو اگر الف سے لکھا جائے ، تو یہ محسوس ہو گا کہ تلفظ کا حق ادا نہیں ہوا ۔ جیسے مشہور بنگالی فلم ڈائرکٹر " ستیہ جیت رے " کا نام ، کہ اگر اِس کو " ستیا جیت " لکھا جائے تو خود بہ خود محسوس ہو گا کہ تیِ کی آواز کھنچ کر بگڑ گئی ہے ۔ یہی صورت کچھ اور لفظوں کی بھی ہے ، جیسے : بھارتیہ جن سنگھ ، مدھیہ پردیش ، ستیہ کام ، بھاگیہ وتی ، راجیہ سبھا ، ستیہ نارائن ، ساہتیہ اکیڈمی ، چانکیہ پوری ، ساہتیہ پریشد ، کاریہ کارنی ، راشٹریہ بھاشا ، شاستریہ سنگیت ؛ ایسے دو چار لفظ اور بھی ہوں گے ۔

اِن سب لفظوں کی صورت ایک جیسی ہے کہ اِن میں تیِ سے پہلے حرف کی جھٹکے دار آواز ، یَ پر زبر کے دباو کو بہت کم کر دیتی ہے ۔

یہ لفظ ، اور اِس قبیل کے اور لفظ ؛ اِن سب کو ہائے مختفی کے ساتھ

لکھا جائے گا اور یہ استثنا ہوگا۔ اِس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر کہنے کی ہے کہ اِس طرح کے لفظ کم بل کہ بہت کم ہیں؛ اور اِس قاعدے کو سختی کے ساتھ اُنھی الفاظ تک محدود رکھّا جائے گا، باقی لفظوں کو عام قاعدے کے مطابق الف ہی سے لکھا جائے گا۔ جیسے ودّیا، گُپتا، گنگا وغیرہ۔ "ودّیا" کی بہ ظاہر وہی صورت ہے جو "ستیہ" کی ہے مگر ایسا ہے نہیں۔ اور اِس لفظ کو لکھا بھی الف سے جاتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ چند خاص الفاظ کے علاوہ، عام الفاظ کو عام قاعدے کے مطابق ہی لکھا جائے گا، اور اِس کی بہت احتیاط کی جائے گی۔

ایک لفظ اور ہے اور یہ ہے "پر" کا مخفف "پہ"، جیسے ع: گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔ یا جیسے ع: اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے۔ اِس کو بھی بہ دستور ہاے مختفی کے ساتھ لکھا جاتا رہے گا، اور یہ بھی استثنا ہوگا۔

ایک وضاحت:

ہندی کے بعض لفظ دفتروں کی فارسی تحریروں میں، اور اُن کے اثر سے عام تحریروں میں ہ سے لکھے جانے لگے، جیسے: بسوہ، بیگہ۔ یا بعض لفظوں کو، فارسی لفظوں کی طرح اضافت کے ساتھ بھی استعمال کیا گیا ہے، جیسے: راجۂ ہند۔ اِس کی جمع "راجگان" بھی بنائی گئی ہے۔ مولانا شبلی کا مصرع ہے: قرابت راجگانِ ہند سے اکبر نے جب چاہی۔ اِسی طرح "پیسہ" اور "روپیہ" بھی ہ سے لکھے جاتے رہے ہیں ـــ

یہ پُرانا اندازِ کتابت ہے اور پُرانی تحریروں تک محدود ہے اور محدود رہنا چاہیے ۔ اب ایسے سب لفظوں کو الف ہی سے لکھا جائے گا۔ "عیسیِ مریم" اور "لیلیِ شب" ، جیسے مرکّبات نظم میں استعمال کیے گئے ہیں ، مگر اِن کی اِس خاص صورت کی بِنا پر ، اِن کا الف سے لکھا جانا نہ ممنوع قرار پائے گا نہ ملتوی ہوگا ۔ یہی صورت "راجۂ ہند" وغیرہ کی ہے کہ قدیم اندازِ نگارش کی وجہ سے ، اب اِن کو مع الف لکھنا نہ ممنوع ہوگا نہ مشکل ۔ اِن سب لفظوں کو الف ہی کے ساتھ لکھا جائے گا ۔

۶

فارسی میں جب "کہ" کے بعد کوئی ایسا لفظ آتا ہے جس کا پہلا حرف الف ہو ، تو شعر میں کبھی کبھی آغازِ لفظ کا الف ، تلفّظ میں ساقط ہو جاتا ہے اور کتابت میں یہ ہوتا ہے کہ کبھی تو "کہ" سے ہائے مختفی اور آغازِ لفظ سے الف ، دونوں کو حذف کر دیتے ہیں ۔ جیسے : "کہ از" کو "کز" لکھنا ۔ مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ صرف ہائے مختفی کو حذف کیا جاتا ہے اور الف کو باقی رکھا جاتا ہے اور کاف و الف کو ملا کر لکھا جاتا ہے ۔ جیسے یہ مصرع : آن سبہا کانبیارا رہبر است ۔

اُردو میں "کہ اے" کے اجتماع میں اِس کی مثال پُرانے شاعروں کے یہاں کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے ۔ جیسے میر حسؔن کی مثنوی سحرالبیان کا یہ شعر :

وزیروں نے کی عرض ، کاے آفتاب
نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب

ایسے مقامات پر ، فارسی کے مسلّمہ طریقۂ کتابت کے مطابق ایسے لفظوں

کو لکھا جائے گا ، مثلاً مندرجۂ بالا شعر میں "کہ اے" کو "کاے" لکھا جائے گا ، جب کہ پڑھنے میں "کَے" آئے گا ۔ اِس کو "کَے" اِس لیے بھی نہیں لکھا جا سکتا کہ اِس صورت میں لفظ ہی بدل جائے گا اور ایک مختلف لفظ "کَے" ، بہ معنی کب ، سے التباس ہو گا ۔ البتہ اِس کا شمار مستثنیات میں کیا جائے گا ۔

۷

کچھ مرکّبات ، جن کے پہلے جُز کا حرفِ آخر ساکن ہے اور دوسرے جُز کا حرفِ اوّل الفِ مفتوح ہے ، ایسے ہیں جن میں ، اُردو محاورے کے لحاظ سے ، الف پوری طرح تلفظ میں نہیں آتا ، الف کی حرکت ، اُس سے پہلے واقع ہونے والے حرفِ ساکن کی طرف منتقل ہو جاتی ہے ۔ جیسے : تیر انداز ، شیر افگن ، بداعمال وغیرہ ، (مثلاً تیر انداز ، تلفظ میں "تیرَن داز" رہ جاتا ہے) ، مگر ایسے مرکّبات میں الف لازماً لکھا جائے گا ۔

الفِ تنوین

تنوین، عربی کی خاص چیز ہے، جیسے: نسلاً، نسلٍ، نسلٌ۔ اُردو میں ایسے لفظ تو بہت کم مستعمل ہیں جن پر دُو زیر یا دُو پیش آتے ہیں — "مشارٌ الیہ"، اور "نسلاً بعد نسلٍ" جیسے کلمے گنتی کے ہیں۔ ہاں ایسے لفظ بہت ہیں جن پر دو زبر آتے ہیں، جیسے: فوراً، حکماً، اتفاقاً، انتظاماً، مثلاً وغیرہ۔ تنوین کا قاعدہ فارسی و اُردو دونوں زبانوں میں مسلسل اور متواتر مستعمل رہا ہے، آج بھی اُسی طرح رائج ہے، اِس لیے اِس مروّج اور متعارف قاعدے میں کسی طرح کی بنیادی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تنوین کی جگہ، ن لکھا جائے۔

۱

تنوین کا طریقہ یہ رہا ہے کہ لفظ کے آخر میں الف بڑھا دیا جاتا ہے اور اُس پر دو زبر لگا دیے جاتے ہیں، جیسے: مثال سے مثالاً۔ اِس میں کچھ جھگڑا نہیں۔ جھگڑا ہوتا ہے اُن لفظوں میں جن کے آخر میں ت

ہوتی ہے۔

عربی میں تاے دراز (ت) اور تاے مدوّر (ۃ) میں فرق کیا جاتا ہے اور جن لفظوں کے آخر میں تاے مدوّر لکھی جاتی ہے، اُن میں ۃ کے بعد الف کا اضافہ نہیں کیا جاتا، بل کہ اُسی ۃ پر دو زبر لگا دیے جاتے ہیں۔ جیسے: ساعۃً، نسبۃً، عادۃً، حکمۃً۔ جن لفظوں کے آخر میں تاے دراز لکھی جاتی ہے، اُن میں ت کے بعد الف کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے: وقتاً۔

ایک عام اُردو والے کے لیے یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کس لفظ کے آخر میں تاے مدوّر ہے اور کس کے آخر میں تاے دراز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک شخص "نسبۃً" لکھتا ہے اور دوسرا شخص "نسبتاً" کو صحیح سمجھتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اِس معلومات کی ضرورت بھی نہیں۔

انجمن نے یہ طے کیا تھا کہ: "عربی کی ۃ کو ہمیشہ اردو میں ت لکھنا چاہیے"۔[1] مگر تنوین کے متعلّق الگ سے راے ظاہر نہیں کی تھی۔ جب اردو میں ایک ہی ت ہے تو پھر تنوین کے لیے بھی، لازماً وہی عام اور یک ساں طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے کہ ت کے بعد، الف کا اضافہ کیا جائے۔

اب قاعدہ یہ ہوا کہ ایسے سب لفظوں کے آخر میں الف کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے:

عادتاً، نسبتاً، حقیقتاً، رعایتاً، مروّتاً، ضرورتاً، کلّیتاً، شکایتاً،

---

[1] رسالۂ اردو، جنوری ۱۹۴۴ء، ص ۱۱۴۔

ارادتاً ، اصالتاً ، امانتاً ، حفاظتاً ، فطرتاً ، قدرتاً ، عبرتاً ، امانتاً ، حکمتاً ،
حکایتاً ، حقارتاً ۔

۲

کچھ لفظ ایسے ہیں جن کو فارسی اور اردو میں ہاے مختفی کے ساتھ لکھا جاتا ہے ، جیسے : نتیجہ ، واقعہ ، کلّیہ ، دفعہ ، ارادہ ۔ عربی میں اِن سب لفظوں کے آخر میں تاے مدوّر (ۃ) ہے ۔ فارسی میں ایسے لفظوں کو ہاے مختفی سے لکھا جانے لگا اور وہی طریقہ اُردو میں برقرار رہا ۔ تنوین کی صورت میں ایسے لفظ بھی ، مذکورۂ بالا قاعدے کے مطابق لکھے جائیں گے ۔ یعنی ، ہاے مختفی کی جگہ پر " تا " کا اضافہ کیا جائے گا ۔ جیسے : نتیجتاً ، دفعتاً ، واقعتاً ، کلّیتاً ۔

فائدہ :

فارسی میں بھی اب اِسی خیال کا اظہار کیا جارہا ہے کہ تنوین کے سلسلے میں تاے دراز اور تاے مدوّر میں امتیاز کی ضرورت نہیں اور تنوین کی صورت میں ایسے سب لفظوں کو بہ اضافۂ الف ، ایک ، طرح لکھنا چاہیے ۔ احمد بہمنیار نے لکھا ہے :

"در رسم الخط عربی بآخر کلمات منصوب و منون الفی الحاق میشود ، مانند : عمداً ، ابداً ، یقیناً ، قطعاً وغیرہ ، جز درصورتیکہ حرف آخر کلمہ تاہ زاید باشد کہ درین صورت بی الف مینویسند ، مانند : دفعۃً ، غفلۃً ، حقیقۃً ، عادۃً وغیرہ ، و برخی ازینگونہ کلمات در فارسی بہمان صورت نصب وتنوین چون حال یا وصف الفعل بکار میرود ۔ زبان فارسی

نویسان در کتابت آنہا پیروی از رسم الخط عربی را لازم و تخلف
انان را غلط میشمرند، درصورتیکہ کلمات عربی مستعمل در فارسی
خواص عربی را از دست دادہ و در ردیف کلمات فارسی درآمدہ
است، رعایت این تفاوت کہ متبنی بر اصلی و زاید بودن تاء
آخر کلمہ است، لزوم ندارد۔ و برای اطراد قاعدہ بہتر آنست
کہ اینگونہ کلمات را خواہ منتہی بتاء باشد یا حرف دیگر، وخواہ
تاء آخرش زاید باشد یا اصلی، با الف بنویسند، مانند:
عمداً، ابداً، قطعاً، ظاہراً، اصلاً، موقتاً، دفعتاً
غفلتاً، اثباتاً، نفیاً، حقیقتاً، عادتاً وغیرہ۔

(لغت نامۂ دہخدا، جلد ۱۱۰، ص ۱۷۳)

۳

اردو میں عربی کے ایسے بہت سے لفظ مستعمل ہیں جن کے آخر میں
اصلاً ہمزہ ہے، مگر اردو میں وہ ہمزہ کے بغیر مستعمل ہیں، جیسے: ابتدا،
انتہا، جزا، شے، جُز۔ عربی میں اِن سب کے آخر میں ہمزہ ہے، یعنی:
ابتداء، انتہاء، جزاء، جُزء، شیٔ۔ اِس طرح کے کچھ لفظ اردو میں
تنوین کے ساتھ بھی استعمال میں آتے ہیں۔ طریقہ یہ رہا ہے کہ ایسے لفظوں
کے آخر میں اِن کا اصلی ہمزہ واپس آجاتا ہے اور اُس پر دو زبر لگائے
جاتے ہیں۔ (اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسے لفظوں کے
آخر میں ہمزہ کا اضافہ کیا جاتا ہے) مگر اُس صورت میں اِس ہمزہ پر دو
زبر لگائے جاتے ہیں جب اُس سے پہلے الف ہو۔ اگر ہمزہ سے پہلے
الف نہ ہو تو ہمزہ کے بعد الف بڑھا کر، تب دو زبر لگائے جاتے

ہیں ۔ جیسے : بناءً ، ابتداءً ، شیئاً ۔

اِس میں بھی ایک طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ ہر صورت میں ہمزہ پر دو زبر لگائے جائیں ، اور جس طرح " ابتداءً " لکھا جاتا ہے ، اُسی طرح "شےءً " لکھا جائے ۔

قاعدہ یہ ہوا کہ جن لفظوں کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہے ، اور اب وہ ہمزہ کے بغیر مستعمل ہیں ؛ تنوین کی صورت میں ایسے لفظوں کو اصل کے مطابق مع ہمزہ لکھا جائے گا اور اُس ہمزہ پر دو زبر لگائے جائیں گے ۔ جیسے : ابتداءً[1] ، براءً ، جزاءً ، انتہاءً ، جزءً ، شےءً ۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اِس طرح کے لفظ چند ہی ہیں اور وہ بھی عام طور پر استعمال میں نہیں آتے ، اِس لیے اِن لفظوں کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ۔

۴

عورتوں کے نام ، جیسے : سلیمن ، کریمن ، عظیمن ، شبراتن وغیرہ کے آخر میں نون لکھا جائے گا ، یہاں تنوین کا کچھ کام نہیں ــــ اِن ناموں کے آخر میں جو نون ہے ، اُسے " نونِ تانیث " کہتے ہیں ۔ اِس کا مفصّل بیان حرفِ نون کے ذیل میں آئے گا ۔

۵

شاعروں کا معمول رہا ہے کہ جس لفظ پر تنوین ہو ، اگرچہ اُس کے آخر

---

[1] " ابتداءً میرزا صاحب کا یہ ارادہ تھا کہ دو چار مہینے رام پور میں قیام کریں گے "۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی (مقدمۂ مکاتیبِ غالب ، ص ۱۲۳)

میں نون نہیں لکھا جاتا ، مگر یہ مان کر کہ تنوین ، نون کی قائم مقام ہے ، اُس لفظ کو ایسے الفاظ کے ساتھ ہم قافیہ کیا جا سکتا ہے جن کے آخر میں نون لکھا جاتا ہے ، مثلاً : گلشن کا قافیہ فوراً ہو سکتا ہے۔ تین مثالوں سے اِس کی وضاحت ہو سکے گی ۔ شروع کے دو شعر، مولانا احسن مارہروی کے ہیں ، جو اُن کی کتاب تاریخِ نثرِ اردو سے ماخوذ ہیں اور باقی اشعار ، رسالۂ اصلاح سے لیے گئے ہیں :

نثرِ اردو کا یہ آئینۂ تاریخ ہے وہ — جس سے پہلو رخِ تاریک کا ، روشن ہوگا
ہنجِ صد سالہ سوانح کا ہے دفتر ، جس سے — یاد ہر واقعہ بھولا ہوا فوراً ہوگا
(احسن مارہروی)

یار ، من من کے بگڑ جاتا ہے — کام بن بن کے بگڑ جاتا ہے
یہ ترا ڈر ہے کہ بوسوں کا کھیل — ادناً ، بن کے بگڑ جاتا ہے
(رشک)

قید اپنا وہ آپ پُر فن تھا — حلقۂ زلف ، طوقِ گردن تھا
عذرِ مانع نہ تھا کوئی تسلیم — ترکِ شعر و سخن یہ قصداً تھا
(تسلیم لکھنوی)

یوں تو قافیے کی بنیاد حروفِ مکتوبی پر ہے ، مگر بعض صورتوں میں اِس طرح کے صوتی مناسبت رکھنے والے قوافی کو جائز رکھا گیا ہے ۔ ایک تو یہی تنوین والے قوافی ہیں ، اور دوسرے یہ عام قاعدہ کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہو ، اُن کو ایسے الفاظ کا ہم قافیہ کیا جا سکتا ہے جن کے آخر میں الف ہو ۔ جیسے : دیکھا کیا ، پردا کیا ۔ یا جیسے : شیدا ہوا چاہتا ہے ، کعبا ہوا چاہتا ہے ۔ اِس فرق کے ساتھ کہ

ایسے مقامات پر ہائے مختفی ، الف سے بدل جاتی ہے ، یعنی "پردہ" اور "کعبہ" کو "پردا" اور "کعبا" لکھا جائے گا ، مگر تنوین کی صورت میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ شاعری میں جن آزادیوں کو روا رکھا گیا ہے ، یہ بھی انہی میں سے ایک ہے ۔

ت ــ ۃ

عربی میں ت کی دو صورتیں ہیں : تاے دراز (ت) اور تاے مدوّر یا تاے موقوفہ (ۃ) ۔ عربی میں اِن دونوں میں فرق کیا جاتا ہے ، مثلاً یہ کہ لفظ کے آخر میں اگر ت ہو ، اِس صورت میں ، تنوین (دو زبر) کے لیے ، ت کے بعد الف کا اضافہ کیا جائے گا ، جیسے : وقتًا ، جنّاتًا۔ اگر لفظ کے آخر میں ۃ ہے تو الف کا اضافہ نہیں کیا جائے گا ، بل کہ اُسی ۃ پر دو زبر لگا دیے جائیں گے ، جیسے : دفعۃً ، نسبۃً۔ کتابت میں بھی اِن دونوں کے فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ، اِس طرح کہ تاے دراز ہمیشہ ت کی صورت میں لکھی جاتی ہے ، اور تاے مدوّر ، ۃ کی صورت میں ــــــ وقف کی صورت میں یہ تبدیلی ہوتی ہے کہ تاے مدوّر ، ہ کی آواز دیتی ہے ، جیسے : " ساعۃٌ " کو وقف کی حالت میں لکھا تو اِسی طرح جائے گا مگر پڑھا جائے گا : ساعہْ۔

تائے دراز میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ایسے بہت سے لفظ، جن کے آخر میں عربی میں تائے مدوّر ہے، فارسی میں ہائے مختفی سے لکھے جانے لگے۔ چوں کہ فارسی میں حرفِ آخر متحرک نہیں ہوتا، اور عربی میں ایسے لفظوں میں حالتِ وقف میں ۃ، ہ کی طرح پڑھنے میں آتی تھی؛ اس لیے فارسی میں ایسے اکثر لفظوں کو ہ سے لکھا جانے لگا۔ فارسی میں ہائے مختفی موجود ہی تھی، اِس بِنا پر یہ مان لیا گیا کہ اِن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہے۔ لکھنے میں طریقہ یہ قرار پایا کہ یہ ہ اگر منفصل ہو تو پوری لکھی جائے، جیسے: جلوہ ـــ اور اگر متّصل ہو تو اُس کو ملا کر لکھا جائے: جیسے: کعبہ، مدرسہ۔

مگر چار صورتوں میں عربی کی تائے مدوّر نے اپنے آپ کو باقی رکھا: (۱) بعض عربی لفظوں میں، عربی املا کی پیروی کی جاتی رہی، جیسے: صلوۃ، زکوۃ۔ (۲) تنوین کی صورت میں، عربی قاعدے کے مطابق، لفظوں کو تائے مدوّر ہی کے ساتھ لکھا گیا، جیسے: عادۃً، فطرۃً۔ (جب کہ تنوین کے بغیر اِن کو عادت اور فطرت لکھا جاتا ہے)۔ یہ تو منفصل صورت تھی؛ متّصل صورت میں یہ طریقہ رواج پا گیا کہ اِس کی شکل تو ہائے مختفی جیسی رہے، مگر اِس پر دو نقطے رکھ دیے جائیں اور پھر اُس پر تنوین لگائی جائے، جیسے: نسبتہً، حقیقتہً۔ (تنوین کے بغیر اِن کو بھی نسبت اور حقیقت لکھا جاتا ہے)۔ یہ گویا

۱؎ قواعد کی زبان میں اِس ت کو "تائے اصلی" کہتے ہیں۔

ایک نئی شکل کا اضافہ تھا۔ (۳) عربی کے بعض لفظ، جن کے آخر میں تاے مدوّر ہے، وہ عربی ترکیب کے ساتھ فارسی میں بھی مستعمل رہے اور متّصل صورت میں، اُن میں بھی، ہاے مختفی کی صورت پر دو نقطے رکھ کر، اُس کو تاے مدوّر فرض کر لیا گیا، جیسے: رومۃ الکبرا، امۃ الزّہرا۔ (۴) چوتھی صورت، تاریخ گوئی کے نتیجے میں سامنے آئی۔ چوں کہ حالتِ وقف میں تاے مدوّر، ہاے ہوّز کی آواز دیتی ہے، اِس لیے تاریخ گوئی کی شریعت میں، تاے مدوّر کے پانچ عدد مانے گئے ہیں (بہ قولِ جمہور) ہاے ہوّز کے بھی پانچ عدد ہوتے ہیں۔ اور اِس ضرورت سے، ایسے مقامات پر اُن لفظوں کو بھی تاے مدوّر سے لکھا گیا، جن کو ویسے تاے دراز سے لکھا جاتا ہے، جیسے: لفظ لُغت میں تاے دراز لکھی جاتی ہے۔ مگر رشکؔ (تلمیذِ ناسخؔ) کے لُغت کا نام "نفسُ اللغۃ" لکھا جائے گا، کیوں کہ یہ تاریخی نام ہے اور یہاں "لغۃ" کی "ۃ" کے پانچ عدد شمار کیے گئے ہیں۔

جن چار صورتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، یہ فارسی و اردو میں مشترک ہیں۔ اُردو میں (اور فارسی میں بھی) اگرچہ تاے دراز اور تاے مدوّر (یا تاے موقوفہ) کی عربی تقسیم نہیں پائی جاتی، یہاں صرف ایک ت ہے؛ مگر عربی کی تاے مدوّر، مختلف صورتوں میں اِن دونوں زبانوں[1] میں لکھی جاتی رہی۔

---

[1] مثلاً اردو میں جلالؔ نے اپنے رسالۂ تذکیر و تانیث مفید الشعرا میں، اُن لفظوں کو ایک فصل میں لکھا ہے جو ہاے مختفی پر، (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۰ پر)

انجمن کی اصلاحِ رسم خط کمیٹی نے یہ تجویز کیا تھا کہ اُردو میں ہمیشہ ت لکھنا چاہیے ۔ یہ فیصلہ نہایت مناسب تھا ، اِس لیے کہ اردو حروفِ تہجّی میں "تاے موقوفہ" یا "تاے مدوّر" نام کی کوئی چیز نہیں اور اِس کی مطلق ضرورت نہیں کہ ، ضرورت کے بغیر ، اِس فہرست میں ایک صورت کا اضافہ کیا جائے ۔ اِس بِنا پر ، ایسے لفظ جن کو تاے مدوّر کے ساتھ لکھا جاتا رہا ہے ، اب اُن کو ت کے ساتھ لکھا جائے ۔ ایسے متعدّد لفظوں کو ت سے لکھا بھی جانے لگا ہے، مثلاً "نجاۃ" اور "حیاۃ" اب کوئی نہیں لکھتا ، البتہ "صلوۃ" اور "زکوۃ" کے دونوں املا دیکھنے میں آتے رہتے ہیں ۔

(الف) اُردو میں اب لازمی طور پر ایسے سب لفظوں کے آخر میں ت لکھی جائے گی ۔ ایسے لفظ یہ ہیں :

صلات ، زکات ، تورات ، مشکات ، حیات ، نجات ۔

فارسی میں بھی اب یہی کہا جا رہا ہے کہ ایسے سب لفظوں میں ت لکھنا چاہیے ۔

یا عربی کے لحاظ سے تاے موقوفہ پر ختم ہوتے ہیں ۔ اِس فصل کا عنوان یہ ہے :
"فصلِ سی و ششم ، اُن اسما کی تذکیر و تانیث کے بیان میں ، جن کے آخر میں تاے موقوفہ یا ہاے مختفیہ ہے " ۔

، "عربی کی ۃ کو ، اردو میں ہمیشہ ت لکھنا چاہیے " ۔
(روودادِ کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط ۔ اردو ، جنوری ۱۹۴۴ء ، ص ۱۱۴)

"کلمات " صلوۃ ، زکوۃ ، حیوۃ ، مشکوۃ ، توریۃ " (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۱ پر)

(ب) اِس قاعدے کی رو سے، چوں کہ اردو میں اب صرف ایک ت ہے، اِس لیے تنوین میں بھی تاے مدوّر اور تاے دراز کی عربی تقسیم لازماً ختم ہو جائے گی اور ہر صورت میں، ت کے بعد الف کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: دفعتاً، حقیقتاً۔ اس کا بیان الفِ تنوین کے ذیل میں آچکا ہے۔

(ج) مفرد لفظوں کے علاوہ، بعض مرکّب کلمے بھی تاے موقوفہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، جیسے: طرفۃ العین، امۃ الزّہرا، رومۃ الکبرا وغیرہ۔ ایسے سب کلمات میں بھی ت لکھی جائے گی، یعنی: طُرفتُ العین، اَمَتُ الزّہرا، رحمتُ[1] اللعالمین، رومتُ الکبرا۔

را باید کہ بہمان قسم کہ تلفظ میشود یعنی بالف و تاءِ کشیدہ نوشت (صلات، زکات، حیات، مشکات، تورات)۔ در عربی ہم این کلمات با لف و تاء نوشتہ میشود و بواو نوشتن آنہا رسم الخط مخصوص بقرآن مجید است کہ عرب آنرا خاص قرآن شمردہ و بکار بردن آنرا در کتابت معمول و عادی ترک کردہ اند، لیکن برخی از فارسی نویسان رسم الخط مطابق تلفظ را متروک و رسم الخط قرآنی را معمول داشتہ اند و میدارند"۔

(املای فارسی، لُغت نامۂ دہخدا، جلدِ چہلم)

[1] جیسے میر صاحب کے اِس شعر میں بلا تکلف "رحمتُ اللعالمین" لکھا جائے گا:

منظہرِ صدہا عجائب، مصدرِ لطف وکرم زیبِ منبر، جانشینِ رحمت اللعالمین (میر)

(کلّیات، مرتبۂ آسی، ص ۷۵۶)

یہ بات ذہن میں رہے کہ اِس طرح کے مرکّبات بہت کم ہیں اور اِن کا استعمال اِس سے بھی کم ہے۔ زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ اِس طرح کے مرکّبات، امکان بھر، استعمال نہ کیے جائیں، اِن کے بغیر بھی آسانی کے ساتھ بات کو کہا جا سکتا ہے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، اِس طرح کے لفظ مفرد ہوں یا مرکّب، ہر صورت میں اُن میں تَ لکھی جائے گی۔

بابت کو "بابتہ" اور مسمّات کو "مسماۃ" لکھا جاتا ہے، دو چار لفظ اِس طرح کے اور بھی ہوں گے؛ اِن سب میں، قاعدے کے مطابق تَ لکھی جائے گی، (بابت، مسمّات)۔

(د) یہ بات لکھی جاچکی ہے کہ عربی کی جو عبارتیں یا مکمّل اجزا، اُردو میں بعینہٖ مستعمل ہیں، اُن کو عربی سے منقول اجزا قرار دے کر، اُسی طرح لکھا جائے گا جس طرح وہ عربی میں لکھے جاتے ہیں۔

ایسے اجزا جن میں اصل کے لحاظ سے تاے مدوّرہ ہے، اور اُردو میں مستعمل ہیں، ان میں ایک جملہ "رحمۃ اللہ علیہ" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے، یہ جملہ بہ نسبت اور اجزا کے، کچھ زیادہ مستعمل ہے۔ اِس کو عربی املا کے مطابق ہی لکھا جائے گا۔ مناسب یہ ہوگا کہ نہ صرف تاے مدوّر کو اُسی طرح لکھا جائے جس طرح وہ عربی میں لکھی جاتی ہے، بل کہ اندازِ کتابت بھی عربی رسمِ خط کے مطابق ہو، (جس طرح واوین میں لکھا گیا ہے)۔ اِس سے امتیاز کا بہ آسانی پتا چلایا جاسکتا ہے۔ عربی کی عبارتیں، قرآنی آیتیں، احادیث کے

اجزا ، عربی ضرب الامثال ، اقوال ، اور کچھ دعائیہ جملے ؛ اردو عبارتوں میں کبھی کبھی آجاتے ہیں ، اِن اجزا کی حیثیت ، عربی اجزا کی رہے گی اور اِن کو عربی ہی کے مطابق لکھا جائے گا ۔ یہی صورت فارسی سے منقول عبارات کی ہوگی ، کہ اُن کو بھی فارسی املا کے مطابق لکھا جائے گا ۔ اور عربی فارسی کی کیا قید ؛ کسی بھی زبان سے منقول اجزا ، اُسی زبان کے مطابق لکھے جائیں گے ۔

(ہ) ہاں ، پُرانی تحریروں میں ایک بات کا لحاظ رکھّا جائے گا اور وہ یہ کہ کتابوں وغیرہ کے بعض تاریخی نام ایسے ہیں جن میں تائے مدوّر کے عدد شمار کیے گئے ہیں ۔ تاریخی عبارتوں میں بھی اِس کا امکان ہے کہ ایسا کوئی لفظ آجائے جس میں تائے مدوّر کو مانا گیا ہو ۔ ایسے مواقع پر تائے مدوّر ہی لکھی جائے گی ۔ یہ استثنا ہوگا ، اور اِس کا تعلق پُرانی تحریروں سے ہے ۔

ت ـ ط

کچھ لفظ ایسے ہیں جو ت اور ط دونوں سے لکھے جاتے ہیں۔ اِن کی صرف ایک لکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے، اور ایسے سب لفظوں کو ت سے لکھنا چاہیے۔ اِس میں سادگی بھی ہے اور آسانی بھی۔

بعض اور حرفوں کی طرح ط بھی عربی سے مخصوص ہے۔ کچھ لفظ جو اصل میں عربی کے نہیں ہیں، معرّب ہو کر ط سے لکھے جانے لگے، جیسے: طشت، طباشیر۔ مگر بعض لفظ ایسے ہیں جو معرّب بھی نہیں ہوئے، پھر بھی اُن کو ط سے لکھا جانے لگا، جیسے: طپیدن، جو اصل میں تپیدن ہے۔ اِسی سے تپش اور تپاں بھی بنتے ہیں، جن کو طپش اور طپاں لکھا گیا یا جیسے: طمانچہ۔ ظاہر ہے کہ ط کو اس میں بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔

اُردو کے لُغت نویسوں نے عموماً ایسے لفظوں کو ت سے مرجح بتایا ہے، بل کہ بعض لفظوں کو اِس صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اُن میں

ط لکھنا درست نہیں ۔ جیسے نور میں "تماچا" کے ذیل میں یہ صراحت ملتی ہے کہ: "یہ لفظ طپانچہ لکھنا غلط ہے، تاے فوقانی سے لکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ لفظ فارسی ہے" ــــــ یا جیسے "توتا" کے ذیل میں لکھا ہے کہ: "اِس کا املا طوطا صحیح نہیں" ــــــ "طپش" کو ط کی فصل میں لکھا گیا ہے، مگر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ: "صحیح املا تپش ہے"۔

آصفیہ میں تشت کے ذیل میں یہ صراحت ملتی ہے کہ: "طشت اسی کا معرّب ہے" ــــــ "تماچہ" کے تحت لکھا ہے: "یہ لفظ فارسی۔ رسم الخط میں طاے مہملہ سے "طپانچہ" لکھا جاتا ہے، مگر لکھنا تاے فوقانی سے واجب تھا، کیوں کہ یہ لفظ فارسی ہے"۔

مگر عدمِ تعیّن کے پھیلائے ہوئے اِس انتشار کا کیا علاج کہ اِن لُغات، خاص طور پر آصفیہ میں، بیش تر لفظ ت اور ط دونوں حرفوں کی فصلوں میں لکھے ہوئے ہیں، اور عبارت میں بھی یہ لفظ کہیں ت سے لکھے گئے ہیں، کہیں ط سے۔ جب لغت کا یہ حال ہے تو عام کتابوں میں اور تحریر میں اگر اِس سے زیادہ ابتری ہو تو اِس پر تعجب کیوں ہو۔

عبدیقی صاحب کی بھی یہی راے تھی کہ تشت، تپیدن جیسے لفظوں کو ت سے لکھنا[1] چاہیے۔ فارسی میں بھی اب یہی رجحان ہے کہ ایسے

---

[1] "فارسی اور ترکی کے بعض لفظ کسی نہ کسی وجہ سے، ت کی بجاے، کبھی ط سے بھی لکھے جاتے ہیں، جیسے: (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۶ پر)

لفظوں کو، فارسی املا کے مطابق، "بہ حروفِ فارسی" لکھنا چاہیے۔

ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

اُستخر، تشت، تشتری، تاس، تاسہ (تاشا)،
توتیا، تپیدن، تپش، تپاں، توتا، تماچا یا
تمانچا، تپنچہ، تمنچا، تہران، تہمورث، تہماسپ،
ترخان، غلتیدن، غلتاں، تبرزد، تبرستان،
تیّار، تیّاری، تلاطم، تنبورہ، ناتا، توتیا باندھنا،
توتیے جوڑنا، تانے تشنے، تراوت، طراوت۔

اِن میں سے بعض لفظ وضاحت طلب ہیں:

تیّار: آمادہ، مستعد، تندرست وغیرہ کے معانی میں، جیسے: سواری تیّار ہے۔ یہ مُرغ تو اب خوب تیّار ہو گیا۔ سفر کی تیّاری وغیرہ، اِن سب معانی میں تیّار لکھا جائے گا۔

طپش، طپیدن، طشت، طوطی۔

محتاط لوگ "ت" ہی سے لکھتے ہیں اور ہم کو بھی یہ املا اختیار کرنا چاہیے: یعنی تپش، تشت، تشتری، توتا، توپ، تماچا۔"

"تیّار کو طیّار بھی لکھتے ہیں، ہم کو "تیّار" اختیار کرنا چاہیے۔ سوائے اِس کے کہ یہ لفظ "اُڑنے والا" کے معنوں میں استعمال ہوا ہو۔"

(اردو املا۔ ہندستانی ۱۹۳۱ء)

لہ بہارِ عجم میں اِس لفظ کے ذیل میں ضروری تفصیلات ملتی ہیں، بعد والوں نے عموماً وہیں سے اُن کو نقل کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۷ پر)

طیّار کے معنی ہیں : اُڑنے والا ۔ طیّارہ اِسی سے بنا ہے ۔ اُڑنے والا کے معنی میں طیّار لکھا جائے گا ۔

تلاطم : اِس میں پہلا حرف ت ہے اور چوتھا حرف ط ہے ۔ اِس کو غلطی سے " طلاطم " بھی لکھ دیا جاتا ہے ۔

اِسی لُغت سے معلوم ہوتا ہے کہ تیّار اور طیّار دونوں لفظ فارسی میں ہیں۔ لفظ " تیار " کے ذیل میں لکھا ہے :

" تیار ، بوزنِ عطّار ، موجِ جہندہ ، و فارسیاں بمعنی آمادہ و مہیّا استعمال کنند ، و بطاے حطّی نیز آید "۔

پھر " طیّار " کے ذیل میں لکھا ہے :

" طیّار ، بالتشدید ، بسیار پرواز کنندہ ۔ و بفوقانی : مرغِ جہندہ ۔ و فارسیاں بمناسبتِ ہر دو معنی ، بمعنی آمادہ و مہیّا استعمال نمایند۔ و حق آنست کہ دراصل اصطلاحِ توشچیان است ، کہ چوں جانورِ شکار انداز از کریز بر آمدہ ، مہیّاے شکار اندازی میشود ، میگویند کہ " طیّار شدہ " ۔ چوں بدیں معنی شہرت گرفتہ ، مجازاً بمعنیِ مطلق آمادہ و مہیّا استعمال یافتہ "۔ (بہارِ عجم)

یہی بات صاحبِ آصفیہ نے لکھی ہے ۔ اُنھوں نے تیار ، تیار کرنا ، تیار ہونا ، تیاری ، تیاری کا رنگ و روغن ؛ سب کو ت سے لکھا ہے ، یہی صورت نور میں ہے ۔ صاحبِ آصفیہ نے تیار کے ذیل میں لکھا ہے :

" جہندہ اور موّاج کے علاوہ ، جس قدر معنی ہیں وہ سب اصطلاحی ہیں ، یعنی فلاں چیز اپنی درستی کے باعث ، اپنے استعمال کی طرف

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۸ پر)

توتیا : اِس کے معنی ہیں : "نیلا تھوتھا ۔ سرمے کا پتھر، سرمہ" (نور)۔
توتیا باندھنا : عربی کا ایک لفظ ہے "توطیہ" (منتخب اللغات)،

جلد جانے والی ہے ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ اِس کا مادّہ طاے مہملہ سے، طیّار بہ معنی اُڑنے والا، خیال کیا جائے ۔کیوں کہ یہ اصطلاح اصل میں میرشکاروں سے لی گئی ہے ۔جب کوئی شکاری پرندہ ،کریز سے نکل کر، اُڑنے اور شکار کرنے کے قابل ہوجاتا ہے تو وہ "طیّار" کہا کرتے ہیں ۔ پس اِس سے ہر ایک مہیّا چیز کے واسطے اصطلاح ہوگئی ۔

بہ لحاظِ ماحصل ، اِس کا املا دونوں طرح درست ہوسکتا ہے "۔

غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے :

" طیّار ، صیغہ مبالغے کا ہے ، لغت عربی ، املا اِس کا طاے حطّی سے ... بازداروں میں اِس لفظ نے جنم لیا ، حقیقت بدل گئی ، طوے، تے بن گئی ۔یعنی جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا ، بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ " فلاں باز ، فلاں شکرہ طیار شدہ است و صید می گیرد "— بہ ہر حال ، اب تاے قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا ۔ اِس لفظ کو مستحدث اور دراصل اردو ، اور باتاے قرشت ، بہ معنیِ آمادہ ، اشخاص اور اشیا پر عام تصور کرنا چاہیے اور عبارتِ فارسی میں استعمال اِس کا کبھی جائز نہ ہوگا "۔

(خط بہ نامِ غلام حسنین قدر بلگرامی خطوطِ غالب ،مرتبہ مہیش پرشاد ، ص ۱۰۳)

لہ جا کے جنّت میں بھی رہتی ہے ترے در کی ہوس ؛ ورنہ مرغانِ اولی اجنحہ کیوں ہوں طیّار (مومن)

اِس کے ایک معنی "تمہید اٹھانا" بھی ہیں۔ اردو کے محاوروں: توتیا باندھنا، توتیے باندھنا اور توتیے جوڑنا میں، یہی لفظ مہنّد صورت میں ہے۔ "توتیا باندھنا" کے معنی ہیں: الزام لگانا۔ آصفیہ میں "طوطیا باندھنا" اور "طوطیا بندھنا" کو ط کی فصل میں لکھا گیا ہے اور "توتیے جوڑنا" کو ت کی فصل میں درج کیا گیا ہے۔ البتّہ نوؔر میں اِن سب کو ت کی فصل میں لکھا گیا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی انسب، بل کہ صحیح[1] ہے۔

آصفیہ میں دو غلطیاں نمایاں ہیں: ایک تو یہ کہ "توطیہ" کو "طوطیا" لکھا گیا ہے۔ یہ غلط ہے، صحیح لفظ "توطیہ" ہے۔ غیاث میں خاص طور پر اِس کی صراحت کی گئی ہے: "اول طاے حطّی نوشتن غلط است، صحیح بہ تاءِ فوقانی باشد"۔ دوسرے یہ کہ اُس میں "توتیے جوڑنا یا توتے جوڑنا" لکھا ہوا ہے۔ "توتے جوڑنا" کوئی محاورہ نہیں۔ مؤلف نے سند کے جو شعر لکھے ہیں، اُن میں "توتے جوڑنا" کہیں نہیں آیا ہے۔ محاورہ صرف "توتیے جوڑنا" ہے۔

---

[1] اُنھی فریادیوں کی ہیں یہ آنکھیں اشک آلودہ — پری زادوں نے جن پر توتیا دو لاب کا جوڑا
انشا (کلامِ انشا ص ۴۷)

سرمہ گھلا کے آنکھوں میں نکلا نہ کیجیے — ایسا نہ ہو کہ آپ پہ کچھ توتیا بندھے
انشا (کلامِ انشا ص ۲۴۳)

توتیے کیا جوڑتا ہے، اُس کو مجھ تک کھینچ لا — دیکھیو کوکا، ارے، ہے یہ موا خوجا خبیث
انشا (کلامِ انشا ص ۴۰۷)

مولّف کی مکمل عبارت یہ ہے :

"توتیے جوڑنا یا توتے جوڑنا : ہ ۔ فعلِ لازم (عو) تہمت اور بہتان لگانا ۔ بدنام کرنا ۔ طوفان لینا ۔ قطعۂ رنگینؔ :

میں نے چاہا جو تجھ کو اے رنگینؔ مجھ سے ہر ایک بدگمان ہوا

توتیے جوڑتی ہے کیا کیا خلق جی لگانا ، بلائے جان ہوا"

تپنچہ : فارسی میں دوسرا حرف پ ہے اور آخر میں ہائے مختفی ہے ۔ "تمنچا" اِس کی اردو صورت ہے اور اِس لحاظ سے اِس کے آخر میں الف لکھنا بالکل مناسب ہوگا ـــــ اِسی طرح تماچا یا تمانچا ، یہ دونوں صورتیں اردو کی تراشیدہ ہیں ، اِس لیے اِن کے آخر میں الف لکھنا صحیح ہے ۔

تاشا : یہ "تاسہ" کی مہنّد صورت ہے ۔

تپیدن : فارسی کا مصدر ہے ، اِسی سے تپش اور تپاں بنتے ہیں ۔ پُرانی تحریروں میں (فارسی و اردو) مصدر اور مشتقات کو ط سے بھی لکھا جاتا تھا ۔ صاحبِ غیاث نے لکھا ہے :" و بہ طاے حطّی نوشتن رسمِ متاخرین است "۔ اب اِن سب کو صرف ت سے لکھا جائے گا ۔

پُرانی تحریروں میں بعض مقامات پر اِس کا پُرانا املا ہی اختیار کرنا پڑے گا ۔ نسّاخ نے مرزا احمد بیگ طپاں کے ترجمے میں لکھا ہے :

" مرزا احمد بیگ اپنا تخلص طاے مہملہ سے لکھا کرتے تھے "۔

(سخنِ شعرا)

یا مرزا محمد اسماعیل عرف مرزا جان طپش کے ترجمے میں لکھا ہے :

"مرزا جان طپش کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلوں میں تخلص اُن کا طاے مہملہ سے لکھا تھا، اِس لیے میں نے بھی تاے فوقانی سے نہیں لکھا"۔

(سخنِ شعرا)

یہ املا قدیم تحریروں تک محدود رہے گا ۔

توتا : اُردو کے اہم لُغت نگاروں نے یہ صراحت کردی ہے کہ اِس کا املا "طوطا" صحیح نہیں ۔ اِس کو ہمیشہ "توتا" لکھنا چاہیے ۔

اِس کے دو مرکبات : "توتا چشم" اور "توتا چشمی" کو بھی اِسی طرح لکھا جائے گا۔

تشنا : یہ عربی کے "تشنیع" کی بدلی ہوئی صورت ہے (آصفیہ) اور اِس کا مرکب "تانے تشنے"، "طعن و تشنیع" کی مہنّد صورت ہے ۔

نور میں "تِشنا" کی سند میں امانت کا یہ شعر درج کیا گیا ہے :

زبانِ موج سے تشنا دیا جو دریا نے
برس پڑی مری ہر آنکھ چشمِ تر کی طرح

اور "تانے تشنے" کے متعلق لکھا ہے: "طعن و تشنیع کا مہنّد ہے"۔

مفرد لفظ "طعنہ" اور اِس کی جمع "طعنے" مستعمل ہے ، البتہ "تشنے" کے ساتھ "تانے" آئے گا ۔ یعنی : "اُنھوں نے طعنے دیے"۔ اور "اُن کے تانے تشنے کون سُنے"۔ ادبی زبان میں "طعن و تشنیع" بھی مستعمل ہے ۔

ناتا : یہ لفظ ہندی ہے ، اِس کو "ناطہ" نہیں لکھنا چاہیے ۔ اردو میں "ناتا" ہی ہے ۔ "رشتہ ناتا" عام طور سے مستعمل ہے اور اِس کو

(حاشیہ ص ۱۳۲ پر دیکھیے)

اسی طرح لکھنا چاہیے ، نہ کہ " رشتہ ناطہ "۔

تراوت : عربی کا لفظ طراوت عام طور پر مستعمل ہے اور مستعمل رہنا چاہیے۔ کہنے کی بات بس یہ ہے کہ اِس کی مہنّد صورت " تراوت" ہے (نور) ۔ مقصد یہ ہے کہ اِس لفظ کو غلط نہ کہا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اِس اردو لفظ " تراوت " کی ایک عوامی صورت " تراوٹ " بھی ہے ، یہ ابھی بول چال کی حد تک محدود ہے۔ بہ ہر صورت یہ بھی ایک لفظ ہے ۔

لہ جیسے اِس شعر میں :

نسل بڑی آدم کی انشا ، کون کسی کو پہچانے
باعثِ کثرت ، ہم دیگر کے ناتے رشتے بھول گئے

(کلامِ انشا ، ص ۲۶۵)

ذال اور زے کے لکھنے میں کبھی کبھی ایسی غلط نگاری ہوتی ہے کہ لفظ اور عبارت، دونوں کی معنویت پر حرف آجاتا ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جن میں ذال لکھی جانا چاہیے، مگر نہ جاننے کے سبب، یا کم احتیاطی کی وجہ سے، ایسے لفظوں میں زے لکھ دی جاتی ہے، اور اِس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ ایسے کئی لفظ ہیں جو ایک معنی میں ذال سے صحیح ہیں اور اگر اُن میں زے لکھی جائے تو دوسرے معنی پیدا ہو جائیں گے۔ اِس طرح کی غلط نگاری سے، لفظوں میں معنوی امتیاز برقرار نہیں رہتا اور اِس کے نتیجے میں خلفشار رونما ہوتا ہے۔ اِس لیے ذال اور زے کے لکھنے میں احتیاط کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اِن حرفوں کے سبب سے، لفظوں میں جو معنوی اختلاف پیدا ہو جایا کرتا ہے، اُس پر بھی نظر رہنا چاہیے۔ جیسے: گزارش کو اگر زے سے لکھا جائے تو اُس کے معنی ہوں گے: پیش کرنا، ادا ے مدعا۔

اگر اِس کو گذارش (ذال سے) لکھا جائے تو اِس کے معنی ہوں گے: چھوڑنا۔ کس قدر فرق ہے! جن لفظوں میں اِس قبیل کی غلط نگاری زیادہ راہ پاتی ہے، وہ یہ ہیں:

آذر۔آذار: آذر، اِس لفظ کے معنی ہیں: آگ۔ موسمِ خزاں کے ایک مہینے کا نام بھی ہے۔ آذر سے اسمِ منسوب آذری بنتا ہے، جو کبھی آذر بہ معنیِ آتش سے نسبت رکھتا ہے اور کبھی اُس ماہِ خزاں سے۔
آذار، موسمِ بہار کے ایک مہینے کا نام ہے۔ "ابرِ آذار" اور "ابرِ آذاری" کی ترکیب کہیں کہیں استعمال کی گئی ہے۔ کبھی کبھی اِس "آذار" کا مخفف "آذر" بھی آجاتا ہے۔
اِن دونوں لفظوں میں ذال ہے۔ بعض مثالوں سے اِن کے استعمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:

تیری تلوار کی وہ آنچ کہ گبر چھوڑ دیویں پرستشِ آذر
(مومن)

ہے تنگِ سینہ، دل اگر آتش کدہ نہ ہو ہے عارِ دل، نفَس اگر آذر فشاں نہیں
(غالب)

نالے سے میرے گرم و خشک، زہرہ و ماہ کا مزاج
گریے سے میرے سرد و تر، طبعِ بروجِ آذری
(مومن)

خندۂ برقِ تیغ میں، گرمیِ مہرِ تیر ماہ گریۂ زخمِ تیر میں، جوشِ سحابِ آذری
(مومن م

اگر میں گریۂ مستانہ کا کروں مذکور   زمینِ مے کدہ ، بے ابرِ آذری ہو گِل

(مومنؔ)

آتشِ مہرِ حمل کو نہ بجھا دیوے کہیں   شعلۂ رشک سے جلتا ہے سحابِ آذار

(مومنؔ)

تیری افواج کا میداں میں دمِ جنگ خروش   بلبلوں کا مہِ آذار، گلستاں میں ہجوم

(مومنؔ)

"آذر پرست" کے معنی ہوں گے : آتش پرست ۔ "آذر آئین" اور "آذر کیش" کے بھی یہی معنی ہوں گے ۔ "آذر پرستی" آتش پرستی کو کہیں گے ۔ مولانا شبلی نے ایک شعر میں "بتانِ آذری" کی ترکیب، حسینانِ پارسی نژاد کے لیے استعمال کی ہے :

بیا ایں جا کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی
بُتانِ آذری را ، دلبرانِ شام و ایراں را

مولانا نے ایک جگہ اِسی مفہوم میں "خوبانِ زردشتی" بھی نظم کیا ہے ۔ "زردشتی" اور "آذری" میں وہی ایک نسبتِ آتش پرستی کار فرما ہے ۔

آذر بایجان ، ایک شہر کا نام ہے ۔ مشہور ایرانی مصنّف لطف علی بیگ کا تخلص آذر تھا ۔ (فرہنگِ فارسی ، از ڈاکٹر محمد معین) ۔ آذر برزیں ، ایک آتش کدے کا نام تھا ۔ آذر گشسپ ، ایک ایرانی نام ہے ۔ آذر کدہ ، آتش کدے کو کہیں گے ۔ آذری ، آذر (آگ) سے نسبت رکھنے والا ہوا اور "بتانِ آذری" حسینانِ آتش پرست ہوئے ۔

خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ اِن سب معانی میں "آذر" ذال سے لکھا جائے گا۔ "آزر" زے سے، ایک دوسرا لفظ ہے، اِس کا بیان آگے آئے گا۔ اِن دونوں لفظوں کے املا میں، اِن کے معنوی فرق کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

جاذِب: اِس کا مادّہ جذب ہے۔ بلاٹنگ پیپر یا "سیاہی چوس" کو بھی کہتے ہیں۔ جذبہ، مجذوب، انجذاب، جذبات؛ سب کی اصل جذب ہے۔

ابوذر: ایک مشہور صحابی ؓ کا نام۔ اِس میں "ذر" عربی کا لفظ ہے۔ (منتخب اللغات)

ذیابیطس: ایک بیماری کا نام۔

اوپر جتنے لفظ آئے ہیں، اُن سب میں ذال ہے۔

آزر: حضرت ابراہیمؑ کے والد یا چچا کا نام۔ اِس معنی میں یہ لفظ زے سے ہے۔ آزری، صنعتِ آزری، آزر کا خواب (ایک کتاب کا نام)، بت خانۂ آزر؛ سب میں یہی لفظ ہے۔

گر آزرِ زمانہ ہے تو گھڑ دے اے خیال
اُس بت کی مجھ کو نقرۂ مہتاب کی شبیہ
(انشا۔ کلامِ انشا، ص ۱۹۳)

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب
تو کہے، بت خانۂ آزر کھلا
(غالب)

لہ قصرِ جنّت ہو اگر بدرۂ زر پر، تو وہاں
کوئی بھی بدرۂ زر دستِ اباذر میں نہیں
(انشا۔ کلامِ انشا، ص ۱۶۶)

یہ لفظ اکثر استعمال میں آتا ہے ۔ آذر اور آزر، دو مختلف المعنی لفظ ہیں ۔ اِن کے املا میں اکثر غلطی ہو جایا کرتی ہے ۔ اِن دونوں کے معنوی فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ ایک مثال سے اِس "معنوی فرق" کا اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے ، مولانا شبلی کا شعر ہے :

بیا ایں جا ، کہ ہر سو کارواں در کارواں بینی بُتانِ آذری را ، دلبرانِ شام و ایراں را

"بُت" کی رعایت سے یہاں بہ ظاہر "آزری" ہونا چاہیے (آزرِ بت تراش کی نسبت سے) ، مگر یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ یہ شعر بمبئی سے متعلّق ہے اور مولانا نے وہاں کے "خوبانِ زردشتی" کا اکثر ذکر کیا ہے ؛ یہاں "بتانِ آذری" مناسب معلوم ہوتا ہے ، "محبوبانِ پارسی" کے معنی میں ۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو پھر لازماً اِس کا املا یہاں پر ذال سے صحیح ہوگا ۔ مگر مومن کا یہ شعر :

بوسہ روا بہ ہر طریق ، سجدہ و فرق ہر فریق
سنگِ درِ اُس کا اک صنم ، رشکِ بتانِ آزری

اِس شعر میں "بتانِ آزری" کو آزرِ بُت تراش سے نسبت ہے ، اور اِس لیے یہاں "آزری" "زے" سے لکھا جائے گا ۔ اِسی طرح غالب کے اِس شعر میں بھی "آزری" "ز" سے لکھا جائے گا :

دیدہ ور آں کہ دل نہد تا بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بُتانِ آزری

زرتشت : زرتشت یا زردشت ، آتش پرستوں کے پیغمبر کا نام ہے ۔ مولانا شبلی کے اِس شعر میں "خوبانِ زردشتی" سے مراد اِسی مشرب کو ماننے والے "محبوبانِ پارسی نژاد" سے ہے :

فغاں از گرمیِ ہنگامۂ خوبانِ زردشتی
بہم آمیختہ از زلف و عارض، ظلمت وضورا

مختصر یہ کہ اِس لفظ میں زے ہے

زکریّا : مشہور پیغمبر کا نام۔ پہلا حرف زے ہے۔

زخّار : یہ لفظ "بحرِ زخّار" کے مرکّب میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ اِس کو غلطی سے "ذخّار" لکھ دیا جاتا ہے، سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ "ذخیرہ" سے تعلق رکھتا ہے، حالاں کہ "زخّار" مختلف لفظ ہے اور زے سے ہے۔ اِس کا مادّہ "زَخر" [1] ہے۔

آزوقہ : غذاے قلیل کے معنی میں آتا ہے اور اِس کو اکثر "آذوقہ" لکھا جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اِس لفظ میں بھی زے ہے۔

اِزدِحام : اِس لفظ میں دوسرا حرف زے ہے اور چوتھا حرف ح ہے۔ اِس کو "اژدہام"، "ازدہام"، "اژدحام" غرض کئی طرح لکھا جاتا ہے۔ صحیح صورت "ازدحام" ہے۔ اِس کا مادّہ "زَحم" ہے (صراح۔ المنجد)۔

زی۔ ذی : یہ دو مختلف لفظ ہیں۔ ذی تو سابقے کے طور پر آتا ہے، جیسے : ذی ہوش، ذی عقل، ذی شان، ذی علم، ذی وقار۔ ذی کے معنی ہیں : والا۔ جیسے : ذی ہوش : ہوش والا،

---

[1] "زخر، بالفتح، پُر شدنِ دریا از آب و پُر کردنِ چیزے را و بالیدن و انبوہ شدنِ گیاہ" (منتخب اللغات)

گرچہ بحرِ عشق اک زخّار ہے ڈوبنے والے کا بیڑا پار ہے
(آغا... داغ)

یا صاحبِ ہوش ۔

زَی کے معنی ہیں : طرف ، اندازہ ، حد وغیرہ ۔ عربی میں زِيّ (بہ یاے مشدّد) کے معنی ہیں : لباس ۔ اردو میں اِس لفظ کے استعمال کی اِس وقت کوئی مثال میری نظر میں نہیں ۔
البتّہ ، حیثیت و مرتبے کے مفہوم میں زَی ، انشا کے یہاں آیا ہے اور اِس معنی میں یہ مہنّد ہے :

دیتے ہو گالیاں مجھے ، انصاف تو کرو
لائق تو ایسی باتوں کے بندے کی زی نہیں

(کلامِ انشا ، ص ۱۵۴)

کلامِ انشا کے مرتبین نے اِس پر یہ حاشیہ لکھا ہے :
" زی : حیثیت ، مرتبہ ۔ (عربی میں زِیّ کے معنی : وضع ، لباس "۔)

آصفیہ ، نور ، سرمایہ میں یہ لفظ موجود نہیں ۔ فرہنگِ اثر میں البتّہ یہ لفظ ہے ، مگر اِس کو " ذ ۔ ی " کی فصل میں ذال سے لکھا گیا ہے (ذی) ۔ یہ درست نہیں ، اِس کو زَی لکھنا چاہیے ۔

ذِی کی طرح ذو بھی (ذال سے) سابقے کے طور پر آتا ہے ، جیسے : ذوالفقار ، ذوالنّون (مشہور بزرگ) ، ذوالمنن[1] ، ذومعنیین ، ذومعنی ، ذوالجلال وغیرہ ۔

---

[1] سماوارض سے اُٹھا نہ جو ... نساں پر پڑا امانتِ خلّاقِ ذوالمنن کا بوجھ
(... کلامِ ... انشا ، ص ۱۴۱)

بذلہ : لطیفہ ، چٹکلے یا " سخنِ مرغوب " کے مفہوم میں یہ لفظ مستعمل ہے۔
لغات میں اِس کو ذال اور زے ، دونوں سے لکھا گیا ہے ۔ نور میں " بزلہ " ہے ۔ اور " با مع ذال " کی فصل میں " بذلہ " لکھ کر لکھا گیا ہے : " دیکھو بزلہ " ۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولّف کی نظر میں " بزلہ " مرجّح ہے ۔ اِس کے برخلاف ، آصفیہ میں " بذلہ سنج " اور " بذلہ گو " کو ذال سے لکھا گیا ہے ۔
فارسی لغات کی صورت یہ ہے کہ برہانِ قاطع میں " بذلہ " اور " بزلہ " دونوں ہیں اور ترجیح کا ذکر نہیں کیا گیا ہے ۔ البتہ صاحب بہارِ عجم نے " بذلہ " کو ذال سے لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے : " و بزاے ہوز تحریف "۔ اِس سے معلوم ہوا کہ مولّف کے نزدیک لفظ " بذلہ " ہے ، ذال سے ۔
غیاث میں صرف " بذلہ " (ذال سے) ہے ، اُس کی عبارت یہ ہے :

" بہ معنیِ لطیفہ و سخنِ مرغوب کہ در محفلِ دوستاں آنرا بذل و خرچ تواں کرد برای نشاطِ خاطر "۔

اِس سے ظاہر ہوا کہ مولّف کے نزدیک " بذلہ " عربی لفظ " بذل " سے کچھ نسبت رکھتا ہے اور قرینہ بھی یہی کہتا ہے ۔ چوں کہ فارسی میں بھی " بذلہ " کو مرجّح بتایا گیا ہے (بہارِ عجم ، غیاث) اور اردو میں بھی عام طور سے اِسی طرح لکھا جاتا ہے ، اِس لیے اِس کو ذال سے لکھنا چاہیے : بذلہ ، بذلہ سنج ، بذلہ گو ، بذلہ آفریں ۔
ذرا : اردو کا لفظ ہے ، جو ذرّہ سے بنا ہے ۔ ذرا کے مفہوم میں ذرّہ بھی استعمال کیا گیا ہے ، مگر اب ذرا ہی استعمال (حاشیہ ص ۱۴۱ پر)

کیا جاتا ہے۔ متعدد اہلِ نظر نے یہ راے ظاہر کی ہے کہ اِس لفظ کو
زے سے لکھنا چاہیے، یعنی: زرا۔ اور اِس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ
اب یہ لفظ ہندی ہے، اِس لیے زے سے لکھنا مناسب ہوگا۔ مگر
یہ قاعدۂ کلّیہ نہیں کہ جو بھی لفظ ہندی ہو جائے، اُس کا املا بھی لازماً
بدل جائے۔ اِس کے علاوہ، یہ لفظ عام طور پر ذال ہی سے لکھا

میرحسن کا شعر ہے:

وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب — نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب
(مثنوی سحرالبیان)

ذرّہ سی بات پر رہے انشا سے یوں خفا — کیا جانے کیا بلا ہے، تو کچھ آدمی نہیں
(انشا)

لہ اِس لفظ کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ چوں کہ
"ذرا" اب اردو کا لفظ ہے، اِس معنی میں یہ لفظ نہ فارسی میں ہے نہ عربی
میں، یہ ذرّہ کی ہندی صورت ہے، اِس لیے اِس کو "زرا" لکھنا چاہیے۔ اُردو
کے لُغت نویسوں میں جلاؔل کی یہی راے تھی۔ اِس زمانے میں ڈاکٹر عبدالستار
صدیقی بھی یہی راے رکھتے تھے۔
صاحبِ آصفیہ نے صرف "ذرا" لکھا ہے اور اِس کو "ذرّہ" سے ماخوذ بتایا ہے۔
نور میں بھی "ذرا" ہے۔ صاحبِ آصفیہ نے تو "زرا" کا ذکر ہی نہیں کیا، صاحبِ
نور نے البتّہ "زے" کی فصل میں "زرا" لکھا ہے، مگر اِس کے آگے صرف
یہ لکھا ہے کہ "دیکھو ذرا"۔ مطلب یہی ہوا کہ اصل لفظ "ذرا" ہے۔
لُغت نویسوں میں جلاؔل اِس راے میں تنہا ہیں، اُن کی راے سے متعدد
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۲ پر)

جاتا ہے ۔ آصفیہ و نور دونوں میں اِس کو ذال ہی سے لکھا گیا ہے ۔ اِس کا املا ذال ہی سے صحیح ماننا چاہیے ، یعنی : ذرا ۔ مولوی نذیراحمد صاحب مرحوم نے ایک خط میں لکھا ہے :

حضرات نے اختلاف ظاہر کیا ہے ۔ پہلے جلال کی عبارت نقل کی جاتی ہے :

" ذرا ، ایک کلمہ ہے کہ لفظِ اندک اور قلیل کے معنی کا فائدہ دیتا ہے اور جو اِس لفظ کو ذالِ معجمہ سے لکھتے ہیں ، مولفِ ہیچ مداں کے عندیے میں خطا پر ہیں ، کیوں کہ ذالِ معجمہ کا وجود جب فارسی میں بعض محققین کے نزدیک نہیں ہے ، تو کلماتِ ہندیہ میں کیوں کر مسلّم رکھا جائے گا "۔ (سرمایۂ زبانِ اردو)

صاف ظاہر ہے کہ جلال نے محض اِس وجہ سے " ذرا " کو صحیح نہیں مانا ہے کہ ذال کا وجود فارسی میں نہیں ہے ، پھر ہندی کلمات میں کیوں ہو ۔ لیکن اب یہ بات مان لی گئی ہے کہ فارسی میں ذال کا وجود ہمیشہ سے تھا اور اب بھی ہے ، اِس لیے اُن کی دلیل یا وجہ ، ساقط ہو جاتی ہے ۔ جلال کے زمانے میں اُن کے ایک حریف شوق نیموی نے اُن کے اِس قول سے اختلاف کیا تھا ، اُنھوں نے اپنے رسالے اصلاح میں لکھا تھا :

" ذرا ، بہ معنیِ اندک ، ذال سے لکھنا چاہیے ، نہ زرا زاے ہوّز سے "۔

پھر اِس کے حاشیے مسمّا بہ ازاحِ میں لکھا :

" مگر تعجب ہے کہ جناب جلال لکھنوی نے سرمایۂ زبانِ اُردو میں ذال کی تغلیط اور زاے ہوّز کی تصحیح کی ہے ۔ اور وجہ یہ لکھی ہے کہ ذالِ معجمہ کا وجود جب فارسی میں بعض محققین کے نزدیک نہیں

"تم نے خط میں "ذرا" لکھ کر "زرا" بنا دیا۔ اصل میں "ذرّہ" عربی ہے، "ذرّات" جمع۔ تصرّفاتِ عجم سے مخفف ہوگیا تو کتابتہً "ذرا" درست ہے"۔ (موعظۂ حسنہ۔ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور، ص ۸۵)

ہے تو کلماتِ ہندیہ میں کیوں کر مسلّم رکھا جائے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ لفظ ہندی الاصل نہیں، بلکہ مہنّد ہے۔ اِس کی اصل ذرّہ ہے۔ رائے مشدّدہ کو مخفّف کرکے، ہائے مختفیہ کو الف سے بدل دیا ہے۔ مہنّد الفاظ میں تو حروفِ عربیہ کے ہونے سے کسی کو انکار نہیں"۔

جنابِ اثر لکھنوی نے، جلالؔ کے اِس قول کو نقل کرکے، لکھا ہے:

"اور تمام دلائل سے قطعِ نظر، حضرت مولّف نے جہاں جہاں الفاظ گزر، گزارا لکھے ہیں، بجائے زے کے ذال سے لکھے ہیں۔ ذرا، لفظِ ذرّہ کی مہنّد صورت ہے، تاکہ اِس کے استخراج کی طرف بھی توجہ رہے، ذال کو قائم رکھا، رائے مشدّد کو مفرد کردیا، اور ہ کو الف سے بدل دیا۔ لفظ ذرّہ، عربی ذرّۃ کی مفرّس صورت ہے، کیا کوئی صاحب دکھا سکتے ہیں کہ لفظ ذرّہ، فارسی میں بجائے ذال کے، زے سے لکھا جاتا ہے ....."۔ (فرہنگِ اثر)

ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی مرحوم نے لکھا ہے:

"عربی کا ایک لفظ "ذرّہ" ہے (جس کی ر پر تشدید ہے) اِس کے معنی ہیں کسی چیز کا بہت چھوٹا ٹکڑا۔ اردو میں یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اِنھیں معنوں میں بولا جاتا ہے۔ مگر اِس کے علاوہ ایک اور لفظ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۴ پر)

ذات : ذرا کی طرح ذات (جس کا ہندی مرادف جات ہے) کے متعلق بھی یہی رائے ظاہر کی گئی ہے کہ اِس کو اِن نئے معنوں میں زات لکھنا چاہیے۔ مگر ذرا کی طرح ذات بھی (سارے معانی میں) مستعملِ خاص

بھی ہے جو صرف صفت اور متعلقِ فعل کے طور پر استعمال ہوتا ہے اور جس کے معنی ہیں "تھوڑا" اِس کی ر پر تشدید نہیں اور اخیر میں الف ہے، ہ نہیں۔ مگر بعض لوگوں کو اصرار ہے کہ چوں کہ اِس لفظ کے پیدا ہونے کا باعث عربی لفظ "ذرّہ" ہے، اِس لیے اِسے بھی ذال ہی سے لکھنا چاہیے، یہ نہیں دیکھتے کہ تلفّظ میں ایک چھوڑ، دو دو تصرّف ہوئے، معنوں میں فرق ہوگیا، یہ کہنا چاہیے کہ اردو نے ایک بالکل نیا لفظ پیدا کرلیا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ز سے نہیں لکھا جائے۔
ادیبوں اور شاعروں کی رایوں میں کتنا اختلاف ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ذ سے لکھو، اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اِس کا املا ز ہی سے صحیح ہے، اور ذ سے غلط۔ اصولاً ز کو ترجیح ہے، اِس لیے کہ عربی لفظ "ذرّہ" سے اِسے اب نہ تلفّظ کی رو سے کچھ واسطہ رہا نہ معنی کی جہت سے، بلکہ زرا، ٹھیٹ اردو لفظ ہوگیا"۔

(اردو املا، ہندستانی، ۱۹۳۱ء)

لُغت نویسوں اور دوسرے لوگوں کی اکثریت "ذرا" کی قائل ہے، مروّج بھی اِسی طرح ہے، اِس لیے اب اِس لفظ کا یہی املا صحیح مانا جائے گا۔

لہ "ذات، عربی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: نفس یا نفسِ نفیس یا شخص' نژاد یا قوم وغیرہ کے معنی نہیں ہیں۔ اِن معنوں (بقیہ حاشیہ ص ۱۴۵ پر)

و عام ہے اور اِس لفظ کو بھی اِسی طرح برقرار رہنا چاہیے ۔ اِن دونوں لفظوں کا املا بدلنے کی مطلق ضرورت نہیں ۔

نذیر : یہ رسول اللہ کا ایک نام بھی ہے ۔ ناموں میں اِسی کو لکھنا چاہیے، جیسے : نذیر احمد ، نذیر محمد ۔

میں جو لفظ اردو میں بولا جاتا ہے ، وہ حقیقت میں سنسکرت کے لفظ "جات" سے نکلتا ہے ۔ ہندی میں تَ کا کسرہ اِس وجہ سے گر گیا کہ کسی لفظ کا حرفِ آخر متحرک نہیں ہو سکتا ۔ اردو والوں نے جَ کو زَ کی آواز سے بدل دیا ۔ چاہیے تھا کہ اِس لفظ کو زَ سے لکھتے ، لیکن عربی لفظ ذات کے دھوکے میں اِس کو بھی ذَ ہی سے لکھنے لگے ۔ اِس غلط طریقے کو یقیناً ترک کر دینا چاہیے ، اور جہاں نژاد ، قوم وغیرہ کے معنی ہوں ، وہاں زَ ہی سے لکھنا چاہیے ، جیسے : زات پات ، زات جماعت ، زات رات ، زات کا برہمن ، اُس کی زات کھتری ہے "۔ (ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ، اردو املا ، ہندستانی ۱۹۳۱ء)

صاحبِ آصفیہ نے لکھا ہے :

"اِس معنی میں ہندی جات صحیح ہے ، مگر اردو والوں نے بہ لحاظِ فصاحت اور الفاظ کی طرح ، اِس کو زاے ہوّز سے بدل کر زات کر لیا ۔ عربی دانوں نے اِسے کوئی لفظ نہ سمجھ کر ، ذالِ ثخذ سے اپنے لفظ کے موافق لکھنا شروع کر دیا "۔

صاحبِ آصفیہ نے خود بھی ذات اور اُس کے جملہ مرکبات و محاورات کو ذال سے لکھا ہے اور زے کی فصل میں ، اِس کا (بقیہ حاشیہ ص ۱۴۶ پر)

نظیر کے معنی ہیں : مثل ، طرح ۔ یہ احمدؐ یا محمدؐ یا حسنؓ جیسے ناموں کے ساتھ نہیں آئے گا ۔ یعنی نظیرحسن ، نظیر احمد وغیرہ نہیں لکھا جائے گا ۔ ہاں بہ طورِ تخلص یہ آتا ہے ، جیسے : نظیر اکبرآبادی ۔ لفظ "بے نظیر" نام کے طور پر آتا ہے ، جیسے : بے نظیرشاہ ۔ مثنوی سحرالبیان کے ہیرو کا نام "بے نظیر" ہے ۔ بے نظیر کے معنی ہوئے : بے مثل ۔

مطلق ذکر نہیں کیا ، اِس سے استعمالِ عام کا اندازہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے ۔ نور میں بھی اِس کو صرف ذال سے لکھا گیا ہے ، زے کے باب میں اِس کا گزر نہیں ۔ خانِ آرزو نے اپنے لغت چراغِ ہدایت میں لفظ "جات" کو اصل مان کر "ذات" کو غلط کہا ہے ، مگر طغرا کے اشعار کی بِنا پر آخر میں اِس کو صاحبِ قدرت کا تصرف قرار دے کر ، جواز کے دائرے میں شامل کر لیا ہے ۔ خیال رہے کہ یہاں "زات" کا مطلق ذکر نہیں ، صرف "ذات" کو لکھا گیا ہے ۔ مناسب یہ ہوگا کہ یہاں پر ضروری عبارت نقل کردی جائے :

"ذات ، لفظِ عربی است بمعنیِ نفسِ شے وبمعنیِ قوم نیز آمدہ ۔ و ایں غلط است ، زیرا کہ بدیں معنی "جات" است بجیم ، و ایں لفظِ ہندی الاصل است ۔ طغرا گوید :

گر کشاید از قدح نوشی بطِ مے را دہن
ذاتِ مرغابی است خواہد صاحبِ منقار شد

وایضاً گوید :

شوخ سوسن را بگو دل میر باید قشقہ ات
ذاتِ رجپوت است ، ترسم دست برجمدھر کند

(بقیہ حاشیہ، ص پر)

البتہ خواتین کا نام نذیرن بھی ہو سکتا ہے اور نظیرن بھی ۔

نذر : نظر اور نذر دو مختلف لفظ ہیں ۔ نذر[1] ، نذرانہ ، نذر نیاز ، نذر ماننا ، نذر چڑھانا ، نذر کرنا ، جیسے : یہ کتاب آپ کی نذر ہے ؛ اِن سب میں ذال ہے ۔ کہیں بھی ظ نہیں لکھی جائے گی ۔

نظر گزر ، نظر کردہ (جیسے نظر کردۂ شاہِ مرداں) جیسے مرکبات میں نظر ہے ۔ نظری کے معنی ہیں : وہ چیز جو نامنظور ہو (اہلِ دفتر کی اصطلاح) بدیہی کا مقابل ۔ (منطق کی اصطلاح) ۔

جذر ۔ جزر : یہ دو مختلف لفظ ہیں ۔ " جزر و مد " جس کے معنی ہیں : جوار بھاٹا ، اِس میں " جزر " ہے ۔ اور جذر حساب کی اصطلاح ہے ۔

وسببِ غلط آن است کہ ذال و زا در زبانِ ہندی نیست و ایں را جیم خوانند ، پس طغرا لفظِ جات را ذات بہ ذال فہمیدہ و غلط کردہ ..... وچوں ایں وضع رابے تکلّف اختیار نمودہ ، تبدیلِ جیم بہ ذالِ معجمہ از جہتِ تصرّف باشد کہ بر صاحبِ قدرت جائز است ..."

اردو میں چوں کہ " جات " نہیں بولتے ، اِس لیے اُس کا بدل " ذات " ہی ہوگا ، جیسا کہ طغرا کے یہاں ہے ۔

[1] ایسے میں چلیے ، کیجے تماشا ، اکثر پریاں آئی ہیں
ندّی کے اندر خواجہ خضر کی نذر کے بیڑے پڑتے ہیں

(انشا ۔ کلامِ انشا ص ۱۳۹)

واسطے نذر کے ، کر تو بھی قصیدہ کوئی عرض   اُٹھ ، کمر باندھ ابھی ، جلد چلا چل ، جھٹ پٹ

(انشا ۔ کلامِ انشا ، ص ۳۱۰)

جذام : اِس میں ذال ہے ۔ جذام : کوڑھ ۔ جذامی : کوڑھی ۔ ع :

جذامی خاکِ رہ مل کر بناتے ہیں بدن بگڑا (آتش)

رُذیل ــ رِذالا : ارذل ، ارذال ، رذالت ، رذیل ؛ یہ سب لفظ ایک ہی خاندان کے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں ۔ رذیل کے ساتھ ساتھ ایک لفظ رذالا بھی اردو میں مستعمل ہے ، جس میں رذیل کے مقابلے میں تحقیر کا پہلو زیادہ نمایاں ہے ۔ آصفیہ میں اِس ایک لفظ کے مفہوم و معنی کے لیے اتنے لفظ لکھے گئے ہیں :

" کمینہ ، سفلہ ، پاجی ، فرومایہ ، لُچا ، گُنڈا ، کم ذات ..... شریر ، بدذات ، دنگئی ، بدمعاش ، شوخ ، بےادب ، بےشرم ، گالی گلوچ بکنے والا "

عربی میں " رَذالۃ " کے خاندان میں ایک اور لفظ " رُذالۃ " بھی ہے ، جو فارسی میں آکر ، دستور کے موافق " رُذالہ " ہوگیا ۔ مجازاً " ناکس و فرومایہ شدن " اِس کا مفہوم ہوا ، اور صاحبِ غیاث کے الفاظ میں " بہ معنیِ ناکس و فرومایہ گویند ، جائز باشد " ۔ اردو کا " رِذالا " (یا رذالہ) اِسی " رُذالہ " کی ذرا بدلی ہوئی صورت ہے ۔ تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ پہلے حرف کا پیش ، زیر سے بدل گیا ہے ۔

صاحبِ غیاث نے ایک اور بات بھی لکھی ہے :

---

[1] میرحسن : رذالوں سے ، نفروں سے ، نفرت اُسے
سدا قابلوں ہی سے صحبت اُسے

(مثنوی سحرالبیان)

"و رذالہ بہ کسرِ اول و زاے ہوّز ، چنانچہ شہرت گرفتہ ، بایں معنی در ہیچ کتابِ معتبر یافتہ نشدہ "۔

نور میں بھی غیاث کی اِس عبارت کا لفظی ترجمہ درج کر دیا گیا ہے ۔ مطلب یہ ہوا کہ اِس لفظ کی ایک لکھاوٹ " رِزالہ" بھی ہے ۔

آصفیہ میں اِس کو "رذالہ" لکھا گیا ہے ، نور میں " رذالا " ہے ۔ البتہ مولّف نے یہ صراحت کردی ہے کہ : " رذالت ..... ہندوستان میں آخر کی ت ، ہ یا الف سے بدل لی ہے "۔ گویا اُن کی راے میں یہ " رذالا " بھی ہے اور" رذالہ " بھی ۔ اردو لغات میں اِس لفظ کو اصل کے لحاظ سے ذال سے لکھا گیا ہے اور اکثر صورتوں میں مہنّد الفاظ میں آخر کی ہاے مختفی ، جو فارسی کی چیز ہے ، اردو کے الف سے بدل جاتی ہے ؛ اِس لیے اِس کو ذال اور الف سے لکھنا چاہیے (رذالا)۔

آصفیہ میں اِس کے یہ مرکّبات ہیں : رذاپن ۔ رذالی بات ۔ رذالے کا لٹھ ۔ نور میں دو مثلوں کا اضافہ کیا گیا ہے : (۱) رذالے کی جورو کو سزا طلاق (۲) رذالے کے ناخن ہوئے ۔

ذلالت : یا تو رذالت کے قیاس پر یا ایک دوسرے لفظ ضلالت (گم راہی) سے دھوکا کھاکر ، ذلالت (کمینہ پن) ایک نیا لفظ بنا لیا گیا ہے ۔ یہ لفظ ابھی تک چند لوگوں کی بول چال تک محدود ہے ۔ نیا لفظ بنانے میں کچھ ہرج نہیں ، خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ ضلالت سے اِس کو ممیّز رہنا چاہیے ۔

زلّت : (زاے ہوّز کے ساتھ) اِس کے معنی ہیں : لغزش ۔ صاحبِ غیاث نے لکھا ہے :

"و در خیاباں نوشتہ کہ زلّت بہ معنیِ لغزش کہ عبارتست از کارِ ناپسندیدہ، و ایں لفظ را بطریقِ ادب استعمال کنند، چنانکہ زلّتِ انبیا علیہم السلام"۔

زلّت، زلّات، زَلَل: اِن سب میں پہلا حرف زے ہے اور اُس پر زبر ہے۔

زلّہ: زلّہ ربا اور زلّہ ربائی، یہ دو مرکّب اردو میں مستعمل ہیں۔ پہلا حرف زے ہے۔ زلّہ ربا کے مُرادی معنی ہیں: خوشہ چیں، فیض حاصل کرنے والا، دوسرے سے فائدہ اٹھانے والا۔

رزائی یا رضائی: صاحبِ آصفیہ نے اِس کو مختلف فیہ بتایا ہے، اُن کی عبارت یہ ہے:

"اِس لفظ کے املا کی بابت محققوں کی دو رائے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس کا موجد محمد رضا نامی کوئی ہندی شخص ہوگا، اِس لیے ضادِ معجمہ سے لکھنا چاہیے۔ مگر زباں دانِ فارس کے کلام میں یہ لفظ کہیں نہیں پایا جاتا، ہاں مرزا بیدلؔ نے، جو ہندی نژاد تھے، اِس لفظ کو باندھا ہے۔
بعض کی رائے ہے کہ ہندستانیوں نے اِس لفظ کو رزیدن سے بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ زباں دانانِ ولایت نے نہیں باندھا۔ ایک انگریز کی رائے ہے کہ رجائی سے "رضائی" ہوگیا، کیوں کہ سنسکرت میں रजक بہ معنی کپڑا آیا ہے اور یہی قرینِ قیاس ہے۔ بعض لوگ ردائی منسوب بہ چادر بھی قرار دیتے ہیں"۔

صاحبِ نور نے "رضائی" لکھا ہے۔ اُنھوں نے مثال میں جو شعر نقل

کیے ہیں، اُن میں مناسبتِ لفظی کی رعایت سے اِس لفظ کا یہی املا (رضائی) مرجّح معلوم ہوتا ہے۔ اصل میں صاحبِ نور کی عبارت کا زیادہ حصّہ بہارِ عجم سے ماخوذ ہے۔ بہارِ عجم کی عبارت یہ ہے:

"رضائی، پوششے معروف در ہند کہ در ایامِ زمستاں برسر گیرند۔ ظاہرا از مخترعاتِ رضا نام شخصے است کہ یاے نسبت بداں ملحق کردہ چنیں خوانده اند، پس لفظِ ہندی باشد۔ و ہندی نہ بودنِ مادّۂ ایں لفظ منافیِ مقصود نیست، از ایں جاست کہ در اشعارِ زبان دانانِ ولایت دیده نشده۔ میرزا بیدل:

زتشریفِ حکمت نہ گردیم عریاں چو بیدل بود پوششِ ما رضائی"۔

نور میں بیدل کے مندرجۂ بالا شعر کے ساتھ، رشک کا یہ اردو شعر بھی لکھا گیا ہے:

ردا تھی، ردائے شکیب و توکّل
رضائے خدا تھی، رضائی علی کی

دونوں شعروں میں لفظی مناسبت "رضائی" کی متقاضی ہے۔

یہ لفظ اردو نژاد نہ سہی، ہندستان نژاد ضرور ہے۔ چوں کہ اِس کو ض سے لکھا جاتا رہا ہے، اِس لیے اِسی املا کو برقرار رکھنا مناسب ہوگا۔

(۲)

ذال اور زے کا سب سے زیادہ جھگڑا، بل کہ گڑبڑ، فارسی کے مصادر: گذشتن، گذاشتن، گذاردن، پذیرفتن اور اُن کے مشتقات میں نظر آتی ہے۔ غلطی سے کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ

ذال فارسی کا حرف نہیں، عربی سے مخصوص ہے۔ مرزا غالب نے، صدیقی صاحب مرحوم کے الفاظ میں "پہلے نادانی سے اور پھر سینہ زوری سے" خاص طور پر اصرار کیا کہ فارسی کے اِن مصادر کو اور اِن کے مشتقات کو زے سے لکھنا چاہیے۔اِس سے املا میں غلط نگاری اور معنی کے لحاظ سے بے امتیازی نے فروغ پایا۔اُس کے اثرات آج تک کارفرما ہیں۔ اِس غلط فہمی اور غلط نگاری نے کس طرح فروغ پایا، اِس کا اندازہ ایک مثال سے کیا جا سکتا ہے، مولّفِ آصفیہ نے "گذار" کے ذیل میں لکھا ہے:

"پہلے فرہنگ نویس اِس قسم کے الفاظ جیسے گزارہ، گزار، گزارش، گزر وغیرہ ذالِ معجمہ سے لکھا کرتے تھے۔لیکن حال کے محققوں نے زاے ہوّز کے ساتھ اِن کا املا صحیح قرار دیا ہے، کیوں کہ ذالِ معجمہ زبانِ فارسی میں نہیں آتی اور یہ تمام الفاظ جو کافِ عجمی اور ذالِ معجمہ کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، فارسی الاصل ہیں، پس ذالِ معجمہ سے اِن کا املا لکھا جانا کیوں کر تسلیم کیا جائے۔

اگلے فرہنگ نویسوں نے اپنی عربی زبان دانی کے سبب اِس امر پر توجہ نہیں فرمائی، اِس کا تصفیہ قاطعِ برہان میں حضرتِ غالب نے خوب کیا ہے۔"

غالب نے آخر تک یہ بات نہیں مانی کہ فارسی میں ذال ہے اور یہ کہ گذشتن وغیرہ کو ذال سے لکھنا چاہیے۔ قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے مضمون "غالب اور ذالِ فارسی" میں لکھا ہے:

"غالب پر کلکتے میں جو اعتراض ہوئے تھے، اُن میں سے ایک یہ بھی

تھا کہ وہ گذاشتن ، گذشتن اور پذیرفتن کو "ز" سے لکھتے ہیں ۔ اِس اعتراض سے واقف ہونے کے بعد ، غالبؔ نے جو خط مرزا احمد بیگ خاں طپاںؔ کو بھیجا تھا ، اُس میں اُنھوں نے اقرار کیا ہے کہ اِن لفظوں کو "ز" سے لکھتا ہوں ، مگر وہ اِسے غلطیِ املا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں"۔
(گنجینۂ غالب ، ص ۳۴)

اِس مضمون کے آخر میں قاضی صاحب نے لکھا ہے :

"خاتمۂ کلام یہ ہے کہ ایرانی "ذ" کو فارسی حروف میں شمار کرتے رہے ہیں۔ "گزاردن" "ز" سے اور "گذاردن" "ذ" سے ، دونوں صحیح ہیں مگر مختلف معانی میں ، اور یہی بات ہندستانی فارسی داں کہتے آئے ہیں ۔ اُردو میں غالبؔ کی وجہ سے گزشتہ ، پزیرا وغیرہ کا غلط املا رائج ہوگیا ہے ، وقت آگیا ہے کہ اُس سے احتراز کیا جائے "۔

غالبؔ کی کیا تخصیص ، خود لُغات میں اِس سلسلے میں اچھا خاصا خلطِ مبحث رہا ہے ، مگر اہلِ نظر برابر اِس پر ٹوکتے بھی رہے ہیں ۔ دو اقوال سے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ صاحبِ غیاثؔ نے "گذاردن" کے ذیل میں لکھا ہے :

"و بعضے محققاں نوشتہ اند کہ گذاردن بہ ذالِ معجمہ ، بہ معنیِ ترک کردن و بہ زاے ہوّز ، بہ معنیِ ادا کردن "۔

پھر "گزاردن" کے تحت لکھا ہے :

"و در شرحِ بوستاں از عبدالواسع مرقوم است کہ گزاردن کہ بہ معنیِ ادا کردن باشد ، بہ زاے ہوّز است ۔ و گذاردن بہ معنیِ ترک کردن باشد بہ ذالِ معجمہ "۔

یہی صحیح بات ہے ۔ برہانِ قاطع کے ایرانی مرتب ڈاکٹر محمد معین نے اِس کے حواشی میں جگہ جگہ اِس کی صراحت کی ہے ۔ مثلاً صاحبِ برہان نے "گزارش" کے تحت اِس کے اصل معانی کے علاوہ ، یہ بھی لکھا ہے کہ : " و بہ معنیِ گذشتن ہم گویند "۔ مرتب نے حاشیے میں لکھا ہے : " باین معنی گذشتن است "۔

مختصر یہ کہ چھوڑنے اور چلنے کے معنی میں گذشتن ، گذاشتن اور گذاردن کو ذال سے لکھا جائے گا ۔ اور ادا کرنے یا شرح و تفسیر کے معنی میں گزاردن کو زے سے لکھا جائے گا ۔ فارسی کے اربابِ نظر اب اِس فرق کو خاص طور پر ملحوظ رکھتے ہیں ، احمد بہمنیار نے اپنے گراں قدر مقالے " املای فارسی" میں لکھا ہے :

" و یکی از این کلمات گذاردن و مشتقات آنست کہ در خط فارسی ہم بہ ذال و ہم بہ زی نوشتہ میشود ، و در نوشتن رعایت این نکتہ را لازم شمردہ اندکہ اگر بہ معنی شرح و تفسیر و ادای سخن یا حق یا وام یا نماز و مانند آن باشد ، بہ زی ، و اگر بہ معانی دیگر باشد ، بہ ذال نویسند "۔

(لغت نامۂ دہخدا)

اب قاعدہ یہ ہوا کہ چلنے چھوڑنے اور پار کردینے کے معانی میں گذاردن ، گذشتن ، اور گذاشتن کو اور اِن کے مشتقات کو لازماً ذال سے لکھا جائے گا ، جیسے :

گذشتہ ، یارانِ گذشتہ ، گذشتگاں ، رفت گذشت ، سرگذشت ، واگذاشت ، گذرگاہ ، گذرگاہِ خیال ، راہ گذر ، درگذر ، راہ گذار ، نیزہ گذار ، تیرِ جوشن گذار ، گذراں ، گذار ۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال ہے تصور میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

— (غالب)

دل ، گذرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی گر نفس ، جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

— (غالب)

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

— (غالب)

کیا صعب گذار ہے رہِ حمد جبریل کا پانو لڑکھڑایا

— (مومن)

نگاہِ دیدۂ نقشِ قدم ہے ، جادۂ راہ گذشتگاں ، اثرِ انتظار رکھتے ہیں

— (غالب)

گذشتگانِ زمانہ کا ذکر تم نہ کرو یہی غم و الم اُس روزگار میں بھی تھا

—

ایسا ترا رہ گذر نہ ہوگا ہر گام پہ جس میں سر نہ ہوگا

— میر (کلیات، مرتبہ آسی، ص ۲۱)

کرے گا کون قیامت کو ریسماں بازی دل و دماغِ گذارِ صراط مجھ کو نہیں

— (میر (کلیات، مرتبہ آسی ص ۱۰۴۱)

بوئے گل ، رنگِ چمن، اور یہ عمرِ گذراں سب ٹھہر جائیں گے ، کوئی اُسے روکے تو سہی

— (میکش اکبرآبادی)

ادا کرنے ، پیش کرنے ، شرح کرنے کے معانی میں ، گزاردن اور اِس کے مشتقات کو زے سے لکھا جائے گا ، جیسے :

گزارش ، باج گزار ، نماز گزار ، تہجد گزار ، خدمت گزار ، مال گزار ،

مال گزاری ، شکر گزار، عبادت گزار ، عرض گزار ، عرضی گزار ، پیام گزار، شکوہ گزار ۔

پہلا لفظ ہے : گزارش ، یہ لفظ درخواستوں اور خطوں میں اکثر لکھا جاتا ہے۔ اِس کے معنی ہیں : عرض کرنا ، پیش کرنا ۔ اگر اِس کو " گذارش " (ذال سے) لکھا جائے گا تو یہ گذاشتن سے مشتق قرار پائے گا اور اِس کے معنی ہوں گے : چھوڑنا ۔ اور اِس صورت میں یہ بالکل مختلف لفظ ہو جائے گا۔

بعض مثالیں :

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
(غالب)

خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ، ورنہ میں اسدؔ سرتا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا
(غالب)

ہیں مخاصم بھی سخت شکر گزار عمر جو کٹ گئی بہ آسانی
(مومن)

کیا پیام اور کیا پیام گزار جس کی ہر بات وعظِ عرفانی
(مومن)

اے شہِ پایہ فزا مدح سرا گر تیرا پستیِ بختِ نگوں سارسے ہو شکوہ گزار
(مومن)

پذیرفتن کے معنی ہیں : قبول کرنا ۔ اِس میں ذال ہے ۔ اِس کے سارے مشتقات میں ذال آئے گی ، جیسے :

پذیرفتہ ، پذیرا ، پذیرائی ، دل پذیر ، اثر پذیر ، رقم پذیر ، جلا پذیر، خلل پذیر ۔

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے صفحہ ہائے لیالی و ایام
(غالب)

جلا پذیر ہو میرے غبارِ دل سے، تو زنگ فنائے آئنہ کے بعد بھی نہ ہو زائل
(مومن)

خلل پذیرِ رطوبت ہوا دماغِ بہار عجب کہ سبزۂ خوابیدہ کو نہ ہو کابوس
(مومن)

گزیدن (پسند کرنا، اختیار کرنا) اور گزیدن (کاٹنا، ڈنک مارنا)، اِن دونوں مصدروں میں زے ہے۔ اِن کے مشتقات، جیسے: گزیدہ، برگزیدہ، برگزیدگی، جاگزیں، خلوت گزیں، حق گزیں ــــــ اور مارگزیدہ، سگ گزیدہ، مردم گزیدہ وغیرہ؛ اِن سب میں زے آئے گی۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئنے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

گزند اور گزاف، اِن دونوں لفظوں میں زے ہے۔ اسی طرح گزیر اور ناگزیر میں بھی زے ہے۔ ع:

ناگزیرِ ہستی ہیں فصلِ گل کے ہنگامے۔

گزرنا، گزارنا، اردو کے مصدر ہیں۔ دونوں مصدروں میں اور اُن کے مشتقات میں زے لکھی جائے گی، جیسے:

گزرا، گزرا ہوا، گزر گیا، گزر جانا (ع: موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے)، گزرتے رہنا، گزار دینا (ع: ہنس کر گزار، یا اسے روکر گزار دے)، گزار لینا، گزارا (جیسے: خدا کا شکر ہے، گزارا

ہو ہی جاتا ہے۔ یا: ہمارا وہاں گزارا نہیں ہوگا۔ یا: گزارے کی رقم ملے جا رہی ہے۔ یا جیسے

جب تک نہ غلامانِ علی کا ہو گزارا
رضوان پکارے ہے کہ جنّت نہیں بھرتی

انشا۔ (کلامِ انشا، ص ۲۲۷)

گزربسر، گزرہی جائے گی، گزار دی، گزرتے رہنا گزرانتا میں بھی زے لکھی جائے گی۔

ایک لفظ ہے: گزری۔ اِس کے معنی ہیں: "وہ بازار جو شام کو رہ گذر پر لگتا ہے" (آصفیہ)۔ اِس کی ایک صورت "گدڑی" بھی ہے۔ اِس کو زے سے لکھا جائے گا۔ مثلاً:

والہِ زلف و رخ و خال و خط و حُسن و نمک — مت ہوا ے دل کہ یہ ہے سب گزری کا عالم

انشا۔ (کلامِ انشا، ص ۱۳۳)

کیا جہانِ گذراں میں بھی لگی ہے گزری — مول لے جاتے ہیں غم، یاں سے گزرنے والے

داغ (آصفیہ)

بیٹھے ہیں دل کے بیچنے والے ہزار ہا — گزری ہے اُس کی راہ گذر پر لگی ہوئی

ذوق (آصفیہ)

یہ بات ایک اصول کی حیثیت سے یاد رکھنے کی ہے کہ اُردو، ہندی، انگریزی وغیرہ کے الفاظ میں ہمیشہ زے لکھی جائے گی، ذال کا تعلق صرف فارسی اور عربی الفاظ سے ہے۔ جیسے: جب تک نہ غلامانِ علی کا ہو گزارا۔ اور جیسے: دل و دماغِ گذارِ صراط مجھ کو نہیں (میر)۔ "گزارا" میں زے ہے اور دوسرے مصرعے کے "گذارِ صراط" میں ذال لکھی جائے گی۔

۳

ژ، فارسی کا خاص حرف ہے۔ فارسی میں اسے "زاے فارسی" کہتے ہیں۔ مکرمی مسعود حسین[1] خاں صاحب کا خیال ہے کہ یہ حرف، اردو میں بس دو تین لفظوں میں آتا ہے، اور اُن میں سے ایک دو کو ز سے لکھا جاسکتا ہے؛ مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ یہ ایسے متعدد الفاظ کا جُز ہے جو اُردو میں بہ کثرت مستعمل رہے ہیں، اور مستعمل ہیں۔ یا تو ایسے سب حرفوں کو ختم کر دیا جائے، جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ "صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مُردہ لاشیں ہیں جسے اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے"۔ اگر یہ ممکن نہیں، تو پھر ایک ہی حرف پر یہ عمل کیوں جاری ہو، اور حرف بھی ایسا، جس کا بدل موجود نہیں۔ اب رہی ژ کو ز سے بدلنے کی بات؛ تو یہ ویسی ہی بات ہے جیسے ہندی والے، ز کو ج سے بدلنے پر مصر ہیں۔ اگر "عزّت" کو "اِجّت" کہنا بھلا نہیں معلوم

---

[1] "اِن میں سے (ژ) سے مرکّب الفاظ اِس قدر کم ہیں کہ اِس کا اخراج کیا جاسکتا ہے۔ صرف چند لفظ ہیں: اژدحام، اژدہا۔ جن کی دوسری شکل اَزدحام اور اَزدہا بھی رائج ہے۔ لیکن مژہ اور مژگاں کا کیا کیجیے گا۔ اور خاص طور سے غالب کی "مژہ ہاے دراز" کا۔ صرف ایک لفظ کی خاطر اِسے آپ اردو صوتیات میں رکھنا چاہیں، تو مجھے کوئی اعتراض نہیں"۔

(ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔ رسالۂ اردوے معلّٰی (دہلی) لسانیات نمبر، ص ۱۱۶)۔

ہوتا، تو "مژدہ" کو "مُزدہ" کہنا کیوں بھلا لگنے لگا۔ "مزدہ" بھی "اجت" سے کچھ کم نہیں۔

یہ حرف اُردو کے حروفِ تہجی میں شامل ہے اور شامل رہنا چاہیے۔ جن لفظوں میں یہ حرف آتا ہے، اُن کو اُسی طرح لکھا جائے گا، جس طرح وہ اب تک لکھے جاتے رہے ہیں۔

ذیل کے الفاظ میں ژ ہے، اور اِن کو لازماً ژ کے ساتھ لکھا جائے گا۔ اِن میں سے اکثر لفظ اُردو میں بالعموم مستعمل ہیں، اور بعض لفظ اساتذہ کے کلام میں ملتے ہیں۔

اژدر، اژدہا (اژدہائے فلک)، اژدھات، ارژنگ، پژمردہ، پژمردگی، پژوہ (حق پژوہ)، دژم (افسردہ، آشفتہ، بدماغ) ژالہ، ژالہ باری، ژاژ خائی (بیہودہ گوئی)، ژرف (گہرا)، ژولیدہ، ژولیدگی، ژولیدہ مو، ژیاں (شیرِ ژیاں)، کژدم، مژدہ، مژہ، مژگاں، نژاد، نژند (سرنگوں، پست، خوار، سرگشتہ)، واژوں، واژونہ اثر، بورژوا، ٹیلی وژن، آنارے ژید۔

بعض مثالیں:

جوشِ سودا میں جو آئی لہر زلفِ یار کی ‏ صورتِ اژدر مجھے ہر ایک جادہ ہوگیا

(برق)

کھول کر زلف کہا، اژدرِ موشا کیا ہے ‏ ہاتھ چمکا کے وہ بولے، یدِ بیضا کیا ہے

(رشک)

زلف کا سودا جو ہے، جنگل کی یوں کرتا ہوں سیر ‏ اژدہے کی ہے سواری، اور کوڑا سانپ کا

(ناسخ)

مٹایا یار کی تصویر نے رنگ اِس قدر اُس کا قلق با تقویمِ پارینہ ہوا آرژنگ مانی کا

(قلق)

یہ چاروں شعر امیر اللغات سے ماخوذ ہیں۔

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں غالب، منہ بند ہو گیا ہے گویا

(غالب)

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق مژدۂ قتل مقدّر ہے جو مذکور نہیں

(غالب)

آئی یک عمر سے معذورِ تماشا نرگس چشمِ شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز

(غالب)

اسدؔ، ہے آج مژگانِ تماشا کی حنا بندی چراغانِ نگاہ و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے

(غالب)

خُمِ واژوں فلک، سبوے تہی دورِ بگذشتہ، گردشِ ساغر

(مومن)

طالعِ پست کی نسبت سے مرے، واژوں چرخ بختِ تیرہ سے مرے، روزِ مہرِ انور، تار

(مومن)

اشکِ واژ و نہ اثر، باعثِ صد جوش ہوا ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

(مومن)

کمی کیا صیدِ معنی کی کہ اپنے پاس ہے انشاؔ
قیامت ایک شاہینِ نگاہِ ژرف کا جوڑا

(انشا۔ کلامِ انشا، ص ۴۳)

ہوائے ابر و باراں میں جو کچھ لہرا آگئی انشا
تو ساقی نے بھرا خونِ نگاہِ ژرف شیشے میں

(انشا ۔ کلامِ انشا، ص ۱۴۶)

منت وزاری سے حسرت کی نہیں ہوتا ہے نرم
دل بتوں کا سنگ ہے، فولاد ہے، اژدھا ہے

(جعفر علی حسرت (کلیاتِ حسرت، ص ۵۳۹)

دیکھ انشا کہ ایک حور نژاد
ہے کھڑی دوں کو، چق کی اوٹ لگی

(انشا ۔ کلامِ انشا، ص ۲۲۰)

رام پور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ عالم

(غالب (نسخۂ عرشی، ص ۲۶۵)

ترے زورِ بازو کی طاقت عیاں ہے
کہ بُز، جس کی قوت سے، شیرِ ژیاں ہے

(میر (کلیات، مرتبۂ آسی، ص ۷۷۵)

"زنہار میرے سوالوں کا جواب، جیسا طریقہ شرفا کا ہے، دیجیے گا، اور بدزبانی اور ژاژ خائی نہ کیجیے گا"۔

(غالب ۔ قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ، ص ۱۸۸)

جن لفظوں کو اوپر لکھا گیا ہے، اُن میں سے بس ایک لفظ "نژاد" ایسا ہے، جس کو کبھی کبھی "نزاد" لکھ دیا جاتا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ صحیح لفظ "نژاد" ہے۔ اِس کے برخلاف، "اژدحام" میں اصلاً زے ہے، مگر اِس کو کبھی

"اژدحام" بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی درست نہیں۔ صحیح لفظ "ازدحام" ہے۔

ہاں، مثالوں کی تعداد کچھ زیادہ ہوگئی ہے، مگر جس طرح اِس حرف کے وجود یا استعمال سے انکار کیا گیا ہے؛ اُس کے پیشِ نظر، اِن مثالوں[1] کو بے جا نہ سمجھا جائے گا۔

---

[1] قدمانے فارسی کے بعض ایسے لفظوں کو بھی استعمال کیا ہے، جو اردو میں ویسے استعمال نہیں کیے جاتے۔ جیسے ایک لفظ ہے: فاژہ، میرؔ کے اِس شعر میں یہ نظم ہوا ہے:

ہے کشش، فاژۂ تنِ خوباں
دائرہ، دورِ دامنِ خوباں

(کلّیات، مرتبۂ آسی، ص ۷۷۰)

تلاش کرنے پر بعض اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔

سؔ جب کبھی لفظ کے شروع یا درمیان میں آتا ہے، اُس صورت میں جلدی یا بے پروائی کی وجہ سے، کبھی کبھی اِس کا ایک دندانہ، یا اِس کے بعد والے حرف کا شوشہ غائب ہو جایا کرتا ہے۔ خاص طور پر اُس وقت جب اِس سے پہلے یا اِس کے بعد کوئی حرف بؔ، تؔ، یؔ کی طرح کا ہو، جو خود ایک شوشے سے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ جیسے: ہندستان، کہ اِس کو جلدی میں "ہندستان" لکھ دیا جاتا ہے یا جیسے: مستیاں، کہ یہ "مستیاں" رہ جاتا ہے۔

سؔ کے بعد جب ایک یا ایک سے زیادہ حرف آئیں جن کو شوشے سے ظاہر کیا جاتا ہے، اُس صورت میں اچھا یہ ہوگا کہ دندانے دار سؔ کے بجائے، کشش دار سؔ بنایا جائے۔ اِس طرح شوشوں کا ہجوم بھی نہیں ہوگا اور غلط نویسی کا امکان بھی کم ہو جائے گا۔ جیسے: یاسین، سُننا۔ خاص کر جب دو سؔ یا شؔ ایک ساتھ آئیں یا ایک دو حرف کے فصل سے آئیں، تب کشش دار شؔ یا سؔ لکھنا مناسب ہوگا، جیسے: کشش،

کشمکش، کشمش۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ دندانے دار صورت بنائی جائے اور ایک جگہ کشش دار، جیسے: شمس۔

ایک بات اور: جب کسی لفظ کے متصل جز میں شؔ اور سؔ یک جا ہوں، اِس صورت میں اچھا یہ ہوگا کہ شؔ کو کشش دار لکھا جائے اور سؔ کو دندانے دار۔ اِس سے امتیاز کا رنگ زیادہ نمایاں رہے گا، جیسے: شمسی۔ ہاں لفظ کے منفصل اجزا میں اگر یہ یک جا ہوں، اِس صورت میں دونوں کو کشش دار لکھنا کچھ بے جا نہ ہوگا، جیسے: شارستان۔

سؔ یا شؔ اور سؔ یا شؔ میں کچھ فرق نہیں، دونوں صورتیں یک ساں ہیں۔ کون سی صورت کہاں پر اختیار کی جائے، اِس کا تعلّق اصل میں تو اِس سے ہے کہ لکھنے میں جلدی، پڑھنے میں آسانی اور اِن دونوں کے بعد یہ کہ خوش نمائی کا تقاضا کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی مرحوم نے، میرے خط کے جواب میں لکھا تھا:

"س اور سں ایک ہی چیز ہے، دونوں پر تین نقطے (...) لگا دیجیے تو دونوں شؔ ہیں۔ شکل سؔ یوں وجود میں آئی کہ منشیوں کو جلدی لکھنا پڑتا تھا اور دندانے بنانے میں انگلیوں کو روکنا ضروری؛ اِس لیے سؔ میں وقت بھی بچا اور ہاتھ زحمت سے بچا۔ ٹائپ میں یہ جھگڑا نہ رہا۔"

فارسی کے بعض لفظ ہیں جن کو کسی نہ کسی وجہ سے، سؔ کے بجائے صؔ سے لکھا جانے لگا (جب کہ صؔ عربی سے مخصوص ہے)۔ ایسا ہی ایک لفظ ہے: صد۔ اِس کے معنی ہیں: سَو۔ قاعدے سے تو اِس کو سؔ سے (سد) لکھا جانا چاہیے تھا، مگر خود فارسی میں اِس کو صؔ سے (صد) لکھا جاتا

ہے ۔ فارسی لغات میں اِس کی وجہ بھی لکھ دی گئی ہے ۔

اِسی طرح کا ایک لفظ اور ہے : شصت ۔ اِس کے معنی ہیں : ساٹھ ۔ اِس میں بھی س آنا چاہیے تھا ، مگر اب اِسی طرح مستعمل ہے ۔ صد اور شصت ، اِن دونوں لفظوں کو اِس لیے ص سے لکھا جانے لگا کہ سد اور شست سے التباس نہ ہو سکے ، جن کے معانی مختلف ہیں ۔

آج کل فارسی والوں کا خیال یہ ہے کہ اِن دونوں لفظوں کو س سے لکھنا چاہیے ۔ مگر اردو میں یہ ص سے مستعمل ہیں ، اور اِن کو اِسی طرح رہنا چاہیے ۔ صد آفریں ، صد رحمت ، صد برگ ، صد پارہ ، صد چاک ، صد وسی سال ، صدہا ، صد ہزار ، صدی ، صدیاں ، صدیوں ، عام طور پر اِسی طرح لکھے جاتے ہیں ، اور اِن کو اِسی طرح لکھا جانا چاہیے ۔

ساٹھ کے عدد کے لیے "شصت" اور نشانے یا مچھلی کے شکار کے کانٹے وغیرہ معانی کے لیے "شست" لکھا جائے گا ۔ اِسی طرح دیوار کے معنی میں "سد"

---

[1] یہ توجیہ صاحبِ غیاث نے پیش کی ہے :

"شست ، بالفتح ، نامِ عددِ معروف کہ آنرا شصت بصادِ مہملہ نویسند ، بجہتِ دفعِ التباس از معانیِ دیگر ، و آنہا این است ....."

"صد ، بالفتح ، عددِ معروف ، لفظِ فارسی است ۔ دراصل بہ سینِ مہملہ بود ، قدما بہ جہتِ رفعِ اشتباہ بہ کلمۂ دیگر ، کہ سد باشد ، بہ معنی حائل و مانع ، اسمِ عدد را بہ صاد نوشتند" ۔

[2] اُردو میں اِس لفظ شست میں ایک تصرّف یہ بھی ہوا ہے کہ شین کو مکسور بولتے ہیں (نور ۔ آصفیہ)

(بقیۂ حاشیہ ص ۱۶۷ پر)

اور سَو کے لیے "صد" لکھا جائے گا۔

قفس: اِس لفظ کو سؔ اور صؔ دونوں سے لکھنا درست ہے (قفص، قفس) فارسی میں دونوں طرح مستعمل ہے، مگر اردو میں عام طور سے قفسؔ لکھا جاتا ہے اور اِس چلن کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اُردو میں اِس کا املا صرف سؔ سے (قفس) ماننا چاہیے۔

ہاں یہ ملحوظ رہے کہ اردو کی بعض قدیم تحریروں میں اور بعض مطبوعہ کتابوں میں بھی اِس کا املا "قفص" ملتا ہے۔ یہ عربی کی تقلید تھی، کیوں کہ عربی میں اِس کو عام طور پر "قفص" لکھا گیا ہے۔

قصّاب: یہ لفظ صؔ سے لکھا جاتا ہے اور اِس میں کچھ جھگڑا نہیں، مگر "قسائی" اور "قصائی" میں ذرا اُلجھن ہوتی ہے۔ "قصّاب" کی رعایت سے "قصائی" مرجّح معلوم ہوتا ہے مگر چلن میں "قسائی" نظر آتا ہے۔ اُردو کے لُغت نویسوں (نور و آصفیہ) نے "قسائی" کو مستعمل بتایا ہے، بل کہ صاحبِ آصفیہ نے تو یہ لکھا ہے کہ اِس کو سؔ سے لکھنا واجب ہے:

"چوں کہ یہ لفظ قص سے بگاڑ کر قسائی اردو زبان میں بنا لیا گیا ہے اور عربی الاصل نہیں رہا، اِس وجہ سے سینِ مہملہ سے لکھنا واجب ہے۔ چناں چہ اِس کے تمام مشتقات بھی اُسی جگہ دیے گئے ہیں"۔

ساٹھ کے عدد کے لیے "شصت"، ہی لکھا جاتا ہے۔ نور میں "شست"، کے اور سب معانی لکھے گئے ہیں، مگر عددِ معروف (۶۰) کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ ساٹھ کے معنی میں اُس میں "شصت"، ہی لکھا گیا ہے۔ مزید صراحت اِس طرح کی گئی ہے: "رسمِ خط صاد سے ہے"۔

نفائس اللغات و سرمایہ میں بھی "قسائی" لکھا گیا ہے۔ صاحبِ نفائس کے اندازِ نگارش سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ "قسائی" کو عربی لفظ "قصّاب" کا اردو مرادف مانتے ہیں:

"قسائی، بہ فتحِ اوّل، کسیکہ گوشت فروشد، بہ عربی آنرا قصّاب و مُشقّص ....."۔

عربی کا ایک لفظ ہے "قساوۃ" کچھ عجب نہیں کہ معنوی ربط کی بنا پر، "قسائی" کی یہ صورت بنی ہو۔ "قسائی پن" کا وہی مفہوم ہے جس کے لیے "قساوت" استعمال کیا جاتا ہے۔ جلالؔ نے سرمایہ میں لکھا ہے:

"قسائی، سوا قصّاب کے، کنایتاً شخصِ ظالم اور جفا پیشہ کو بھی کہتے ہیں"۔

اِس سے اِسی خیال کی تائید سی ہوتی ہے کہ قسائی، قساوت سے تراشا گیا ہے۔

اردو میں اِس کو "قسائی" لکھنا چاہیے۔ اِس کی تانیث "قسائنی" یا "قسینی" ہوگی۔

مسالا: دہلی میں اِس لفظ کا املا "مصالح" ملتا ہے۔ وہاں کے لُغات اور کتابوں میں اِس لفظ کی یہی صورت نظر آتی ہے۔ آصفیہ میں مصالح، گرم مصالح، مصالح ٹانکنا، مصالح کا تیل، مصالح دار، مصالح کی سِل، مصالح رگڑنا موجود ہیں۔

فارسی میں بھی اِس لفظ کا یہی املا ہے (بہارِ عجم، چراغِ ہدایت، غیاث) امیر مینائی نے ایک خط میں اِس کا املا "مسالا"[۱] بتایا ہے۔ مولفینِ نور و

۱۔ "مسالا" معلوم ہوتا ہے کہ "مصالح" کا مہنّد ہے (بقیہ حاشیہ ص ۱۶۹ پر)

سرمایہ نے بھی یہی لکھا ہے۔ گویا اہلِ لکھنؤ کے نزدیک یہ "مسالا" ہے۔
اب اِس لفظ کو عام طور پر "مسالا" لکھا جاتا ہے۔ اِسی املا کو اختیار کرنا
چاہیے۔ مصالح (بہ کسرِ لام) مصلحت کی جمع ہے اور اِسی حیثیت سے مستعمل
بھی ہے، اور اِس لحاظ سے بھی مناسب ہوگا کہ عمارت کے سامان (چونا،
گارا وغیرہ) ہانڈی کے سامان، اور گوٹا کناری وغیرہ کے لیے "مسالا"

جو عربی میں مصلحت کی جمع ہے، اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور
ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور یہی محلِّ استعمال ہندیوں کے
یہاں بھی ہے، جیسے عمارت کے لیے چونا، سرخی وغیرہ، تالیف کے لیے وہ کتابیں
وغیرہ جن سے اُس تالیف میں مدد مل سکے، کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کے
لیے گوٹا، پٹھا، بنت کناری، کھانے کے لیے لونگ، الائچی، دھنیا، مرچ، بال
دھونے کا مسالا، محرم کا مسالا، مسالے کا تیل۔
دلّی والے اصل کی طرف جاتے ہیں، مگر چوں کہ زبانوں پر "مصالح" نہیں ہے،
یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا، گرم مصالح ہوگیا، کُرتی
میں مصالح کم پڑا، اب کے محرم کا مصالح ہم کو نہیں دیا، اِس لیے میری رائے
ہے کہ اردو میں جو بولیں، وہی لکھیں۔ جس طرح "مسالا" بولتے ہیں، اُسی طرح
لکھا بھی جائے، اور یہی مشربِ متوسّطین و متاخرین شعراے لکھنؤ کا ہے، جیسا
کہ رشک نے اپنے لُغت میں لکھا ہے:

"مسالا، میمِ مفتوح، سینِ مہملہ ولام بہ الف کشیدہ، ضروریاتِ ہر چیز
باشد کہ بداں ضروریات، رونق ولذّتِ آں چیز شود۔ ظاہرا ایں
لغت از مصالح باشد"۔ (بقیہ حاشیہ ص ۱۷۰ پر)

لکھا جائے۔ بعض اور لوگوں نے بھی یہی کہا ہے:
ہاں، اِس کا املا "مسالا" ہوگا، یعنی آخر میں الف لکھا جائے گا۔ ہائے مختفی نہیں آئے گی۔

اور اِسی کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت گلشنِ فیض میں کی ہے۔ منیر مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے:
نمک چھڑکنے کو مانگے جراحتِ دل پر — جو دیکھے آپ کے موبات کا مسالا، سانپ
"کالا سانپ" اور "پالا سانپ" زمین ہے۔ جان صاحب کے ایک شعر سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ محلاتِ لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی:
اے جان، ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر — انگیا کا میری سارا مسالا مسل گیا"۔
(مکتوبِ امیر بہ نامِ نورالحسن نیّر کاکوروی مولفِ نوراللغات)
مکاتیبِ امیر مینائی، مرتبۂ ثاقب)

لہ یعنی جلال، مولفِ نور، رشک، جن کا حوالہ امیر کے خط میں آچکا ہے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا ہے:

"مسالا ہر معنی میں س اور الف سے لکھنا چاہیے۔ گرم مسالا، مسالا (گوٹا کناری وغیرہ)، مسالا (کسی چیز کے اجزا یا ضرورمات یا لوازمات وغیرہ)۔ "مصالح" لکھنا یوں غلط ہے کہ یہ مصلحت کی جمع ہے، ہمارے لفظ کو اِن معنوں سے اصلاً تعلق نہیں۔
مزید برآں یہ کہ تلفّظ بھی مختلف ہے۔ یہی حال "مصالحہ" کا ہے۔ "مصالحہ" کے معنی ہیں: "لڑنے والے دو فریقین کے مابین صلح"۔
(اُردو املا)

مسرا : جیسے : اُنکار ناتھ مسرا ۔ اِس کو س سے لکھنا چاہیے ۔ پہلے اِس کو "مصرا" بھی لکھا جاتا تھا ، اب بھی بعض لوگ ص سے لکھتے ہیں ۔ اِن سب لفظوں کو لازماً س سے لکھا جائے گا :

مسر ، مسرا ، مسرانی ، مسرجی ۔

صحنک : یہ لفظ متفقہ طور پر اِسی طرح ہے (ص ۔ ح) ۔ مگر آصفیہ میں س مع ہائے ہوز کی فصل میں لکھا ہوا ہے : "سہنک ، اسمِ مونث ، دیکھو صحنک ؎ آج نوچندی ہے ، سوداسری سہنک کا تمام

چوک سے جا کے تمھیں لائیو بی سیدانی (رنگین)"

اِس کے بعد ص مع ح کی فصل میں اصل لفظ "صحنک" لکھا ہے ۔ یہ بہت مغالطہ آفریں اندراج ہے ۔ کسی کم سواد کاتب نے رنگین کے شعر میں "سہنک" لکھ دیا ہوگا ، اور اِس غلط نگاری کی بنیاد پر ، اِس لفظ کی ایک یہ صورت بھی مان لی گئی ۔

صحیح املا "صحنک" ہے ۔ "سہنک" کوئی لفظ نہیں ۔ نور میں صحیح طور پر اِس لفظ کو صرف صاد مع حائے حطی کی فصل میں (صحنک) لکھا گیا ہے اور اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔

مِسَل : اِس کو کچھ لوگ س سے (مسل) اور بعض لوگ ث سے (مثل) لکھتے ہیں ۔ مولّفِ آصفیہ نے اِس لفظ کو س سے غلط بتایا ہے ۔ اُن

؎ ریاض خیر آبادی نے ایک خط میں لکھا ہے :

"مسالہ ، س ۔ ہ ۔ سے صحیح اردو ہے "۔

(مکتوبِ ریاض بہ نامِ صفدر مرزاپوری ۔ مرقعِ ادب ، جلدِ دوم ، ص ۱۶۲)

کی عبارت یہ ہے :

"مثل : رویدادِ مقدمہ ، مقدمے کی کیفیت یا کارروائی ۔ چوں کہ اِس لفظ کا اُن کاغذات پر اطلاق کیا جاتا ہے جو باہم متماثل اور ایک ہی مقدمے یا معاملے سے متعلق ہوں ، لہٰذا ثاے مثلّثہ سے لکھنا چاہیے ۔ جو لوگ سوال کو اِس کا ماخذ خیال کرکے ، سینِ مہملہ سے لکھتے ہیں اور اِس کو اصل میں مسئلہ خیال کرتے ہیں ، وہ محض غلطی پر ہیں ۔"

مگر یہ خیال صحیح نہیں ۔ مولانا احسؔن مارہروی نے صحیح بات لکھی ہے :

"مسل MISSAL انگریزی لفظ ہے ، اور وہ ایک کتاب ہوتی ہے جو گرجوں میں رہتی ہے ، اور اُس کا رواج قدیم ہے ۔ ث سے لکھنا صحیح نہیں ـــــ اِسی طرح "سمتن" ۔"

(خط بہ نام محؔفیر احسنی ، علمی نقوش ص ۲۱۶)

قرینہ اِسی پر دلالت کرتا ہے کہ یہ انگریزی[1] کا لفظ ، اُردو میں ذرا مختلف

---

(1)
Missal: I. the book containing the service of the Mass for the whole year; a Mass book
(b) Used vaguely for: a Roman Catholic book of prayers, especially when illuminated; an illuminated book of hours, or the like.
II. (attributive and in compounds) as in:
missal-album, missal-hand, missal-letter, missal-like.
(Adjective) of or pertaining to the Mass; Mass-
Missal-Book = Mass-book.

(Oxford English Dictionary)

معنی میں استعمال ہونے لگا۔ معنوی مشابہت یا مناسبت موجود ہی تھی۔
بہ ہر صورت "مسل" اور "سمن"؛ اِن دونوں لفظوں کو سؔ سے لکھا
جائے گا۔ صاحبِ نوراللغات نے "مثل" کے ذیل میں لکھا ہے: "اِس
معنی میں املا سؔ سے ہوگیا ہے"۔
مکاتیبِ غالب، مرتّبۂ مولانا امتیاز علی خاں عرشی پر تبصرہ کرتے ہوئے
ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی مرحوم نے لکھا تھا:

"مثل ہے تو عربی، پر "دفتر" کے معنوں میں عربی میں نہیں آتا۔
اُردو میں عام طور پر ثؔ کے زبر سے بولا جاتا ہے۔ بعضے لوگ اُردو
لفظ جان کر، اسے سؔ سے لکھتے ہیں؛ کچھ بے جا نہیں"۔

[ہندستانی (الہٰ آباد)، جولائی ۱۹۳۸ء]

حرف صؔ کے سلسلے میں ذہن میں رہنا چاہیے کہ شوشہ، اِس کا جُز ہے۔
شوشے کے بغیر یہ ناتمام رہے گا۔ اِس حرف کے بعد بؔ، یؔ جیسے حرف جب
آتے ہیں، تو بعض دفعہ صؔ کا شوشہ غائب ہوجاتا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے
کہ اب سے چند سال پہلے رسالۂ صبا (حیدرآباد) کے نام کے سلسلے میں باقاعدہ
بحث ہوئی تھی کہ صحیح صورت "صبا" ہے یا "صبا"۔ ڈاکٹر صدّیقی مرحوم
کے الفاظ میں: "صبا، اِسے کوئی بھلا آدمی "صبا" نہیں پڑھ سکتا۔ یہی
خیال کرے گا کہ لکھنے والا "صاحب" لکھنا چاہتا تھا "صا" کے بعد "حب"
(یا کوئی اور حرف) سہواً چھوٹ گیا اور نیچے جو نقطہ ہے، شاید یہاں مکھی
بیٹھ گئی ہوگی"۔ (مکتوب بہ نامِ راقم الحروف)۔
لفظ کے شروع یا بیچ میں جب صؔ آئے تو اِس کا خیال رکھنا چاہیے
کہ ایک شوشہ اِس کے ساتھ اِس کے جُز کی حیثیت سے ضرور بنایا

جائے ۔ جیسے : صد اور صید ۔ صاحب اور صبا ۔ صبح ، صُبح ، صبیح ، صیاد ، صباحت ، مصباح ، صبور ۔

غضب ، عربی کا لفظ ہے اور اِس میں ض ہے ۔ ایک دوسرا لفظ ہے : غیظ ۔ اِس میں ظ ہے ۔ " غیظ و غضب " مستعمل مرکّب ہے ۔ کبھی کبھی اِس کو " غیض و غضب " لکھ دیا جاتا ہے ، یہ صحیح نہیں ۔

نکہت : یہ لفظ متفقہ طور پر مع کافِ ہے ، مگر معلوم نہیں کیوں کر ، اِس کو گافِ سے (نگہت) لکھنے کا رواج سا ہو چلا ہے ۔ یہ بالکل غلط املا ہے۔ اِس کو لازماً کاف کے ساتھ (نکہت) لکھا جائے گا ۔

افگندن ، شگفتن اور کشادن کے بہت سے مشتقات اور اُن کے مرکبات اُردو میں مستعمل ہیں ۔جیسے : شگفتہ ، کُشادہ ، شیر افگن ، کشادہ پیشانی وغیرہ ۔ فارسی لُغات میں اِن کی صورت " افکندن " ، " شکفتن" اور "گشادن" بھی ملتی ہے اور آج کل فارسی میں رجحان یہ ہے کہ "گشادن" گاف کے ساتھ اور " افکندن " و " شکفتن " کاف کے ساتھ لکھے جائیں ۔

فارسی املا اپنی جگہ پر ، اُس کی پابندی کا تعلق فارسی زبان سے ہے؛ اُردو میں ہر صورت میں ، رواج کے مطابق ، اِن لفظوں کو اُسی طرح لکھا جائے گا جس طرح اب تک لکھے جاتے رہے ہیں ۔ ایسے اور سب الفاظ میں بھی اِسی اصول کو برتا جائے گا ۔

(۱)

ایسے مصدر اچھی خاصی تعداد میں ہیں جن میں دو نون یک جا ہیں، جیسے: مانتا، جاننا۔ ایسے بعض مصدروں کو یا اُن کے بعض مشتقات کو نونِ مشدّد کے ساتھ بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ غلط نگاری عام تحریروں تک محدود نہیں، لُغات میں بھی اِس غلط نگاری نے راہ پالی ہے۔ اِس کی بڑی وجہ کتابت کی بے راہ روی ہے۔ ایک مثال سے کتابت کے اِس خلفشار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے: آصفیہ میں "بُننا" دو نون سے اور "بَنّا" ایک نون سے لکھے ہوئے ہیں، مگر مثالوں کی عبارت میں "بَنّا" میں دو نون ملتے ہیں، جیسے: "یار بننا"، "بیٹا بننا"، "کام بننا"، "مکان بننا"۔ مگر اِس کے بعد "بَنّا ٹھنّا" نظر آتا ہے اور آگے چل کر "بھوت بَنّا" ملتا ہے۔

نور میں "بِپتّا" اور "بُنّا" یہ دونوں مصدر بہ نونِ مشدّد لکھے ہوئے ہیں، جب کہ آصفیہ میں "بِپننا" اور "بُننا" ہیں۔ اِس کے برخلاف نور میں "بَندنا" ہے اور آصفیہ میں "بَنّا"۔ اور "بھوننا" دونوں

لغات میں ایک ہی طرح ملتا ہے۔

جن مصدروں میں "ماننا" اور "بننا" کی طرح دو نون یک جا ہیں، یعنی ایک نون علامتِ مصدر "نا" کا جزوِ اوّل ہے اور ایک نون اصل مادّے کا جزوِ آخر ہے (من + نا ۔ مان + نا ۔ بن + نا)؛ اُن مصدروں میں دو نون لکھے جائیں گے، جیسے:

بننا، مُننا، بھُننا، سُننا، دُھننا، چُننا، مَننا، ماننا،
سَننا، ساننا، پہننا، چھننا، چھیننا، گِننا، تَننا، تاننا،
جَننا، چھَننا، چھاننا، بکھاننا، گُننا، جاننا، ٹھننا، ٹھاننا،
بھوننا، گزراننا، پہچاننا۔

اِن مصدروں کی محرّف صورت میں بھی دونوں نون برقرار رہیں گے، جیسے:

ماننے پر، جاننے کو، سُننے میں، چھیننے تک، گننے سے،
چھاننے میں، بُننے کو، بھوننے سے، بَننے کے لیے، پہچاننے
کی بات، عرضی گزراننے تک۔

قاعدہ یہ ہے کہ دو کلموں سے مرکّب ٹکڑوں میں ایک ہی حرف کی تکرار اگر اِس طرح ہو کہ پہلے کلمے کا آخری حرف وہی ہو جو دوسرے کلمے کا پہلا حرف ہے؛ تو اُس حرف کو لازماً دو بار لکھا جائے گا (جان + نا)۔

اگر ایک کلمے میں، فصل کے بغیر، ایک حرف کی تکرار ہو؛ تب ایک حرف لکھا جائے گا اور اُس پر تشدید آئے گی، جیسے: چھَننا ایک کلمہ ہے جو دو ٹکڑوں سے مرکّب ہے: پہلا جُز "چھَن" جو مادّہ ہے اور دوسرا جُز "نا" جو علامتِ مصدر ہے؛ اِس لیے اِس کو "چھَننا" لکھا جائے گا۔ اِس کے

مقابلے میں ، ایک اسم ہے "پَھنّا" ، جس کی تانیث "چھنّی" ہے ؛ یہ ایک کلمہ ہے ، اِس لیے اِس میں نون مشدّد ہی لکھا جائے گا ۔ "گِننا" میں دو نون اور "گنّا" میں ایک نون (مشدّد) لکھا جائے گا ۔

رشک نے نفس اللغۃ میں لکھا ہے :

"بداں کہ در الفاظِ ہندی ہرگاہ کہ دو حرف از یک جنس در دو کلمہ بہم آیند ، بہ نوعیکہ آخرِ کلمۂ اوّل و اوّلِ کلمۂ آخر حرفِ متجانس باشد مانندِ مانںا و چھاننا ، اُس سے و اِس سے ؛ ایں چنیں جا بہ یک حرف اکتفا کردہ تشدید دادن خطاست ، بلکہ بہمیں صورت نویسند کہ نوشتہ شدہ ۔

و اگر دو حرفِ یک جنس در یک کلمہ بود ، بریک اکتفا کنند ، چنانکہ بلّی و لٹّو و کتّا و کوّا و جز آنہا "۔ (لفظ "بھوننا" کے تحت) ۔

(۲)

مصادر کی طرح عام الفاظ کو بھی اِسی قاعدے کے تحت لکھا جائے گا ۔ یعنی اگر لفظ دو کلموں سے مرکّب ہے اور پہلے کلمے کا آخری حرف اور دوسرے کلمے کا پہلا حرف یک جنس ہیں ؛ اِس صورت میں وہ حرف دو بار لکھا جائے گا ۔ اِس میں نون کی قید نہیں ، کوئی سا حرف ہو ۔ اگر ایک ہی کلمے میں حرف کی تکرار ہو ، تب تشدید آئے گی ۔

پُرانی تحریروں میں ، اور کبھی کبھی آج بھی " اُسّے ، اُتّے ، جِتّے ، جسّے " وغیرہ لکھے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان سب کلموں میں مشدّد حرف کو دو بار لکھا جائے گا ، کیوں کہ یہ دو اجزا سے مرکّب کلمے ہیں ، یعنی :

اس سے ، جس سے ، کس سے ، کن نے ، ان نے ، جن نے ۔

یا جیسے "جگن ناتھ"، کو "جگنّاتھ" لکھنا، کہ یہ بھی درست نہیں؛ اِس کو "جگن ناتھ" لکھا جائے گا، مگر پرسنّا، مُنّن، شدّن، مُدّھن، چنّن، کھنّا، گنّا، حصّہ، حُقّہ، کتّھا، عزّت، لذّت، جیسے مفرد کلموں میں حرفِ مشدّد آئے گا۔

(۲)

(۱)

قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں نونِ ساکن کے بعد ب ہو، تو ن کی آواز، میم کی آواز سے بدل جاتی ہے۔ یعنی لکھا تو جاتا ہے ن، مگر پڑھا جاتا ہے م۔ جیسے: منبر، جنبش، گُنبد۔

یہ قاعدہ عربی و فارسی الفاظ تک محدود ہے۔ دوسری زبانوں کے لفظوں میں میم ہی لکھا جائے گا، جیسے: کھمبا، بمبا، اچمبھا، لمبر۔

ہوا یہ کہ عربی فارسی لفظوں کے قیاس پر، ایسے متعدّد لفظوں میں بھی ن لکھا جانے لگا، جن میں م آنا چاہیے تھا۔ بمبئی نہ عربی کا لفظ ہے نہ فارسی کا، مگر پرانی تحریروں میں (مطبوعہ بھی اور خطّی بھی) اِس کا املا "بنبئی" ملتا ہے۔ انبالہ، سنبھل، اچنبھا، جیسے لفظ اب بھی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں، حالاں کہ اِن میں سے کسی لفظ کا تعلّق عربی فارسی سے نہیں۔

بات یہ ہوئی کہ پہلے فارسی میں لکھنا پڑھنا زیادہ ہوتا تھا، چوں کہ فارسی میں ایسے لفظوں کو نون سے لکھنے کا رواج رہا ہے، اِس لیے اُسی طرح کے کچھ دوسرے لفظوں کو بھی، فارسی لفظوں کی طرح لکھا جانے لگا، جیسے: تمباکو،

کہ اِس کا املا "تنبا کو" ملے گا۔ یا جیسے مخزنِ نکات میں ایک مزاحیہ شعر ہے جس میں "زنبق" کا قافیہ "بھنبق" آیا ہے اور "زنبق" کے قیاس پر اِس کو "بھمبق" کے بجائے "بھنبق" لکھا گیا ہے۔

بہ ظاہر یہ عجیب سی بات ہے کہ لکھا جائے نون اور پڑھا جائے میم، مگر عربی و فارسی میں یہی طریقہ ہے اور اُن زبانوں کے لفظ اُردو میں بھی اِسی طرح لکھے جاتے ہیں، اِس لیے اِس قاعدے کو برتنا پڑے گا؛ البتہ لازمی طور پر اِس کا خیال رکھا جائے گا کہ یہ قاعدہ، عربی و فارسی الفاظ تک محدود رہے۔

صدّیقی صاحب مرحوم نے لکھا ہے:

"جب کسی لفظ میں نونِ غنّہ کے بعد ہی ب ہو، تو یہ دونوں حرف مل کر م کی آواز دیتے ہیں، جیسے: آنب سے آم (جس کی تصغیر "انبیا" کا تلفّظ "امبیا" بل کہ "امیا" ہوتا ہے)، نیب سے نیم، سینب سے سیم۔ اِن لفظوں کو میم ہی سے لکھنا چاہیے۔

فارسی عربی لفظوں زنبور، تنبورہ، شنبہ، گنبد، جنب میں جو ساکن ن ہے، وہ تلفّظ میں م ہو جاتا ہے، مگر لکھا ن ہی جاتا ہے۔ البتّہ جب "گنبد" سے اُردو والوں نے "گمٹ" بنایا اور اُس کی تصغیر "گمٹی"، تو اِن دونوں لفظوں کو م ہی سے لکھنا پڑا۔

پس قاعدہ یہ نکلا کہ فارسی عربی کا لفظ ہو تو املا میں اُنھی بانون کی پیروی کی جائے، نہیں تو م لکھا جائے۔"

(ہندستانی)

تو اب قاعدہ یہ بنا کہ:

عربی فارسی کے جن لفظوں میں نونِ ساکن کے بعد ب ہو ، اُن میں اِن زبانوں کے قاعدے کے موافق نون لکھا جائے گا ، مگر پڑھا جائے گا میم ، جیسے :

اِنبار ، انبساط ، انبوہ ، پُنبہ ، تنبیہ ، چنبر ، جنبش ، حنبل ، دُنبال ، زنبق ، زنبور ، زنبیل ، سُنبل ، سُنبلہ ، شنبہ ، عنبر ، گُنبد ، قرنبیق ، منبر ، مُنبسط ۔

عربی فارسی کے علاوہ ، اور زبانوں کے الفاظ میں میم ہی لکھا جائے گا ۔ اِس میں وہ لفظ بھی شامل ہیں جو بہ ظاہر فارسی نژاد معلوم ہوتے ہیں ، جیسے : تمباکو ۔ اور وہ لفظ بھی جن کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ فارسی و ہندی میں مشترک ہیں ، جیسے : چمپا ۔

ایسے لفظوں کی مختصر سی فہرست یہ ہے :

امبالہ ، اچمبھا ، امبر ، امبیڈکر ، امبیسی ، امبولنس ، بمبا ، بمبو ، بمبوق ، بمبئی ، بھمبق ، تمباکو ، تمبو ، ٹمبر ، جمبو ، چمپا ، چمپاکلی ، چُمبک ، چمپی ، چمپئی ، چمپت ، چمبل ، دسمبر ، ڈگمبر ، رمبھا ، زمبیا ، زمبور (اوزار) ، سمبھل ، شمبھو ، ستمبر ، سمبھا ، سمپٹ ، سمبت ، کھمبا ، کمبل ، کمبوڈیا ، کمبوہ ، کھمبایت ، کمپو ، کمپنی ، کمپوزنگ ، کمپالا ، کُمبھ ، کمپا ، کمپاس ، گمبھیر ، گُڑمبا ، لمبا ، لمبائی ، لمبان ، لمبو ، لمبوترا ، ممباسا ، مزمبیق ، ممبر ، نمبر ، نمبوتری پد ۔

اِس سلسلے میں بعض باتوں کی وضاحت ضروری ہے :

(الف) صاحبِ آصفیہ نے حرفِ نون کے ذیل میں لکھا ہے :

"جب یہ حرف باے موحدہ یا باے فارسی کے ساتھ کسی کلمے کے وسط میں ملا ہوا آتا ہے تو وہاں ادغام ہوکر، اُس کی آواز میم سے بدل جاتی ہے، جیسے: زنبیل، سُنبل، منبر، انبالہ، سنپت، سنپورن وغیرہ"۔

مولّف نے ہندی کے مثالیہ الفاظ (سنپت، سنپورن، انبالہ) جو لکھے ہیں، اُن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی فارسی لفظوں کے ساتھ، اور زبانوں کے الفاظ پر بھی اِس قاعدے کا اطلاق ضروری سمجھتے ہیں؛ یہ احتمال اِس لیے اور ہوتا ہے کہ اُنھوں نے عبارت میں کوئی تحدید یا صراحت نہیں کی۔ مگر ہندی، انگریزی کے ایسے لفظ جن میں ن اور ب یا پ یک جا ہیں، وہ آصفیہ میں عام طور سے میم سے لکھے گئے ہیں، مثلاً: چمبک، چمپا، چمپت، بمبا، بمبو، گمبھیر، لمبا، سمبت، سمبندھ، سمپٹ، سمپورن، کُمبھ، کمپاس جیسے الفاظ، میم سے لکھے گئے ہیں۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حقیقت میں وہ اِس قاعدے کو عربی فارسی الفاظ ہی سے متعلق سمجھتے تھے۔ اُن کی جس عبارت کو اوپر نقل کیا گیا ہے، اُس میں ہندی کے لفظ غلطی سے شامل ہوگئے ہیں۔

(ب) ایسے متعدّد لفظ ہیں جن کو اب سے پہلے (ہندستانی) فارسی تحریروں میں اور اردو تحریروں میں بھی ایک مدّت تک ن سے لکھا گیا، مگر اب یہ لفظ اکثر و بیش تر میم سے لکھے جاتے ہیں، جیسے: چمپا، تمباکو، کمبوہ، اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ خود اردو میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں کہ لکھا جائے ن اور پڑھا جائے میم؛ اِس لیے اگر فارسی کے بعض لفظوں میں

اِس طرح کی تبدیلی از خود عمل میں آنے لگے تو اُس کو مطلقاً رد نہیں کر دینا چاہیے۔ بعض لفظ ایسے ہیں کہ اگر اُن کو میم سے لکھا جائے تو احساس نہیں ہوگا کہ صورت بدل گئی ہے، جیسے ایک لفظ ہے: گُنبد۔ اِس کا املا تو یہی ہے، مگر "گُمبد" بھی کچھ اجنبی نہیں معلوم ہوتا۔ یا جیسے چُنبک فارسی میں مقناطیس کو کہتے ہیں (برہانِ قاطع) اِس کو اردو میں "چُمبک" لکھا جائے تو مطلق احساس نہیں ہوگا کہ لفظ بدل گیا ہے یا مسخ ہوگیا ہے۔ یا جیسے فارسی میں ایک لفظ ہے چُنبُل، بروزنِ بُلبُل، بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔ اردو میں یہ لفظ بہ فتحِ اول و سوم، کاسۂ گدائی کے معنی میں مستعمل ہے، فقیروں کی صدا سنی ہوگی: "بابا! چمبل بھر دے"۔ نور و آصفیہ میں اِس کو اصل کی رعایت سے "چنبل" لکھا گیا ہے، اب اگر اِس کو "چمبل" لکھا جائے تو کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔ (اردو میں اِس لفظ کے کچھ اور معانی بھی ہیں)۔ اِسی طرح "دُنبہ" کو "دُمبا" لکھا جا سکتا ہے۔

"تنبول" کو فارسی و اردو لغات میں ن سے لکھا گیا ہے، حالاں کہ یہ ہندستانی پان کا نام ہے (برہانِ قاطع) اِس کو "تمبول" کیوں نہ لکھا جائے؟ تمولی میں تو میم آ ہی گیا ہے۔ ترکی کے معروف شہر استامبول کا املا عموماً "استنبول" ملتا ہے، اگر کوئی شخص اِس کو "استمبول" یا "استام بول" لکھے تو کیا بے جا ہے؟ یہ لفظ نہ فارسی کا ہے نہ عربی کا۔

ایسے لفظوں کی اچھی خاصی تعداد اردو میں شامل ہوئی ہے جن میں "م ب" یک جا ہیں، جیسے: زمبیا، مزمبیق، زمبور، ممبر، کمبوڈیا

وغیرہ ؛ اِن سب لفظوں کو مٓ ہی سے لکھا جاتا ہے ، اِس وجہ سے بھی ، متعدّد لفظوں میں اب نٓ کی جگہ مٓ لکھنے پر کسی طرح غلط نویسی کا گمان نہیں ہوتا ۔

قاعدہ اپنی جگہ پر برحق اور مسلّم ، اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے مُراد صرف یہ ہے کہ بعض لفظوں میں اگر اِس قسم کی تبدیلی راہ پاجائے تو اِس پر آشفتہ خاطری کی ضرورت نہیں ۔ یہ تبدیلی کچھ ہی لفظوں تک محدود رہے گی اور اردو کے لحاظ سے غیر مناسب نہیں ہوگی ۔

(ج) گُنْبَد ، بِھنْبِھنانا جیسے لفظوں میں نوٓن لکھا جاتا ہے ، اِس لیے کہ تلفّظ میں نوٓن ہی آتا ہے ، یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اِن میں کسی طرح کی غلطی ہے ۔

(۳)

(۱)

جن لفظوں میں نونِ غنّہ اور ہائے ہوّز (ملفوظ) یک جا ہیں ، اُن کے لکھنے میں اچھا خاصا اختلاف دیکھنے میں آتا رہتا ہے ۔ ایک ہی طرح کے لفظوں کو کئی طرح لکھا جاتا ہے ۔ اِس اختلافِ نگارش کی اصل وجہ وہی عدمِ تعیّن ہے جو لُغات سے لے کر عام تحریروں تک ہر جگہ نظر آتا ہے ۔ کتابت کی کرشمہ کاریاں اِس کے علاوہ ہیں ۔

مُنْہ اور رَمْنہ ، یہ دونوں لفظ کسی اختلاف کے بغیر ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں ۔ اِن میں نونِ غنّہ ، ہائے ساکن سے پہلے لکھا

جاتا ہے ۔ اِن لفظوں میں کسی طرح کا اختلاف یوں بھی جگہ نہ بنا سکا کہ پہلے "مُنْہ" کو "موںہ" لکھا جاتا تھا ؛ واو ہٹا ، "مُنہ" رہ گیا ۔ "مِنہ" کی ایک صورت "میںہ" بھی ہے ؛ یؔ بیچ سے نکل گئی ،"مِنّہ" رہ گیا ۔

ایک لفظ ہے : منْہدی ۔ غور کیجیے تو اِس لفظ کے جُزوِ اوّل کی وہی صورت ہے جو "مِنْہ" کی ہے ؛ اِس بِنا پر اِس کے اِملا میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ہونا چاہیے تھا ، مگر اختلاف ہے ۔

نور میں اِس کو صحیح طور پر "م مع ن" کی فصل میں لکھا گیا ہے ، بل کہ مولّف نے خاص طور پر وضاحت کی ہے کہ "ہاے ہوّز سے پہلے نون لکھنا چاہیے" ـــــ مگر آصفیہ میں پہلے "منہدی" لکھا گیا ہے اور پھر "م ہ ن" کے ذیل میں "مہندی" لکھا گیا ہے اور اِس کے زیادہ مرکّبات یہیں لکھے گئے ہیں ۔

بنْہگی کی بھی وہی صورت ہے جو منْہدی کی ہے ۔ نور میں اِس لفظ کے ذیل میں بھی صراحت ملتی ہے : "بنہگی (ب ن ہ زبر بنہ ، گ ی زیر گی)" ۔ قاعدے کے لحاظ سے یہ بالکل صحیح املا ہے ، مگر آصفیہ میں اِس کو "بہنگی" لکھا گیا ہے ۔ اِس لفظ کی یہی ایک صورت اِس میں ملتی ہے ۔

منْہگا ، منْہگی : نور میں اِن لفظوں کو بھی صحیح طور پر "میم مع نون" کی فصل میں لکھا گیا ہے ، مگر آصفیہ میں اِن کو بھی "مہنگا ، مہنگی" لکھا گیا ہے ۔

اِسی قبیل کا ایک لفظ ہے لنْہگا ۔ نور میں اِس لفظ کو "لہنگا" لکھا

گیا ہے ، حالاں کہ قاعدے کے مطابق اِس کو بھی " منہگا " کی طرح " لنہگا " لکھنا چاہیے تھا۔

آصفیہ میں مُنہّ ، منہّا منہ ، صحیح طور پر لکھے ہوئے ہیں ، یعنی پہلے م پھر نون ، پھر ہ ۔ ایک اور لفظ مُنہنال بھی اسی طرح صحیح طور پر لکھا گیا ہے ۔ (اِس کی ایک صورت مُہنال بھی ہے)

اب اِن سب لفظوں کو ، اور اِن کی طرح کے دوسرے لفظوں کو ، ایک ہی طرح لکھا جائے گا کہ نونِ غنہ ، ہائے ہوّز سے پہلے آئے گا :

مُنہّ ۔ مُنہا مُنہ ۔ مِنہ ، مینہ ۔ مُنہنال ۔ مِنہدی ۔ منہگا ۔ منہگائی ۔ منہنگ مولا ۔ لنہگا ۔ بنہگی ۔ منہگی ۔

[1] اِن لفظوں میں املائی اُلجھن نونِ غنہ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ اس کا صحیح مقام کیا ہے ؛ ہائے ہوّز کے بعد ، کہ ہائے ہوّز سے پہلے ۔

غنائیت خواہ وہ لفظ کے بیچ میں آئے یا آخر میں ، ہمیشہ مصوّتے کی غنائیت ہوگی ۔ مندرجۂ بالا تمام مثالوں میں پہلا حرف متحرک ہے ، یعنی اُس کے بعد مصوّتہ ہے اور اُس کے فوراً بعد ہائے ہوّز ۔ ہ کی صورت کے بارے میں طے ہے کہ یہ ماقبل یا مابعد کے مصوّتوں سے مل کر ہیرے کا روپ اختیار کر لیتی ہے ۔ اِن لفظوں میں یہی ہوا ہے ، ہ کی آواز ، مصوّتۂ ماقبل سے مل کر ادا ہوتی ہے ، اور پہلے حرف یعنی م یا ل (وغیرہ) کے معاً بعد غنائیت کی چھاپ لگنا شروع ہوجاتی ہے ، اور مصوّتے اور ہ کی آواز پر حاوی رہنے کے بعد ، اُس کا کچھ اثر ہ کے بعد بھی ظاہر ہوتا ہے ۔ اسی وجہ سے اِس غلط فہمی کی گنجائش نکل آتی ہے کہ نونِ غنہ ، ہ کے بعد ہے ۔ غنائیت کا عمل چوں کہ پہلے حرف یعنی م یا ل (وغیرہ) کے فوراً بعد شروع ہوجاتا ہے ، اِس لیے نونِ غنہ کو ہ سے پہلے لکھنا درست ہوگا ۔

" مُنہّ " اور " مِنہ " (" مینہ " کا مخفف) اِن دونوں لفظوں میں نونِ غنہ ، ہ سے پہلے لکھا جاتا ہے اور اِس املا میں کسی طرح کا اختلاف نہیں ؛ " منہدی " اور " منہگا " میں بھی شروع کا جز وہی ہے ، یہی صورت " لنہگا " وغیرہ کی ہے ۔ ایسے سب لفظوں کے املا میں اس لحاظ سے یک سانی ہوگی اور ہونا چاہیے ۔ اُردو کا معیاری تلفظ بھی اِس کی تائید کرتا ہے ۔ " مہنگا " یا " لہنگا " ، معیاری تلفظ نہیں ۔

(۲)

دو لفظ اور ہیں : پہنچا ، پہنچی ۔ پہنچا فعل بھی ہے اور اسم بھی ، یہی صورت پہنچی کی ہے ۔ اِن میں نونِ غنّہ ، ہائے ہوّز کے بعد لکھا جاتا ہے ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ پہنچ (مادّہ) اور پہنچنا (مصدر) دونوں میں ہ متحرک ہے اور نونِ غنّہ اور چ ساکن ہیں ۔ پہلے اِس کو "پہونچنا" اور "پہونچ" لکھا جاتا تھا (بہت سے لوگ اب بھی اِسی طرح لکھتے ہیں) اِس لیے اِن لفظوں کو مہندی وغیرہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ۔ اِن کو اِسی طرح لکھا جائے گا ۔ یعنی :

پہنچ ، پہنچنا ، پہنچانا ، پہنچوانا ، پہنچا ، پہنچی ، پہنچوائی ۔

(۳)

بانہہ کی جمع ہے : بانہیں ۔ واحد کو تو سبھی صحیح طور پر لکھتے ہیں مگر اِس کی جمع میں بعض دفعہ نونِ غنّہ کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور " باہیں " لکھ دیا جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں ۔ بعض شاعروں نے " چاہیں " اور " آہیں " کا قافیہ " باہیں " باندھا ہے ۔ پُرانے قاعدے کے بہ موجب تو یہ ٹھیک نہیں ، مگر شاعری میں ایسی پابندیاں غیر ضروری ہیں ؛ اِس لیے ایسے قوافی پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے ، مگر اِس کو شاعری کی مجبوری یا ضرورت کے علاوہ ، دوسرے مقامات پر خوش آمدید نہیں کہنا چاہیے ۔ شاعری کی دنیا ذرا مختلف ہوتی ہے ۔

(۴)

سِنّہ کو " سن " لکھنا ، جس قدر فاحش غلطی ہے ، اُسی قدر عام ہوتی جاتی ہے ۔ سِن (بہ کسرِ اوّل) کے معنی ہیں : عُمر ۔ جیسے : کم سِن ، بہ معنیِ

کم عمر۔ سَنہ مختلف لفظ ہے اور اِس کو اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔ تفصیلات " ہائے مختفی " کے ذیل میں لکھی گئی ہیں ۔

(۴)

(۱)

ایسے متعدّد لفظ ہیں جن کو قدما نوؔن کے بغیر بھی لکھا کرتے تھے ، اِن میں تین لفظ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں : دونو ، ماؔ ، مینےؔ ۔ " مینے "تو اب بھی دیکھنے میں آتا رہتا ہے اور اِس کا گزر مطبوعات میں بھی ہے ۔ مثلاً خورشید لکھنوی کی کتاب افاداتؔ کے صفحہ ۲۶ پر، جو اتفاق سے اِس وقت میرے سامنے ہے ؛ تین جگہ " مینے " چھپا ہوا ہے اور تین جگہ " میں نے "۔ آصفیہ میں " توتیے جوڑنا " کے ذیل میں رنگینؔ کا ایک قطعہ لکھا گیا ہے ، اِس کا پہلا مصرع اِس طرح لکھا ہوا ہے :

مینے چاہا جو تجھ کو اے رنگیںؔ

اِن لفظوں کو مع نونِ غنّہ لکھنا چاہیے : دونوںؔ ۔ ماںؔ ۔ میں نے ۔

(۲)

یہ قاعدہ ہے کہ منادا کے آخر میں اگر نوؔن جمع کا ہو ، تو اُس کو نہیں لکھا جاتا جیسے : اے دوستو ، اے لوگو ۔ حرفِ ندا مذکور ہو یا محذوف ، دونوں صورتوں میں یہی قاعدہ نافذ رہتا ہے ۔ اِس کی پابندی کرنا چاہیے ۔ جیسے :

زلف و چشمِ یار ہیں ، دام گرہ گیرو قفس ۔۔۔ تھی اسیری اپنی قسمت میں بہ زنجیر و قفس
مرغِ روح اپنا نہ کر جاوے کہیں پرداز، ہاں ۔۔۔ کرو دو اِس سینے کو ، اے صیاد کے تیرو! قفس
بال و پر اُڑ جائیں ، گو ہوں دام میں مجروح سب ۔۔۔ چھوڑیو ہرگز نہ لیکن سن تو نخچیرو! قفس

کہ بیٹھیے صاف اُس سے، یہ دل جس سے نہ وا ہو — لے واو زبر زَو ہو، اُڑ پُھو ہو، ہُوا ہو
لکھ میں نے دیا خطِ غلامی اُنھیں، کر مُہر — لو، دستخط اِس پر کرو تم اپنے، گوا ہو!

انشا (کلامِ انشا، ص ۱۷۱)

یا جیسے یہ شعر:

جھوٹ کہتا نہیں میں، سچ جانو — کافرِ عشق ہوں مسلمانو!

---

(۳)

لفظ کے آخر میں نونِ غنہ ہو تو اُس نون کو نقطے کے بغیر لکھنے کا رواج ہے۔ اِسے برقرار رہنا چاہیے۔ فارسی والے اب نونِ غنہ کو نہیں مانتے، اِس لیے فارسی کی عبارتوں میں بے نقطہ نون ہوتا ہی نہیں، مگر ہندستان میں آخر تک فارسی میں بھی اِس کا عمل دخل رہا ہے۔

اردو ٹائپ کی جو مشینیں عام طور سے یہاں دیکھنے میں آتی ہیں، اُن میں صرف نونِ نقطہ دار ہوتا ہے؛ نتیجہ یہ ہے کہ اِن مشینوں سے ٹائپ کی ہوئی اُردو عبارتوں میں ہر نون نقطے دار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ٹھیک نہیں۔

یہ خرابی ٹائپ تک محدود نہیں، بعض مطبوعہ کتابوں میں بھی اِس نے راہ پائی ہے۔ اِس وقت میرے سامنے مضامینِ شبلی کی چھٹی جلد ہے، جس پر سالِ اشاعت ۱۹۵۱ع لکھا ہوا ہے، اِس میں کاتب صاحب نے اکثر مقامات پر لفظوں کے آخر میں آنے والے نونِ غنہ پر اہتمام کے ساتھ نقطے لگائے ہیں۔

کچھ پرانی کتابوں کی بھی یہی صورت ہے کہ اُن میں نونِ غنہ پر بھی

نقطے ملیں گے۔ مثلاً امیر اللغات (جو لغت ہے) میں یہی صورت پائی جاتی ہے کہ نونِ غنہ پر بھی نقطہ رکھا گیا ہے، جب کہ اور کتابوں اور لغات کے مقابلے میں، امیر اللغات میں صحتِ املا اور تصحیح کا اہتمام نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اِس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔

(۵)

(۱)

کچھ مصدر ایسے ہیں جن میں نونِ غنہ اصلاً جزوِ لفظ ہے، جیسے: آنکنا، اُنڈیلنا، جانچنا۔ قاعدے کی رو سے سیدھی سی بات تو یہ ہوئی کہ اگر کسی فعل کے مادّے میں نونِ غنہ موجود ہے، تو مصدر اور مشتقات میں بھی موجود رہے گا، مصدر خواہ لازم ہو خواہ متعدّی۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ اگر مصدر میں نونِ غنہ شامل ہے، تو اُس کے مشتقات میں بھی شامل رہے گا۔

بہت سے مصدروں کی یہی صورت ہے، یعنی اِس قاعدے پر پورے اُترتے ہیں۔ جیسے ایک مصدر ہے: اَونٹنا (مادّہ ہوا: اَونٹ) یہ لازم صورت ہے، اِس کا متعدّی ہوا: اَونٹانا۔ اَونٹی، اِسی سے مشتق ہے۔ اِن کے مشتقات میں نونِ غنہ لکھا جاتا ہے، کوئی جھگڑا نہیں۔

کچھ مصدر ایسے بھی ہیں کہ مصدرِ متعدّی میں نون موجود ہے مگر مصدرِ لازم کو اور اُس کے مشتقات کو اکثر نون کے بغیر اور کم تر مع نون لکھا جاتا ہے۔ اِس ذیل میں متعدّد مصدر آتے ہیں اور یہ ایک طرح کا لسانی رجحان معلوم ہوتا ہے (محدود پیمانے پر) کہ جب نونِ غنہ

سے پہلے حرفِ علّت ، خاص طور پر الف نہ ہو (اور اِس قبیل کے لازم مصادر میں عموماً یہی صورت ہوتی ہے) تو نونِ غنّہ ، یا تو ساقط ہوجایا کرتا ہے یا بے طرح دب جایا کرتا ہے ۔ " بانٹنا " اور " بٹنا " اِس کی واضح مثال ہے ۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ مصدر میں نونِ غنّہ موجود ہے مگر بعض مشتقات میں نظر نہیں آتا ۔

بعض مصدروں میں نونِ غنّہ کے ہونے نہ ہونے کو ، دہلی و لکھنؤ کے اختلافات کا نتیجہ بتایا جاتا ہے ۔ بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ املا کے لحاظ سے عدمِ تعیّن نے اختلافات کی صورت گری کی ، اور تکرار سے یہ مصنوعی صورتیں ، نقش بن گئیں ۔ خود لغات میں جو اِس طرح کے اختلافات ہیں کہ ایک ہی لفظ ایک لُغت میں ایک طرح لکھا ہوا ہے اور دوسرے لُغت میں دوسری طرح ؛ اِس میں حقیقی اختلافات کے ساتھ ساتھ ، اِس عدمِ تعیّن کے پھیلائے ہوئے انتشار کا بھی کچھ حصّہ ہے ۔ جس طرح بہت سے لفظوں میں ہائے مخلوط کے ہونے نہ ہونے کا حال ابھی تک تعیّن طلب ہے (جیسے : ڈھونڈھنا ، ڈھونڈنا ۔ ہونٹھ ، ہونٹ ۔ ٹھیٹھ ، ٹھیٹ) ، وہی صورت بہت سے الفاظ میں نونِ غنّہ کے عدم و وجود کی ہے ۔ اب حال یہ ہے کہ جس کے قلم سے جو نکل جائے ، وہی ٹھیک ہے ۔

آج اگر نصاب کی کتابیں تیار کی جائیں تو اُن میں لفظوں کو کس طرح لکھا جائے ، یہ بات خصوصی توجہ کی طلب گار ہے ۔ اِس کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ املا کا ، یعنی صورت نگاری کا تعیّن کیا جائے ، اور اُس کے لیے ، اختلافات کی صورت میں ، ترجیح کا کوئی نہ کوئی پہلو بہ ہر صورت پیشِ نظر

رکھنا ہوگا۔ اِس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ پُرانی صورتوں کو غلط قرار دیا جارہا ہے، یا صفحۂ لُغت سے محو کیا جارہا ہے، اِس کا مقصد محض یہ ہوگا کہ عام تحریر اور نصابی ضرورتوں کے لیے، صورتوں کا تعین کیا جائے۔ نصاب کی کتابوں میں تو ایک لفظ کی ایک ہی صورت جگہ پائے گی۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ ایک صفحے پر "بانٹنا" لکھا ہوا ہو اور دوسرے صفحے پر "باٹنا"۔ شاگرد "بندر بانٹ" لکھے اور اُستاد تختۂ سیاہ پر "حصہ باٹ" لکھے۔ تولنے کے لیے ایک صاحب "بانٹ" پسند کریں اور دوسرے صاحب "باٹ" کو منتخب کریں۔ ایک شخص "سوئی بھونکنا" لکھے اور دوسرا "سوئی بھوکنا" کو صحیح سمجھے۔ طالب علم "کھینچنا" لکھے اور اُستاد "کھیچ تان" اُستاد خود "سینچنا" اور "سنچائی"، لکھے اور شاگرد "سیچنا" اور "سچائی" لکھے اور کتاب میں کہیں ایک طرح چھپا ہوا ہو اور کہیں دوسری طرح؛ اور معلوم کسی کو نہ ہو کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔

اِس لحاظ سے یہ ضروری ہوگا کہ ایسے مصدر جن میں اصلاً نونِ غنّہ موجود ہے، اُن کی مفصّل فہرست مرتّب کی جائے اور اختلافات کی صورت میں، ضروری تفصیلات اور تشریحات کو منضبط کیا جائے، تاکہ املا کے نقطۂ نظر سے صورتوں کا تعیّن کیا جاسکے اور ترجیح کا فیصلہ کیا جاسکے۔ اِس سلسلے میں جو کچھ لکھا جائے گا، اُس کو اِسی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ ترجیح کا مطلب یہ کبھی نہیں ہوتا کہ باقی صورتیں غلط ہیں، مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ عام تحریر اور نصابی ضرورتوں کے لحاظ سے اُن صورتوں کا تعیّن کیا جائے جن کو اب اختیار کرنا چاہیے۔ باقی صورتیں لُغت میں محفوظ رہیں گی اور لسانی بحثوں کے کام آتی رہیں گی۔

ذیل میں ایسے مصادر کی فہرست پیش کی جاتی ہے ۔ مصادر کے تحت کچھ مشتقات اور مرکّبات کو بھی لکھا جائے گا ۔ جن مصادر کے تحت تشریحات مذکور نہیں، اُس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مصادر نونِ غنّہ کے وجود کے لحاظ سے اختلاف یا قابلِ ذکر اختلاف سے محفوظ رہے ہیں ؛ ایسے مصدروں کو مع مشتقات و مرکّبات، مع نونِ غنّہ ہی لکھا جائے گا ۔ جن مصادر میں نونِ غنّہ کے ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے کسی طرح کا اختلاف ہے، اُن میں ترجیح کا پہلو اِس لحاظ سے پیش کیا گیا ہے کہ اب اِن الفاظ یا مصادر کو کس طرح لکھا جائے ۔

آنکنا[1] ۔ اُمنڈنا[2] ۔ اُنڈلنا[3] ۔ اُنڈیلنا[4] ۔ اَڈنسنا[5] ۔ اَونٹانا[6] ۔ اَونٹوانا[7] ۔ اَوندھنا[8] ۔
اَوندھانا[9] ۔ اَوندھا ۔ اونگھنا[10] ۔ اونگھ ۔ اَینٹھنا[11] ۔ اینٹھن ۔
اینچنا[12] ، اینچ کھینچ ۔ اینڈنا[13] ۔

بانٹنا[14] ، بانٹ ، بانٹ چونٹ ، بانٹ بونٹ ، بانٹ دینا ، بانٹ لینا ، بانٹ کھانا ۔

بانٹ کے کئی معنی ہیں، جیسے : تاش کے پتّوں کی تقسیم ، حصہ بانٹ ، "پتھر لوہے وغیرہ کے وہ آلات جن سے تولتے ہیں"۔ آخری معنی کے تحت صاحبِ نورؔ نے "بانٹ" کو لکھنؤ سے مخصوص بتایا ہے اور دہلی کے متعلق لکھا ہے : "دہلی میں بٹ یا باٹ کہتے ہیں"۔

مولّف کے اِس قول کی بنیاد غالباً اِس پر ہے کہ آصفیہ میں "بانٹ" کے ذیل میں لکھا ہوا ہے : "بٹ ۔ تولنے کا باٹ"۔ مگر آصفیہ میں اِس سے پہلے "ب مع الف" کی فصل میں "باٹ" کو گنواروں کی زبان لکھا گیا ہے :

"باٹ ۔ ہ ۔ اسمِ مذکر ۔ (گنوار) سنگِ ترازو ۔ وزن کرنے کے بٹ"۔

اِس کا مطلب بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سنگِ ترازو کے معنی میں نونِ غنّہ کے بغیر "باٹ" گنواروں کی زبان ہے ۔ مگر یہ ضرور ہے کہ یہ لفظ نونِ غنّہ کے بغیر مستعمل رہا ضرور ہے ، اِس میں دہلی و لکھنؤ کی قید نہیں اور اب بھی نون کے بغیر سُننے میں آجاتا ہے ۔ صاحبِ نفائس نے پہلے "باٹ" لکھا ہے اور اُس کے متعلّق لکھا ہے : " بہ تاے ہندی در آخر، سنگے کہ بہ آں وزن کنند"۔ اِس کے بعد "بانٹ" کے ذیل میں انھوں نے لکھا ہے :

"بانٹ ، بہ سکونِ نون و تاءِ ہندی در آخر ، سنگے کہ بہ آں وزن کنند ....

و تحقیقِ آں در لغتِ باٹ ، کہ لہجۂ اکثرے از مردمِ دہلی است ، گذشت"۔

ایک اور لفظ ہے "باٹ" ، جس کے معنی ہیں : راہ ۔ "باٹ دیکھنا" کے معنی ہیں : راہ دیکھنا ۔ "راہ باٹ" اِسی سے بنا ہے ۔ اِسی سے ایک اور مرکّب بنا ہے : بارہ باٹ ۔ معنی ہوئے : بارہ راستے ، متفرق ، الگ الگ ۔ ذوقؔ کی ایک رباعی میں یہ مرکّب اِس طرح آیا ہے کہ ایہام کا لطف پیدا ہوگیا ہے ۔

دل کو سرِ بازارِ جہاں کر نہ اُچاٹ جس طرح بنے ، سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوقؔ ! فلک آپ ہے بارہ حصّے سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

بازار ، سود و زیاں ، سودا ، بارہ حصّے ؛ اِن سب مناسبات کے ساتھ "بارہ باٹ" میں اصل معنی کے علاوہ ، "بانٹ" کا مفہوم بھی پیدا ہوگیا ہے ۔ اِس رباعی کو صاحبِ نفائس کے قول کی تصدیق میں پیش کیا جاسکتا ہے ۔

فرہنگِ اثر میں ایک مثل درج ہے : " کم بخت گئے ہاٹ ، ترازو ملی نہ باٹ"

اِس کو عورتوں کی زبان بتایا گیا ہے ۔ بہ ہر صورت اِس سے استعمالِ عام کا پتا ضرور چلتا ہے ۔ ایک اور مثال سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے ، انشاؔ نے کہا ہے :

بیگما! چاہ کے دریا کے بڑے پاٹ کو سوچ — بدھڑک پانو نہ دھر، پہلے تو گھر گھاٹ کو سوچ
موتیوں میں اُنھیں آنکھوں کی ترازو پر تول — ارے انشاؔ، نہ تو بنیوں کی طرح باٹ کو سوچ

(کلامِ انشا ص ۲۰۸)

آصفیہ و نورؔ کے علاوہ جلالؔ و رشکؔ نے " سنگِ ترازو " کے معنی میں صرف " بانٹ " لکھا ہے :

" بانٹ ، ف : سنگِ ترازو ۔ و امر بود بہ تقسیم کردنِ چیزے "۔ (نفس)
" بانٹ ، وہ پتھر جن سے کسی چیز کا ترازو میں وزن کریں ، یعنی تولیں ۔
ف : سنگِ ترازو ۔ اور گنجیفہ بازوں کی اصطلاح میں باہم اوراقِ گنجیفہ کی تقسیم کر لینے کو کہتے ہیں "۔ (سرمایہ)

یہ تھی تفصیل ۔ اِس سے قطعِ نظر کر کے ، " بانٹنا " کا امر " بانٹ " ہوگا (مع نونِ غنّہ) اور سنگِ ترازو کے لیے " باٹ " لکھا جائے گا (بغیرِ نونِ غنّہ) ۔ باٹ ، بٹے ، بٹیا ؛ یہ سب لفظ استعمالِ عام میں بغیرِ نونِ غنّہ مستعمل ہیں اور اِسی کی پیروی کی جائے گی ۔

اب صورت یہ ہوئی : ——— بانٹنا ۔ بانٹ (فعلِ امر) ۔ باٹ (سنگِ ترازو ۔ راستہ) ۔ بارہ باٹ ۔ راہ باٹ ۔ ترازو باٹ ۔

بٹنا[15] ، بٹانا[16] ، بٹوانا[17] ۔ بٹائی ، بٹوارا ، بٹوائی ، بٹ جانا[18] ۔

یہ مصدر اور اِن کے مشتقات عام طور پر اب نونؔ کے بغیر مستعمل ہیں اور یہ استثنا ہے ، کیوں کہ نونِ غنّہ اصلاً جزوِ لفظ ہے ۔ اِس صراحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ صاحبِ نورؔ نے " بٹنا " لکھ کر یہ بھی لکھا ہے کہ : " اِس جگہ

بنٹنا فصیح ہے "۔ مگر ان کا یہ قول استعمالِ عام اور مختاراتِ اہلِ لغت کے خلاف ہے ۔ اُنھوں نے اصل پر نظر رکھی ہے ، استثنا کو نظر انداز کر دیا ہے۔ آصفیہ میں "بٹنا" ہی ہے اور بحرؔ لکھنوی نے بھی یہی لکھا ہے :

" بٹنا ، بہ فتح ، تا بیدنِ رشتہ ۔ و تقسیم شدنِ خوردنی و چیز ہاے دیگر "

(بحرالبیان)

بٹانا اور بٹوانا کو خود مولفِ نور نے (صاحبِ آصفیہ کی طرح) نون کے بغیر ہی لکھا ہے اور سند میں بحرؔ کا یہ شعر لکھا ہے :

اعضا بٹائیں درد اگر میرے قلب کا
رگ رگ بدن میں نبض کی صورت تپاں رہے

بٹانا اور بٹوانا کے مشتقات کو بھی اُنھوں نے نون کے بغیر ہی لکھا ہے ، جیسے : بٹائی ، بٹوائی ، بٹوارا ۔ بٹائی اور بٹوائی ، نفس میں بھی نون کے بغیر لکھے گئے ہیں ۔

بٹ جانا کے ایک معنی ہیں : " اِدھر اُدھر چلا جانا "۔ اِس معنی میں بھی یہ نون کے بغیر ہی ہے ۔ مولفِ نور نے بھی اِس کو نون کے بغیر ہی لکھا ہے اور سند میں میر حسن کا یہ شعر لکھا ہے :

خواصیں جو تھیں رو بہ رو ، ہٹ گئیں
بہانے سے ہر کام کے بٹ گئیں

حاصلِ کلام یہ ہے کہ بٹنا (تقسیم ہونے یا رسّی وغیرہ بٹنے کے معانی میں) بٹانا ، بٹوانا ، اور اِن کے مشتقات جیسے : بٹائی ، بٹوائی ، بٹوارا ؛ یہ سب نون کے بغیر لکھے جائیں گے ۔ یہی صورت بٹ جانا کی ہے ـــــ اور بانٹنا اور اِس کے جُملہ مشتقات کو مع نون لکھا جائے گا ۔

باندھنا[19] ۔ بندھنا[20] ۔ بندھانا[21] ۔ بندھوانا[22] ، بندھوا ، باندھنو ، بندھائی ، بندھوائی ۔

بھانپنا[23] ، بھانپ لینا[24] ، بھانپو :

نون کے بغیر "بھاپنا" لکھنا درست نہیں ۔ صاحبِ نور نے "بھاپنا" لکھ کر لکھا ہے : "دیکھو بھانپنا" ۔ مطلب اُن کا یہی ہے کہ لفظ "بھانپنا" ہے ، مگر اِس اندراج سے ہلکا سا احتمال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شاید "بھاپنا" بھی کوئی لفظ ہو۔ اربابِ لغت نے اِس کو صرف مع نون لکھا ہے (آصفیہ ، سرمایہ ، نفس ، فیلن ، بحرالبیان) ۔ جرأت کا شعر ہے :

دیکھا تو یوں وہ کہہ کے ، لگے منہ کو ڈھانپنے
کم بخت پھر لگا مجھے نظروں میں بھانپنے

بھاپ الگ ایک لفظ ہے ، اُس کو اِس "بھانپ" یا "بھانپنا" میں آمیز نہیں کرنا چاہیے ۔ ہاں جی چاہے تو مولوی وحیدالدین سلیم کے بنائے ہوئے قاعدے کے مطابق ، بھاپ سے بھاپنا ، بھاپ دینے کے معنی میں ، ایک نیا مصدر بنا لیجیے ۔ بھاپ اور بھپارا تو موجود ہی ہیں ۔

بھنبھڑنا[25] ۔ بھونکنا[26] ۔ بھونکانا[27] ۔

بُھنکنا[28] ۔ بُھونکنا[29] ۔ بُھنک جانا[30] :

اِن مصدروں کا مادّہ ایک ہے ۔ بُھنکنا لازم ہے ، بھونکنا متعدّی ؛ اِس لیے اِن مصادر اور اِن کے مشتقّات کی ایک ہی صورت ہونا چاہیے ؛ مگر آصفیہ میں بُھکنا (بغیرِ نون) ہے اور اِس کا متعدّی "بھونکنا" (مع نون) ہے ۔ "بُھنکنا" یا "بھوکنا" اِس میں موجود نہیں ۔ "بُھکنا"

کے معنی لکھے ہیں : " گھپنا ، گھس جانا ، چُبھنا ، سوئی یا کیل وغیرہ کا جسم میں اُتر جانا "۔ اور " بھونکنا " کے معنی لکھے ہیں : " فعلِ متعدّی ، کسی نوک دار چیز کو کسی جسم کے اندر گھسانا ، چبونا ۔ فارسی میں خلانیدن ۔ (۲) گنوار : گھوپنا ، موٹی موٹی بسلائی کرنا "۔ مطلب یہ ہے کہ اصل معنی کے لحاظ سے اِن میں کچھ فرق نہیں ، یہ نہیں کہ مع نون کے کچھ معنی ہوں اور بغیر نون کے دوسرا لفظ ہو ، بس لازم متعدّی کا فرق ہے ۔

صاحبِ نور نے " بھکنا " ، " بھک جانا " ، " بھوکنا " کو نون کے بغیر لکھا ہے ۔ اِس کے بعد " بھونکنا " بھی لکھا ہے ، مگر اُنھوں نے " بھوکنا " اور " بھونکنا " کو اِس طرح درج کیا ہے جیسے یہ دو مختلف مصدر ہوں ۔ " بھوکنا " کے ذیل میں لکھا ہے : " بہ ضمِ اول و سکونِ واوِ مجہول ۔ لازم ، گھسیڑنا ۔ اِس معنی میں بغیر نون قبل کاف کے صحیح ہے "۔

مولّف نے غالباً نفس کے اندراج سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے ۔ رشک نے اِس مصدر کی صرف ایک صورت " بھوکنا " لکھی ہے اور معنی لکھے ہیں : " خلانیدن "۔ یہ معنی وہی ہیں جو سب نے لکھے ہیں ۔ غالباً اِسی سے صاحبِ نور نے قیاس کیا کہ چبھونے کے معنی میں " بھوکنا " الگ مصدر ہے اور " نوک دار چیز کو کسی دوسری چیز میں چبھونا " کے معنی میں " بھونکنا " الگ مصدر ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ محض مفروضہ ہے ۔

یہ بات کہ مصدر لازم " بھُنکنا " مع نون تھا اور " بھونکنا " اِسی کا متعدّی ہے ؛ اِس کی مزید تصدیق بحرالبیان سے ہوتی ہے ۔ بحر نے پہلے تو بابِ فعلن کے اوزان کے ذیل میں ایک اور مصدر " ٹھُنکنا " لکھا ہے اور اِس صراحت کے ساتھ کہ : " بہ ضمِ تاے ثقیل و ہا و نونِ مخلوط "۔ اِس

کے بعد ہی " بُھنکنا " لکھا ہے اور اِس کے متعلق لکھا ہے : " بہ ہماں وزن ، نوکِ کدام چیز در بدن پیوستن "۔ اِس کے بعد بابِ فاعلن کے تحت لکھا ہے :

" بھونکنا ، بہ فتحِ ہاو واو و نونِ مخلوط ، غرّیدنِ سگ ــــ و بہ ضمِّ واوِ مجہول، دخولِ کارد در شکم ۔ و ایں مصدرِ متعدّی کردہ است بہ از دیادِ نگواو ۔ و از بابِ فعلن ، در بابِ فاعلن آوردہ "۔

بعض اور مصادر کی طرح ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس مصدر کی متعدّی صورت تو مع نون ہی مستعمل رہی (بھونکنا) اور مصدرِ لازم کو بعض نے نون کے بغیر استعمال کیا ۔

اب اِس کو لازم و متعدّی دونوں صورتوں میں مع نون ماننا چاہیے ۔یعنی: بُھنکنا ، بُھونکنا ، بُھنکوانا ۔ اِن کے مشتقات میں بھی نون برقرار رہے گا ، جیسے : " سوئی بُھنک گئی " ، اور " چُھری بھونک دی "۔

بھچنا ، بھینچنا :

نور میں " بھچنا " نون کے بغیر ہے ۔ " بھیچنا " کو بھی اِسی طرح لکھا ہے ۔پھر آگے چل کر " بھینچنا " لکھ کر لکھا ہے : " دیکھو بھیچنا "۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اُن کے نزدیک فصیح یا مرجّح صورت نون کے بغیر ہے ۔

آصفیہ میں " بھچنا " اور " بھیچنا " دونوں صرف بغیرِ نون ہیں ـــــ سرمایہ میں " بھیچنا " ہے نون کے بغیر ۔ نفس میں " بھیچ " اور " بھیچنا " دونوں بغیرِ نون ہیں ۔

فیلن نے " بھچنا " کو نون کے بغیر اور " بھیچنا " کو دونوں طرح لکھا ہے ، یعنی : بھیچنا اور بھینچنا ۔ البتّہ بحر نے مصدرِ لازم کو مع نون لکھا ہے :

" بھِنچنا ، بہ کسرِ باے ابجد و ہا و نون ہر دو مخلوط ۔ تنگا تنگ آمدہ شدن "۔
لُغت نویسوں کی اکثریت نے اِن مصادر کو نون کے بغیر لکھا ہے۔ سماعت میں دونوں طرح ہیں ۔ اختلاف سے قطعِ نظر، اب اِن کو نون کے بغیر مرجّح سمجھنا چاہیے ، یعنی : بھِچنا ، بِھچنا۔

بیونتنا ۔ بیونتانا ، بیونت ، کتر بیونت ۔

بِندھنا ، بِیندھنا ۔ بِدھنا ، بیدھنا :

بِندھنا یا بِدھنا کے ایک معنی ہیں : " موتی میں سوراخ ہونا "۔ تعدیے کی صورت میں بِیندھنا یا بیدھنا ہو جائیں گے ۔ لکھنؤ کے لُغت نویسوں نے درخشاں ، جلال ، مولّفِ نور) " بیدھنا " نون کے بغیر لکھا ہے ، بل کہ صاحبِ نور نے " بیدھنا " کے ذیل میں صراحت کر دی ہے کہ : " لکھنؤ میں یاے مجہول کے ساتھ ۔ دہلی میں یاے معروف اور نونِ غنّہ اضافہ کر کے بولتے ہیں "۔ آصفیہ میں صرف " بندھنا " اور " بیندھنا " ہیں ، مع نون ۔

اِن مصادر کی دونوں صورتوں کو صحیح مان لینا چاہیے ۔ دونوں دبستانوں کی اب سے پہلے تک کی تحریروں میں اِس اختلاف کی پابندی کی جائے گی۔ اور نصابی ضرورتوں کے لیے ، میرا خیال ہے کہ اِس کو مع نون مان لینا چاہیے ، یعنی : بِندھنا ، بِیندھنا ۔

پوچھنا ، پُچھوانا ، پوچھ گچھ :

پوچھنا (واو معروف) میں اصلاً نون موجود نہیں ، مگر مصدر اور اِس کے مشتقات کو مع نون بھی لکھا جانے لگا تھا ۔ اِس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔ مثلاً خورشید لکھنوی کی کتاب افادات (مطبوعۂ قومی پریس لکھنؤ ، ۱۹۳۸ء) میں جگہ جگہ یہ لفظ مع نون ملتا ہے ۔ کچھ پرانی تحریروں

میں بھی اِس کا یہ املا نظر آتا ہے۔

یہ مصدر اور ایک اور مصدر "سوچنا" اِن دونوں میں یہی ہوا ہے کہ اِن کو مع نون بھی لکھا گیا (پونچھنا۔سونچنا)۔ مگر اب اِس پر اتفاق ہے کہ یہ دونوں مصدر نون کے بغیر صحیح ہیں۔

پُونچھنا۔پُنچھوانا۔پُونچھن، پُونچھ پانچھ، پِچھنا:

اِس مصدر میں نونِ غنہ کے ہونے یا نہ ہونے کے متعلق اچھا خاصا اختلاف نظر آتا ہے۔ آصفیہ میں "پوچھن" اور "پوچھنا" نون کے بغیر لکھے ہوئے ہیں۔ رشک نے بھی نفس میں "پُرسیدن اور صاف کردن" دونوں معانی میں ایک ہی مصدر "پوچھنا" لکھا ہے، نون کے بغیر:

"پوچھنا: صاف کردنِ چرک و آلایش و آلودگی بود از چیزے۔ و بہ واوِ معروف: پُرسیدن"۔

"پوچھن: جامہ دلتہ و پنبہ کہ بداں نجاست پاک کردہ بیفگنند..."۔

مگر نور میں اِس معنی میں "پوچھن" کو غلط بتایا گیا ہے:

"پوچھن۔صحیح پونچھن ہے، دیکھو پونچھن"۔

"پونچھنا" اور "پونچھن" کو نور میں مع نون لکھا گیا ہے۔ مگر اِس کے لازم کو نون کے بغیر "پُچھنا" لکھا گیا ہے:

"پُچھنا (ہ) لازم۔پونچھا جانا۔(فقرہ) یہ میز ابھی تک نہیں پُچھی"۔

حالاں کہ اُن کے لکھنے کے مطابق صحیح "پونچھنا" ہے تو اِس کا لازم "پُنچھنا" ہوا۔پونچھنا کے متعدی المتعدی کو بھی اُنھوں نے مع نون لکھا ہے۔فیلن نے "پونچھنا" اور "پونچھن" کو صرف مع نون لکھا ہے۔جلال نے سرمایہ میں "پوچھنا" اور "پوچھن" نون کے بغیر لکھے ہیں۔

مناسب یہ ہے کہ اب اِس کی ایک صورت پُونچھنا (مع نون) اختیار کرلی جائے۔ اِس طرح "پوُچھنا" (بہ معنیِ پرسیدن) اور "پُونچھنا" میں امتیاز بھی برقرار رہے گا۔ اِس کی دوسری صورت پُنچھوانا ہوگی۔ پُونچھ پانچھ" کو بھی مع نون لکھا جائے گا:

کیا صاف حُسن ہو گیا، کیسے نکھر گئے
چہرے کو پونچھ پانچھ کے کیا آئنہ کیا

اور "پوُچھنا" (بہ معنیِ پرسیدن) سے "پوُچھ پاچھ" بنے گا۔ یہ امتیاز مناسب بھی ہے اور ضروری بھی ــــ اِسی طرح "پونچھن" کو بھی مع نون لکھا جائے گا۔

البتہ "پچھنا" کو نون کے بغیر مان لینا چاہیے، استعمال میں اِس کا نون ساقط ہوچکا ہے۔ پوُچھنا (بہ معنیِ پرسیدن) کا لازم آتا ہی نہیں، اِس لیے کسی التباس کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا۔ "میز پونچھ دی گئی" اور "میز پچھ گئی" لکھا جائے گا۔

پھنسنا ۔ پھانسنا ۔ پھنسانا ۔ پھنسوانا ۔ پھنسا وا، پھنساو، پھانس پھونس کر، اُڑاو پھنساو:

آصفیہ، نور، بحرالبیان، سرمایہ میں "پھنسنا" مع نون ہے۔ کوئی اختلاف نہیں۔ اِس کے مشتقات کو بھی مع نون لکھا گیا ہے۔ صرف نفائس میں اِس کو نون کے بغیر (پھسنا) لکھا گیا ہے۔

زبانِ داغ (مرتبۂ رفیق مارہروی مرحوم) میں داغ کا ایک خط افتخار عالم مارہروی کے نام ہے، جس میں داغ نے "پھسنا" کو نون کے بغیر صحیح بتایا ہے:

"لفظ پھسنا بغیر نون کے صحیح ہے ۔ چناں چہ میں نے بھی یہی کہا ہے ۔ رند کے شعر سند میں لکھتا ہوں"۔ (زبانِ داغ ص ۱۰۵)

داغ نے رند، ذوق، میر اور بہادر شاہ ظفر کے اشعار سنداً لکھے ہیں۔ بنائے استدلال بظاہر یہ ہے کہ چوں کہ لفظ "پھس" ہوس، مگس وغیرہ کا ہم قافیہ ہے، اس لیے وہ لازماً بغیرِ نون ہوگا ۔ صرف ذوق کے شعر نقل کیے جاتے ہیں:

ہوں یہ لاغر، جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے
جوں کبادہ لچکے ہے پائے مگس کے بوجھ سے
نکلے دنیا سے کہاں احمق اُٹھا کر بارِ حرص
رہ گیا یہ تو گدھا دَل دَل میں پھس کے بوجھ سے

لیکن یہ استدلال درست نہیں ۔ "پھنس" مع نونِ غنّہ، مگس کا ہم قافیہ ہوسکتا ہے ۔ افادات میں اس پر مفصّل بحث کی گئی ہے (افادات، ص ۹۸) اُن کی تحریر کا ملخص یہ ہے کہ: "ہنس کا قافیہ بلا تردّد دس، کس وغیرہ کے ساتھ درست[1] ہے"۔

یہ سب مصادر اور اِن کے جملہ مشتقات نونِ غنّہ کے ساتھ لکھے جائیں گے۔ ہاں، نور میں "پھنسنا" کے ذیل میں "پھنساو" اور "پھنسادا" کو بھی

---

[1] صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے:

اے ابرِ تر تو اور کسی سمت کو برس — اِس ملک میں ہماری ہے یہ چشمِ تر ہی بس
اے گریہ اُس کے دل میں اثر خوب ہی کیا — روتا ہوں جب میں سامنے اُس کے، تو دے ہے ہنس

(میر۔ کلیاتِ میر، مرتبۂ آسی، ص ۱۱)

مع نوٓن لکھا گیا ہے اور یہ بالکل ٹھیک ہے، مگر اِس سے پہلے، صرف اِن دو لفظوں کو نوٓن کے بغیر بھی لکھا گیا ہے (پھساو۔ پھساوا) یہ درست نہیں۔ یہ دونوں لفظ بھی مع نوٓن لکھے جائیں گے۔

پھانکنا۔ پھنکوانا۔ پھاندنا۔ پھندانا۔ کود پھاند۔

پہنچنا۔ پہنچانا۔ پہنچوانا، پہنچ۔

پُھنکنا۔ پھونکنا۔ پُھنکوانا۔ پھونک، جھاڑ پھونک، پھونک مارنا، پھونک پھونک کر:

اِن مصادر میں بھی وہی عدمِ تعیّن کی پیدا کی ہوئی گڑبڑ ہے۔ آصفیہ میں پہلے "پُھکنا" نوٓن کے بغیر ہے۔ "پھوکنا" اِس میں موجود نہیں۔ اِس کے بعد "پُھنکنا" اور "پھونکنا" مع نوٓن ہیں۔ اِن کے زیادہ مشتقات نوٓن کے ساتھ ہی لکھے گئے ہیں۔ بحر نے اِس کو صرف مع نوٓن لکھا ہے:

"پھونکنا، بہ واوِ معروف وہاء و نونِ مخلوط، نفخ بہ منفاخ و پلف کردن وسوزانیدن"۔ (بحرالبیان)

رشک نے پھونکنا، پھونک مارنا، پھونک؛ سب کو مع نوٓن لکھا ہے۔ جلاؔل نے بھی "پھونکنا" کو صرف مع نوٓن لکھا ہے۔ نوؔر میں بھی پھونک، پھونکنا، پھونک دینا، پھونک ڈالنا؛ سب کو مع نوٓن لکھا گیا ہے، مگر "پُھکنا" کے ذیل میں یہ لکھا گیا ہے:

"پُھکنا۔ اِس لفظ کے اِملا میں اختلاف ہے۔ بعضے بغیر نونِ غنّہ لکھتے ہیں اور بعض نونِ غنّہ کے ساتھ۔ اصل میں تو نونِ غنّہ ضرور ہے، اِس لیے کہ پھونکنا میں نونِ غنّہ ہے، اُسی سے لازم ہے، مگر اب لہجے میں اور املا میں بغیرِ نونِ غنّہ زیادہ رواج ہے"۔

مگر بحرؔ نے مصدرِ لازم کو صرف مع نوؔن لکھا ہے : " پھنکنا ، بہ ضم و ہا و نونِ مخلوط ، سوختن "۔

اصل میں نوؔنِ غنّہ ہے ، اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ اِس مادّے سے بننے والے مصادر اور مشتقّات کو مع نوؔن لکھا جائے ۔ یعنی : پُھنکنا ، پھونکنا، پُھنکوانا ۔ سینۂ غمِ نہاں سے پُھنک رہا ہے ۔ بدن بخار سے پُھنکا جا رہا ہے ۔ پھونک پھونک کے قدم رکھنا ، وغیرہ ۔

پھوک ، ایک اور لفظ ہے ۔ گنڈیری وغیرہ کا رس نکل جانے کے بعد جو ثفل بچتا ہے ، اُس کو "پھوک" کہتے ہیں ۔ اُس نکلا ہوا ، خالی ، کھوکھلا ، بے وزن۔

پھنٹنا ۔ پھینٹنا ۔ پھنٹوانا ۔ پھینٹ :

نورؔ و آصفیہؔ دونوں میں اِس کو مع نوؔن اور بغیرِ نوؔن ، دونوں طرح لکھا گیا ہے (پھیٹنا ۔ پھینٹنا) ۔ دونوں لُغات میں " پھینٹنا " کے بعد لکھا گیا ہے۔ " دیکھو پھیٹنا "۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں مولّفوں کے نزدیک "پھیٹنا" نوؔن کے بغیر مرجّح ہے ۔

نفسؔ میں " پھینٹ " اور " پھینٹنا " دونوں مع نوؔن ہیں ۔ یہی صورت فیلنؔ کے لُغت میں ہے ۔

یہ مسلّم ہے کہ اِس کے مادّے میں نوؔنِ غنّہ شامل ہے ۔ سُننے میں دونوں طرح آیا ہے ۔ اصولاً اِس کو مع نوؔنِ غنّہ لکھنا چاہیے ، یعنی : پھینٹ ، پھینٹنا ، پھنٹنا ، پھنٹوانا ۔

پھینچنا ۔ پھنچائی ۔

پھنکنا ۔ پھینکنا ۔ پھنکوانا ۔ پھینک پھانک :

" پھینکنا " متّفقہ طور پر مع نوؔنِ غنّہ ہے ۔ " پھنکنا " کے متعلق مولّفِ نورؔ نے

لکھا ہے کہ: "اِس کا املا بھی مثل "پھکنا" کے ہے"۔ یعنی "بعضے بغیر نونِ غنّہ لکھتے ہیں اور بعض نونِ غنّہ کے ساتھ"۔ آگے چل کر "پھنکنا" مع نوؔن کے ذیل میں لکھا ہے: "اب لکھنؤ والے نوؔن نہیں لکھتے"۔ آصفیہ میں "پھنکنا" صرف مع نوؔن ہے۔

اِس اختلاف کا تعلّق تدوین سے رہے گا۔ عام تحریر کے لیے اب لازم و متعدّی مصادر کو اور اُن کے مشتقات کو صرف مع نوؔن لکھنا چاہیے۔

تانسنا[۶۲]۔ تونسنا[۶۳]، تونس۔ ٹانچنا[۶۴]

ٹنکنا[۶۵]۔ ٹانکنا[۶۶]۔ ٹنکانا[۶۷]۔ ٹنکوانا[۶۸]۔ ٹانکا۔ ٹنکائی۔ ٹنکوائی:

"ٹانکنا" اور "ٹانکا" میں کوئی اختلاف نہیں۔ "ٹانکنا" کا لازم ہوا "ٹنکنا"۔ آصفیہ میں "ٹکنا" (نوؔن کے بغیر) ہے۔ نور میں "ٹنکنا" (مع نوؔن) کو مرجّح بتایا گیا ہے۔ مولّف نے "ٹکنا" لکھ کر لکھا ہے: "اِن معنوں میں ٹنکنا بولتے ہیں"۔ بحؔر نے بھی اِس کو مع نوؔن لکھا ہے: "ٹنکنا، بہ فتحِ تا سے تقیل و نونِ غنّہ، دوختہ مثلِ بندِ قبا وغیرہ"۔ نور میں "ٹنکائی" کو بھی مع نوؔن ہی لکھا گیا ہے۔

ٹانکنا، ٹنکوانا، ٹانکا، ٹانکے، ٹنکائی: یہ سب مع نوؔن مستعمل ہیں، لُغات میں بھی اِن کو مع نوؔن ہی لکھا گیا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ لازم مصدر کو بھی مع نوؔن ہی لکھا جائے (ٹنکنا)۔ "ٹنکائی" کو بھی مع نوؔن لکھا جائے گا ــــ ٹانک رکھنا: یادداشت کے لیے لکھ لینا، ٹانک لینا: کسی رقم کو درج کر لینا؛ یہ سب مع نوؔن ہی لکھے جائیں گے۔

ٹِنکنا (بہ کسرِ اوّل)، ایک دوسرا مصدر ہے۔ "ٹنکنا" کو مع نوؔن لکھنے سے، اصل اور چلن کی پابندی کے علاوہ، دونوں میں امتیاز کا پہلو بھی

نمایاں رہے گا۔

ٹنگنا۔ ٹانگنا۔ ٹنگوانا۔ ٹونگنا۔

ٹھونسنا۔ ٹھنسنا۔ ٹھانسنا۔ ٹھنسوانا۔ ٹھونس ٹھانس:

ٹھانسنا اور ٹھونسنا، دونوں مع نون ہیں اور اِس میں کچھ جھگڑا نہیں۔ اِنھی سے ایک مرکّب بنتا ہے: ٹھونس ٹھانس، یہ بھی مع نون ہے۔ آصفیہ میں یہ موجود نہیں، مگر نور میں ہے اور مع نون ہے۔

آصفیہ میں "ٹھانسنا" اور "ٹھونسنا" دونوں کو فعلِ متعدی لکھا ہے، ٹھانسنا کا لازم ہوا: ٹھنسنا، اور ٹھونسنا کی دوسری صورت ہوئی ٹھنسوانا؛ مگر آصفیہ و نور دونوں میں "ٹھسنا" اور "ٹھسوانا" دونوں کو نون کے بغیر لکھا گیا ہے۔ سرمایہ میں "ٹھوسنا" نون کے بغیر ہے۔ البتہ بحر نے مصدرِ لازم "ٹھنسنا" مع نون لکھا ہے:

"ٹھنسنا، بہ فتحِ تاے ثقیل، و ہا و نونِ مخلوط؛ چیزے بہ منفذِ تنگ دخول شدن کہ گنجایشِ آں نداشتہ باشد" (بحرالبیان)

صاحبِ نور نے "ٹھسنا" کے ساتھ ساتھ ایک اور مصدر "ٹھَبنا" (بہ فتحِ اول، بغیرِ نون) بھی لکھا ہے اور معنی لکھے ہیں:

"ٹھسنا، آبِ رواں کا کسی جگہ جمع ہو جانا۔ (فقرہ) پُل میں پانی ٹھس گیا۔ (۲) خوب ٹھونس ٹھونس کے بھرنا، (فقرہ) برف بوتل میں ٹھس کر بھر دی۔"

اثر لکھنوی نے اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"پلیٹس میں درج ضرور ہے، مگر لکھنؤ میں مستعمل نہیں۔ "پُل میں پانی ٹھس گیا" کی جگہ کہیں گے: "پُل میں پانی بھر گیا، یا رک گیا"۔ زیادہ سے زیادہ ٹھنس گیا (بالضم و نونِ غنّہ) کہ پیچھے (ٹھونستا ہے)"۔ (فرہنگِ اثر)

• گویا صاحبِ فرہنگِ اثر کے نزدیک بھی "ٹھنسنا" مع نون ہے۔

حاصلِ گفتگو یہ ہوا کہ مصدرِ لازم "ٹھنسنا" ہے، خواہ "ٹھانسنا" کی رعایت سے بالفتح کہیے، خواہ ٹھونسنا کی نسبت سے بالضم۔ یعنی ٹھَنسنا اور ٹھُنسنا دو صورتیں ہوئیں، اصلاً دونوں میں نون ہے۔ ٹھونسنا، ٹھانسنا، ٹھُنسوانا یہ سب بھی مع نون ہوئے۔ "ٹھونس ٹھانس" میں بھی دونوں اجزا مع نون ہیں۔ "ٹھسنا" اور "ٹھسوانا" کو نون کے بغیر بھی لکھا گیا ہے۔ یہ اختلاف برحق، مگر اب اچھا یہ ہوگا کہ اِن سب کو اصل کے مطابق مع نون ہی لکھا جائے۔

ٹھُس، ایک اور لفظ ہے، معنی بھی اِس کے مختلف ہیں، یعنی: "ٹھوس، پُرمغز، نکمّا، اور سُست آدمی، کُند ذہن، روپیا جس میں جھنکار نہ ہو" وغیرہ۔ ٹھُس پن میں یہی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: بھدّا پن، کُند ذہنی۔ ٹھُوس اور ٹھُس، دونوں لفظ نون کے بغیر ہیں ـــــ ایک اور مرکّب ہے: ٹھساٹھس، یہ تحریر و تقریر میں نون کے بغیر ہی مستعمل ہے، یہ اِسی طرح رہے گا۔

ٹھُونکنا، ٹھُنکنا، ٹھُنکوانا۔ ٹھوکنا۔

نور و آصفیہ دونوں میں اِس مصدر (ٹھونکنا) کی دونوں صورتیں ملتی ہیں یعنی مع نون بھی اور بلا نون بھی (ٹھوکنا، ٹھونکنا)۔ آصفیہ میں ترجیح کی صراحت نہیں، البتّہ صاحبِ نور نے لکھا ہے:

"لکھنؤ میں نونِ غنّہ کے ساتھ آواز نکالتے ہیں۔ ہندی میں دونوں طرح ہے"۔

نیز "ٹھکنا" لکھ کر لکھا ہے: "اِس جگہ لکھنؤ میں ٹھنکنا بولتے ہیں"۔ پھر "ٹھکوانا" کے تحت لکھا ہے: "لکھنؤ میں اِس جگہ ٹھنکوانا بولتے ہیں"۔

بحر نے "ٹھنکنا" کو مع نون لکھا ہے:

" ٹھُکنا، بہ ضمِ تائے ثقیل، و ہا و نونِ مخلوط، نفوذ شدنِ میخ در چیزے و سر کوفتہ شدنِ چیزے تا اندرونِ چیزے رود" ۔

اختلاف سے قطعِ نظر، یکسانیت کے نقطۂ نظر سے اچھا یہی ہوگا کہ اصل کی رعایت سے اِس کو مع نون لکھا جائے، یعنی: ٹھُنکنا ۔ ٹھونکنا ۔ ٹھُنکوانا ۔ اِسی طرح " ٹھونک بجا کے "، " ٹھونک پیٹ "، " ٹھونک ٹھانک کے " سب کو مع نون لکھا جائے گا ۔

اِس مصدر کے ایک معنی مارنے پیٹنے، جوتا کاری کرنے کے بھی آتے ہیں — صاحبِ آصفیہ نے اِن معنوں کی سند میں سودا کا ایک شعر درج کیا ہے اور اِس میں " ٹھونک " مع نون ہی لکھا ہوا ہے :

مسجد میں واعظوں کے تئیں لگ گئی ہے بھیڑ زاہد نے ٹھونکا شیخ کو، پگڑی اُتار کر

اثر لکھنوی نے ٹھکنا اور ٹھکوانا کے ذیل میں صاحبِ نور کے اِس قول پر کہ " لکھنؤ میں ٹھنکنا، ... ٹھکوانا ... اِس جگہ ٹھنکوانا کہتے ہیں " تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

" یہ بیان گمراہ کن ہے، ہم نے یہاں بھی نازک فرقِ مفاہیم سے کام لیا ہے ۔ ٹھونکنا: کوئی چیز گاڑنا، پیوست کرنا ہے ۔ مثلاً: کیل دیوار میں ٹھونک دو ۔ متعدّی: ٹھنکوانا ۔

ٹھوکنا: خوب مارنا، زدوکوب کرنا ۔ مثلاً: میں نے اُسے خوب ٹھوکا ۔ متعدّی: ٹھکوایا " ۔ (فرہنگِ اثر)

گویا ٹھونکنا اور ٹھنکوانا عام معانی میں، اُن کے نزدیک بھی مع نون ہیں، اور ایک خاص معنی میں نون کے بغیر ۔ میرے خیال میں یہ امتیاز نہایت مناسب ہے ۔

جُنچنا[۸۰]، جانچنا[۸۱]، جَنچوانا[۸۲]، جانچ، جانچ جونچ، جانچ پرکھ، جُنچا تُلا۔

جھانپنا[۸۳] (ڈھانکنا، غلاف چڑھانا) جھانپ (بانس کا بڑا خوان پوش)

جھانکنا[۸۴]، جُھنکانا[۸۵]، جھانکی، جھانک تاک، جھانکا جھونکی۔

جانچنا متفقہ طور پر مع نون ہے۔ جانچ کی بھی یہی صورت ہے۔ اس کا لازم آصفیہ میں "جچنا" لکھا ہوا ہے۔ نور میں ایک جگہ "جچنا" ہے اور دوسری جگہ "جنچنا"۔ "جنچنا" کے ذیل میں تو صاحبِ نور نے کوئی صراحت نہیں کی، البتہ "جچنا" کے تحت لکھا ہے کہ: "یہ جانچنا کا لازم ہے۔ اصل میں نون ہے، لیکن بول چال میں نون حذف کرکے بولتے ہیں"۔

اثر صاحب نے اِس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "لکھنؤ میں نونِ غنّہ کے استعمال کے ساتھ بولتے ہیں"۔ (فرہنگِ اثر)۔ نور میں "جچّا تلا" چھپا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ تشدید، غلطیِ کتابت ہے۔ اثر صاحب نے لکھا ہے:

"جچّا تلا میں جچّا پر صاف صاف علامتِ تشدید ہے، یہ غلط در غلط"

غلط در غلط سے اُن کی مراد یہی ہے کہ ایک تو "جنچا" کو نون کے بغیر لکھا گیا اور پھر اِس پر تشدید بھی لگ گئی۔ مطلب یہ ہوا کہ اُن کی راے میں "جنچا تلا" مع نون ہی ہے۔ نیز "منجی چوٹ" کے ذیل میں "جنچا ہاتھ" انھوں نے لکھا ہے (فرہنگِ اثر، ص ۱۴۳)۔ بحر نے بھی "جنچنا" کو مع نون لکھا ہے:

"جنچنا، بہ فتحِ جیم، بہ جیمِ فارسی د میان نونِ غنّہ، چیزے خوب، قدر و قیمتِ آں ذہن نشیں شدن"

اور مصادر کی طرح اِس کے بھی مصدرِ لازم میں اختلاف ہے، یہ برحق، مگر اب اِس کی سب صورتوں کو مع نون ہی لکھنا چاہیے۔

جھانکنا، بالاتفاق مع نون ہے۔ اِس کے مشتقات کی بھی یہی صورت

ہے۔ مگر آصفیہ و نور دونوں میں "جھکانا" نون کے بغیر ہے۔ مگر "کنویں جھنکانا" مع نون سنا گیا ہے۔ اور نفائس میں گھر جھنکنی رزنے کہ یک جا قرار نگیرد وہ بخانۂ ہمسایگاں رود) کو نون کے بغیر لکھا گیا ہے۔ اِس کو استثنا مانا جا سکتا ہے۔ جُھکانا سے التباس نہ ہو؛ اِس لیے بھی مناسب یہی ہوگا کہ لازم و متعدّی دونوں کو مع نون لکھا جائے، یعنی جھانکنا، جھنکانا۔

جُھنجلانا، جھنجلاہٹ، جھنجوڑنا۔

جُھونکنا، جھونک، جھونک دینا، جھونک مارنا، جھونک سنبھالنا، نوک جھونک۔ جھونکا۔

نور میں "جھوکنا" لکھا ہے، اور اِس کے بہت سارے معانی لکھنے کے بعد، آخر میں لکھا ہے: "اِن معانی میں جھونکنا ہی بولتے ہیں"۔ "جھوک" نون کے بغیر لکھ کر لکھا ہے: "عموماً اِس لفظ کا تلفّظ نون کے ساتھ یعنی جھونک ہے"۔ اِسی طرح "جھوکا" کے ذیل میں جتنی مثالیں درج کی ہیں، اُن سب میں "جھونکا" لکھا ہوا ہے۔ "نوکا جھوکی" اِس میں نون کے بغیر ہے، اثر صاحب نے اِس کے متعلق لکھا ہے: "لکھنؤ میں نوک جھونک ہے" (فرہنگِ اثر) آصفیہ میں پہلے "جھوکنا" ہے، پھر "جھونکنا" بھی لکھا ہوا ہے مگر اندازِ تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ بغیرِ نون کو مرجّح سمجھتے تھے۔ "جھوک" بھی نون کے بغیر ہے، مگر مثال میں "نشے کی جھونک" لکھا ہوا ہے۔ بحرالبیان میں "جھونکنا" ہے۔

ایک مصدر کی دو شکلیں خواہ مخواہ بن گئی ہیں، اِس مصدر اور اِس کے جملہ مشتقات کو مع نون ماننا چاہیے۔

جُھونکنا۔ جھینکنا۔

یہاں پر صرف یہ صراحت کرنا چاہتا ہوں کہ "جھکانا" ایک الگ مصدر ہے، اِس کے معنی ہیں: حیران کرنا، مغالطہ دینا وغیرہ۔ اسی سے "جھکائی" بنا ہے۔ صاحبِ نور نے اِس لفظ کو "جھکانا" (جھانکنا کا لازم) کے ذیل میں لکھا ہے، یہ صحیح نہیں۔ فرہنگِ اثر میں بھی اِس غلطی کی نشان دہی کی گئی ہے۔

چونکنا[۹۲]، چونکانا[۹۳]، چونک اُٹھنا، چونک جانا، چونک پڑنا۔

نور میں صرف مع نون۔ آصفیہ میں بھی چونک، چونک اٹھنا، چونک پڑنا، چونک جانا، سب مع نون ہیں، مگر اِن سے پہلے چ مع واو کی فصل میں "چوکنا یا چونکنا" لکھا ہے، اگرچہ اِس کے آخر میں یہ صراحت بھی کردی ہے کہ "اہلِ دہلی نونِ غنّہ کے ساتھ بولتے ہیں"۔ اِس صراحت کے بعد، اِس کو نون کے بغیر لکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اِس کے سوا کہ احتمال کا شائبہ پیدا ہو، اور کچھ حاصل نہیں۔ چوکنا (بغیرِ نون۔ واو معروف) ایک دوسرا مصدر ہے۔

چُندرانا[۹۴]۔ چوندھیانا[۹۵]، چکاچوندھ۔

چھانٹنا، چھنٹنا (چھٹنا)، چھنٹوانا، کاٹ چھانٹ۔

نور و آصفیہ میں "چھانٹنا" مع نون ہے، اِس کے مشتقات بھی مع نون لکھے گئے ہیں: چھانٹن، کاٹ چھانٹ۔ اِس کا لازم مصدر نور میں "چھٹنا" نون کے بغیر ہے، اِس کے بعد "چھنٹنا" مع نون لکھ کر لکھا ہے: "دیکھو چھٹنا" گویا مرجّح نون کے بغیر ہے، مگر "چھنٹاو"، اور "چھنٹیل" کو صرف مع نون لکھا ہے۔

آصفیہ میں پہلے "چھٹنا" نون کے بغیر ہے، پھر آگے "چھنٹنا" مع

نون بھی لکھا گیا ہے اور " چھنٹاو " کو صرف مع نون لکھا ہے ۔ " چھنٹاو " کے ذیل میں جو عبارت ہے ، اُس میں " چھنٹن " مع نون ہے ۔
بحر نے " چھنٹنا " مع نون لکھا ہے ۔

" چھنٹنا " جیم فارسیِ مفتوح ، و نونِ مغنونہ و تائے ثقیل ، شاخ ہائے درخت قلم شدن ، و چیزے از چیزے منتخب شدن " ۔

" چھٹنا " نون کے بغیر مستعمل رہا ہے ۔ امیر اللغات میں " ابر چھٹنا " لکھا گیا ہے ، سند میں اسیر کا یہ شعر درج کیا گیا ہے :

گیسو تمھارا چہرۂ روشن سے ہٹ گیا
لو چاندنی نے کھیت کیا ، ابر چھٹ گیا

" وہ تو چھٹا ہوا لفنگا ہے " ، اس طرح کے جملوں میں بھی " چھٹا ہوا " نون کے بغیر ہی سُننے اور دیکھنے میں آیا ہے ۔

اِس مصدر کی اور سب صورتوں کو اب صرف مع نون لکھا جانا چاہیے ، البتہ لازم صورت " چھٹنا " اور اُس کے بعض مشتقات میں اختلاف کو تسلیم کر لینا چاہیے ، یعنی اِس کے بعض مشتقات مع نون لکھے جائیں گے اور بعض نون کے بغیر ۔ اِس طرح :

چھنٹنا : چھنٹن ، چھنٹاو ، چھنٹیل ، چھنٹائی ۔

چھٹنا : چھٹا ہوا ، ابر چھٹنا ، چھٹنی ، چھٹ چھٹا کر (چھنٹ چھنٹا کر) ۔

چھانٹنا ، چھانٹ ، کاٹ چھانٹ ، چھانٹن ، لغت چھانٹنا ، منطق چھانٹنا ، قابلیت چھانٹنا ، چھنٹوانا ، چھنٹوائی ۔

چھونکنا ، چھونک ۔ چھینکنا ، چھینک ۔

دھوانْسنا ، دھواں جانا ۔

ڈھنگارنا[۱۰۲]، ڈھنگار۔ ڈھونکنا[۱۰۳]، ڈھونکنی ۔ دھنسنا[۱۰۴]، (دھسنا)، دھنسانا[۱۰۵]، دھانسنا[۱۰۶]، دھانس :

آصفیہ و نور میں " دھنسنا " اور " دھسنا " دونوں ہیں اور ترجیح کے بغیر ۔ نور میں دو مثالیہ فقرے اور ایک شعر درج کیا گیا ہے ، اِن میں دو جگہ " دھسنا " اور ایک جگہ " دھنسنا " ہے ۔

سرمایہ اور بحر البیان میں " دھنسنا " (مع نون) ہے مگر نفائس میں " دھسنا " ہے ۔

" دھانسنا " نور و آصفیہ میں مع نون ہے مگر آصفیہ میں اِس کے معنی " گھوڑے کا کھانسنا " ہیں ۔ نور میں اِس کے ساتھ ساتھ " زمین میں دھسا دینا " بھی ہے ۔ مثالیہ فقرہ یہ ہے : " پیسا زمین میں دھانس دیا " ۔ مولف نے اِس کو " ہندو عوام " سے مخصوص کیا ہے ۔ بہ ہر صورت اِس معنی میں مادہ وہی ایک ہے ۔

" دھسانا " نور و آصفیہ میں نون کے بغیر ہے ۔ آصفیہ میں " دَھسَن " اور " دھسان " بھی نون کے بغیر ہیں ۔ اور " بھیڑیا دھسان " نور، آصفیہ اور سرمایہ میں نون کے بغیر ہے ، مستعمل بھی اِسی طرح ہے ۔

دھسن ، دھسان ، بھیڑیا دھسان ؛ یہ سب تو نون کے بغیر ہی مستعمل ہیں ۔ یہی صورت " دھسانا " کی ہے ۔ لازم مصدر دونوں طرح مستعمل ہے ، (دھنسنا ۔ دھسنا) ، اِس لیے اِس کو مختلف فیہ ماننا چاہیے ۔ ترجیح کی حد تک ، لازم مصدر کو بھی نون کے بغیر ماننا چاہیے ، اِس لیے کہ مصدر کی متعدی صورت اور خود اُس کے بعض مشتقات نون کے بغیر ہی مستعمل ہیں ۔ اور " دھانسنا " ، دونوں معانی میں مع نون رہے گا ، یعنی : دھنسنا ــــــ

دھسنا ، دھسانا ، دھسن ، دھسان ، بھیڑیا دھسان ، دھس جانا۔
دھانسنا ، دھانس ۔

۱۰۷
ڈانٹنا ، ڈانٹ ، ڈانٹ ڈپٹ ، ڈانٹ پھٹکار ۔
اِس مصدر میں کچھ اختلاف نہیں ، بس یہ صراحت کرنا چاہتا ہوں کہ "ڈاٹنا" ایک اور مصدر ہے ، جس کے معنی ہیں : روکنا ، بند کرنا ، ڈاٹ بند کرنا ، جیسے : معمار کو ابھی اِک ذرا ڈاٹنا باقی ہے ۔ ٹھونسنا ، جیسے : خوب ڈاٹ ڈاٹ کے روئی بھر دو ۔ زیبِ بدن کرنا ، جیسے : مزے سے اکہرا کُرتا ڈاٹے ہوئے بیٹھے ہیں ۔ (نور)
اِسی سے "ڈاٹ" بنتا ہے ، جس کے معنی ہیں : محراب کے بیچ کا پتھر ، مجازاً محراب ہی کو کہنے لگے ۔ بوتل وغیرہ کو بند کرنے کا کاگ ۔
آصفیہ میں ڈاٹ ، ڈاٹ لگانا ، ڈاٹ کر بھرنا ، سب کو ٹھیک لکھا گیا ہے ۔ اور ڈانٹ ، ڈانٹ ڈپٹ ، ڈانٹنا ؛ اِن سب کو بھی صحیح جگہ پر صحیح معانی میں لکھا گیا ہے ، مگر "ڈ مع الف" کے ذیل میں "ڈانٹنا" لکھا ہوا ہے ، ڈاٹ لگانا کے معنی میں ۔ یہ اصل میں کتابت کی غلطی ہے ، کیوں کہ "ڈ ، الف ، ن" کی فصل کے الفاظ اُس کے بہت بعد شروع ہوتے ہیں ۔

۱۰۸
ڈھانپنا ، ڈھانپ کر ۔ ڈھانکنا ۔ ڈھنکنا یا ڈھکنا ۔
نور میں "ڈھاپنا" اور "ڈھانپنا" دونوں ہیں ، مگر "ڈھاپنا" کے ذیل میں غالب کا جو شعر لکھا گیا ہے ، اُس میں "ڈھانپنا" مع نون لکھا ہوا ہے ۔ نیز "ڈھاپنا" کے تحت آخر میں لکھا ہے : " دیکھو ڈھانپنا " ۔ یعنی مرجّح لفظ مع نون ہے ۔ عبارت میں بھی ہر جگہ "ڈھانپنا" مع نون ہے ۔

آصفیہ میں صرف مع نون ہے (ڈھانپنا)۔ نفائس میں بھی "ڈھانپنا" اور "ڈھانکنا" دونوں مع نون ہیں۔

اصل میں اِس مصدر میں بجائے خود کوئی اختلاف نہیں، یہ صرف مع نون ہے۔ صاحبِ نور نے خواہ مخواہ "ڈھاپنا" اور "ڈھانپنا" دو صورتیں فرض کرلی ہیں۔ سرمایہ میں "ڈھانپنا" اور "ڈھانکنا" دونوں مع نون ہیں، مثال میں جراَت کے یہ دو شعر لکھے ہیں:

دیکھا، تو یوں وہ کہہ کے لگے منہ کو ڈھانپنے کم بخت پھر لگا مجھے نظروں سے بھانپنے

ہوا ہے اب تو یہ نقشا ترے بیمارِ ہجراں کا کہ جس نے کھول کر مُنہ اُس کا دیکھا، بس وہیں ڈھانکا

"ڈھانپنا" کی طرح "ڈھانکنا" بھی مع نون ہے اور اِس میں اختلاف نہیں، مگر "ڈھنکنا" کو آصفیہ میں نون کے بغیر لکھا گیا ہے —— صاحبِ نور نے پہلے تو "ڈھکنا" نون کے بغیر لکھا ہے، اور آگے چل کر "ڈھنکنا" مع نون بھی لکھا ہے اور مثال میں یہ فقرہ لکھا ہے: "سب برتن ڈھنکے ہیں"۔

بحر نے مصدر اور اسم، دونوں کو مع نون لکھا ہے:

"ڈھنکنا، بہ فتحِ دالِ ثقیل و ہا و نونِ مخلوط، چیزے را از چیزے پوشیدن۔ و سرپوش رانیز گویند"۔

نور میں لفظ سر کے ذیل میں "سر ڈھانکنا" اور "سر ڈھنکنا" لکھا گیا ہے مگر آخر الذکر کے ذیل میں جو مثالیہ شعر ہے، اُس میں "سر کیا ڈھکا" لکھا ہوا ہے۔ اِس کے بعد "سر ڈھکی" لکھا ہوا ہے، اِس کے معنی لکھے ہیں: "شبِ زفاف"۔ اثر لکھنوی نے اِس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ارے صاحب! ڈھکی کو یائے مجہول سے پڑھیے۔ بن سر ڈھکے ہوئے، یعنی .....سر رنڈی کا ڈھکا جاتا ہے" (فرہنگِ اثر)

عبارت میں ہر جگہ "ڈھکنا" بغیرِ نون ہے۔

ڈھکنا بہ طورِ اسم، اِس کی تانیث ڈھکنی۔ ڈھکنا کی ایک اور صورت ڈھکّن، سب نون کے بغیر مستعمل ہیں۔ اور اِن سب کا یہی املا اب صحیح ماننا چاہیے۔ ڈھکنا بہ طورِ مصدر اور اُس کے مشتقات، مع نون اور بغیرِ نون دونوں طرح مستعمل ہیں۔ "سر ڈھکنا" جیسے مرکب مصادر عموماً نون کے بغیر مستعمل ہیں۔ اِس لیے اِس مصدر کو دونوں طرح صحیح ماننا چاہیے، مگر بغیرِ نون زیادہ مستعمل ہے۔ ترجیح کی حد تک بغیرِ نون کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ "ڈھانکنا" صرف مع نون ہے۔ اِس کے مشتقات بھی صرف مع نون لکھے جائیں گے۔

مختصر یہ کہ ڈھانکنا مع نون ہے اور ڈھکنا نون کے بغیر۔ اسم کے طور پر ڈھکنا اور ڈھکنی کو بھی نون کے بغیر لکھا جائے گا۔

ڈھونڈھنا[111] یا ڈھونڈنا۔ ڈھنڈوانا[112]۔

راندھنا[113]۔ ریندھنا[114]۔ رنگنا[115]، رنگانا[116]، رنگوانا[117]، رنگائی۔ رَوندنا[118]، رَوندن۔

رینگنا[119]۔ رینگنا[120]۔

سانٹھنا[121]۔ سنٹھنا یا سٹنا[122]۔ سٹانا[123]۔ سانٹھ۔ سانٹھ گانٹھ۔

"سانٹھنا" اور "سانٹھ" نور و آصفیہ میں مع نون ہیں۔ نور میں "سانٹھ" کے ذیل میں یہ شعر درج کیا گیا ہے:

ماں جو اُس حور کی تھی بس کی گانٹھ گھر میں سب سے ملا رہی تھی سانٹھ

"سٹنا" اور "سٹانا" دونوں لغات میں اسی طرح ہیں۔
"سانٹھنا" اور اُس کے مشتقات کو مع نون و ہاے مخلوط لکھنا چاہیے۔
"سنٹھنا" اور "سٹنا" دونوں صورتیں قابلِ تسلیم ہیں۔

سِنکنا[۱۲۴]، سینکنا[۱۲۵]، سِنکوانا[۱۲۶]، سینک۔

آصفیہ میں اِن کو نون کے بغیر لکھا گیا ہے۔ "سینکنا" بھی ہے مگر اِس کے ساتھ لکھا ہوا ہے: "دیکھو سیکنا"۔ یعنی نون کے بغیر مرجّح ہے۔ نور میں مع نون۔ مولفِ نور نے صراحت بھی کی ہے کہ: "بیش تر فصحا کی زبان پر سینک، نونِ غنّہ کے ساتھ ہے"۔ عبارت میں بھی اُنھوں نے ہر جگہ مع نون لکھا ہے، جیسے: سینک پہنچنا، سینکتے پھرنا، کباب سینکنا وغیرہ۔ سرمایہ میں بھی مع نون ہے، اِس میں صراحت کردی گئی ہے کہ "تحتانیِ مجہول اور نونِ غنّہ کے ساتھ"۔ بحر نے "سینکنا" مع نون لکھا ہے۔ تلفظ و تحریر میں مصدر اور مشتقات بالعموم مع نون آتے ہیں، اور اِسی طرح لکھنا بھی چاہیے۔

سنبھلنا[۱۲۷]، سنبھالنا[۱۲۸]، سنبھلوانا[۱۲۹]، سنبھالا لینا، سنبھل۔
سِنگارنا[۱۳۰] (بنانا سنوارنا)، سِنگرنا[۱۳۱]۔ سَنگوانا[۱۳۲]، سَنگوا لینا (جمع کرلینا، قابو میں کرلینا، مار رکھنا)۔ سنورنا[۱۳۳]، سنوارنا[۱۳۴]، سنوار۔ سونپنا[۱۳۵]، سونپ دینا۔
سوندھنا[۱۳۶] یا سَوندنا۔ سونگھنا[۱۳۷]، سُنگھانا۔ سَونلانا[۱۳۸]۔ سینتنا[۱۳۹]، سینت کے رکھنا[۱۴۰]۔
سینچنا[۱۴۱]، سِنچائی۔ سِنچنا[۱۴۲]۔

نور میں مع نون۔ آصفیہ میں سیچنا اور سینچنا دونوں، مگر سینچنا کے ساتھ یہ

مع ہیں۔ اِس کے بعد کھینچ، کھینچ کرنا، کھینچ لانا، کھینچنا، سب مع نون ہیں۔ تقریباً دو کالموں میں مثالیں ہیں، جن میں ہر جگہ مشتقات مع نون ہیں۔

نور میں قریب قریب اِسی کی نقل کی گئی ہے۔ اِس میں کہیں کھچاؤ ہے کہیں کھنچاؤ۔ "کھچ جانا" کے ذیل میں جو مثالیہ شعر دیا گیا ہے، اُس میں "کھنچ گیا" مع نون لکھا ہوا ہے (کھنچ گیا کیوں یار مجھ سے، ہے یہ حیرانی مجھے)۔

اِن مصدروں کو اور اِن کے جملہ مشتقات کو اب مع نون لکھنا چاہیے:
کھنچنا، کھینچنا، کھنچانا، کھنچوانا، کھنچائی، کھنچاو، کھنچاوٹ، کھینچ تان، کھینچا تانی، ہینچ کھینچ، کھنچ جانا، کھنچا چلا جانا، کھنچ آنا، کھنچا رہنا، کھنچے کھنچے پھرنا، کھینچ لانا، کھینچ بلانا، کھینچ کھانچ، کھنچا ہوا، کھینچا کھینچ، کھینچے پھرنا۔

۱۶۱
کھونسنا

لغات میں اِس کو مع نون اور بغیرِ نون دونوں طرح لکھا گیا ہے (کھونسنا۔ کھوسنا)۔ بہت کم استعمال ہونے والے مصدروں میں ہے۔ اختلافِ نگارش سے کوئی ہرج واقع نہ ہوگا۔ مع نون کو مرجح سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۶۲
کونچنا۔ کوچنا۔

آصفیہ میں صرف بغیرِ نون۔ نور میں دونوں طرح۔ سرمایہ میں بغیرِ نون اور بحرالبیان میں مع نون۔ اِس کا حال بھی مذکورۂ بالا مصدر کا سا ہے۔

نون کے ساتھ یعنی سونچنا، ناجائز ہے "۔ مگر لفظ "منتھنا" کے ذیل میں
اِس میں یہ لکھا ہوا ہے: "دل میں کسی بات کو بار بار سونچنا" (جلد چہارم ص ۴۰۰)۔
یہ وہی کتابت کی کرشمہ کاری ہے۔

متقدمین اِس کو مع نون لکھا ضرور کرتے تھے۔ شوق نیموی نے لکھا ہے:

"سونچ کو متقدمین نون سے لکھا کرتے تھے، ایک آدھ جگہ[*] چونچ کے قافیے میں بھی نظر سے گزرا ہے، مگر اب فی زمانتا اکثر سوچ بغیر نون لکھتے ہیں۔"

(اصلاح)

اِس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ بحر نے اِس کو مع نون لکھا ہے: " سونچنا، بہ واوِ مجہول و نونِ غنہ، خیال کردن و بیاد آوردن چیزے را"۔ بہ ہر حال، اب مع نون متفقہ طور پر متروک ہے۔

کانپنا[۱۴۴] ـ کانپ جانا، کانپ۔

صرف یہ کہنا ہے کہ کپکپانا، ایک مستقل مصدر ہے، نون کے بغیر، جس کے مشتقات میں کپکپی اور کپکپاہٹ ہیں۔

کھاندنا[۱۵۲] ـ کھندوانا[۱۵۱] ـ کانکھنا[۱۴۷] ـ کھانسنا[۱۴۸] ـ کوندنا[۱۴۹] ـ گھنڈلنا[۱۵۰] ـ کھنکارنا[۱۴۶] ـ کھنگالنا[۱۴۵]
کھنگنا[۱۵۳] ـ کھنڈنا[۱۵۴] ـ کھونڈنا[۱۵۵] ـ کھونکیاتا[۱۵۶] ـ کھینچنا[۱۵۷]، کھنچنا[۱۵۸]، کھنچانا[۱۵۹]، کھنچوانا[۱۶۰]:
اِن مصدروں کا بھی عجیب حال ہے۔ آصفیہ میں پہلے کھچا، کھچا جانا، کھچا رہنا، کھچاو، کھچ جانا نون کے بغیر ہیں مگر "کھچنا" اور "کھنچنا" دونوں

---

[*] سوچ، بوچ کے قافیے میں آگیا ہے اور آپ خود گلشنِ فیض میں "سوجی" کے بعد اور "سوخت" کے قبل لکھتے ہیں: "سوچ، بسینِ مہملہ بواوِ مجہول و جیمِ فارسی"۔ جب سوچ بے نون صحیح ہوا تو سوچنا بے نون کیوں غلط ہونے لگا۔ (یادگارِ وطن ص ۸)

نون ہیں۔ اِس کے بعد کھینچ، کھینچ کرنا، کھینچ لانا، کھینچنا، سب مع نون ہیں۔ تقریباً دو کالموں میں مثالیں ہیں، جن میں ہر جگہ مشتقات مع نون ہیں۔

نور میں قریب قریب اسی کی نقل کی گئی ہے۔ اِس میں کہیں کھچاؤ ہے کہیں کھنچاؤ۔ "کھچ جانا" کے ذیل میں جو مثالیہ شعر دیا گیا ہے، اُس میں "کھنچ گیا" مع نون لکھا ہوا ہے (کھنچ گیا کیوں یار مجھ سے، ہے یہ حیرانی مجھے)۔

اِن مصدروں کو اور اِن کے جملہ مشتقات کو اب مع نون لکھنا چاہیے:

کھنچنا، کھینچنا، کھنچانا، کھنچوانا، کھنچائی، کھنچاو، کھنچاوٹ، کھینچ تان، کھینچا تانی، اینچ کھینچ، کھنچ جانا، کھنچا چلا جانا، کھنچ آنا، کھنچا رہنا، کھنچے کھنچے پھرنا، کھینچ لانا، کھینچ بلانا، کھینچ کھانچ، کھنچا ہوا، کھینچا کھینچ، کھینچتے پھرنا۔

۱۶۱

کھونسنا

لُغات میں اِس کو مع نون اور بغیرِ نون دونوں طرح لکھا گیا ہے (کھونسنا۔ کھوسنا)۔ بہت کم استعمال ہونے والے مصدروں میں ہے۔ اختلافِ نگارش سے کوئی ہرج واقع نہ ہوگا۔ مع نون کو مرجح سمجھا جا سکتا ہے۔

۱۶۲

کونچنا۔ کوچنا۔

آصفیہ میں صرف بغیرِ نون۔ نور میں دونوں طرح۔ سرمایہ میں بغیرِ نون اور بحر البیان میں مع نون۔ اِس کا حال بھی مذکورۂ بالا مصدر کا سا ہے۔

گنجولنا[163] ۔ گونجنا[164]، گونج ۔ گنوانا[165] ۔ گوندھنا[166] ۔ گندھنا[167] ۔ گندھانا[168] ۔ گندھوانا[169] ۔ گندھاوٹ، گندھائی ۔ گھنگولنا ۔ گھمنڈنا[171] ۔ گھونپنا[172] ۔ گھونپ دینا ۔ گانسنا[173] ۔ گانس لینا ۔ گوتھنا[174] (گونتھنا) ۔ گتھنا[175] (گنتھنا) ۔ گتھوانا[176] ۔ گتھ جانا ۔

آصفیہ میں گوتھنا اور گونتھنا دونوں ہیں، مگر "گونتھنا" کے ساتھ یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ "دیکھو گوتھنا" ۔ یعنی گوتھنا مرجح ہے ۔

نور میں "گونتھنا" کو دہلی سے مخصوص بتایا گیا ہے، جب کہ آصفیہ میں "گوتھنا" کو مرجح ظاہر کیا گیا ہے ۔ لازم مصدر نور و آصفیہ دونوں میں "گتھنا" نون کے بغیر ہے ۔ نور میں گتھ جانا، گتھنا، گتھم گتھا، گتھواں، گتھوانا، گتھی، سب نون کے بغیر ہیں ۔ آصفیہ میں بھی گوتھنا، گتھنا، گتھم گتھا، گتھی، نون کے بغیر ہیں ۔ بول چال میں بھی یہ سب نون کے بغیر ہیں، اس لیے اِس مصدر کی سب صورتوں کو اور اُن کے مشتقات کو نون کے بغیر مرجح سمجھنا چاہیے، یعنی:

گتھنا، گوتھنا، گتھوانا، گتھواں، گتھی، گتھم گتھا، گتھ جانا ۔

---

[177] گانٹھنا ۔ (باندھ دینا، گرہ دینا، جوڑنا، پیوند لگانا، سازش کرنا، موافق بنا لینا، جوتے کی مرمت، جیسے: جوتی گانٹھنا، منصوبہ گانٹھنا وغیرہ) ۔ گٹھنا ۔ گانٹھنا اور گانٹھ دونوں مع نون ہیں اور اختلاف کے بغیر ۔ مگر لازم مصدر آصفیہ میں "گٹھنا" ہے نون کے بغیر ۔ اِسی طرح گٹھانا، گٹھ جانا، گٹھوتی، گٹھوانا، بھی اِس میں نون کے بغیر ہیں ۔

نور میں "گٹھنا" (سیا جانا، پیوند لگنا) بغیر نون لکھ کر، یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ ... معنی ... گا ... اور ٹ کے بیچ میں نون غنہ ہے ۔

اِسی طرح گٹھانا کو بغیرِ نون لکھ کر لکھا ہے : " اصل میں نون ہے ، کیوں کہ گانٹھنا کا متعدّی ہے ، لیکن اب بغیرِ نون کے بھی زبانوں پر ہے "۔
اصل کی رعایت ملحوظ رکھی جائے تو جملہ مصادر و مشتقات میں نونِ غنّہ آنا چاہیے ۔ گانٹھنا تو متفقہ طور پر مع نون ہے ، سارے معانی میں (سازش کرنا ، پیوند لگانا ، جوتے وغیرہ کی مرمّت وغیرہ) ۔ گانٹھ میں بھی کچھ اختلاف نہیں ۔" گٹھنا " مل جانے ، سازش کرنے ، جُفتی کھانے وغیرہ کے معانی میں عموماً نون کے بغیر مستعمل ہے ۔ اِس کے مشتقات بھی نون کے بغیر ہی مستعمل ہیں ، جیسے : گٹھا ہوا ، گٹھاو ، گٹھیلا ۔ گٹھ جانا بھی نون کے بغیر دیکھنے اور سننے میں آیا ہے ۔
بیگما جان ! بڑے شرم کی ہے یہ تو بات گٹھ گئی بطخے سے انشا کے تمھاری بی قاز
(یہ شعر نور سے ماخوذ ہے) ۔" گٹھوت گانٹھنا " ، " گٹھوائی " بھی نون کے بغیر ہیں ۔
مختصر یہ کہ : گانٹھنا اور اِس کے جملہ مشتقات مع نون لکھے جائیں گے ۔ لازم مصدر گٹھنا ، اب نون کے بغیر مرجّح سمجھا جائے گا ۔ گٹھوانا اور گٹھانا بھی نون کے بغیر مرجّح سمجھے جائیں گے ۔ اِن کے مشتقات کی بھی یہی صورت ہوگی ۔

گھونٹنا[۱۷۸] ۔ گھوٹنا[۱۷۹] ۔ گُھٹنا[۱۸۰] ۔ گھٹانا[۱۸۱] ۔ گُھٹوانا[۱۸۲] ۔ گُھٹن ۔ گھوٹا ۔ گھٹائی ۔ گُھٹا ہوا ۔
نور میں پہلے " گھوٹنا " (واو مجہول ، بغیرِ نون) کے معنی لکھے ہیں : " رگڑنا ، حل کرنا ، باریک کرنا ، کچلنا ، (فقرہ) دال گھوٹ دو (۲) کسی چیز سے رگڑ

کے چکنا کرنا۔ (فقرہ) کاغذ گھوٹ لیا، چکنا ہو گیا۔ (۳) بار بار پڑھنا۔ (۴) دبانا، جیسے: گلا گھوٹنا، منڈوا کر چکنا کرنا"۔

اِس کے بعد "گھونٹنا" (مع ن، واو معروف) کے معنی لکھے ہیں: "گلا دبانا ... جیسے ... بغیر نون کے بھی بولتے ہیں، دیکھو گلا گھوٹنا ..."۔

پھر "گھونٹنا" (بہ واوِ مجہول) لکھ کر معنی لکھے ہیں: "رگڑنا، حل کرنا، گھوٹنا، کسی چیز سے رگڑ کے کاغذ کو چکنا کرنا۔ کسی چیز کو اوکھلی یا کسی اور ظرف میں ڈال کر دستے یا کسی لکڑی سے گھسنا۔ بار بار رٹنا"۔

جلالؔ نے اِس کی صرف دو صورتیں درج کی ہیں: ایک واوِ معروف کے ساتھ، ایک واوِ مجہول کے ساتھ۔ نونِ غنّہ دونوں میں ہے۔ گلا گھونٹنے کے معنی میں اُنھوں نے واو معروف کے ساتھ لکھا ہے اور باقی معانی میں واو مجہول کے ساتھ۔

صاحبِ آصفیہ نے جس طرح گھوٹنا اور گھونٹنا کو لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مع نون اور بغیر نون، دو مختلف معانی میں ہیں۔ واو معروف و مجہول کی تفریق نہیں کی گئی، ایسی کوئی صراحت بھی نہیں ہے۔ گھوٹنا کے معنی لکھے ہیں: رگڑنا، حل کرنا، کھرل یا کونڈی میں خوب باریک کرنا، جیسے: بھنگ گھوٹنا (۲) مُہرا کرنا، مُہرے سے صفائی کرنا (۳) خوب یاد کرنا۔ بار بار پڑھ کر یاد کرنا، بار بار پڑھ کر ذہن نشیں کرنا، جیسے: سبق گھوٹنا۔

گھونٹنا کے معنی لکھے ہیں: "گلا دبانا، دم روکنا، ٹیٹوا دبانا، گردن مروڑنا ... سانس بند کرنا، جیسے گلا گھونٹنا، دم گھونٹنا (۲) (عو) بند کرنا، منقبض کرنا، نفس تنگ کرنا، ضیق میں کرنا، تنگ کرنا"۔

نیز اِس سے پہلے گھونٹ گھونٹ کے مارنا کے معنی لکھے ہیں: "جلا جلا کر مارنا، رنج دے دے کر مارنا، چپکی مار دینا، اندرونی رنج دینا"۔

اِس کے بعد ہی "گھونٹنا" لکھ کر لکھا ہے " دیکھو گھوٹنا " ، اِس کا مطلب غالباً یہی ہے کہ اوپر " گھونٹنا " کے جو معنی لکھے گئے ہیں ، اُن کے علاوہ دوسرے معانی کے لیے " گھوٹنا " ہے ۔

واوِ معروف و مجہول کا امتیاز تو اب باقی نہیں رہا ، اِس سے قطع نظر کرکے مناسب یہ ہوگا کہ اختلافِ معانی کے لحاظ سے دو مستقل مصدر مان لیے جائیں ، اِس طرح :

گھوٹنا : رگڑنا ، حل کرنا ، چکنا کرنا ، رٹنا وغیرہ ۔ تختی گھوٹنا ، بھنگ گھوٹنا ، دال گھوٹنا ، گھوٹا ، گھوٹا لگانا ، گھوٹ چھان کے ۔

گھونٹنا : گلا گھونٹنا ۔ (گلا گھونٹ کے مار ڈالا) ۔

گھٹنا : کو نون کے بغیر مان لینا چاہیے (ایسے اور مصادر کی طرح) سارے معانی میں ، جیسے : گلا گھُٹ گیا ۔ آج کل خوب گھُٹ رہی ہے ۔ گھُٹنا چھننا ۔ سر گھُٹ گیا ۔ دم گھُٹ گیا ۔ بڑی گھُٹن ہے ۔ بھنگ گھٹنا (بھنگ گھوٹنے کا سونٹا) وہ اِسی طرح گھُٹ گھُٹ کے مرجائیں گی ۔

گھٹانا : بھی نون کے بغیر مرجح مانا جائے گا جیسے : سر گھُٹا لینا ، گھُٹا ہوا ، گھُٹا ہوا جوگی ، گھُٹائی : فرش کی گھُٹائی خوب ہوئی ہے ۔

گھٹوانا : بھی نون کے بغیر مرجح رہے گا : سر گھُٹوانا ، فرش گھُٹوانا ، گلا گھُٹوانا ، دال گھُٹوانا ۔

لانگھنا[183] ، لانگھن لُنڈھنا[184] ، لُنڈھانا[185] ۔

مانجنا[186] ، منجنا[187] ، منجھنا[188] ، منجھانا[189] ، منجھا ہوا ۔ مُندنا[190] ، مُوندنا[191] ، مُنڈنا[192] ، مُونڈنا[193] ، مُنڈانا[194] ، منڈوانا[195] ، مُنڈائی ، مونڈن ۔ مَنڈھنا[196] ، مَنڈھانا[197] ،

منڈھوانا[198] ۔ منڈلانا[199] ۔ مانگنا[200] ، منگانا[201] ، منگوانا[202] ۔ منگتا ۔ پینجنا[203] ، ناندھنا[204] ، ناگھنا[205] ۔ نگلنا[206] ، نگلانا[207] :

یہ مصدر اصلاً نونِ کے بغیر ہیں ۔ صراحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ نور میں " ننگلانا " بھی اِس کی ایک صورت لکھی گئی ہے : " ننگلانا، بالکسر، دوسرا نونِ غنّہ ، لکھنؤ : نگلانا " ۔

اِس اندراج سے یہ احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید دہلی میں مع نونِ غنّہ ہوگا ، مگر ایسا نہیں ، آصفیہ میں صرف " نگلنا " لکھا ہوا ہے ۔ بول چال میں کبھی کبھار ممکن ہے کہ مع نونِ غنّہ آجاتا ہو ، مگر تحریر میں نظر سے نہیں گزرا ۔ نگلنا اور نگلانا ، دونوں مصدر نونِ کے بغیر ہی ہیں ۔

ہانپنا[208] ۔ ہانکنا[209] ۔ ہنکانا[210] ۔ ہنگوانا[211] ۔ ہانکا ، ہنکوا ۔ ہنکنی (کتّوا ہنکنی) ۔ ہنڈنا ، ہنڈانا ، ہنڈتے پھرنا ۔ ہنسنا ، ہنسانا ، ہنسوانا ۔ ہنسائی ، (جگ ہنسائی) ہنسوڑ ۔ ہنسی ۔ ہونسنا ۔ ہونکنا ۔

(۲)

مصدروں کی طرح ، نونِ غنّہ کے جزوِ لفظ ہونے نہ ہونے کے لحاظ سے بہت سے اسموں کی بھی یہی صورت ہے ۔ لُغات میں کچھ لفظوں کو مع نونِ اور بغیرِ نونِ دونوں طرح لکھا گیا ہے اور ترجیح کا ذکر نہیں ۔ کچھ لفظوں کا حال یہ ہے کہ ایک لفظ ایک لُغت میں صرف ایک طرح لکھا ہوا ہے اور دوسرے لُغت میں وہی لفظ دوسری طرح لکھا ہوا ہے اور صراحت نہ یہاں ہے نہ وہاں ۔ حقیقی اختلافات کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک زمانے میں لفظوں کو انفیانے کی طرف رجحان زیادہ رہا ہے ۔

بعض علاقوں میں یہ رجحان خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ یہ اثرات بھی لفظوں میں جذب ہوتے رہے اور ایک سے زیادہ صورتوں کی تشکیل کرتے رہے۔ غلطی بس یہ ہوئی کہ بعض صورتوں میں، لہجے کے اختلافات کو بھی، لغت کے مسلّمہ اختلافات کا درجہ دے دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے کلّیاتِ ولی کے مقدّمے میں لکھا ہے:

"نونِ غنّہ پرانے زمانے میں بہت تھا، یہاں تک کہ بعضے لوگ فارسی لفظوں کوچہ، ہیچ، پایچہ، کو "کونچہ"، "ہینچ"، "پائنچہ" لکھا کرتے تھے۔ توں (تو)، کوں (کو)، سیں (سے)، نے (نے)، سداں (سدا)، دیکھناں (دیکھنا) وغیرہ بہت عام تھے"۔

(کلّیاتِ ولی۔ طبعِ دوم، ص ۳۳)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے لکھا ہے:

"ضمنی اور غیر اہم انفیانے (NASALIZATION) کی مثالیں عام طور پر پائی جاتی ہیں، مثلاً ایسے الفاظ جن میں مَ یا نَ کے پاس واقع مصوّتے انفی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو کے بعض علاقوں بالخصوص دہلی اور اُس کے اطراف میں اِس کی مثالیں کثرت سے مل جاتی ہیں، جس کا اثر ہمیں قدیم دکنی پر بھی نظر آتا ہے، مثلاً: کونچے، آنگے (قدیم)۔ یا آنتا، چانول، گھانس، جاناں (جدید)۔ یہ غیر ضروری انفیانا، اردو میں ناشستہ تلفّظ کی علامت سمجھی جاتی ہے۔"

(اردو صوتیات کا خاکا۔ اردوے معلّیٰ (دہلی) لسانیات نمبر، ص ۱۱۸)

"بارہ" کو "باراں" بولنا اور "سوچنا" کو "سونچنا" کہنا بھی اِسی ذیل میں آتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ایک شخص مثلاً "کوپل" کہتا ہے اور

دوسرا "کونپل"۔ یا ایک شخص "چوچلا" بگھارتا ہے اور دوسرا "چونچلے" کرتا ہے۔
ایسے کچھ لفظ یہ ہیں :

گھاس : صاحبِ نور نے لکھا ہے : " عوام، گھانس نونِ غنّہ کے ساتھ بولتے ہیں "۔ اِس کے برخلاف جلال نے سرمایہ میں لکھا ہے کہ : " اور جو اِس لُغت کو بعد الف کے نونِ غنّہ کے ساتھ نہیں بولتے، موئفِ ہیچ مداں کے نزدیک اُن کی غلطی ہے "۔

آصفیہ میں گھاس اور گھانس دونوں کو درج کیا گیا ہے، ترجیح کا اندازہ نہیں ہوتا۔ عبارت میں کہیں " گھاس " ہے اور کہیں " گھانس "۔ مگر اِس کے سارے مرکّبات کو نون کے بغیر لکھا گیا ہے : " گھاس پھوس، گھاس کاٹنا، گھاس کھانا، گھاس کھودنا، گھاس والی "۔ لیکن اِن کے ذیل میں جو عبارتیں ہیں، اُن میں یہ لفظ دونوں طرح ملتا ہے ــــ گھسیارا، گھسیاری، گھس کھدا ؛ یہ بھی نون کے بغیر ہیں، مگر اِن سے متعلق عبارتوں میں ہر جگہ " گھانس " مع نون ملتا ہے۔

نفائس میں اِس کو دونوں طرح لکھا گیا ہے، مگر اندازِ نگارش سے، مع نون مرجّح معلوم ہوتا ہے :

" گھانس، بہ فتحِ اوّل مخلوط التلفظ بہ ہا باالف و نونِ غنّہ و سینِ مہملہ درآخر۔ و بہ حذفِ نون ہم آمدہ "۔

یہ مسلّم ہے کہ گھسیارا، گھسیاری یا گھسیارن، گھس کھدا ؛ یہ سب نون کے بغیر ہیں اور اصل لفظ کو بھی عموماً نون کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے، اِس لیے اب اِس لفظ کا املا نون کے بغیر ہی ماننا چاہیے۔

کوپل : آصفیہ میں " کوپل " کو فارسی بتایا گیا ہے اور اِس کے ذیل میں

یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ: "اردو والوں نے اسی کو" کونپل "کر لیا ہے"۔
اس عبارت سے صاف طور پر مطلب یہ نکلتا ہے کہ موّلف کے نزدیک "کوپل" نون کے بغیر فارسی ہے اور مع نون (کونپل) اردو ہے، مگر عبارت میں ہر جگہ "کوپل" ملتا ہے۔ پھر "کونپل" جہاں لکھا گیا ہے، وہاں اس کے آگے یہ بھی لکھا گیا ہے: "دیکھو کوپل مع مشتقات"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موّلف کے نزدیک مرجّح لفظ "کوپل" ہے نون کے بغیر۔ یہ پریشان کُن صورت ہے۔

نور میں "کونپل" کا ذکر ہی نہیں ملتا، اس میں صرف "کوپل" ہے۔
اسی طرح سرمایہ میں بھی یہ نون کے بغیر ملتا ہے۔

عام طور سے اس لفظ کا املا نون کے بغیر (کوپل) دیکھنے میں آتا ہے اور اب اسی کو مرجّح ماننا چاہیے۔

سنپیرا، سنپولا، سنپولیا: نور و آصفیہ دونوں میں یہ مع نون بھی ہے اور نون کے بغیر بھی (سنپیرا۔ سپیرا)۔ سرمایہ میں صرف مع نون ہے (سنپیرا)۔ سپولا اور سپولیا کی بھی یہی صورت ہے۔ آصفیہ میں سپولا یا سنپولا درج نہیں، البتہ سپولیا اور سنپولیا دونوں موجود ہیں۔ ترجیح کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

اصل کے لحاظ سے ان سب کو مع نون ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ سانپ میں مسلّمہ طور پر نونِ غنّہ شامل ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ ان لفظوں کو مع نونِ غنّہ مرجّح مانا جائے یعنی: سنپیرا، سنپولیا، سنپولا۔

پینٹھ: آٹھویں دن کا بازار۔ آصفیہ میں مع نون اور بغیرِ نون دونوں طرح ہے (پیٹھ۔ پینٹھ)۔ مگر نور میں صرف مع نون ہے۔ یہی صورت

مرجح معلوم ہوتی ہے۔ مصدر بیٹھنا کا امر ہے: پَیٹھ، جو "گھس پیٹھ" میں شامل ہے، اِس سے امتیاز کے لیے بھی اِس لفظ کو "پَینٹھ" لکھنا مناسب ہے۔

پانسا: نور میں "پاسا" اور "پانسا" دونوں صورتیں ملتی ہیں، صراحت کے بغیر۔ مثالیہ عبارت میں کہیں "پاسا" ہے، کہیں "پانسا"۔ آصفیہ میں اِن دونوں لفظوں کو جس طرح لکھا گیا ہے، اُس سے مترشح ہوتا ہے کہ مرجح صورت نون کے بغیر ہے۔ سرمایہ میں اِس کو صرف مع نون لکھا گیا ہے۔

سماعت میں بیش تر مع نون آیا ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِس کی مرجح صورت مع نون مانی جائے، یعنی: پانسا۔

بھوچکّا: آصفیہ و نور، دونوں میں یہ مع نون بھی ہے اور بغیرِ نون بھی، (بھوچکّا۔ بھونچکّا)۔ مگر بھچک دونوں لغات میں صرف بغیرِ نون ہے۔ مستعمل بھی اِسی طرح ہے۔ بھوچکّا اور بھونچکّا دونوں صورتیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ صرف ترجیح کے خیال سے، بھچک کی رعایت سے، اِس کو نون کے بغیر مرجح مان لینا چاہیے۔

مجیرا: نور و آصفیہ میں یہ لفظ مع نون اور بغیرِ نون دونوں طرح ملتا ہے۔ (مجیرا۔ منجیرا)۔ سماعت میں اکثر یہ نون کے بغیر آیا ہے۔ صورتیں دونوں برحق، مگر ترجیح کے خیال سے، بغیرِ نون کو افضل ماننا چاہیے، یعنی: مجیرا۔

چوچلا: نور و آصفیہ میں دونوں طرح (چوچلا۔ چونچلا)۔ مگر چوچلا بگھارنا، چوچل ہائی، چوچل ہایا؛ یہ سب آصفیہ میں نون کے بغیر ہیں۔

نور میں چوچلا بگھارنا، چوچلا کرنا، نون کے بغیر ہیں اور چونچل ہایا اور چونچل ہائی مع نون ہیں۔

ترجیح کے لیے، اِس کو نون کے بغیر مان لینا چاہیے۔

رُوانسا: آصفیہ و نور میں مع نون و بغیر نون، دونوں طرح ہے (روانسا۔ رواسا)۔ اصل لفظ رونا میں نون شامل ہے، اِس لحاظ سے مع نون (رُوانسا) کو ترجیح دی جائے گی۔ اِس کی تانیث رُوانسی ہوگی۔ اِس کی ایک صورت "روہانسا" بھی ہے (فرہنگِ اثر ص ۱۹۵) نون اِس میں بھی موجود ہے۔ اِس معنی میں ایک اور لفظ "رُہاندا" بھی ہے۔ نون اِس میں بھی ہے۔ فرہنگِ اثر میں انشا کا یہ شعر درج کیا گیا ہے:

"دیکھ کر مجھ کو روہاندا سا، لگے فرمانے آپ
ٹھیسرا یہ میری چڑ ہے، ناک اپنی مت پھُلا"

کلیاتِ انشا میں حاشیے پر صراحت کردی گئی ہے کہ: "روہاندا اور ٹھیسرا، دونوں کے معنی ہیں: رونی صورت"۔

(کلیاتِ انشا، ص ۳۲)

سماں: نور میں "سما" کو دہلی سے اور "سماں" کو لکھنؤ سے منسوب کیا گیا ہے: "سما۔ سماں: دہلی میں سما۔ لکھنؤ میں سماں ہے"۔ مگر لطیفہ یہ ہے کہ اِس کے ساتھ ہی میر اور میرحسن کے وہ شعر ہیں جن میں "سماں" آیا ہے۔ شعر یہ ہیں:

عجب وقت ہے اور عجب ہے سماں
کرے دو گھڑی آکے مجرا یہاں (میرحسن)

نہ میرے باعث اب شور و فغاں ہو — ابھی کیا جانیے یاں کیا سماں ہو

(میر)

خط میں کیا ہے سماں پسینے پر — موتی گویا جڑے ہیں مینے پر

(میر)

بات یہ ہے کہ مولف نے آصفیہ کی عبارت اور اشعار کو نقل کر لیا ہے ۔ آصفیہ میں "سما یا سماں" لکھا ہوا ہے، مگر اس میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ "سما" دہلی سے یا "سماں" لکھنؤ سے مخصوص ہے ۔ اس کے برخلاف، صاحبِ آصفیہ نے اردو کے جتنے شعر درج کیے ہیں، اُن میں یہ لفظ مع نون آیا ہے ۔ صرف ایک شعر نقل کیا جاتا ہے :

لبِ جو، کس نے اے رشکِ پری ایسا سماں باندھا
کہ تونے دو ترانے گائے اور آبِ رواں باندھا

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولف کے نزدیک مرجّح لفظ مع نون ہے ۔ جلال نے بھی سرمایہ میں اس کو صرف مع نون لکھا ہے ۔

اب اس لفظ کا ایک املا " سماں " (مع نون) ماننا چاہیے ۔ ضمنی طور پر "سما" بہ معنیِ آسمان سے (ارض و سما ۔ سما سے سمک تک) امتیاز کا فائدہ بھی حاصل ہو جائے گا ۔

منجھولا ۔ منجھولی : نور میں یہ دونوں لفظ مع نون اور بغیرِ نون دونوں طرح لکھے گئے ہیں (مجھولا، منجھولا ۔ مجھولی، منجھولی) ترجیح کا اندازہ نہیں ہوتا ۔

نور کی طرح آصفیہ میں بھی یہ لفظ دونوں طرح لکھے گئے ہیں، مگر "مجھولا" کے ذیل میں صراحت کر دی گئی ہے کہ : " اہلِ دہلی ایک نون زیادہ کر کے منجھولا بولتے ہیں، اور یہی صحیح ہے " ۔ " مجھولی " کے تحت بھی

یہ صراحت موجود ہے : "اہلِ دہلی ایک نون زیادہ کرکے منجھولی بولتے ہیں"۔
اس صراحت سے بہ ظاہر یہ خیال ہوتا ہے کہ مع نون دہلی سے مخصوص ہے ، مگر جلالؔ نے سرمایہ میں دونوں لفظوں کو مع نون ہی لکھا ہے ، یعنی :
"منجھولا ، منجھولی"۔

منجھلا اور منجھلی کو آصفیہ و نور دونوں میں مع نون لکھا گیا ہے ۔ مستعمل اسی طرح ہیں ۔ منجھو اور منجھو ، اِن دونوں کو بھی مع نون ہی لکھا گیا ہے ، یہ دونوں منجھلا اور منجھلی کے مصغر ہیں ۔ (مرزا منجھو ۔ منجھو بیگم)
اس بنا پر کہ اور سب لفظ مع نون ہی مستعمل ہیں ، ان دونوں لفظوں کو مع نون ہی لکھنا چاہیے ۔ یعنی : منجھولا ، منجھولی ۔

مانجھی : آصفیہ میں "م ا جھ" کے ذیل میں "ماجھی یا مانجھی" دونوں لفظ ایک ساتھ لکھے ہوئے ہیں ۔ یہی صورت نور میں ہے ۔ اِس کے بعد آصفیہ و نور دونوں میں "م ان" کے ذیل میں "مانجھی" لکھ کر مثال میں ناسخ کا یہ شعر لکھا گیا ہے :

بتاؤ مانجھیو ، تم کو قسم ہے گنگا کی
کدھر وہ کھیل رہے ہیں شکار مچھلی کا

اس سے ہلکا سا اندازہ ہوتا ہے کہ شاید دونوں مولفین کے نزدیک مع نون مرجح ہے ۔
سماعت میں یہ لفظ مع نون آتا ہے ۔ اب اِس کا املا مع نون ماننا چاہیے ، یعنی : مانجھی ۔

گھونسا : آصفیہ و نور میں یہ لفظ مع نون ہے ، اِس لفظ میں تو بہ جاے خود کوئی اختلاف نہیں ، مگر نور میں "گھونسم گھانسا" ہے اور آصفیہ میں

"گھوسم گھانسا" کو مرجّح بتایا گیا ہے۔

سماعت میں یہ مرکب مع نون آیا ہے، اِس کی صوتی حیثیت بھی اِسی کی متقاضی ہے؛ اِس لیے اب اِس مرکب کے دونوں اجزا کو مع نونِ غنّہ ماننا چاہیے، یعنی: گھونسم گھانسا۔

گِردی: نور میں اِس کی دو صورتیں ہیں: گردی، گردیں، مگر عبارت میں ہر جگہ "گردی" ملتا ہے۔ "گردی ہونا" میں بھی یہی صورت ہے۔ آصفیہ میں، اِس کی صرف ایک صورت "گروی" ملتی ہے۔ فارسی کا لفظ ہے: گِرِو۔ یہ لفظ اردو میں مستعمل ہے، جیسے: زندگی ہے گرِو عشقِ بُتاں۔ اِسی "گِرو" سے "گروی" بن گیا ہے، اِس میں نون کا اضافہ کچھ ضروری نہیں۔ اب اِس کا ایک املا "گروی" مان لینا چاہیے۔

کیچوا: اہلِ لغات کا خیال ہے کہ یہ لفظ "کیچ" سے بنا ہے، اِس لحاظ سے اِس کو نون کے بغیر "کیچوا" ہی ہونا چاہیے۔ آصفیہ میں "کیچوا" کے ساتھ "کینچوا" بھی لکھا گیا ہے، مگر اِس کے ساتھ یہ صراحت بھی موجود ہے: "دیکھو کیچوا۔ چوں کہ اِس کا مادہ کیچ ہے، اِس وجہ سے وہاں لکھا گیا"۔

نور میں بھی "کینچوا" کے ذیل میں لکھا ہوا ہے کہ: "دیکھو کیچوا" مطلب وہی ہے کہ مرجّح لفظ نون کے بغیر ہے۔

اِس لفظ کے دو املا خواہ مخواہ بن گئے ہیں۔ بہ ہر صورت، اب اِس کا املا "کیچوا" ماننا چاہیے۔

گنگوارا: نور میں اِس کو مع نون ہی لکھا گیا ہے، قوسین میں اِس کی صراحت بھی کی گئی ہے کہ: ہندی میں "گوآرا" بھی ہے"۔

آصفیہ میں یہ لفظ مع نونؔ موجود ہی نہیں ۔ اِس میں "کوآرا" ہے ۔ اِس کے متعلقات کو بھی اِسی طرح لکھا گیا ہے ، جیسے : کوآرپن ، کوآری ، کوآری بالی وغیرہ ۔

سماعت اور عام استعمال دونوں میں یہ لفظ مع نونؔ ہے ۔ اِس کا املا مع نونؔ ہی ماننا چاہیے ، یعنی : کُنوارا ، کُنواری ، کُنوارپن ۔

منجدھار : آصفیہ میں پہلے "م مع الف" کے ذیل میں "مانجھ دھار" لکھا ہوا ہے ، اِس سے پہلے "مانجھ" بہ معنی "وسط ، بیچوں بیچ" لکھا ہوا ہے ، یعنی "مانجھ دار" کا پہلا جُز "مانجھ" ہے ۔

اِس کے بعد "م ن جھ" کے ذیل میں پہلے "منجھ" ، "بیچوں بیچ" کے معنی میں لکھا ہوا ہے اور اُس کے بعد "منجھ دھار" لکھا ہوا ہے ۔

نورؔ میں "مانجھدار" (کذا) کو دہلی سے مخصوص بتایا گیا ہے ، مگر آگے چل کر "منجدھار" کے ذیل میں لکھا ہے کہ : "رشکؔ نے "مانجھدھار" کہا ہے : ہوں مانجھدھار میں اے چرخِ آشنا دشمن

یہ ناوِ بحرِ مصیبت سے پار ہونے دے "

اِس کا صاف مطلب یہ ہے کہ "مانجھدھار" کی دہلی سے تخصیص درست نہیں ۔

اِس کے علاوہ "منجدھار" کے دو املا اِس میں ملتے ہیں : "منجدھار ، منجھدار" ۔ جب یہ مسلّم ہے کہ اِس میں آخری جُز "دھار" ہے تو پھر "منجھدار" تو اِس کا املا ہو ہی نہیں سکتا ۔

اصلاً یہ لفظ "منجھ" (بہ معنی درمیان) اور "دھار" سے مرکّب ہے ۔ (منجھ ۔ دھار) کثرتِ استعمال سے ایک ہائے مخلوط ساقط ہوگئی ہے ۔ اب

اِس کا املا "منجدھار،، ماننا چاہیے۔

مؤچھ، مچھندر: آصفیہ میں "م وچھ" کی فصل میں "موچھ یا مونچھ" لکھا ہوا ہے، اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس لفظ کی دو صورتیں ہیں، مگر اِس کے جملہ متعلقات کو نون کے بغیر لکھا گیا ہے، جیسے: موچھ کا بال، موچھ منڈا، موچھوں کو تاؤ دینا وغیرہ۔ اِسی طرح اِس کی جمع "موچھیں" لکھی ہے۔ آگے چل کر "م و ن" کے تحت "مونچھ" لکھ کر لکھا ہے: "دیکھو موچھ" اِس سے معلوم ہوا کہ مؤلف کے نزدیک مرجح لفظ نون کے بغیر ہے۔ بالکل یہی صورت نور میں ہے۔ مچھندر دونوں لغات میں نون کے بغیر ہے۔

سماعت میں یہ لفظ دونوں طرح ہے۔ ترجیح کے لیے، اِس کا املا نون کے بغیر مان لینا چاہیے (مؤچھ۔ مچھندر) مؤلفینِ آصفیہ و نور کا رجحان بھی اِسی طرف تھا۔

مُنڈاسا: (پگڑی۔ صافہ)۔ آصفیہ میں صرف مع نون ہے (مُنڈاسا)۔ نور میں "مڈاسا (ھ منڈاسا)" لکھا ہوا ہے، اِس کا مطلب یہ ہوا کہ مؤلف کی رائے میں اردو میں نون کے بغیر ہے اور ہندی میں مع نون ہے۔

یہ لفظ قلیل الاستعمال ہے اور جو لوگ اِس کو استعمال کرتے ہیں، اُن کی زبان سے سننے میں مع نون ہی آیا ہے (مُنڈاسا)۔ اِس کے قریب کے الفاظ جیسے مُنڈیا اور مونڈ، بھی مع نون ہی مستعمل ہیں؛ اِس لیے اِس لفظ کو بھی مع نون مان لینا چاہیے: مُنڈاسا۔

کینچلی: آصفیہ اور سرمایہ میں یہ لفظ صرف مع نون ہے۔ نور میں پہلے "کیچلی" ہے اور یہاں اِس کے بعض متعلقات کو لکھا گیا ہے، اِس کے

بعد "ک ی ن" کے ذیل میں "کینچلی" ہے اور یہاں اِس کے اکثر متعلقات کو لکھا گیا ہے۔ اِس طرح ترجیح کا فائدہ مع نون کے حصّے میں آتا ہے۔

اِس لفظ کو مع نون مرجّح ماننا چاہیے، یعنی: کینچلی۔

جھونک، جھونکا: "جھونک" کو نور و آصفیہ میں دونوں طرح لکھا گیا ہے (جھونک۔ جھوک)۔ مگر نور میں یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "عموماً اِس کا تلفّظ نون کے ساتھ، یعنی "جھونک" ہے"۔

"جھونکا" اِسی "جھونک" کی ایک صورت ہے۔ اِسے بھی نور و آصفیہ میں دونوں طرح لکھا گیا ہے، مگر نور میں جو مثالیہ اشعار "جھوکا" کے ذیل میں لکھے گئے ہیں، اُن میں ہر جگہ مع نون "جھونکے" لکھا ہوا ہے۔ آصفیہ میں "جھوکا" کے ذیل میں جو ایک مثالیہ شعر لکھا گیا ہے، وہ ناسخ کا ہے اور کلیاتِ ناسخ میں وہ مع نون "جھونکا" ہے۔ شعر یہ ہے:

دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا　　　جھونکا نسیم کا جو ہیں سَن سے نکل گیا

(کلیاتِ ناسخ اشاعت ۱۲۶۳ھ)

بول چال میں یہ لفظ عام طور پر مع نون سننے میں آیا ہے، لکھنے میں بھی بیش تر مع نون آتا ہے۔ اِن تینوں لفظوں کو اب مع نون مرجّح ماننا چاہیے، یعنی:

جھونک، جھونکا، جھونکے۔

ہاں، ایک اور لفظ "جھونٹا" متفقہ طور پر مع نون ہے، اِس کے ایک معنی ہیں: "پینگ۔ جھولے کی جنبش"۔ اِن معنی میں یہ لفظ معناً بھی "جھونکا" سے قریب ہے۔ یہ ایک اور وجہِ ترجیح ہاتھ آئی۔

کچھ لفظ ایسے بھی ہیں جن میں بجائے خود اختلاف موجود نہیں، مگر بے توجہی یا کم احتیاطی، جو روشِ عام بنتی جارہی ہے، اُس کے سبب سے اختلاف کی صورت گری ہوتی رہتی ہے اور کبھی تلفظ کی ابہامی کیفیت بھی مغالطے میں مبتلا کردیا کرتی ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے: جھونپڑا۔ اِس کی تانیث ہوئی: جھونپڑی۔ یہ لفظ آصفیہ و نور میں مع نون ہے۔ اِس کو نون کے بغیر بھی لکھ دیا جاتا ہے۔

اِس کے برخلاف بھی ہوتا ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے: خوناب۔ یہ برفاب اور زہراب کی طرح مرکّبِ مقلوب ہے۔ اِس کو "خوںناب" بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ "خونِ ناب"، کو ن کی اضافت کے ساتھ لکھا جائے گا اور یہ دوسرا لفظ ہے۔ "خوناب" دوسرا لفظ ہے، اِس کو اِسی طرح لکھا جائے گا۔ "خونابہ فشاں" اور "خونابہ فشانی" میں یہی "خوناب" ہے۔

یا جیسے ایک لفظ ہے: پیترا۔ اِس میں کوئی اختلاف نہیں۔ اِس کو مع نونِ غنّہ "پینترا" بھی لکھ دیتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ ایسے الفاظ متعدد ہیں اور اِن میں احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

۴

پہلے کچھ لفظوں میں بعض لوگ نونِ غنّہ کا اضافہ بھی کرلیا کرتے تھے۔ جیسے: سونگھنا، پونچھنا۔ اِن کا بیان اوپر آچکا ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ ہے: ڈاکا۔ اب اِس کو عام طور پر اِسی طرح لکھا جاتا ہے۔ ڈاکو اور ڈکیت بھی اِسی طرح لکھے جاتے ہیں، مگر "ڈانکا" بہ اضافۂ نونِ غنّہ

بھی استعمال کیا گیا ہے۔ شوق نیموی نے لکھا ہے :

"ڈانکا۔ عوام نون سے لکھتے ہیں۔ اور سحر مرحوم نے بھی "خنداں کا"، "افشاں کا" کی زمین میں یہ شعر لکھا ہے :

چلا کر ٹھوکروں سے، نقدِ دل مُردوں کے لیتے ہیں
سحر! شہرِ خموشاں میں بھی اب پڑنے لگا ڈانکا

مگر ڈاکو میں نون نہ ہونا، ڈاکے کے بے نون ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اِس کے علاوہ، نون جمہور شعرا کے خلاف ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانے میں اِس کی بحث آپڑی تھی، قلق، برق، قبول، طور، اسیر ایسے نامی شعرا موجود تھے، سب نے اتفاق کیا کہ اِس کو بے نون لکھنا چاہیے" (اصلاح)۔

شوق نے جو دلیل دی ہے کہ: "ڈاکو میں نون نہ ہونا، ڈاکے کے بے نون ہونے پر دلالت کرتا ہے"، اگر اِس کو اصولی طور پر پیشِ نظر رکھا جائے تو ایسے اور بہت سے لفظوں کے متعلق فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

۵

نہ اور نا، نفی کے لیے آتے ہیں، جیسے: نہ کرو۔ نا دہند۔ یہ دونوں فارسی میں بھی مستعمل ہیں۔ اُردو میں تاکید کے لیے بھی[1] نا آتا ہے اور یہ اردو کی چیز

---

[1] جیسے اِن اشعار میں :

آوارہ پڑے پھرتے ہیں کیوں دھوپ میں صاحب تہ خانے میں سو رہیے نا، چلتی ہے ہوا گرم

انشا (کلامِ انشا، ص ۱۳۴)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۴۰ پر)

ہے ، جیسے : جاؤ نا ، ارے آؤ نا ، تم اُس کو سمجھاؤ نا ، تم اناڑی ہو نا ۔
کبھی نفی کی تاکید کے لیے بھی آتا ہے ، جیسے : نا بھائی ، ہم تو بہت بھر بھگت چکے ، اب ہمارا سلام ہے ۔ نا بابا ! تمھاری بات کون مانے ، تمھارا کیا بھروسا ۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسے مقام پر نہ نہیں لکھنا چاہیے ۔ یہ غلطی کبھی کبھار دیکھنے میں آجایا کرتی ہے ۔

(۶)

لفظ کے آخر میں نون تانیث کے لیے بھی[1] آتا ہے ، جیسے : دھوبی اور دھوبن ، نذیر اور نذیرن ، سلیم اور سلیمن ۔ عورتوں کے ایسے سب ناموں کے آخر میں نون لکھا جائے گا ، اِن کو تنوین کے ساتھ نہیں لکھا جائے گا ۔ یعنی صحیح املا " تسلیمن " ہوگا ، اِس کو " تسلیماً " نہیں لکھا جائے گا ۔ ایسے کچھ نام یہ ہیں :

امیرن ، بشیرن ، تمیزن ، جمیلن ، حمیدن ، حلیمن ، حفیظن ، رحیمن ، کریمن ، نصیبن ، مقبولن ، مقصودن ، محمودن ، تسلیمن ، نسیمن ، سلیمن ،

مت بھول دلا ، ربطِ مواخاتِ جہاں پر — قابیل نے توڑی ہے نا ہابیل کی گردن
(انشا دکلامِ انشا ، ص ۱۵۹)

س " نا " کی جگہ اکثر " نہ " لکھ دیا جاتا ہے ۔ اوپر جو شعر درج کیے ہیں ، اِن میں بھی " نہ " چھپا ہوا ہے ، حالاں کہ وہ دوسری چیز ہے ۔ یہاں " نا " کا محل ہے ۔

[1] " حرفِ نون در آخرِ اسم ، علامتِ تانیث است ، چوں : رحیمن و کریمن ۔ و گاہے علامتِ زوجہ ، چوں : تیلن و تنبولن و دلھن و سمدھن " (بحر البیان) ۔

وحیدن ، عزیزن ، ظہورن ، رضین ، رفیعن ، سعیدن ، قمرن ، زینبن ، عیدن ، شبراتن ، وفاتن ، براتن ، نجمن ، وصین ، علیمن ، غفورن ، شکورن ، مجیدن ، مسیتن ، خیراتن ، شریفن ۔

۲

ایسے ناموں کے آخر میں بھی ن آتا ہے جو پیار کے طور پر رکھ لیے جاتے ہیں۔ اِن میں اکثر تصغیر کا پہلو بھی شامل ہوتا ہے ۔ ایسے سب ناموں کو بھی نون سے لکھا جائے گا ، تنوین کا یہاں بھی گزر نہیں ہوگا ، جیسے :

اچھن ، اغن ، شبن ، جُمن ، بُدھن ، بِدن ، شدن ، شمن ، اِبن ، اِشن ، اِفن ، کبن ، اَمن ، مجن ، لڈن ، بچن ، بُھلن ، کلن ، رُفن ، پِھدن ، مُنن ، نقن ، شُجن ۔

(۸)

آنو ، پانو ، ٹھانو ، چھانو ، دانو ، کھڑانو ، گانو ، نانو :

یہ آٹھوں لفظ ایک ہی قبیل کے ہیں ۔ پانو کے کتابوں میں چار املا نظر آتے ہیں : پانو ، پانوں ، پانوں ، پاؤں ۔ شوق نیموی نے لکھا ہے ۔

" پاؤں ، اِس کا املا مختلف فیہ ہے ۔ دلی والے " پانو " لکھتے ہیں اور ردیفِ واو میں لاتے ہیں ، اور لکھنؤ والے " پاؤں " لکھتے ہیں اور ردیفِ نون میں داخل کرتے ہیں ۔ اور بعضے " پانوں " بھی لکھتے ہیں ، یعنی الف کے بعد بھی نون لکھتے ہیں "۔ (اصلاح)

شوق کا یہ قول درست معلوم ہوتا ہے ، مثلاً آتش کی وہ غزل جس کا مطلع ہے :

باہر نہ پاپچے سے ہوں اُس گل بدن کے پانوں　　پھیریں چھری نہ پنجۂ قصّاب بن کے پانوں

نون کی ردیف میں ملتی ہے ۔ اور غالبؔ کی یہ غزل :

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو　　رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

واو کی ردیف میں ہے ۔ مولّفِ نور نے بھی یہی بات لکھی ہے :

" حضراتِ لکھنؤ آخر میں نون (پاؤں) ، اور حضراتِ دہلی آخر میں واو (پانو) لکھتے ہیں "۔

مگر صاحبِ آصفیہ کے اندازِ نگارش سے مترشح ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک مرجّح صورت " پاؤں " ہے ۔ اُنھوں نے لکھا ہے :

" پانو یا پانوں ۔ ہ ۔ اسم مذکر ۔ دیکھو : پاؤں "۔

اِس کے سب متعلّقات کو بھی " پاؤں " کے ذیل میں لکھا ہے ۔

لفظ تو " پانو " تھا ، ہوا یہ کہ شعرا نے اِس کو اشباع کے ساتھ بھی نظم کیا ، جیسے :

توفیق یہاں تلک جو لاتی
منہدی پاؤں کی گھِس نہ جاتی　　(گلزارِ نسیم)

شعرا اُس زمانے میں بہت سے الفاظ کو بہ اشباع نظم کر لیا کرتے تھے ، لیکن اُس اشباع سے ، لفظ کی اصل صورت پر مستقل اثر نہیں پڑتا تھا ، مگر اِس ضرورتِ شعری کے نتیجے میں ، اِس لفظ کی تین چار شکلیں خواہ مخواہ بن گئیں ۔ اِس کا اندازہ یوں بھی ہوتا ہے کہ مولّفِ نور نے جلدِ اوّل کے مقدّمے میں ، بحثِ متروکات میں لکھا ہے :

" پاؤں ، بر وزنِ فعلن متروک اور بر وزنِ فعِ مستعمل ہے "۔

پھر لفظ " پاؤں " کے ذیل میں لکھا ہے :

"پاؤں"، بروزنِ فع مستعمل، بروزنِ فعلن متروک۔ تحر:

یہ پیترے بھلے نہیں، یہ چال چھوڑ دو　　خلقِ خدا کو روندتے ہیں بانک پن کے پاؤں"۔

اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اِس لفظ کو اشباع کے ساتھ، فعلن کے وزن پر جو نظم کیا گیا ہے، وہ اب متروک ہے اور اب اصل کے مطابق، اِس کو فاع کے وزن پر استعمال کرنا چاہیے۔ بروزنِ فاع ماننے کا مطلب یہ ہوا کہ اِس کا املا پانو ہونا چاہیے، جو بروزنِ فاع ہے۔ یہی اِس لفظ کی اصل صورت ہے۔

چھانو کو شعرا نے عام طور پر بروزنِ فاع نظم کیا ہے، جیسے:

جنوں پسند مجھے چھانو ہے ببولوں کی　　عجب بہار ہے اِن زرد زرد پھولوں کی

(ناسخ)

بیٹھ جاتا ہوں، جہاں چھانو گھنی ہوتی ہے　　ہائے، کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

(حفیظ جون پوری)

ممکن ہے اِس لفظ کو بھی اشباع کے ساتھ نظم کیا گیا ہو، مگر اب اُس کا شمار بھی متروکات میں ہوگا۔

اب اِن سب لفظوں کا، تلفّظ کے مطابق، ایک املا ماننا چاہیے، اِس طرح کہ آخر میں واو ساکن، اور اُس سے پہلے نونِ غنّہ، یعنی[1]:

پانو، چھانو، گانو، دانو، نانو، ٹھانو، کھڑانو، آنو

اگر یہ غلطیِ کتابت نہیں، تو مولف سے چوک ہوئی۔ "فع" کی جگہ فاع ہونا چاہیے۔ پا بروزنِ فع ہے اور پانو بروزنِ فاع ہے۔

[1] پانو، گانو، چھانو (وغیرہ) اسم ہیں، اگر اِن کے تلفّظ کا مقابلہ فعل مضارع "پاؤں" (مصدر: پانا) (بقیہ حاشیہ [illegible] پر)

فائدہ :

پانا ، گانا ، چھانا ؛ اِن تینوں مصدروں سے فعل کی ایک صورت " پاؤں گاؤں ، چھاؤں " بھی بنے گی ۔ یہ فعل اِسی طرح لکھے جاتے ہیں اور اِن کو اِسی طرح لکھنا بھی چاہیے ۔ اب " پاؤں " فعل ہوا اور " پانْو " اسم ہے۔ "چھاؤں " فعل ہے جو"چھانا"سے بنا ہے اور " چھانْو " اسم ہے ۔ اِسی طرح "گانا"سے فعل بنے گا " گاؤں " اور " گانْو " ایک الگ اسم ہوگا ـــــ یہ امتیاز نہایت مناسب ہے اور اصل کے مطابق بھی ہے ـــــ ضمنی طور پر ایک یہ بات بھی کہہ دی جائے کہ "چھانْو " کی ایک قدیم شکل چھانْہ (آخر میں ہاے ملفوظ) بھی ہے ۔ مضافات میں اب بھی یہ لفظ سننے میں آجاتا ہے ۔

اِن الفاظ میں سے دو لفظوں کی جمع " وُں " کے اضافے سے بنائی جاتی ہے۔ جمع کی صورت میں اِن کو قاعدے کے مطابق " پانْوؤں " اور " گانْوؤں " لکھا جائے گا ۔ کھڑانْو کی جمع " کھڑانْوؤں " اور " کھڑانْویں " بنے گی ۔ اگر اِن لفظوں کو " گاؤں " اور " پاؤں " لکھا جائے تو اِن کی جمع کیا ہوگی؟

اور " گاؤں " (مصدر: گانا) سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مضارع میں آخری صوت (اوں) ہے، یعنی مصوتے (واو) کی غُنائیت کے ساتھ ؛ جب کہ اسموں میں آخری صوت نیم مصوتہ (واو) ہے ۔

پانْو ، گانْو (وغیرہ) میں غُنائیت دراصل پہلے حرفِ صحیح (یعنی پ اور گ) کے فوراً بعد شروع ہوجاتی ہے ، یہ الف پر حاوی رہتی ہے اور اُس کے بعد چوں کہ نیم مصوتہ (واو) ہے ، جو ہِرے کا کام دیتا ہے ؛ غُنائیت اُس کو بھی متاثر کرتی ہے اور اُس کا کچھ اثر بعد تک رہتا ہے ، اِس لیے مغالطہ ہوجایا کرتا ہے اور واو کے بعد بھی نون لکھ دیا جاتا ہے ۔ یہ درست نہیں ۔

ایک مثل ہے : ہاتھی پھرے گانْو گانْو ، جس کا ہاتھی اُس کا نانْو ۔

"گاؤں" کے آگے "ؤں" کا اضافہ کیا جائے تو اُس کی صورت "گاؤؤں" ہوگی اِسی طرح "پاؤں" سے "پاؤؤں"۔ اور یہ قابلِ قبول نہیں۔ ہاں، "گانو" سے "گانوؤں" اور "پانو" سے "پانوؤں" قاعدے کے مطابق جمع بنے گی۔
ایک بات اور: گنوار میں متفقہ طور پر نونِ غنہ درمیانِ لفظ میں موجود ہے؛ یہ مزید ثبوت ہے اِس کا کہ "گانو" میں واو سے پہلے نونِ غنہ ہے۔
رہی دہلی و لکھنؤ کے اختلاف کی بات، سو اب نہ وہ دہلی ہے نہ وہ لکھنؤ؛ اب نہ وہ دبستانی چشمک ہے اور نہ وہ جذبۂ رشک و رقابت یا جذبۂ مسابقت۔ رات گئی بات گئی۔ اِس لیے اِس اختلاف کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں[1]۔

۲

کُنواں، دُھواں، رُواں؛ یہ تین لفظ قریب قریب ایک ہی انداز کے ہیں، مگر استعمالِ عام نے اِن کو الگ الگ سانچوں میں ڈھال لیا ہے۔

---

[1] خطوطِ غالب، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے مقدمے میں، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا تھا:

"اردو کے بعضے لفظوں میں نونِ غنہ لکھنے نہ لکھنے کے بارے میں اختلاف ہے، غالب اِس مسئلے میں ایک قطعی رائے رکھتے تھے۔ قاضی عبدالجمیل کو لکھتے ہیں: "پاؤں غلط املا ہے؛ صحیح ہے: پانو، گانو، چھانو"۔

ایک اور شاگرد کے ایک مصرع میں "پانوں" لکھا دیکھا تو غالب نے آخری "ں" کو قلم زد کرکے لکھا:

"پانو، قافیہ گانو اور چھانو کا ہے۔ آگے اس کے نون لکھنا غلط ہے۔ مگر

کنواں کا ایک املا "کنوا" بھی ہے ۔ آصفیہ میں اِس کو دونوں طرح لکھا گیا ہے : "کنواں یا کنوا" ۔ مگر اِس کے متعلقات میں ہر جگہ "کنواں" لکھا ہوا ملتا ہے ۔ اِس کی جمع "کنووں" یا "کووں" لکھی گئی ہے ، مگر متعلقات میں یہاں بھی ہر جگہ "کنووں" ملتا ہے ۔ امیراللغات میں دو جگہ "کنواں" ملتا ہے (ص ۱۰۷ - ۲۵۷) ۔ اِس کی محرّف صورت آصفیہ میں "کنوئیں" ملتی ہے ـــــ نور میں اِس کو "کنواں" اور "کنویں" لکھا گیا ہے ۔

عام استعمال میں "کنواں" ہے ، یعنی نونِ غنّہ دو جگہ ۔ اور اِس کا یہی املا اب ماننا چاہیے ۔ اِس کی جمع "کنووں" اور "کنویں" ہوگی ـــ محرّف حالت میں بھی "کنویں" لکھا جائے گا ۔

دُھواں : یہ لفظ تلفّظ کے لحاظ سے "کنواں" کی طرح ہے ، یعنی جزوِ اوّل میں غنّہ کی آواز شامل رہتی ہے ، مگر استعمالِ عام نے اِس میں نونِ غنّہ کو کتابت سے دور رکھا اور اِس کا متعارف املا "دُھواں" ہے ۔ اور یہی املا صحیح مانا جائے گا ۔ اِس کے مشتقات کی بھی یہی صورت ہوگی ۔ "دُھواں" کی محرّف صورت "دُھویں" ہوگی ،

ہاں بہ صیغۂ جمع یوں لکھنا چاہیے : پانووں "

پانو ، گانو ، چھانو ، دانو کی یہ املا یقیناً بہتر ہے ؛ اِس لیے کہ ایک تو غنّہ یہاں حقیقت میں الف میں ہے ، دوسرے جمع کی محرّف حالت میں اِن لفظوں کی صورت یوں ہوتی ہے : "پانوؤں" ، "گانوؤں" وغیرہ ۔ بہ خلاف اِس کے ، اگر واحد کی لکھاوٹ "پانوں" یا "پاوں" قرار دیجیے تو جمعِ محرّف "پانونوں" یا "پاوِنوں" بنتی ہے جو ہرگز قبول کرنے کے لائق نہیں " (مقدمۂ خطوطِ غالب)

"کنویں" کی طرح ۔ آصفیہ میں " دھوئیں اُڑانا " کی مثال میں مومن کے یہ دو شعر ملتے ہیں :

" نالہ اک دم میں اُڑا دیوے دھوئیں چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا

آہ نے دل سے کیا اٹھائے دھوئیں چاہِ بابل سے بھی اُڑائے دھوئیں"

دونوں جگہ " دُھویں " ہونا چاہیے ـــــ " دھوئی " میں بھی نونِ غنّہ نہیں لکھا جائے گا ، یہاں تو وہ شاملِ تلفظ بھی نہیں ۔

رُواں : اِس لفظ کے املا میں خاصا تنوّع ہے ۔ نور میں اِس کی دو صورتیں نظر آتی ہیں : " رواں " اور " رویاں " ۔ اِس کی جمع " روئیں " ملتی ہے ۔ آصفیہ میں " رُواں " اور " رویاں " دونوں صورتیں ملتی ہیں مگر اِس میں صراحت کردی گئی ہے کہ " رویاں " لکھنؤ سے مخصوص ہے ۔ اِس کا مطلب یہ نکلا کہ مولّف کے نزدیک دہلی میں " رُواں " ہے ۔ " رویاں " کی سند میں اسیر کا یہ شعر لکھا گیا ہے :

بدلے پانی کے اگر خاک چھنے بدلی سے
ایک رویاں نہ ہو میلا مری بارانی کا

میں نے بعض جگہ اِس کی ایک اور صورت " رواں " بھی دیکھی ہے ۔ اصل میں یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب حقیقی صورتیں ہیں یا محض کتابت کے کرشموں نے نمود کی ہے ۔ بہ ہرصورت ، املا کی یہ سب صورتیں لُغت میں محفوظ کی جا سکتی ہیں ۔ اب عام استعمال میں زیادہ تر " رُواں " ہے اور اب اِس لفظ کا یہی املا مرجّح مانا جائے گا ۔ اِس کی جمع " روئیں " ہوگی ۔ محرّف صورت میں بھی اسی طرح لکھا

جائے گا ، جیسے : روئیں دار ۔ اب صورت یہ ہوئی : رُواں ، روئیں ، روئیں دار ۔

قدیم عبارات اور اشعار میں کیا صورت ہو ، اِس کا تعلق تدوین اور املا کے مسائل سے ہے اور اِس کو وہاں دیکھا جائے ۔

ہاں ، " دھواں " کے ذیل میں یہ بات رہ گئی کہ اِس کا امکان ہے کہ قدما کے یہاں بعض مقامات پر " دھوئیں " بروزنِ "فعلن" نظم ہوا ہو ۔ ایسے مقامات پر اِس لفظ کا املا " دھوئیں " اختیار کیا جائے گا ، مگر اِس املا کا تعلق ، صرف ایسے ہی مقامات سے ہوگا ۔ اور اب اِس کو " دھویں " ہی لکھا جائے گا ۔

اب اِن الفاظ کی صورت یہ ہوئی :

کُنواں ، کُنویں ، کُنووں ۔

دُھواں ، دھویں ۔

رُواں ، روئیں ، روؤں ۔

واو

(۱)

پہلے بہت سے لفظوں میں پیش کو ظاہر کرنے کے لیے واو لکھا جاتا تھا، جیسے: "اوس، اودھر، اودھار، اودھم، اوٹھانا"۔ یہ واو لفظ کا جز نہیں ہوتا تھا، بل کہ "اعراب بالحروف" کے طور پر محض علامت کی حیثیت رکھتا تھا۔ بہت سی اور تبدیلیوں کے ساتھ، یہ فالتو واو اکثر لفظوں میں سے نکل گیا، مگر بعض لفظوں میں اُس زائد اور علامتی

ؔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم نے ایک خط میں لکھا ہے:

"لفظ "اُس" اور "اِس" کی بابت میں تم کو لکھنے والا تھا۔ حرکات بالحروف اردو میں نہیں، تو "اوس" بالواو کیوں ہو اور "اوس" ہو تو "اِس" کی جگہ "ایس" کیوں نہ ہو۔ اِسی طرح "اُٹھانا" وغیرہ۔ لیکن ایک غلط دستور واو لکھنے کا رواج پاگیا ہے: تم چاہو دستورِ غلط کی تقلید کرو، یا پابندِ صحت ہوکر ترکِ واو کا التزام کرو"۔ (موعظۂ حسنہ، لاہور اڈیشن، ص ۴۴)

واؤ کی صورت اب بھی نظر آجایا کرتی ہے ، جیسے : دوکان ، پہونچنا۔
کچھ لفظوں کی صورت یہ ہے کہ اصل لفظ میں واو جز و لفظ کی حیثیت سے موجود ہے ، اُس لفظ سے ایک اور لفظ بنا ، جس میں تلفّظ کے لحاظ سے واو کی گنجایش نہیں ، مگر کچھ لوگ اصل کی رعایت سے اِس لفظ کو بھی مع واو لکھنے لگے اور کچھ لوگ تلفّظ کی رعایت سے واو کے بغیر لکھتے رہے ، جیسے : لوہار اور لُہار۔ اصل لفظ لوہا ہے[1]۔
مشکل یہ ہوئی کہ خود لُغات میں یہ خلفشار پایا جاتا ہے۔ بہت سے لفظ جن میں زائد واو لکھا جاتا تھا ، واو کے بغیر لکھے ہوئے ہیں اور کچھ لفظ اُسی طرح مع واو ملتے ہیں[1]۔ اِس سے بھی زیادہ الجھن کی بات یہ ہے کہ کچھ لفظوں کو الگ الگ فصلوں میں ، مع واو بھی لکھا گیا ہے اور بلا واو بھی ، اور صراحت بھی نہیں کی گئی ہے۔ جیسے : آصفیہ میں بُہنی اور بوہنی ، دونوں کو الگ الگ فصلوں میں درج کیا گیا ہے اور کہیں یہ نہیں لکھا گیا کہ اِس لفظ میں واو کی حیثیت کیا ہے۔ اِسی طرح لوہار اور لہار ، موچھندر اور مچھندر ، دُہرانا اور دوہرانا ، دُہائی اور دوہائی اِن سب لفظوں کی دو دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ مچھندر اور موچھندر ،

---

[1] رشک نے نفس اللغۃ میں "اوبال" ، "اوبالا" ، "اوبھارنا" ، "اوتارہ" وغیرہ کو "الف مع واو" کی فصل میں درج کیا ہے اور اِس کی وضاحت بھی کی ہے کہ:
"و دریں جملہ لُغات واو بہ سببِ املا نوشتہ می شود ، مگر خواندہ نہ می شود ، چناں کہ واوِ خورش و خواب ۔ و ایں واو را واوِ معدولہ گویند و ضمۂ ماقبل را ، ضمۂ اشباع گویند" (نفس ، ص ۲۹)

یہ دونوں لفظ الگ الگ فصلوں میں آئے ہیں (م ج : مچھندر ۔ م و : موچھندر) اور ایک مثالیہ شعر دونوں میں مشترک ہے، جس میں وزن کے لحاظ سے "مچھندر" نظم ہوا ہے ؛ اِس سے معلوم ہوا کہ وزن کو ملحوظ نہیں رکھّا گیا، لفظ کی رائج اور قدیم صورتوں کو مدِّ نظر رکھّا گیا ہے ۔ اِس سے بہت اُلجھن پیدا ہوتی ہے ۔

اِس اُلجھن میں مزید اضافہ یوں ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو ایک جگہ مع واو لکھا گیا ہے، پھر دوسری فصل میں اُسی لفظ کو واو کے بغیر لکھا گیا اور اِس کے ساتھ ہی اُس پہلے والے لفظ کو دیکھنے کی ہدایت کی گئی ؛ جیسے : آصفیہ میں "دولائی" کے ذیل میں لکھا گیا ہے : "دیکھو دُلائی"۔ یا "مونہہ" کے تحت لکھا گیا ہے : "دیکھو منہ" پڑھنے والا خواہ مخواہ یہ سمجھے گا کہ اِس لفظ کی صورتیں تو دونوں حقیقی اور برحق ہیں ؛ فرق ہوگا تو ترجیح کا ہوگا ۔

ایسے لفظ جن میں واو، پیش کو ظاہر کرنے کے لیے لکھا جاتا تھا ؛ اب اُن سب کو واو کے بغیر[1] لکھا جائے گا ۔ ایسے کچھ لفظوں کی فہرست پیش

---

[1] پہلے متعدد لفظوں کو واو کے اضافے کے ساتھ بھی نظم کر لیا جاتا تھا ۔ بہت سے شعروں میں اودھر، (اور اِسی طرح ایدھر) بروزنِ فعلن مل جائے گا ، یا افتادہ، اوفتادہ ملے گا ۔ ایسے ہی بعض اور لفظ ۔ ایسے مقامات پر اِن الفاظ کو مع واو ہی لکھا جائے گا ، اس لیے کہ یہ واو ایسے الفاظ میں جزوِ لفظ کی حیثیت سے آیا ہے ۔ جیسے غالب کا یہ شعر: دور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مرغِ خیالِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج

کی جاتی ہے ۔ بعض الفاظ کے ذیل میں کچھ ضروری تشریحات کو بھی درج کیا گیا ہے :

دُکان : عربی میں کاف مشدّد ہے (دُکّان)۔ فارسی میں اِس کو بہ تشدید و بہ تخفیف دونوں طرح استعمال کیا گیا ۔ صاحبِ بہارِ عجم نے اِس لفظ کے ذیل میں صراحت کر دی ہے کہ اِس کو مع واو لکھنا یا بولنا غلط ہے:

"وتلفظ وکتابتِ آں بہ واو بعد الدال غلطِ فاحش ، بلکہ خطاست "۔

(مگر کتابت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ عبارت میں دو جگہ " دوکان " بھی لکھا ہوا ملتا ہے)

نور میں بھی صراحت کر دی گئی ہے کہ " اِس کا املا واو کے ساتھ غلط ہے "۔ آصفیہ میں پہلے " دُکان " لکھا گیا ہے ، اِس کے بعد " دال مع واو " کی فصل میں " دوکان " لکھ کر لکھا گیا ہے :" دیکھو دکان "۔ اِس سے بات صاف نہیں ہوتی ، احتمال کی گنجایش رہتی ہے کہ شاید اِس لفظ کے دونوں املا صحیح ہوں ۔

اِس لفظ کا صحیح املا " دُکان " ہے ، واو کے بغیر ۔ نظم میں اگر یہ " طومار " کے وزن پر آئے تو اصل کے مطابق " دکّان " (بہ تشدیدِ کاف) لکھا جائے گا ۔ جیسے ؏ :

خانمانِ عاشقاں ، دکّانِ آتش باز ہے (غالب)

پہنچنا ، پہنچانا ، پہنچوانا ، پہنچ ، پہنچا ، پہنچی :

مصدر اور مشتقات کو پہلے زیادہ تر مع واو لکھا جاتا تھا (پہونچنا) ۔ اِس لفظ کا یہ قدیم املا اب بھی دیکھنے میں آجاتا ہے ۔ اِس کو لازمی طور پر واو کے بغیر لکھنا چاہیے ۔

اِس لفظ میں ایک اور اختلاف بھی ہے اور اِس کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے:
رشکؔ نے نفس اللغۃ میں لکھا ہے :

"پوہنچا، ف : بندِ دست - ع : ساعد - و املاے ایں لغت ہمین است، چہ اگر ہاے ہوز بعدِ باے فارسی نویسند، باے فارسی مخلوط الہا شود، فتامل - و ماضیِ رسیدن"۔

اِس لُغت میں "پوہنچ"، "پوہنچانا"، "پوہنچی" اِسی طرح لکھے گئے ہیں -

صاحبِ نور نے بھی اِن لفظوں کے اِسی املا کو صحیح مانا ہے، "پہنچ" کے ذیل میں لکھا ہے : "اِس کا صحیح املا "پوہنچ" ہے" - پھر "پہنچا" لکھ کر لکھا ہے : "اِس کا صحیح املا "پوہنچا" ہے" - مؤلف نے حوالہ نہیں دیا، مگر یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے قول کی بنیاد، رشکؔ کے مندرجۂ بالا اندراج پر ہے - مگر صاحبِ نور کے علاوہ، اور لوگوں نے اِس کو تسلیم نہیں کیا، یہاں تک کہ رشکؔ کے شاگرد جلالؔ نے اپنے لُغت سرمایۂ زبانِ اردو میں اِس کی پیروی نہیں کی اور اِن لفظوں کا املا وہی لکھا ہے جو اُس زمانے میں رائج تھا، یعنی "پہونچا"، "پہونچی"، "پہونچا ہوا" - اُس زمانے کے اندازِ نگارش کے مطابق واو اُن کے یہاں بھی موجود ہے -

آصفیہ میں پہنچ، پہنچا، پہنچنا، پہنچانا، پہنچی؛ اِن سب کو صحیح طور پر واو کے بغیر لکھا گیا ہے -

مُٹاپا - بُڑھاپا - منگیلا - مُجلاہا -

اُبھار - پُھندر - اُدھار -

دُلھن ۔ دُلھا یا دُولھا :

دُلھن عام طور سے واو کے بغیر بولا جاتا ہے ۔ اِس کو "دُلہن" بھی سُنا گیا ہے ۔ دُلھا کو مع واو اور واو کے بغیر، دونوں طرح سُنا جاتا ہے ۔ تحریر کا بھی یہی حال ہے ۔ نظم میں بھی اِس کو دونوں طرح استعمال کیا گیا ہے ۔

نور میں اِن لفظوں کو جس طرح لکھا گیا ہے، اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موٴلف کے نزدیک دُلھن واو کے بغیر، اور دولھا مع واو ہے ۔ چلن بھی اِسی کا زیادہ ہے ۔ آصفیہ میں بھی "دولھن" کے ذیل میں لکھا گیا ہے : "دیکھو دُلھن" ، اِس سے بھی اِسی پہلو کی تائید ہوتی ہے ۔ دولھا کو دونوں طرح لکھا گیا ہے، مگر اِس کے زیادہ متعلقات کو "دولھا" ہی کے ذیل میں لکھا گیا ہے ۔

مختصر یہ کہ "دلھن" کو واو کے بغیر لکھا جائے گا اور "دولھا" کو مع واو لکھا جائے گا ۔ ضرورتِ شعری کی بات دوسری ہے[1] ۔

---

[1] بول اُٹھیں، بن کے ڈومنیاں، ساری قمریاں   صاحب! ہمیں دلائیے دولھا دُلھن کی بیل

انشا (کلامِ انشا، ص ۱۳۲)

نہ دیکھ دولھا کو، ساس نندوں کے آگے، گھونگٹ اٹھا اٹھا کر
نئی نویلی دُلھن ہے بچّی! ابھی تو دو چار دن حیا کر

(رجان صاحب، ماخوذ از آئینۂ بلاغت طبعِ اول، ص ۱۱)

دُلھن کو بہ اشباعِ واو "دولھن" بروزنِ فعلن بھی نظم کیا گیا ہے، مگر یہ محض ضرورتِ شعری ہے، جیسے انشا کے اِس شعر میں :

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۵ پر)

چُغا : آصفیہ میں اِس کو "چوغہ" لکھا گیا ہے ۔ یہ وہی اعراب بالحروف والی بات ہے اور آخر میں الف کی جگہ ہائے مختفی ، غلط العوام کا کرشمہ ہے ۔ نور میں صحیح طور پر صراحت کے ساتھ لکھا گیا ہے : " چغا ۔ ت میں چوغہ ۔ واو غیر ملفوظ ہے "۔

جُڑواں : آصفیہ میں " جوڑواں " ۔ نور میں صحیح طور پر " جُڑواں " لکھا گیا ہے ۔

جُتائی ۔ جُتاؤ : آصفیہ میں " جوتاؤ ، بہ واوِ معدولہ " ہے ۔ جتائی اِس میں موجود نہیں ۔ واو پُرانی لکھاوٹ کی نشانی ہے اور بس ۔ نور میں دونوں لفظ صحیح طور پر لکھے ہوئے ہیں ، یعنی : جُتائی اور جُتاؤ ۔

اُنٹنی ۔ اُنچائی : پہلا لفظ اُنٹنی ، آصفیہ میں " اونٹنی " ہے مع واو ۔ حالاں کہ تلفظ میں واو نہیں ۔ نور میں واو کے بغیر ہی ہے ۔ اُنچائی دونوں لُغات میں واو کے بغیر ہے ۔

دُہائی : آصفیہ میں " دُہائی یا دوہائی " لکھا ہوا ہے ، مگر اِس کے مرکبات کو واو کے بغیر لکھا گیا ہے ، جیسے : دُہائی پھرنا ، دُہائی دینا ، دہائی ہے ۔

باجی کی باس میں جو رچی اک چنے کی باس ۔۔۔ تو ٹھیک ٹھیک ہوگئی دولھن پینے کی باس

(کلامِ انشا ، ص ۴۱۵)

ہاں " دولھا " کی ایک صورت " دولہ " بھی ملتی ہے ، جیسے میر کے اِس شعر میں :

کد خدا ہونے کو چلا دولہ ۔۔۔ یاں و گوپال عظم سے جوں شہ

(کلیاتِ میر ، مرتبہ آسی ، ص ۱۰۸۶)

مگر عام طور پر مستعمل لفظ " دولھا " ہے ۔

نور میں پہلے " دوہائی بروزنِ خدائی "۔ اِس کے ذیل میں جو عبارت ہے اور مرکبات ہیں، اُن میں کہیں " دوہائی " اور کہیں " دُہائی "۔ اِس کے بعد " دُہائی " لکھ کر لکھا ہے: " دیکھو دوہائی "۔ اِس طرح یہ ظاہر ہے یہ لفظ مع واو مرجّح ٹھہرا۔ مولّف اِس کو مانتے ہیں کہ یہ لفظ " خدائی " کے وزن پر ہے اور پھر بھی " دوہائی " لکھتے ہیں۔

اب اِس لفظ کی صرف ایک صورت " دُہائی " (بغیر واو کے) صحیح ہے۔

دُلار۔ دُلارا۔ دُلاری: نور میں اِسی طرح ہے (واو کے بغیر)۔ آصفیہ میں پہلے دلار، دلارا، دلاری۔ مگر " دال مع واو " کی فصل میں " دولار، دولارا، دولاری " بھی لکھے گئے ہیں، اگرچہ اُن کے آگے یہ بھی لکھا گیا ہے: " دیکھو دلار "۔ " دیکھو دلارا "۔ " دیکھو دلاری "۔

اِن سب لفظوں میں واو بالکل زائد ہے اور قدیم طرزِ کتابت کی یادگار ہے۔ اِن لفظوں کی صحیح صورت واو کے بغیر ہے۔

دُدھیل: آصفیہ میں " دُدھیل " اور " دودھیل " دونوں ہیں، ترجیح یا صراحت کے بغیر۔ نور میں " دودھیل " کے آگے یہ بھی لکھا ہوا ہے: " واو غیر ملفوظ "۔ جب واو غیر ملفوظ ہے تو لکھنے کی کیا ضرورت۔ یہاں وہی صورت ہے جیسے لوہا کی رعایت سے کچھ لوگ " لوہار " لکھتے ہیں، یہ سمجھنے کے باوجود کہ واو غیر ملفوظ ہے؛ اِسی طرح دودھ کی رعایت سے " دودھیل " فرض کر لیا گیا۔

اِس کا املا " دُدھیل " (واو کے بغیر) صحیح ہے۔

دُہرا۔ دُہری۔ دُہرانا: نور میں اِسی طرح اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ آصفیہ میں " دوہرا "، " دوہرانا "، " دوہرا تہرا " مع واو۔ دوہرا کے ذیل میں

یہ مثالیہ شعر لکھا ہے:

"بل بے شوخی، دیکھتے ہیں جب مرا قدِ دوتا
ہنس کے کہتے ہیں، بدن کیا اِن کا دوہرا ہوگیا"

شعر میں "دُہرا" بروزنِ فعلن ہی آیا ہے، پھر بھی اِس کو "دوہرا" لکھا گیا ہے۔ آگے چل کر "ذال مع ہ" کی فصل میں "دُہرا" بھی لکھا گیا ہے، مگر اِس کے اور مشتقات کو یہاں نہیں لکھا گیا۔ اِس لیے ترجیح کا پہلو دوہرا مع واو کے حصے میں آتا ہے اور یہ کسی طرح ٹھیک نہیں۔
یہ سب لفظ صرف واو بغیر لکھے جائیں گے۔

دُلائی: نور میں "دُلائی"۔ آصفیہ میں پہلے "دُلائی"۔ پھر "دولائی" لکھ کر لکھا گیا ہے: "دیکھو دُلائی"۔ نظم و نثر دونوں میں یہ لفظ واو کے بغیر ہی مستعمل ہے اور اِس کا یہی ایک املا ماننا چاہیے۔ اصل میں یہ لفظ مرکّب ہے، پہلا جُز "دو" ہے، مگر واو تلفّظ و تحریر دونوں سے خارج ہوچکا ہے۔

گُہار۔ گہار لڑنا۔ کوّا گہار۔ نور و آصفیہ میں اِس کو دونوں طرح لکھا گیا ہے (گہار۔ گوہار) مگر نور میں "گوہار" کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا گیا ہے: "واو غیر ملفوظ ہے"۔ اِس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ واو تلفّظ میں نہیں آتا مگر تحریر میں آتا ہے۔ نور میں سنداً یہ دو شعر لکھے گئے ہیں:

ہجومِ غم پہ کیا حسرتوں نے ہنگامہ ہمارے دل کی طرف غیب سے گُہار آئی

خدائے یکتا معیں ہے ہردم، پھنکیت ہیں مشرکیں تو کیا غم
گُہار بھی اُن سے جو کریں ہم وہ ہیں مُوحّد اک انگ ہوکر

اِن دونوں شعروں میں یہ لفظ واؤ کے بغیر لکھا ہوا ہے۔ اِس لفظ کو اب قطعاً واؤ کے بغیر لکھنا چاہیے۔

گوئیاں: آصفیہ میں صرف اِسی طرح (گوئیاں)۔ نور میں بھی اِسی طرح، مگر اِس صراحت کے ساتھ: "واؤ غیر ملفوظ"۔ مثال میں جانؔ صاحب کا یہ شعر لکھا گیا ہے:

"اِک دم نہ یاد بھولے گی مرزا تراب کی
گوئیاں! یہ عشق خاک میں مجھ کو ملائے گا"

اِس شعر میں بھی، اور اِس کے علاوہ اور اشعار اور بول چال میں بھی یہ لفظ واؤ اور ہمزہ کے بغیر ہی مستعمل ہے۔ خود صاحبِ نور نے "واو غیر ملفوظ" کی صراحت کی ہے، پھر اِس کو مع واؤ لکھنا کچھ ضرور نہیں۔ "گوئیاں" واؤ اور ہمزہ کے اضافے کے ساتھ، اِس لفظ کا پُرانا طرزِ کتابت ہے۔ اب اِس کو سادہ طور پر، واؤ اور ہمزہ کے بغیر، گُیّاں لکھنا چاہیے۔

گھیاں: نور میں لکھا ہے: "گھوئیاں، ایک قسم کی ترکاری۔ اردیاں"۔ پھر اِس کے بعد "گھیاں" لکھ کر لکھا ہے: "دیکھو گھوئیاں"۔ مطلب یہ نکلا کہ صحیح لفظ "گھوئیاں" ہے۔

آصفیہ میں اِس کا املا "گھُئیّاں" ملتا ہے۔

عام طور پر "گھُیّاں" بولا جاتا ہے اور اِسی کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔

ٹُیاں: آصفیہ میں ایک جگہ "ٹُیاں"، اور "ٹُیاں طوطا" ہے اور اِسی کو آگے "ٹُئیّاں" بھی لکھا گیا ہے۔ نور میں "ٹوِیاں تلفظ ٹُیاں" لکھا ہوا ہے۔

جیساکہ صاحبِ نور نے لکھا ہے ، اِس کا تلفظ "مُنیاں" کیا جاتا ہے ؛ اِس لیے اِس کو کسی اور طرح لکھنا ٹھیک نہیں ۔ اِس کا املا "مُنیاں"[1] مانا جائے گا۔

گونیا : اِس کا تلفظ عام طور سے "گُنیا" کیا جاتا ہے ۔ یہ معماروں کے استعمال کی چیز ہے اور وہ اِسی طرح بولتے ہیں ۔ نور میں اِس کو مع واو اور بغیرِ واو ، دونوں طرح لکھا گیا ہے (گُنیا ۔ گونیا) ۔ البتہ آصفیہ میں صرف "گُنیا" ہے ، اور یہی ٹھیک ہے ۔

پوربیا : آصفیہ و نور میں اِسی طرح ۔ دونوں میں ر پر زبر اور ب پر جزم لگایا گیا ہے (پورَبْیا) ۔ مگر استعمال میں "پُربیا" ، "پُرَبْیا" اور "پُربیے" ، "پُرَبیے" ہے ۔ داغ کا شعر ہے :

بلا میں آئی رعیّت ، غضب میں شہر آیا   یہ پُربیے نہیں آئے ، خدا کا قہر آیا

اگر یہ لفظ کہیں بہ اشباعِ نظم ہو ، اُس صورت میں تو ضرور اِس کو مع واو لکھا جائے گا ، اور یہ ضرورتِ شعری کا نتیجہ ہوگا ۔ ویسے اِن لفظوں کا املا واو کے بغیر صحیح ہوگا ۔

اودھم : صاحبِ نور نے اِس کو واو کے بغیر لکھا ہے اور صراحت بھی کر دی ہے : "پہلے اودھم ، واو معروف کے ساتھ تھا ، اب واو کم بولا جاتا ہے" اور مثال میں یہ دو شعر لکھے ہیں :

---

[1] کسی مزاح نگار شاعر کا شعر ہے :

وہ اپنے چھوٹے بھیّا کو بھی اپنے ساتھ لائے ہیں
کسے ترجیح دوں میں اب لبیڑی اور مُنیاں میں

شور ہے قلقلِ مینا کا ، چلو آؤ پیو
مُغ بچوں نے بھی مچا رکھی ہے کیا کیا اودھم
(داغ)

جائیں کیا سیر کو ہم ، باغ میں کیا رکھا ہے
واں اُدھم نالۂ بلبل نے مچا رکھا ہے

اربابِ دہلی میں سے بیش تر واوِ معروف کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ آصفیہ میں "اودھم" اور "اودھمی" لکھے ہوئے ہیں۔ سائل دہلوی نے، احسن مارہروی کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"اودھم کے متعلق میں اپنا مطلع حاضر کرتا ہوں اور یہ مطلع اُس غزل کا ہے جو حضرت اُستادِ مرحوم کے ملاحظے سے گزری ہوئی ہے:

وہ کرتے رہے دل لگی دیر تک
شبِ وصل اودھم مچی دیر تک

اِس مطلعے کے موزوں پڑھے جانے میں، آپ کے تمام مطالب حاصل ہو جائیں گے۔ تذکیر و تانیث و اشباع، کسی بات کی کسر نہ رہے گی"۔

(نقوش۔ مکاتیب نمبر، جلدِ اول، ص ۳۹۲)

مگر اب یہ لفظ واو کے بغیر ہی بولا جاتا ہے۔ نظم کی ضرورت سے قطعِ نظر کرتے ہوئے، عام طور پر اُدھم اور اُدھمی لکھنا چاہیے۔

گومڑ، گومڑا، گمڑا۔ گوکھرو، گُکھرو: گومڑ تو مع واو ہے۔ گمڑا اور گومڑا، دونوں مستعمل ہیں۔ یہی صورت گکھرو اور گوکھرو کی ہے۔ نظم میں عموماً "گوکھرو" ملتا ہے اور بول چال میں واو کے بغیر ہے۔ املا میں

---

[1] جیسے:

گوکھرو، لہر، بنت، ڈانک، ستاروں کے سمیت
اور اک پہنچے گی زربفتِ نمودار کی گیند
انشا (کلامِ انشا، ص ۷۶)

یہی بات ملحوظ رکھی جائے گی کہ اگر مع واو نظم ہوں تو مع واو لکھے جائیں گے، ورنہ واو کے بغیر۔

گُلائی، گولائی: دونوں لفظ مستعمل ہیں، اور املا میں، استعمال کے مطابق، اختلافِ نگارش رہے گا۔ بہ ہر صورت، گوکھرو اور گکھرو (وغیرہ) کی طرح، اِن لفظوں کے بھی دونوں املا صحیح مانے جائیں گے۔ البتہ "گُلاوٹ"، واو کے بغیر لکھا جائے گا۔ جیسے:

اے واہ رے بالیدگی اور چمپئی رنگت یہ گات، یہ سج دھج
اور جامۂ شبنم کی یہ چولی کی پھنساوٹ بازو کی گُلاوٹ
(انشا)

مونھ: یہ مُنہ کا پُرانا املا ہے اور اب متروک ہے۔ اب صرف "مُنہ" لکھا جائے گا۔

(۲)

(الف)

بہت سے مرکبات ایسے ہیں جن کا پہلا ٹکڑا "دو" ہے۔ اِن میں خالص فارسی مرکبات بھی ہیں اور مہنّد مرکبات بھی ہیں، اُن کو اردو مرکبات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِن میں سے بعض مرکبات میں واو کا تلفظ نسبتاً واضح طور پر ہوتا ہے، جیسے: دو دلا، دو رُخا۔ لیکن اکثر مرکبات میں واو کا تلفّظ نہ ہونے کے برابر ہے۔ شروع سے ایسے مرکب واو کے ساتھ ہی لکھے جاتے رہے ہیں۔ اِن کی یہ لکھاوٹ کسی اختلاف یا تفریق کے بغیر مروّج اور متعارف ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ٹھیک بھی ہے کہ اصل ترکیبی اجزا برقرار رہتے ہیں۔ فارسی میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

(حاشیہ ص ۲۶۲ پر)

رواج کے مطابق، اِن سب مرکّبات کو واو کے ساتھ ہی لکھا جائے گا۔
ایسے کچھ مرکّبات یہ ہیں:

دوآبہ، دوآتشہ، دوٹّانی، دوفصلا، دوبارہ، دوباز، دوپارہ، دوپلاّ،
دوپلّی، دوپلڑی، دوپہریا، دوپلکا، دوپٹّا، دوچار، دوچند، دوخصمی،
دودستی، دودلا، دودھارا، دودھاری، دوراہا، دورنگا، دورنگی،
دورویہ، دوسالہ، دوزانو، دوسوتی، دوعملی، دوشالہ، دوطرفہ، دوشاخہ،
دوگاڑا، دوگانہ، دوگانا، دولتّی، دومحلا، دوبالا، دومنزلا، دومُنہا،
دوورقی، دوہتڑ، دوہتّی، دوشنبہ، دوسار، دوہاجن، دوہاجو۔

اوپر جو لفظ لکھے گئے ہیں اُن میں "دوپٹّا" بھی ہے۔ اِس لفظ کے املا میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے: ایک تو یہ کہ اِس کے آخر میں الف ہے، اِس کو "دوپٹّہ" لکھنا صحیح نہیں۔ دوسرے یہ کہ اِس میں پہلا حرف دال ہے، اِس کو دال کے بجاے ڈال سے لکھنا بھی غلط ہے (ڈوپٹّا)۔ اِس میں بھی پہلا جز "دو" ہے۔ ہاں بول چال میں "روپٹّا" بھی سُننے میں آیا ہے اور "رُپٹیا" بھی سُنا گیا ہے۔ بہ ہر حال یہ بول چال کی زبان ہے۔ تحریر میں "دوپٹّا" ہی ہے۔

اِس فہرست کا ایک اور لفظ ہے: دوگنا۔ اصلاً اِس لفظ میں واو ہے، کیوں کہ پہلا ٹکڑا "دو" ہے۔ بولنے میں یہ لفظ دو طرح آتا ہے: ایک تو اصل کے مطابق، جس میں گاف پر پیش ہے، واو کبھی ملفوظ ہوتا ہے،

لہ "برخی از کلمات در فارسی بدو وجہ کتابت و یک وجہ قرائت میشود مانند دو چار کہ هم با واو و هم بی واو نوشتہ و مینویسند، و برخی بدو وجہ هم نوشتہ و هم خوانده

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۳ پر)

کبھی غیر ملفوظ۔ ان صورتوں میں اِس کا املا مع واو ہوگا: دوگُنا، دوگُنی۔
کبھی یہ لفظ بہ حذفِ واو اور بہ سکونِ گاف بھی استعمال کیا جاتا ہے،
یعنی: دُگنا، تِگنا کی طرح۔ یہی صورت دُگنی اور دُگنے کی ہے۔ بل کہ
عام طور پر لوگ واو کے بغیر ہی استعمال کرتے ہیں۔ جب یہ لفظ اِس طرح
استعمال کیے جائیں گے تو اِن کا املا واو کے بغیر ہوگا، یعنی: دُگنا، دُگنی
دُگنے۔ یہ استثنا ہے۔

(ب) رومال:

یہ دو لفظوں سے مرکب ہے: رو (چہرہ)، مال (مالیدن کا امر)۔ یہ لفظ نظم
میں عام طور پر بہ اظہارِ واو استعمال کیا گیا ہے، جیسے یہ شعر:

درویشوں سے نفرت نہ کرو اوڑھ کے رومال ایسا نہ ہو رومال سے رومال بدل جائے

دولتِ فقر ہوا اے منعمو اور کملی ہو فخر کیا ہے جو دوشالہ ہوا، رومال ہوا

یہ دونوں شعر نور سے ماخوذ ہیں۔ بول چال میں یہ اِس طرح بھی آتا ہے کہ
واو غیر ملفوظ رہتا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ مع واو ہی لکھا جاتا ہے، نظم میں
استعمال بھی عام طور پر مع واو ہوتا ہے، اِس لیے اِس کو اِس کے متعارف املا

میشود مانند چہل و چہار کہ چِل و چار ہم میگویند و مینویسند در نوشتن اینگونہ کلمات
بہتر آنست کہ رعایت اصل را منظور دارند و بوجہی کہ اصل کلمہ را نشان میدہد،
بنویسند"۔ (املای فارسی۔ لغت نامۂ دہخدا۔ ص ۱۰۰)

حال کے سکّے کو گر ماضی کا سکّہ دیکھ لے سو روپے کے نوٹ کے منہ پر ذواتی تھوک دے
(جوش ملیح آبادی)

کے مطابق ہی صحیح ماننا چاہیے : (رومال) ۔ ضمنی طور پر اصل کی رعایت بھی ملحوظ رہے گی ۔

اِسی کی ایک صورت رومالی ہے ۔ اس کے کئی معنی ہیں ۔ "رومالی سوئیاں" تو بہتوں نے کھائی ہوں گی ۔ اِس کا متعارف املا بھی مع واو ہے ، اور اِس کو بھی بدلنا غیر مناسب ہوگا ۔

ہاں ، پاجامے کی " رومالی " کو اگر " رُمالی " بنا لیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا ۔ اِس خاص معنی میں یہ لفظ واوِ غیر ملفوظ کے ساتھ ہی مستعمل ہے اور بڑی حد تک اصل سے بے تعلق بھی ہو چکا ہے ، نیز معنوی امتیاز کے اعتبار سے بھی یہ مناسب ہوگا ۔ گویا اب یہ لفظ ہی مختلف ہو گیا ۔

اب اِن لفظوں کی صورت ہوئی : رومال ۔ رومالی (مختلف معانی میں) ۔ رُمالی (پاجامے کی) ۔

(ج) ہندوستان ۔ ہندستان ۔ ہندستانی :

ہندوستان میں اصلاً واو ہے ۔ نظم میں بہ اظہارِ واو بہ کثرت استعمال کیا گیا ہے ۔ یہ مصرع تو شاید سبھی نے سنا ہوگا : اے ہمالہ ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں ۔ بول چال میں عموماً واو کے بغیر آتا ہے ۔ اِس لفظ میں واو کو لکھنے نہ لکھنے کی بحث پہلے بھی ہو چکی ہے ۔ الہ آباد کی ہندستانی اکیڈمی اور اُس کا تماہی رسالہ ہندستانی ، واو کے بغیر ہی لکھے جاتے تھے ۔ اِس کو واو کے بغیر " ہندستان " لکھنا چاہیے ۔ یہی صورت " ہندستانی " کی ہوگی ۔ نظم کی ضرورت سے جب یہ بہ اشباع آئے گا تو اِس کا املا خود بہ خود " ہندوستان " ہو جائے گا ۔

(د) عُمَرؓ ۔ عمرو :

صاحبِ آصفیہ نے لکھا ہے :

"عمرو، ایک فرضی نام ہے، جیسے زید، بکر، خالد، ولید وغیرہ - چوں کہ حضرت عمرؓ کے نام اور اِس نام میں بہ حالتِ تحریر فرق و امتیاز نہیں رہتا تھا، اور عُمر بالضّم کو، عَمرو بالفتح پڑھ دینا، سوءِ ادبی میں داخل تھا، لہٰذا ایک زائد واو کے ساتھ اِس نام کے لکھنے کی رسم ڈالی گئی"۔

یہ نہایت مناسب بات تھی اور اب بھی اِس کو اُسی طرح برقرار رہنا چاہیے۔ فارسی میں بھی[1] یہی کہا گیا ہے۔

یہ لفظ اصلاً بہ سکونِ میم ہے۔ فارسی میں اِس کو اِسی طرح استعمال کیا گیا ہے، مگر اردو میں بہ فتحِ میم بھی استعمال کیا گیا ہے۔ پہلے اِس کی صراحت کردی جائے کہ داستانِ امیر حمزہ کے معروف کردار عمرو عیّار کا نام بہ سکونِ میم اور مع واو ہے (عَمْرو)۔ اور یہ بھی اِسی لیے کہ یہ حضرت عُمرؓ کے نام سے الگ رہے۔ اردو میں اِس عَمْرو کو "عَمَر" بھی نظم کیا گیا ہے، جیسے :

دُرِ معنی سے مرا صفحہ، لقا کی داڑھی غمِ ہستی سے مرا سینہ، عَمَر کی زنبیل

غالب (نسخۂ عرشی ص ۱۲۴)

ایک کوڑی کو نہ لیجیے، جو فروشندہ کہے ہے بکاؤ، کوئی زنبیلِ عَمرو لیتا ہے

انشا (کلامِ انشا ص ۲۶۲)

---

[1] "از حروفی کہ در عربی نوشتہ می شود و خواندہ نمیشود، واوی است کہ بآخر "عمرو" میافزایند تا از "عمر" ممتاز باشد، درخطِ فارسی ہم این تفاوت را بنا باصل احتراز از التباس باید منظور داشت و "عمرو" را در ہمہ جا با واو نوشت"۔

(املای فارسی۔ لغت نامۂ دہخدا، جلد چہارم ص ۱۰۳)

یہ ویسا ہی تصرّف ہے جیسے مومنؔ نے شِمر کو شَمَر نظم کیا ہے : مُحب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا ــــ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ اِس کو عَمرو کہا جائے یا عَمْرو ، ہر صورت میں واو لکھا جائے گا ۔ اَن جانے پن یا کم احتیاطی کے سبب واو چھوٹ جایا کرتا ہے ۔

" زید عمرو " لکھا جائے ، " عمرو عیار " لکھا جائے یا " عمرو زید " لکھا جائے ، ہر صورت میں واو لکھنے کا التزام کیا جائے ۔ " عمرو و زید " میں دو واو یک جا ہوں گے ، ایک اصل لفظ کا زائد جز ، اور ایک عطف کا ۔ جیسے سعدیؔ کا یہ شعر :

اے دلِ عشّاق بدامِ توصید ما بتو مشغول و تو با عمرو و زید

یا جیسے صباؔ کا یہ شعر :

شرابیوں کا بھلا عمرو و زید سے مطلب
ہماری بزم میں ہو حق ہے ، قیل قال نہیں

صباؔ کے دیوان غنچۂ آرزو (مطبوعۂ مطبعِ محمدی) میں اِس شعر میں صرف ایک واو چھپا ہوا ملتا ہے " عمرو زید " ۔ اگر یہاں عطف مانا جائے (اور اسی کا محل بھی ہے) ، تو اِس کو غلط الکاتب ماننا ہوگا ۔

(۵) بُل ہوس ، بُل عجب ، بُل فضول :

" بل ہوس " میں " بُل " فارسی کا کلمہ ہے ، " بہت " کے معنی میں ۔ صاحبِ فرہنگِ جہانگیری نے لکھا ہے ۔

" بل ، با اوّل مضموم بثانیِ زدہ ، دو معنی دارد : اول ، احمق .... دوم ، بمعنیِ بسیار آمدہ ۔ چنانچہ بلہوس ؛ بلکامہ ، بمعنیِ بسیار ہوس و بسیار کام بود " ۔

یہی بات برہانِ قاطع میں کہی گئی ہے ۔ اردو میں اسے " بوالہوس " بھی

لکھا جاتا ہے ۔ مرحوم اثر لکھنوی "بل ہوس" لکھا کرتے تھے ۔ اُنھوں نے فرہنگِ اثر میں اِس کی صراحت کی ہے ۔ بہ ہر طور ، اصلاً کلمۂ اوّل "بُل" ہے ، اور اِس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ، اِس لیے "بُل ہوس" اور "بُل عجب" ہی لکھنا چاہیے ۔

احمد بہمنیار نے "املای فارسی" میں "بُل ہوس" کی صحّت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ، وہ قابلِ توجہ ہے :

"یکی از تصرّفِ فارسیان در کلماتِ عربی این است کہ ہمزۂ "ابو" را از ابتدای کنیۂ عربی حذف میکنند ؛ ابوالحسن و ابوسعید را فی المثل ، بوالحسن و بوسعید میگویند و مینویسند ۔ و از اینجا جمعی از کلمات "بلہوس و بلعجب و بلفضول" ، باشتباہ افتادند و آنہا را مخفّفِ "ابوالہوس و ابوالعجب و ابوالفضول" پنداشتہ اند ، و در کتابت "بوالہوس و بوالعجب و بوالفضول" مینویسند ، غافل از اینکہ عرب "ابوالہوس و ابوالعجب و ابوالفضول" نگفتہ است ۔ و اگر ترکیبِ این سہ کلمہ عربی میبود ، در اثرِ نویسندگانِ دانشمندِ فارسی بصورتِ غیر مخفّف ہم دیدہ میشد ، چنانکہ بوالحسن و ابوالحسن و بوسعید و ابوسعید ہر دو دیدہ میشود ۔

و بہ ہر حال ، جزوِ اولِ این کلمات کہ "بل" باشد ، فارسی و اداتِ تکثیر ، و نظیر "بل" در کلماتِ "بلکامہ" (بسیار کام ، پُر مدعا) ، و "بلغاک" (غوغا و آشوبِ بسیار) و "بلغندہ" (بالای ہم نہادہ ، جمع کردہ ، فراہم آوردہ) است ۔ و باید بدونِ واو و الفِ زاید ، و چسپیدہ بکلمہ نوشتہ شود"۔

(لغت نامۂ دہخدا ۔ شمارۂ چہلم)

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اُس کی رو سے، اِن مرکبات کا پہلا جُز "بُل" ہے جو فارسی کا کلمہ ہے۔ صحیح بات یہی ہے، اور اِن کلمات کو واو کے بغیر لکھنا چاہیے، یعنی: بُل ہوس، بُل ہوسی، بُل عجب، بُل عجبی، بُل فضول۔

(۳)

(الف) واوِ معدولہ:

فارسی کے کچھ لفظوں میں واوِ معدولہ ہے۔ ایسے اکثر لفظ اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ اور اگر اِس واو کے بعد الف ہو، تو اُس کی آواز، الف کی آواز میں مخلوط ہو کر ایک خاص طرح نکلتی ہے، جیسے: خواب، خواجہ، خوان۔

اگر اِس کے بعد الف کے علاوہ کوئی اور حرف ہو تو واو تلفّظ میں نہیں آتا، جیسے: خود، خوش، خویش۔

ایسے لفظ جن میں واوِ معدولہ ہے، شروع سے اب تک مع واو لکھے جاتے رہے ہیں اور یہ اِن کا مروّج اور متعارف املا ہے، اِس لیے اب بھی اِن کو اِسی طرح مع واو لکھا جائے گا۔ جن لفظوں میں اِس واو کے بعد الف ہوتا ہے، اُن میں تو اِس واو کی آواز بھی ایک طرح سے شاملِ تلفّظ ہوتی ہے۔ جن مصدروں میں واوِ معدولہ ہے، اُن کے مشتقات میں بھی وہ برقرار رہے گا۔

ایسے لفظوں کی ایک نامکمل فہرست یہ ہے۔ اِس فہرست میں مفرد الفاظ کے ساتھ بعض مرکّبات اور مصادر کے ساتھ اُن کے بعض مشتقّات کو بھی شامل کر لیا گیا ہے:

خواب، خواب گاہ، خواب و خور، خواجہ، خواجہ تاش، خواجہ سرا، خواجگان، خواجو، خوار، خواری، خواستن، خواست گار، خواست گاری،

درخواست ، خدانخواستہ ، خواہش ، خواہ ، خواہاں ، خواہ مخواہ ، خواہی نخواہی ، دل خواہ ۔

تنخواہ ۔ استخوان ، خوان ، خوانچہ ، خوان سالار ، خوان پوش ، خواندن ، خواندہ ، نوشت وخواند ، خواندگی ، افسانہ خواں ، کتاب خواں ، خوردن ، خوردہ ، خورد بُرد ، خوردنی ، خورش ، خوراک ، خور و نوش ، برخوردار ، درخورد (لائق) ، درخور ۔

خود ، خودی ، بے خودی ، خود دار ، خود داری ، خود رفتہ ، خود سر ، خود ستائی ، خود نمائی ، خود کام ، خود شناسی ، خود بہ خود ، خود کاشت ، خود کُشی ، خود کار ۔

خوش ، خوشی ، خوشا ، خوش باش ، خوش بو ، خوش خوراک ، خوش فعلی ، خوش دامن ، خوش گو ، خوش گپیاں ، خوش نود ، خوش نودی ، خوش نما ، خوشامد ، خوشامدی ، خورشید ، خور ، ہفت خوان ، خوارزم ، خواہر ۔

خویش ، خویشی[1] ، بے خویش ، خویشتن ، بے خویشتن ، خویشاوند ۔

قیمتی کپڑے کی ایک قسم "کم خواب" بھی ہے ۔ اِس کے املا میں (فارسی میں بھی) اختلاف ہے ۔ بعض "کم خواب" کہتے ہیں اور کچھ "کم خاب" لکھتے

---

[1] "خویش" کے معنی ہیں : اپنا ۔ اور داماد کو بھی کہتے ہیں ۔ "خویشی" میں بھی یہ دونوں معنی پائے جاتے ہیں ۔ میرؔ کے اِس شعر میں دامادی کے معنی پائے جاتے ہیں ، شعر کے مخاطب حضرت علیؓ ہیں :

کوئی بے گانہ تری تقلید کیوں کر کر سکے   تھا تو ایسا جب پیمبر کی ہوا خویشی کا باب

(کلیات ، مرتبہ آسی ، ص ۸۰ د)

ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیے غیاث اور بہارِ عجم)۔ اردو میں اِس لفظ کو دونوں طرح لکھا جاتا ہے (کمخاب، کمخواب)۔ فرہنگِ اصطلاحاتِ پیشہ وراں میں اِس کا املا "کمخاب" ملتا ہے ــــ اختلاف سے قطعِ نظر کے، اردو میں "کم خواب" کو مرجح سمجھنا چاہیے۔

وجہِ ترجیح کی وضاحت ضروری ہے: جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، اِس لفظ کا ایک املا "کمخواب" بھی رہا ہے۔ یہ کہا گیا ہے کہ اِس میں "خواب"، "روئیں" کے معنی میں ہے۔ کم خواب: کم روئیں والا۔ "خواب" کے متعارف معنی "نیند" ہیں۔ نظم میں جگہ جگہ ایہام کے طور پر "کم خواب" نظم کیا گیا ہے۔ ایسے مقامات پر "خواب" سے متعلق مناسبات اِس طرح آئے ہیں کہ اِس میں کسی طرح کا شک نہیں رہتا۔

ٹک تکیے پہ سر دھر کے رہے سو، تو لگائی ۔۔۔ صاحب نے ہمیں مسندِ کمخواب کی چوری

(کلامِ انشا، ص ۲۴۳)

قصہ خواں! نیند جو تھوڑی سی بھی آجائے، تو دوں ۔۔۔ جوڑی سونے کی کڑوں کی تجھے، کمخواب پہ رکھ

(کلامِ انشا، ص ۱۹۰)

یاں سرِ پُرشور، بے خوابی سے، تھا دیوار جو ۔۔۔ واں وہ فرقِ ناز، محوِ بالشِ کم خواب تھا

(غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۴۵)

اِس طرح اِس کا بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ "کم خواب" خاص طور پر استعمال میں رہا ہے اور ایسی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ اِس استعمال سے استناد نہ کیا جائے اور یہ کہ اِس کے مقابلے میں دوسری صورت "کمخاب" کو مرجح قرار دیا جائے۔

ایک اور وضاحت:

خورشید کو فارسی میں مع واو اور بغیرِ واو، دونوں طرح لکھا گیا ہے، مگر اکثر کتابوں میں خورشید ہی ملتا ہے (مثلاً بہارِ عجم)۔ جو لوگ "خرشید"

(واو کے بغیر) لکھتے ہیں، وہ بھی اِس کے مخفف کو خُر کے بجاے خور لکھنا بہتر سمجھتے ہیں، اِس خیال سے کہ "خر" سے التباس نہ ہو۔

اردو میں یہ لفظ عام طور سے مع واو لکھا جاتا ہے (خورشید)، پہلے بھی اِسی طرح لکھا جاتا تھا، اِس لیے اُردو میں اِسے کسی اختلاف کے بغیر خورشید ماننا چاہیے۔ اِس کا مخفف "خور" ہوگا، جیسے:

کچھ نظر میں سمائے، تو دیکھے پنجۂ خور کو، اُس کا دست نگر

(مومن)

اے دیوِ سفیدِ سحری، کاش تو توڑے اک مُکّے سے خور کے، شبِ دیجور کی گردن

انشا (کلامِ انشا ص ۱۶۱)

(ب) کچھ لفظوں میں اصلاً واوِ معدولہ موجود نہیں، مگر ایسے دوسرے لفظوں کے قیاس پر یہ فرض کرلیا گیا کہ اِن میں بھی واوِ معدولہ ہے اور اِس قیاس کی بڑی) وجہ غالباً یہ ہوئی کہ حرف خ اِن سب میں مشترک ہے، جو واوِ معدولہ سے پہلے ہوتا ہے —— ایسے لفظوں کو اصل کے مطابق صحیح طور پر واو کے بغیر لکھنا چاہیے۔ ایسے لفظ درجِ ذیل ہیں:

خُرد: چھوٹا، بزرگ کی ضد۔ اِس لفظ میں واوِ معدولہ شامل نہیں، مگر اِس کو "خورد" لکھ دیا جایا کرتا ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ خوردن کا ماضی ہوگا: خورد، جس کے معنی ہیں: کھایا۔ اور بزرگ کی ضد ہوگا: خُرد۔ خُردسال کے معنی ہوئے: کم عمر۔ اور سال خورد یا سال خوردہ کے معنی ہوئے: بڑی عمر والا۔ پُرانا۔ لُغات میں صراحت بھی کردی گئی ہے کہ خُرد کو واوِ معدولہ کے ساتھ لکھنا صحیح نہیں (بہارِ عجم۔ غیاث۔ نور)

خُردہ: ریزہ، ٹکڑا، ریزگاری، عیب۔

خرسند ۔ خرم ۔

برخاست :

درخواست کے قیاس پر " برخاست " کو " برخواست " لکھنا غلط ہے ۔ خواستن، جس کے معنی ہیں : چاہنا ، اِس میں واوِ معدولہ ہے ، اور خاستن ایک دوسرا مصدر ہے ، جس کے معنی ہیں : اُٹھنا ۔ اِسی سے " برخاست " بنا ہے ، جیسے : محفل برخاست ہوگئی یا فلاں شخص کو برخاست کردیا گیا ، یعنی نوکری سے الگ کردیا گیا ۔

اِن الفاظ کو اِن کے بعض متعلقات کے ساتھ درج کیا جاتا ہے :

خُرد : خُردی ، خُرد و بزرگ ، خُرد و کلاں ، خُرد سال ، خُردِ سالی ، خُرد بین ، خُردنوکا ۔

خُردہ : خُردہ فروش (تھوک فروش کی ضد) ، خردہ فروشی ، روپیا خُردہ کرنا یا کرانا ، روپے کا خُردہ (ریز گاری) ۔

خُردہ : (عیب) : خُردۂ زر[1] ، خُردۂ گل[2] ، خُردہ گیر ، خُردہ گیری ، خُردہ بیں[3] ۔

خُرسند ۔ خُرسندی ، خُرّم ، خُرّمی ، خوش و خُرّم ۔

برخاست ، برخاستگی ۔

خانساماں : آصفیہ میں اِس کو " خوان ساماں " بھی لکھا گیا ہے ۔ گویا مولّف نے پہلے جُز کو ایک جگہ " خان " مانا ہے اور اِس لحاظ سے " خ مع الف " کی فصل میں پہلے " خانساماں " لکھا ہے ، اور دوسری جگہ اِس کو " خوان " فرض کرکے ،

---

[1] لکھیے اُس ہاتھ کو جو پنجۂ مہر ۔ ذرّہ پا دے رواج خردۂ زر (مومن)

[2] واہ قسمت کہ نہ دے خردۂ گل بھی گل چیں ۔ زمزمے مرغ گلستاں کے سے کھینچوں میں ہزار (مومن)

[3] عیب جو خُردہ بیں کا یہ احوال ۔ دوپہر کو فلک نہ آئے نظر (مومن)

"خوان سامان" لکھا ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ لفظ "خان سامان" ہے، میر سامان کی طرح۔ صاحبِ بہارِ عجم نے لکھا ہے :

"خانساماں، بہ اظہارِ نون، از عالم خاندان۔ دمی نواند کہ ترکیبِ اضافی باشد بہ معنی صاحبِ سامان، بر قیاسِ میر سامان۔ محاورۂ بعضے فارسی زبان دانانِ ہندوستانست"۔

نور میں صرف "خان ساماں" ہے اور یہی صحیح ہے۔

(ج) خُزادہ : آصفیہ میں یہ لفظ موجود نہیں، البتہ اصل لفظ "خواجہ زادہ" موجود ہے۔ نور میں اِس کو خُزادہ اور خوزادہ، دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ عبارت یہ ہے :

"خزادہ (ف خواجہ زادہ کا مخفّف) مذکر، صاحب زادہ، سردار۔ انیسؔ :
اسوار ہوا جب وہ دو عالم کا خوزادہ۔ اِس کا املا دونوں طرح، یعنی خزادہ اور خوزادہ، صحیح ہے، لیکن واو سے لکھنا بہتر ہے"۔

مرزا غالبؔ نے ایک خط میں "خُزادہ" کو "خداوندزادہ" کا مخفّف بتایا ہے :

"خزادہ"، "خداوندزادہ" کا مخفّف ہے؛ لیکن فارسی عربی نہیں، اُردو کا روزمرّہ تھا۔ "خُزادہ" اور "خُزادی"، مرادفِ "صاحب زادہ" اور "صاحب زادی" ہے، مگر فی زماننا متروک ہے"۔

(بہ نام یوسف علی خاں عزیزؔ۔ خطوطِ غالب، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم، ص ۱۶۲)

اگر اِس کو "خداوندزادہ" کا مخفّف مان لیا جائے، اُس صورت میں تو "و" بے محل ہوگا۔ بہ ہر صورت، مناسب یہی ہوگا کہ اِس کا املا واو کے بغیر "خُزادہ" اور "خُزادی" مانا جائے۔ یہ لفظ اب واقعتاً استعمال میں نہیں آتے، اِس لیے کچھ ایسی پریشانی کی ضرورت نہیں۔

(د) اولوالعزم ، اولوالعزمی ، اولوالامر ، اولوالابصار (یا اولی الابصار) اولی اجنحہ :
یہ عربی کلمات ، اردو میں استعمال کیے گئے ہیں ۔ اولوالعزم اور اولوالعزمی تو بہ کثرت استعمال کیے گئے ہیں ۔ بعض مثالیں :

کو صولتِ اسکندر و کو حشمتِ دارا — اے صاحبِ فطرت
پڑھ "فاعتبروا یا اولی الابصار" کا آیا — تا ہو تجھے عبرت

انشا (کلامِ انشا ، ص ۵۸)

مرغانِ اولی اجنحہ ، مانندِ کبوتر — کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

انشا (کلامِ انشا ، ص ۱۷۱)

جا کے جنت میں بھی ، رہتی ہے ترے در کی ہوس — ورنہ مرغانِ اولی اجنحہ کیوں ہوں طیّار

مومن (قصیدہ در منقبتِ حضرتِ عثمانؓ)

کیوں اولوالعزم کو نہ بھاوے یہ مرزم — یعنی ہے اُس کی رزم بھی ، اک بزم

انشا (کلامِ انشا ، ص ۳۴۵)

" اولوالابصار پہلے حُسنِ ترکیبِ الفاظ دیکھیں ، پھر معانی کے نون پانی کا مزا چکھیں "۔ غالب (قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ ، مرتبۂ قاضی عبدالودود صاحب ، ص ۲۳۱)

اِن کلمات کے پہلے جُز "اولو" یا "اولی" میں واو غیر ملفوظ ہے ، مگر اِس کا لکھنا ضروری ہے ۔ اِن کلمات کی حیثیت عربی سے منقول اجزا کی سی ہے ، اِس لیے اِن کو ، عربی رسمِ کتابت کے مطابق لکھا جائے گا ۔

ذو : عربی کا ایک سابقہ ہے : ذو ۔ جیسے :- ذو فنون ۔ ذو معنیین ۔ ذو معنی ۔ جب اِس کے بعد "الف لام" آئے گا تو واو غیر ملفوظ ہو جائے گا ، مگر لکھا ضرور جائے گا ۔ اُردو میں زیادہ مستعمل لفظ یہ ہیں ۔

ذوالفقار ، ذوالجلال ، ذوالقرنین ، ذوالمنن ، ذوالجناح ، ذوالنورین ، ذوالنون ۔

جُزو، جُز: جُز، جس کے معنی ہیں: ٹکڑا، عربی الاصل لفظ ہے۔ عربی میں "جزء" مع ہمزہ ہے۔ فارسی میں آکر یہ "جُز" رہ گیا۔ عربی کے بہت سے لفظ جن کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہے، فارسی میں ہمزہ کے بغیر مستعمل ہیں۔ یہ تعزیس ہے۔ "جُزئی" اور "جزئیات" میں ہمزہ اپنی جگہ پر واپس آجاتا ہے۔
فارسی ہی میں اِس لفظ کے آخر میں ایک واو کا اضافہ ہوگیا اور طریقہ یہ قرار پایا کہ جب یہ لفظ مضاف ہو، اُس وقت اِس کو "جزو" مع واو لکھا جائے، جیسے جزوِ بدن۔ "جُزِ بدن" بھی لکھا جاسکتا ہے، مگر مع واو افصح ہے۔ اور بہ حالتِ مفرد، دونوں طرح استعمال کیا جائے۔
اردو میں یہ لفظ دونوں طرح مستعمل ہے اور یہاں بھی یہی رہا ہے کہ مضاف ہونے کی صورت میں اِس کو مع واو لکھا جاتا ہے۔ اضافت کے بغیر، "جز" کو فصیح سمجھا جاتا ہے، اگرچہ "جزو" کے استعمال کی مثالیں[1] بھی ملتی ہیں۔
اِس لفظ کے استعمال میں یہی طریقہ برقرار رہنا چاہیے کہ اضافت کے سوا، اور مقامات پر اِس کو واو کے بغیر استعمال کیا جائے جیسے: کتاب کے دو جُز یا جُز دان۔ اضافت کی صورت میں مع واو لکھا جائے۔ جیسے: جزوِ بدن۔
جز، جس کے معنی ہیں: سوا، وہ فارسی کا لفظ ہے اور اصلاً ہمزہ کے بغیر ہے۔ اور اِسی طرح مستعمل بھی ہے، جیسے: ع: جز ترے کچھ نظر نہیں

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے ایک مضمون میں اِس لفظ پر مفصل بحث کی ہے تفصیل کے لیے اُس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ مضمون کا عنوان ہے: "جُز اور جزو کی بحث"، مشمولہ رسالۂ معیار (پٹنہ) جولائی ۱۹۳۶ء۔

آتا۔ اِن دونوں لفظوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔
آصفیہ میں "جز" بہ معنی ٹکڑا اور "جز" بہ معنی سوا؛ دونوں کو فارسی لکھا گیا ہے۔ اور "ٹکڑا" کے معنی میں اِس کو "جزو" کا مخفف بتایا گیا ہے۔ دونوں باتیں درست نہیں۔
آصفیہ میں "جزو" کے متعلقات میں جزو دان، جزو رس، جزو رسی، جزوِ لایتجزّیٰ اور جزوی لکھے گئے ہیں۔ مگر اردو میں جُز دان، جُز رس، جُز رسی، جُز بندی، فصیح ہیں اور اِن کو اِسی طرح لکھنا چاہیے۔
"کُل" کے متضاد کے طور پر "جُزئی"[1] اور ویسے "جُزوی" لکھا جائے گا۔ جیسے: "جزوی طور پر یہ بات ٹھیک ہے"۔ "جزدیات" کے بجائے، ہر جگہ "جُزئیات" لکھنا فصیح سمجھا جائے گا۔
پھُوار: آصفیہ میں اِس ایک لفظ کے چار املا نظر آتے ہیں: "پھُآر" "پھوآر"۔ "پھُہار"۔ "پھوہار"۔ اِس کے سوا، ایک جگہ تو "پھوآر یا پھُہار" لکھ کر لکھا ہے: "دیکھو پھُہار"۔ اِس سے بہ ظاہر یہ مطلب

---

[1] جیسے:

عاقبت ہر جزو کو ملنا ہے اپنے کُل کے ساتھ — پھر وہیں جاوے گی آخر، ہے جہاں کی میدنی

انشا (کلامِ انشا، ص ۲۴۲)

اِس کے برخلاف:

جُزمرتبۂ کُل کو حاصل کرے ہے آخر — اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

میر (کلیات، مرتبۂ آسی ص ۲۳)

[2] کُلّیات ایک طرف، تجھ سے کسی ڈھب سے کبھی — امرِ جُزئی میں بھی کچھ بندے کی امداد نہ ہو

انشا (کلامِ انشا، ص ۱۸۰)

نکلتا ہے کہ اصل لفظ "پُھہار" ہوگا ۔ مگر دوسری جگہ "پھوہار یا پھوآر" لکھ کر لکھا ہے : "دیکھو پھآر" ۔ یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرجح لفظ "پُھآر" ہوگا ۔
نور میں پہلے "پُھوار" ملتا ہے ۔ اِس کے آگے قوسین میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے : "بیش تر فصحا کی زبانوں پر "پھوہار" ہے " ۔ پھر آگے چل کر "پھوہار" کے ذیل میں لکھا ہے : "دیکھو پھوار" ۔ اِس سے بہ ظاہر مطلب یہ نکلا کہ اصل لفظ "پُھوار" ہے ۔ یہ پریشان کن صورت ہے ۔
نفس میں اِس لفظ کا صرف ایک املا "پُھہار" ملتا ہے ۔
اِن اختلافات سے قطعِ نظر کرکے ، اب اِس کا ایک املا "پھوار" ماننا چاہیے ۔ گفتگو اور تحریر دونوں میں اب یہ لفظ اِسی طرح مستعمل ہے ۔
فوّارے کی ایک عوامی صورت "پُھوارا" کو بھی مع واو لکھا جائے گا ۔ یہ بھی اِسی طرح مستعمل ہے ۔
چُھوارا : آصفیہ میں اِس کو دو طرح لکھا گیا ہے : "چھوارا یا چُھہارا" ۔ مگر "چھوارا بیر" میں اِس لفظ کو مع واو لکھا گیا ہے ۔ بالکل یہی صورت نور میں ہے ۔
اِس لفظ کو اب بھی عموماً مع واو لکھا جاتا ہے ، اِس لیے اب اِس لفظ کا مرجح املا مع واو "چُھوارا" مان لینا چاہیے ۔
روپیا ۔ روپے : روپیا کا تلفّظ کئی طرح کیا جاتا ہے ، مگر اِس کو لکھا ایک ہی طرح جاتا ہے ۔ اِس کا پُرانا املا "روپیہ" ہے ۔ جمع کی صورت میں اِس کو "روپیے" ، "روپے" اور "رُپے" لکھا جاتا ہے ۔ جمع کی صورت میں اِس کا عمومی تلفّظ "روپے" (واو غیر ملفوظ) ہے ، اور اِس کو اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔ رشک کا شعر ہے :

کب مجھے رکھے گی مفلس ہمتِ شاہِ جنوں
دولت اِن داغوں کی، اشرفیاں، روپے ہو جائے گی

نئے، نئے قافیے ہیں (مقدمہ نفس اللغۃ)

"روپیا پیسا" اور "روپے پیسے" بول چال میں آتا ہے۔ "روپے" میں واو غیر ملفوظ رہتا ہے، مگر لکھا جائے گا اور یہ محض اس لیے کہ یہ لفظ اپنی اصل "روپا" سے بالکل بے تعلق نہ ہو جائے۔ مگر اہم بات یہ بھی ہے کہ اب تک اس کو مع واو لکھا جاتا رہا ہے اور یہ اس کی متعارف اور مانوس صورت ہے اور ضمنی بات یہ کہ اصل سے قریب بھی ہے۔ ان دو وجوہ کی بنا پر، اِن لفظوں کا املا روپیا اور روپے مانا جائے گا۔
مگر "رُپہلا" اور "رُپہلی" کو، سنہرا اور سنہری کی طرح واو کے بغیر لکھنا چاہیے۔

لہ دیوِ سفیدِ صبح کے سر پر نظر پڑی
آج اک رُپہلی اور سنہری کرن کی شاخ
(انشا، کلامِ انشا، ص ۵۰)

خیر انشا کی جو چاہو تو پلا دو دھو کر
اُس کے بازو کا وہ ننھا سا رُپہلا تعویذ
(انشا، کلامِ انشا، ص ۸۰)

ہ

ہ کی تین قسمیں ہیں : ہائے ملفوظ ۔ ہائے مخلوط ۔ ہائے مختفی ۔
ہائے ملفوظ اُس ہ کو کہیں گے ، جس کو مستقل حرف کی طرح استعمال کیا جائے ، اور واضح طور پر تلفظ میں آئے ۔ جیسے : ہوا ، بہت ، جگہ ، راہ ۔
ہائے مخلوط ، مستقل حرف کی حیثیت نہیں رکھتی ، یہ کسی حرف کے ترکیبی جُز کے طور پر ، شاملِ حرف ہوتی ہے ۔ اُس مخلوط حرف کو آپ مطرد حرف مانیں یا مرکب آواز سے تعبیر کریں ؛ ہائے مخلوط کی آواز اُس حرف کی آواز کا جُز ، اور بھاری پیوند ہوتی ہے ، جیسے : گھر ، اُدھار ، راکھ ۔
ہائے مختفی ، مستقل حرف کی حیثیت نہیں رکھتی ۔ اِس کی اپنی کوئی آواز نہیں ، یہ اپنے سے پہلے والے حرف کو اِس طرح سہارا دیتی ہے کہ اُس کی حرکت قائم رہ سکے ۔ اِس طرح ، اِس کی حیثیت علامت کی

سی ہے ، جیسے : خانہ ، وقفہ ۔

ہائے ملفوظ

(۱)

تحریر میں ہائے ملفوظ کی چار شکلیں مستعمل ہیں : جب یہ لفظ کے شروع میں آئے گی تو ب کے شوشے (۲) کی طرح لکھی جائے گی اور علامت کے طور پر ایک مزید شوشہ اُس کے نیچے لگایا جائے گا ، اِس طرح جیسے ب کے نیچے نقطہ لگایا جاتا ہے ۔ (۲) اِس شوشے کو عوامی زبان میں " لٹکن " بھی کہتے ہیں ، جیسے : ہَوا ، ہبوط ، ہے ، ہمزہ ، ہاتھ ۔ اِس شوشے کے بغیر ، اِس ہ کو مکمل نہیں مانا جا سکتا ۔

جب یہ لفظ کے بیچ میں آئے گی تو اِس کی شکل بدل جائے گی ، اِس شکل کو " کھنی دار " کہتے ہیں ۔ جیسے : بہت ، بہو ، بہتا ، مہا دیو ۔ نیچے والا شوشہ ، اِس صورت کا بھی لازمی جُز ہے ۔

جب یہ آخر میں آئے گی اور اِس سے پہلے ایسا حرف ہوگا جس سے ملا کر اِس کو لکھا جا سکتا ہے ؛ اُس صورت میں اِس کو ملا کر لکھا جائے گا اور اب اِس کی وہی صورت ہوگی جو ہائے مختفی کی ہوتی ہے ، مگر نیچے والا شوشہ یہاں بھی لازماً آئے گا ، اور یہی شوشہ اِس کی پہچان ہوگا کہ یہاں ہائے مختفی نہیں ، ہائے ملفوظ ہے ۔ جیسے : جگہ ، یہ ، کہ ، مُنہ ۔

ہ کی مکمل شکل ہمیشہ لفظ کے آخر میں آئے گی اور اُس صورت میں جب کہ اِس کو منفصل لکھا جائے ، جیسے : راہ ، ماہ ۔ آخرِ لفظ میں ہ کو اگر ملا کر لکھا جائے گا تو اُس کی شکل ، ہائے مختفی کی طرح ہوگی ، مگر اُس کے نیچے جو شوشہ بنایا جائے گا ،

نہ اِس بات کی نشانی ہوگا کہ یہاں ہاے مختفی نہیں، بل کہ ہاے ملفوظ ہے۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایسے مقامات پر یہ شوشہ نہیں لگایا جائے گا، تو ہاے ملفوظ، ہاے مختفی میں بدل جائے گی اور اِس کا غلط ہونا ظاہر ہے۔ جیسے: ایک لفظ ہے: مَہ، یہ ماہ کا مخفف ہے، اِس میں ہاے ملفوظ ہے۔ ایک اور لفظ ہے: خامہ۔ اِس کا آخری جُز بھی "مہ" ہے، مگر اِس میں ہاے مختفی ہے، جو محض میم کی حرکت کو سہارا دیے ہوئے ہے؛ اب اگر ماہ کے مخفف "مہ" کو "مہ" لکھا جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط لکھاوٹ ہوگی۔

آخرِ لفظ میں آنے والی اِس ہاے ملفوظِ متصل کی کتابت میں یہ غلطی اکثر دیکھنے میں آتی رہتی ہے کہ اِس کے ایک لازمی جُز، یعنی نیچے والے شوشے کو غائب کر دیا جاتا ہے۔ یہ بات خاص طور پر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اِس ہاے ملفوظ کے نیچے یہ شوشہ لازماً بڑھایا جائے گا — جیسے غالب کا یہ مصرع:

مَہِ فلک آئنہ ایجادِ کفِ گوہر بار

اِسی کو اگر یوں لکھا جائے: نہ فلک آئنہ...، تو لفظ ہی مشکوک ہو جائے گا۔ جب تک اِس کے نیچے یہ شوشہ "ہ" نہیں آئے گا، اُس وقت تک اِس کو "مَہ" پڑھا ہی نہیں جا سکتا۔

غالب ہی کا مصرع ہے: "نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں"۔ شروع ہی میں تین لفظ یک جا ہیں، جن میں سے دو لفظوں "نہ" اور "کہ" میں ہاے مختفی ہے، اور "کہہ" میں ہاے ملفوظ ہے۔ یہ "کہنا" کا امر ہے۔ صرف نیچے والا شوشہ اِن الفاظ میں امتیاز کو باقی رکھتا ہے۔

"کہ" اور لفظ ہے، جسے "کاف بیانیہ" کہتے ہیں، اور "کہ" دوسرا لفظ ہوگیا، جو "کہنا" کا امرِ حاضر ہے۔

اِسی طرح ایک اور غلط نگاری عام ہے، اور اِس کی اصلاح بہت ضروری ہے:

جیساکہ ابھی لکھا جاچکا ہے، جب ہائے ملفوظ بیچ میں کہیں پر آتی ہے، تو عموماً "کہنی دار" لکھی جاتی ہے، جیسے: بہت۔ مگر ہوا یہ کہ بعض لفظ، جن کے آخر میں ہائے ملفوظ ساکن ہے، اُن میں، اُس ہ کو "کہنی دار" لکھا جانے لگا۔ اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُس کے بعد ایک ہائے مختفی کا اضافہ کیا جائے، کیوں کہ اِس اضافے کے بغیر، کہنی دار ہ کیسے لکھی جاسکتی تھی۔ مثال کے طور پر اِن لفظوں کو دیکھیے: یہ، جگہ، مہ، تہ۔ اِن لفظوں کی صحیح لکھاوٹ یہی ہے، مگر اِن کو "یہہ"، "جگہہ"، "مہہ"، "تہہ" لکھا جانے لگا۔

پہلا لفظ ہے: یہؔ۔ یہ دو حرفی لفظ ہے، اِس میں پہلا حرف "ی" ہے، اور دوسرا حرف "ہ" ہے۔ اِس کو "یہہ" لکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ دو حرفی لفظ، تین حرفی بن گیا: ایک "ی" بیچ میں ایک ہائے ملفوظ اور آخر میں ہائے مختفی۔ لفظ ہی مسخ ہوگیا۔

ؔ ہائے ملفوظ ہو یا ہائے مختفی، اِن دونوں کی کتابت میں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جب یہ آخرِ لفظ میں ملا کر لکھی جائیں گی تو حرفِ ماقبل کے لیے کوئی شوشہ نہیں بنایا جائے گا، جیسے: یہ، مہ، تُہ، منہ، جگہ، گُنہ، کُنہ، تہ، نہ، مے خانہ، پیمانہ، مستانہ۔ (بقیہ حاشیہ ص ۲۸۳ پر)

یا جیسے : کہنا ، سہنا ، بہنا ؛ یہ تین مصدر ہیں ۔ اِن کے امر ہوئے : کہ ، سہ ، بہ ۔ پہلا مصدر ہے : کہنا ، یہ "کہ" (مادۂ فعل) اور علامتِ مصدر "نا" سے مرکّب ہے ۔ مصدر کی علامت "نا" نکل گئی ، تو "کہ" رہ جائے گا ۔ یہ دو حرفی لفظ ہے ، جو کؔ اور ہؔ سے مرکّب ہے ۔ اب اگر اس کو "کہہ" لکھا جائے گا تو یہ بالکل غلط املا ہوگا ، کیوں کہ اِس صورت میں اِس کو "کَہِ" کے بجائے ، "کَہَہْ" یا "کَہِہْ" پڑھنا پڑے گا ، یا پھر اِس کو "کھ" ماننا ہوگا ، اور یہ سب صورتیں اصل لفظ سے بے تعلق ہیں ۔ یہی حال باقی مصدروں کا ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ غلط نویسی ، خوش نویسی کی پیدا کی ہوئی ہے ۔ خطّاطوں نے ایسے مختصر دو حرفی لفظوں میں ، کہنی دار ہؔ کا اضافہ ، محض خوش نمائی کے نقطۂ نظر سے روا رکھا تھا ، مگر اِس حُسن کاری سے ، املا چوپٹ ہوگیا ۔ چوں کہ خطّاطی میں کتابت کا حُسن اصل چیز ہے ، املا ثانوی چیز ہے ؛ اِس لیے اِس طرف توجہ بھی نہیں کی گئی ۔

یہ غلط نگاری ، ایسے لفظوں میں خاص طور پر نظر آتی ہے جن میں آخر کی ہائے ملفوظ سے پہلے یؔ ہوتی ہے ، جیسے : تشبیہ ، توجیہ ، تنبیہ ۔ اِن کو نہایت درجہ بے احتیاطی کے ساتھ ، "تشبیہہ" ، "توجیہہ" ، "تنبیہہ" لکھا جانے لگا ۔ جب کہ یہ لکھاوٹ بالکل غلط ہے ۔

"یہ" ، کو "یہہ" لکھنا ٹھیک نہیں ہوگا ۔ یہ اندازِ کتابت ، ہائے متّصل کی اِس صورت کے لیے خاص ہے ۔ البتہ ہائے مختفی سے قبل اگر ہائے ملفوظ ہوگی ، تب شوشہ لازماً آئے گا ، جیسے : امروہہ ۔ یہاں شوشہ نہ لگانا غلط ہوگا ؛ اور یہ استثنا ہے ۔

اِس کے برخلاف، یہ بھی ہوا کہ جن لفظوں کے آخر میں واقعتاً دو "ہ" ہیں، ایک ملفوظ اور دوسری مختفی، اُن میں ایک "ہ" لکھنے پر قناعت کرلی جاتی ہے، جیسے: "قہقہ" اور "جبہ" ۔ کہ اِن کا صحیح املا "قہقہہ" اور "جُبہہ" ہے۔

اب قاعدہ یہ ہوا کہ:

(الف) ہاے ملفوظ جب ملاکر لکھی جائے گی (شروع، درمیان یا آخر میں) اِس صورت میں اُس کے نیچے ایک شوشہ لازماً بنایا جائے گا۔ یہ شوشہ (،) ہاے ملفوظِ متصل کا جُز ہوگا، اور اِس شوشے کے بغیر، یہ حرف مکمّل نہیں ہوگا۔ جیسے:

یہ، بُہ، مِہ، توبہ، توجہ، وجہ، سیہ، روبہ، جگہ، مُنبہ، منہ، کہ وہ، گہ (کوہ کا مخفف)، کہ (کہنا کا امر)، تہ، بہ (بہنا کا امر) سہ (سہنا کا امر)، شبہ، مُشتبہ، شبہ، والہ، دیہ، ریہ، بارگہ، کارگہ، فربہ، روبہ، فواکہ، مُشابہ، کُنہ، فقہ، مُتنبہ۔

ملہ: یک عرق آینہ بر جبہۂ سائل باندھا (غالب)

ملہ: شبہہ ہو جاتا ہے پردے سے تری آواز کا (آتش)

ملہ نظم میں اِس کا اندازہ زیادہ واضح طور پر ہوتا ہے، جیسے

ملہ: سنگ یہ کارگہِ ربطِ نزاکت ہے کہ ہے (غالب)

ملہ: کُشتۂ افعیِ زلفِ سیہِ شیریں کو (")

ملہ: غنچۂ لالہ، سیہ مستِ جوانی ہے ہنوز (")

عَلَیہ ، اِلٰہ ، فقیہہ ، شبیہہ ، وجیہہ ، اِلَیہ ، توجیہہ ، تشبیہہ ، تنزیہہ
تنبیہہ ، کریہہ ، سفیہہ ۔
کہنا ، بہت ، سہنا ، بہنا ، بہو ۔
ہو ، ہے ، ہیں ، ہُوا ، ہُوا ، ہوس ۔

(ب) جن لفظوں کے آخر میں ہائے ملفوظِ ساکن ہے ، ایسے لفظوں کو لکھتے وقت ، اِس کا خیال رکھا جائے گا کہ اصل کے مطابق ، صرف ایک ہ لکھی جائے ۔ غلط نگاری نے ؛ ایسے لفظوں میں جو دو ہ لکھنے کی عادت ڈال دی ہے ، (آخر میں ہائے مختفی اور اس سے پہلے کہنی دار ہ) اُس کی تکرار نہ ہو ۔ جیسے :

یٹہ ، جگہ ، مہ ، تہ ، بہ ، سـہ ، کہ ، گہ ، اِلٰہ ، توجہ ،
توبہ ، مُنہ ۔

(ج) جن لفظوں کے آخر میں ، اصل کے مطابق ، دو ہ ہیں ، اِس طرح کہ آخر میں ہائے مختفی ہے اور اُس سے پہلے ہائے ملفوظِ متحرک ہے ؛ اُن کو صحیح طور پر لکھا جائے گا ۔ ایسے لفظ کچھ زیادہ نہیں ، مثلاً :

له ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے ، عرشی صاحب کی کتاب دستور الفصاحت سے متعلق ایک خط میں لکھا ہے (یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے) :

"یہ" ، "گہ" وغیرہ میں بھی صرف ایک ہی ہ ہے ، مگر ٹائپ چھاپنے والے ، اِن میں ایک کی جگہ دو ہ کر دیتے ہیں ۔ ان صورتوں میں ایک ہی ہ ہونا چاہیے "۔ (مکتوبِ ڈاکٹر صدیقی ، بہ نام مولانا امتیاز علی خاں عرشی

نقوش ، خطوط نمبر ، جلد سوم)

قہقہہ ، شبیہہ ، شُبہہ ، جبہہ ، مشافہہ ، فاکہہ ، مواجہہ ۔

اس کو یوں بھی دیکھیے کہ کچھ لفظوں میں ، آخر کی ہائے مختفی سے پہلے ، حائے حُطّی (ح) ہے ؛ ایسے لفظوں میں دونوں حروف لکھے جاتے ہیں ، جیسے :

فاتحہ ، مصافحہ ، سُبحہ ، فتحہ ، سانحہ ، رشحہ ۔

اسی طرح " شیہہ " وغیرہ لکھے جائیں گے ۔

ہاں " ہ " کے جوڑ کے سلسلے میں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے : لفظ کے آخر میں " ہ " ہو (مختفی یا ملفوظ) اور اُس سے پہلے کوئی اور حرف ہو ، جیسے یہ ، نہ ، پہ وغیرہ ؛ تو اِن صورتوں میں آخری " ہ " سے پہلے کوئی شوشہ نہیں آتا ۔ یعنی دونوں حرف (آخری " ہ " ، اور اُس کا حرفِ ماقبل) درمیانی شوشے کے بغیر لکھے جاتے ہیں ۔ لیکن حرفِ اوّل جب " ہ " ہوگا (یعنی دو " ہ " یک جا ہوں گی) تو جوڑ کا شوشہ ضرور آئے گا ، جیسے : امروہہ ، درماہہ وغیرہ ۔ یہاں درمیانی شوشہ ضروری ہے ۔

کچھ متفرق لفظ :

ہائل : اِس کے معنی ہیں : ہول ناک ، شدید ۔ ڈرانے والا (غیاث) ۔

---

[1] کھڑی جھانکتی تھی وہی پری ، نہیں شبہہ اس میں تو واقعی
وہ جو عطرِ فتنہ کی باس تھی ، سو رچی ہوئی ہے کواڑ میں (انشا ، کلامِ انشا ، ص ۱۲۳)

[2] جو شخص جبہہ سا ہو خدمت میں یاں تمھاری کیوں کر نہ پھر وہ دیکھے لاہوت کا تماشا
(انشا ، کلامِ انشا ، ص ۳۰)

" ہائل " کی جگہ " حائل " یا اِس کے برعکس ، استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ "حائل" کے معنی ہیں : بیچ میں آنے والا ، روک ۔ جیسے : پردۂ حائل ۔ " واقعۂ ہائلہ " کے معنی ہوں گے : ہول ناک واقعہ ۔ یہ مرکب نثری عبارتوں میں آتا رہتا ہے ۔

ہامی : " ہامی بھرنا " کے معنی ہیں : اقرار کرنا ، ہاں کرنا ۔ اِس معنی میں " حامی " نہیں لکھنا چاہیے ۔" حامی " کے معنی ہیں : محافظ ، مددگار ۔ یہ عربی کا لفظ ہے ، یہاں اِس کا کیا کام ۔" ہامی " اردو کا لفظ ہے ۔ نور میں " حامی " کے ذیل میں صراحت کردی گئی ہے کہ : " حاے حُطّی سے ، بہ معنیِ اقرار ، غلط ہے "۔

" ہامی " اور " حامی " کے املا میں اِس معنوی امتیاز کو ملحوظ رکھنا چاہیے ۔ مثلاً اِس شعر میں " ہامی " آئے گا :

کیوں مرے قتل پہ ہامی کوئی جلّاد بھرے
آہ جب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے

اِس لفظ کا ایک اور املا بھی دیکھا گیا ہے ۔ خطوطِ غالب ، مرتبہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کا مقدمہ ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم کا لکھا ہوا ہے ، اُس میں یہ جملہ بھی ہے : " مجھے ہامیں بھرتے ہی بنی " (ص ب) اِس کتاب کے چھاپے کی نگرانی ، ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے خود کی تھی ، اور آخر میں غلط نامہ بھی شامل کیا تھا ، اِس اہتمام کے پیشِ نظر یہ ماننا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ " ہامیں " خود صدیقی صاحب کا پسندیدہ املا ہے ۔ شاید اُنھوں نے اِس لفظ کو " ہاں مَیں " کی بدلی ہوئی صورت مانا ہوگا ۔

چوں کہ "حامی" اور "ہامی" دونوں لفظوں کے آخر میں اب تک مسلسل و متواتر یاے معروف لکھی جاتی رہی ہے؛ اِس لیے اِس لفظ کا یہی مروّج املا "ہامی" اختیار کرنا چاہیے۔

تہس نہس: بعض لوگ "تہس نحس" اور بعضے "تحس نحس" لکھا کرتے ہیں۔ لفظ "نحس" مغالطہ دیتا ہے۔ اِس کا صحیح املا "تہس نہس" ہے۔ مولّفِ آصفیہ نے وضاحت بھی کردی ہے۔

"بعض لوگ اِس کا املا "تحس نحس" لکھتے ہیں اور یہ محض غلط ہے، کیوں کہ عربی میں "تحس" بہ معنیِ غم زدہ، اور "نحس" نامبارک آیا ہے، جس سے یہاں کچھ تعلق نہیں۔..... اہلِ لکھنؤ "تھس مس" بولتے ہیں"۔

آخری جملے میں بہ ظاہر کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ "تھس مس" کوئی لفظ ہی نہیں۔ نور میں "تَہس نَہِس" (ت پر زبر اور ہ پر زیر) لکھ کر، صرف یہ لکھا گیا ہے کہ: "اہلِ لکھنؤ "تَہِس نَہِس" بولتے ہیں"۔ یعنی فرق صرف ہ کے زیر اور سکون کا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ عورتیں اِس مرکّب کو ہ کے زیر کے ساتھ بولتی ہیں۔

ہرج، ہرجا، ہرجانا: ہرج اور حرج، دو مختلف لفظ ہیں۔ حرج کے معنی ہیں: "تنگی و تنگ شدن و گناہ ... حرام شدنِ چیزے و جاے تنگ و درختانِ بسیار" (منتخب) اور ہرج کے معنی ہیں: آشوب، فتنہ، .... بسیار گفتن و در آمیختن" وغیرہ۔ ہوا یہ ہے کہ عام استعمال میں یہ دونوں لفظ گڈمڈ ہوکے رہ گئے ہیں۔ ہاں، ایک بات یہ بھی ہے کہ "حرج" جس کے معنی: تنگی و سختی ہیں، اِن میں نقصان، ضرر، تضیعِ اوقات، دیر، کمی، اردو کا اضافہ ہیں؛ اِس لیے اِن معانی میں، آصفیہ

میں اِس کو "اردو" لکھا گیا ہے۔

اردو میں "ہرجا" اور "ہرجانا" دو نئے لفظ بن گئے ہیں، جن کو لُغات اور عام تحریر، دونوں میں ہ سے لکھا جاتا ہے۔ "ہرجا خرچا" بھی مستعمل ہے۔ داغ کے ایک خط کا عکس، مثنوی فریادِ داغ مرتبۂ تمکین کاظمی مرحوم میں شائع ہوا ہے، اُس میں "ہرجِ کار منظور نہیں" لکھا ہوا ہے۔ شوق نیموی نے لکھا ہے:

"ہرج بہ معنیِ معروف، بعضوں کے نزدیک بہ ہاے ہوّز و سکونِ راے مہملہ غلط ہے۔ حرج بہ حاے حطّی و فتحِ راے مہملہ چاہیے۔ مگر میرے نزدیک، اُردو میں جہاں ترکیبِ فارسی نہ ہو، "ہرج" کچھ مضائقہ نہیں"۔ (اصلاح)

اردو میں اب اِن دونوں لفظوں: حرج، ہرج، میں معنوی اختلاف کے لحاظ سے امتیاز ختم ہو کے رہ گیا ہے۔ اب ایک صورت ہرج کو اختیار کرلیا جانا چاہیے۔ اِس ترجیح کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہرجا، ہرجانا، ہرج مرج، ہرجا خرچا؛ اِن سب کو ہاے ہوّز سے لکھا جاتا ہے۔ اب اِن سب لفظوں کی صورت نویسی اِس طرح ہوگی:

ہرج، ہرج مرج، ہرجِ کار، ہرج ہونا، ہرجا، ہرجا خرچا، ہرجانا۔

اثر لکھنوی نے بھی یہی راے ظاہر کی تھی:

"اردو میں ہرج بہ معنیِ نقصان، خرابی، مستعمل ہے۔ میری راے ہے کہ اسی کو رکھیے، اور "حرج" سے دست بردار ہو جیے"۔

(فرہنگِ اثر ص ۲۳۸)

ہاں، "ہرجانا" کو الف کے بجاے، ہاے مختفی کے ساتھ "ہرجانہ" لکھنا

ٹھیک نہیں ہوگا۔

ہَونَق : (احمق ۔ باولا ۔ جانگلو) آصفیہ میں اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے، مگر نور میں اِس کو تین فصلوں میں تین طرح لکھا گیا ہے : "حونق" "ہبنق"، "ہونق"۔ مولّف نے "حونق" کے ذیل میں یہ صراحت بھی کردی ہے کہ : "یہ لفظ عربی "ہبنق" سے بگاڑا ہوا ہے"۔ "ہبنق" سے بگڑ کر "ہونق" بنے گا، نہ کہ "حونق"۔

اردو میں اِس لفظ کا صحیح املا "ہَونَق" ہوگا۔ اردو میں اِسی طرح مستعمل ہے، اور اِسی طرح مانا جائے گا۔

سہی : آصفیہ میں اِس لفظ کو دو طرح لکھا گیا ہے : "سہی یا سئی" ـــ صرف کرخنداری تلفظ میں "سئی" آتا ہے، ورنہ عام و خاص سب "سہی" بولتے اور لکھتے ہیں، اور اِس کا یہی املا صحیح مانا جائے گا۔

گِرِہست، گرستی : آصفیہ میں "گرہست"، "گرہستن"، "گرہستی" مع ہائے ہوّز لکھے گئے ہیں۔ اِس کے برخلاف نور میں "گرست"، "گرستی"، "گھرگرست"، یعنی بغیر ہائے ہوّز لکھے گئے ہیں۔

اثر لکھنوی مرحوم نے، نور کے اِس اندراج (گرست) پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"لکھنؤ میں بہ اضافۂ ہائے ہوّز "گرہست" کہتے ہیں" (فرہنگِ اثر)

اور سند میں جانؔ صاحب کا یہ شعر لکھا ہے :

اُس گھر کو اجی بھاڑ سے بدتر ہوں سمجھتی
جس گھر میں گرہستی کا اٹالا نہیں رہتا

اِس شعر میں "گرہستی"، بہ ہائے ہوّز ہرگز نہیں۔ یا تو اِس کو "گرھستی"

بہ ہائے مخلوط مانیے، یا پھر یہ مانیے کہ "گرستی" ہے۔
نور میں "گھر گرستی" کے ذیل میں منیر (شکوہ آبادی) کا یہ شعر لکھا ہے:

چوتھی چالوں سے جب ہوئی فرصت
آگئی گھر گرستی کی نوبت

اس شعر میں "گھر گرستی" آتا ہے، نہ کہ "گھر گرہستی"۔
حقیقت یہ ہے کہ صاحبانِ آصفیہ و فرہنگِ اثر نے ہندی کی پیروی کی ہے۔ اردو میں یہ لفظ ہ یا ھ کے بغیر ہی مستعمل ہیں، اور اب اِن کا یہی املا صحیح مانا جائے گا، یعنی:

گرست، گرستی، گرستن، گھر گرست، گھر گرستن، گھر گرستی،

جوش ملیح آبادی کی ایک نظم "ماتمِ آزادی" کے ایک بند کی ٹیپ کا یہ شعر یاد آگیا:

گھر اپنا گھر گرست ہی خود موسنے لگی
حد ہے، زبانِ دیو، پری چوسنے لگی

یہاں بھی "گھر گرست" ہے، نہ کہ "گھر گرہست"۔
تھاہ۔ اتھاہ: دونوں لفظوں کے آخر میں ہائے ملفوظ ہے۔ تلفظ میں لفظ "تھاہ" کبھی کبھی اِس طرح آتا ہے کہ آخری ہ کی آواز بہت دب جاتی ہے، مگر اِن دونوں لفظوں کو لکھا جائے گا مع ہائے ہوز یعنی: تھاہ اور اتھاہ۔
کھوہ: یہی صورت اِس لفظ کی بھی ہے۔ اِس کے آخر میں ہائے ملفوظ ہے۔ بول چال میں ہائے ہوز کی آواز بے طرح دب جاتی ہے، مگر ساقط نہیں ہوتی۔ اِس لفظ کو بھی مع ہائے ہوز لکھا جائے گا، یعنی:

کھوہ ۔ پہاڑ کی کھوہ ۔ آصفیہ میں اِس لفظ کو صحیح طور پر "کھوہ" لکھا گیا ہے۔ نور میں "کھو" اور "کھوہ" دونوں املا ملتے ہیں ۔ صرف "کھو" مصدر "کھونا" کا امرِ حاضر ہے اور بس ۔ صحیح املا وہی ہے جس کو آصفیہ میں لکھا گیا ہے ۔

اُفّوہ : اِس لفظ کی بھی یہی صورت ہے کہ بول چال میں ہائے ملفوظ کی آواز دب کر نکلتی ہے ، جس سے بعض وقت شبہہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ لفظ بغیرِ ہائے ہوّز ہے ۔ نور میں قدر کا یہ شعر سنداً لکھا گیا ہے اور اِس سے تلفّظ اور املا ، دونوں کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے :

ذرّوں میں ہے ٹھکانا ، نہ قطروں میں ہے پتا
اُفّوہ ! دیکھیے تو ذرا انتشارِ دل

بولا کسی طرح جائے ، لکھا جائے گا مع ہائے ہوز ، یعنی : اُفّوہ ۔

ٹھہرنا : متقدمین کے یہاں ، بل کہ متاخّرین کے دورِ اوّل تک اِس لفظ کے دو املا ملتے ہیں : ٹھہرنا ، ٹھیرنا ۔ نور میں اِس کو جس طرح لکھا گیا ہے ، اُس سے مترشّح ہوتا ہے کہ اِس لفظ میں جو اختلافِ املا ہے ، مولّف اُس کو دہلی و لکھنؤ سے مخصوص سمجھتے ہیں ۔ مولّف نے دہلی کا نام تو نہیں لیا ہے ، مگر "ٹھہرنا" (مع ہائے ہوّز) کے آگے "لکھنؤ" لکھ دیا ہے ، جس سے مطلب یہی نکلتا ہے ۔ یہ شعر بھی مثال میں لکھا ہے :

دروازے پہ دیووں کا تھا پہرا
بھجوا کے خبر ، وہ شحنہ ٹھہرا (گلزارِ نسیم)

مزید لکھا ہے کہ : "اِس کا امر ٹھہر ، بروزنِ سحر ہے "۔

مؤلّف کا یہ خیال کہ "ٹھہر" لکھنؤ سے مخصوص ہے، درست نہیں۔ شعراے دہلی نے اِس لفظ کو دونوں طرح استعمال کیا ہے، مثلاً:

اب تو اگلی سی طرح کا نہیں گہرا پردہ　　رہ گیا آپ میں اور ہم میں اکہرا پردہ[1]

گر پڑا، تھا جو دوشالہ بھی پڑا چلون پر　　ٹانگ جو تم نے دیا تھا، سو نہ ٹھہرا پردہ

انشا (کلامِ انشا، ص ۳۹)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں　　اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

حالی (دیوانِ حالی، اشاعتِ اول، ص ۱۰۹)

اِس کے برخلاف، بحر لکھنوی کے دیوان میں ایک غزل ہے، قافیہ و ردیف ہے: درم ٹھیرے، ہم ٹھیرے۔ دیوان (ریاض البحر) میں ردیف "ٹھیرے" چھپی ہوئی ہے۔ یہ کتابت کی غلطی نہیں، بحر نے بحر البیان میں لکھا ہے: "ٹھیرنا، بہ فتحِ ہاو یا مخلوط، از روانی باز ماندن"۔

اِس کے برخلاف، رشک نے نفس اللغۃ میں "ٹھہر" لکھا ہے (دیباچہ ص ۹)۔ ہاں آصفیہ میں اِس کو صرف مع ی لکھا گیا ہے: "ٹھیرنا، ٹھیرانا، ٹھیراو"۔

بعض لوگ اِس کا ایک اور املا "ٹہر" بھی لکھتے تھے۔ عرشی صاحب نے مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے:

"ٹھہرنا، دلّی میں "ٹہرنا" بولا جاتا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ میرزا صاحب ہمیشہ ایک ہ سے لکھتے ہیں۔ ناظم نے لکھا تھا:

---

[1] کلامِ انشا میں ردیف کو "پردا" لکھا گیا ہے اور اِس غزل کو الف کی ردیف میں رکھا گیا ہے۔ میں اِس کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ لفظ "پردہ" ہے، اِس لیے یہاں اِس کی پابندی کی گئی ہے۔

ع : جو آگئے ہو مرے گھر، تو کوئی دم ٹھیرو

میرزا صاحب نے اسے "ٹھہرو" بنا دیا ــ بیتاب کا شعر تھا :

کیسا مزہ دکھاتے ہیں ہم بھی ، تو ٹھیر جا
تقریریں کر کے اور یہ ناصح تو ہل گیا

اِس میں میرزا صاحب نے "ٹھہر تو جا" اصلاح[1] دی "۔

(مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۲۲۹)

آج کل اِس کو عام طور پر "ٹھہرنا" لکھا جاتا ہے ، اور اب اِسی املا کو مرجّح ماننا چاہیے ۔ یعنی :

ٹھہرانا ، ٹھہرنا ، ٹھہر جانا ، ٹھہرالینا ، ٹھہراو ، ٹھہر ٹھہر کر ، ٹھہرے گا ، وغیرہ ۔

پروا : اصل لفظ "پروا" ہے ، مگر متقدمین اِس لفظ کو بہ اضافۂ ہ ، "پرواہ" بھی استعمال کرتے تھے ۔

جلنے سے میرے کیا اُسے پرواہ ، جل گیا — شعلے کو کب ہے غم جو پرِ کاہ جل گیا
(میر سوز)

او چلے جانے والے بے پرواہ — کچھ فقیروں کے حال پر بھی نگاہ
(میر سوز)

---

[1] ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے مکاتیبِ غالب کے تبصرے میں لکھا تھا :
"اُس زمانے میں لوگ اکثر "ٹھہر" میں ایک ہ لکھا کرتے تھے ، اُسی کے مطابق غالب نے "ٹھہرتا" لکھا ۔ چھاپے خانے والے نے اگر دو چشمی بنا دی تو کوئی بڑا گناہ نہیں کیا ۔ تصحیح یوں ہونا چاہیے تھی : "ٹھہرتا" ۔"
(تبصرۂ مکاتیبِ غالب ۔ ہندستانی ، جنوری ۱۹۳۸ء)

نوؔر میں پہلے "پروا" لکھا گیا ہے، اُس کے بعد "پرواہ" کو بھی ایک مستقل لُغت کی حیثیت سے درج کیا گیا ہے اور سند میں جاںؔ صاحب کا یہ شعر لکھا گیا ہے:

اپنے ہوئے بے گانے، تو بندی کا خدا ہے
پرواہ کسی کے نہیں ملنے کی ذرا ہے

مولّف نے اِس کو عورتوں سے مخصوص بتایا ہے، مگر یہ نہیں لکھا کہ اب متروک ہے۔ آصفیہ میں صرف "پروا" لکھا گیا ہے۔

اب یہ لفظ ہ کے بغیر مستعمل ہے، اور اِسی طرح لکھا جائے گا: پروا۔

ہیؔ: یہ حرفِ حصر ہے۔ جب یہ آپ کے ساتھ آتا ہے اور یہ مرکّب "فعلن" کے وزن پر استعمال کیا جاتا ہے، تو اِس کو دو طرح لکھا جاتا ہے: آپی، آپھی۔ امیؔر مینائی نے یہ راے ظاہر کی تھی کہ ایسے مقامات پر "آپی" کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔ انھوں نے لکھا تھا:

"بعض لوگ "آپی" کو "آپھی" ہاے مخلوط التّلفّظ کے ساتھ لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ مولّف کی راے ہے کہ ایسے مقامات میں ہاے مخلوط التّلفظ کا ترک کرنا تحریر اور تقریر میں مستحسن ہے"۔ (امیر اللغات)

یہ راے نہایت مناسب ہے، اور اب اِس لفظ کا یہی املا اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی جب یہ مرکّب، فاعلن کے وزن پر آئے گا تو "آپ ہی" لکھا جائے گا

نہ ہو یہ کھر کوچ مٹّے چاہ نصیبِ اعدا ۔۔۔ کرے اِس دُکھڑے کو اللہ نصیبِ اعدا
خوبیِ خلطے کی، دوانہ نہ ہو، بس مُنہ کو سنبھال ۔۔۔ میں کروں غیر کی پرواہ نصیبِ اعدا

انشا (کلامِ انشا، ص ۷)

اور جب فعلن کے وزن پر آئے گا تو "آپی" لکھا جائے گا، جیسے:

آپ ہی آپ ہے پکار اٹھتا ۔ دل ہے جیسے گھڑی فرنگی کی

گھل گیا آپی آپ کچھ قائم ۔ کیا بلا اِس جوان پر آئی

جب کوئی بھی ملا نہ ہمیں اپنا دردمند ۔ ہم آپی سوگوار بنے اپنے واسطے

"آپ ہی" کے مخفف "آپی" کی طرح "ایک ہی" کا مخفف "ایکی" آتا ہے اور اِس کو اب "ایکھی" کوئی نہیں لکھتا۔ رشک کا شعر ہے:

ہے امتیازِ عاجز و ظالم زمین پر ۔ ایکی ہیں ناتوان و توانا زمین میں

(مقدمۂ نفس)

"ایکا ایکی" اِسی طرح بنا ہے۔ اور اِس لفظ "ایکی" کے قیاس پر "آپی" کو مرجّح قرار دینے کی ایک اور وجہ ہاتھ آئی۔ ہی کی ہائے ہوّز کا حذف کچھ اِنھی دو لفظوں سے مخصوص نہیں، جب یہ کلمہ کس، مجھ، تجھ، اُس، اِس کے ساتھ آتا ہے، تب بھی ہائے ہوّز ساقط ہو جاتی ہے، اور کسی، مجھی، تجھی، اُسی، اِسی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ قاعدے کے مطابق مجھ ہی، تجھ ہی، کس ہی، اُس ہی، اِس ہی، استعمال کر سکتے ہیں، نظم میں یہ لفظ اِس طرح استعمال کیے بھی گئے ہیں، مگر اب عام طور پر اِن کلمات کو بہ حذفِ ہا استعمال کیا جاتا ہے اور اِسی طرح فصیح سمجھا جاتا ہے۔

دو اور اسمائے اشارہ "یہ" اور "وہ" کے ساتھ بھی یہی صورت ہے کہ "یہ ہی" اور "وہ ہی" کے بجائے، "یہی" اور "وہی" زیادہ مستعمل ہیں۔ شاعروں نے یہ ہی" اور" وہ ہی" بھی نظم کیا ہے، اب بھی نظم کر سکتے ہیں، مگر

اب عام طور پر تقریر و تحریر میں "یہی" اور "وہی" فصیح سمجھے جاتے ہیں۔ مؤلفِ نور نے مقدمۂ جلدِ اوّل میں لکھا ہے: "وہ ہی کی جگہ وہی فصیح ہے"۔

ہی کی ہائے ہوّز، کئی جگہ ہائے مخلوط میں بدل جاتی ہے۔ "آپ ہی" کو اسی لیے "آپھی" لکھا جانے لگا تھا۔ چوں کہ "آپھی" کے مقابلے میں "آپی" رواں اور سبک ہے، اس لیے متاخرین نے اسی کو مرجّح قرار دیا، مگر کچھ دوسرے لفظوں کے ساتھ مرکّب ہو کر، مختلف صورتوں میں، ہائے ہوّز، ہائے مخلوط میں بدل جاتی ہے اور انھی صورتوں کو اب مرجّح سمجھا جاتا ہے۔ یہ کلمات ہیں: اب، سب، کب، جب، تب ـــــ یہ کلمے، ہی کے ساتھ مل کر "فَعَل" کے وزن پر استعمال کیے جاتے ہیں، تو ہائے مخلوط ہی لکھی جاتی ہے، یعنی: ابھی، سبھی، جبھی، کبھی، تبھی۔ قاعدے کے مطابق تو سب ہی، جب ہی وغیرہ استعمال کیے جاسکتے ہیں، مگر عام طور پر، ان کو بہ ہائے مخلوط، مرجّح، بل کہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔

تم اور ہم کے ساتھ ہی کے اضافے کی صورت میں قاعدے کے مطابق "تم ہی" اور "ہم ہی" اور ان کی مخفّف صورت تمھی اور ہمی ہونا چاہیے۔ ان کو اس طرح استعمال کیا بھی گیا ہے، اور استعمال کیا بھی جاتا ہے، مگر ان کی ایک صورت تمھیں اور ہمیں بھی ہے اور یہ اس طرح بھی مستعمل ہیں۔ مؤلفِ نور نے لکھا ہے:

"ہم کے ساتھ ہی آئے تو ہ حذف ہو جاتی ہے اور اُس کے آخر میں نونِ غنّہ زیادہ کیا جاتا ہے، جیسے: (غالب) اک یہاں جینے سے بیزار ہمیں ہیں یارب ٭ یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں۔

تم کے ساتھ ہی واقع ہو تو ہی کی ہ کو ہائے مخلوط التلفظ سے بدل کر، آخر میں نونِ غنّہ زیادہ کرتے ہیں: ؎ : یہ کہ سکتے ہو، ہم دل میں نہیں ہیں، پھر یہ فرماؤ (کذا) ؏ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو، تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو۔

بعض نون زیادہ نہیں کرتے اور تمھی کہتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے بعض اہلِ زبان ہم اور تم کے ساتھ ہی آئے تو اس میں کچھ تغیّر نہیں کرتے اور "ہم ہی" اور "تم ہی" کہتے ہیں۔

نظم میں بھی بعض اوقات "ہم ہی" اور "تم ہی" اپنی اصلیت پر قائم رہتے ہیں۔ غالب: پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام؏

ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا"

واقعہ یہ ہے کہ اِن لفظوں کی سب صورتیں مستعمل ہیں، یعنی: ہم ہی، ہمی، ہمیں۔ تم ہی، تمھی، تمھیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کس صورت کو ترک کیا جائے۔ اصل کے لحاظ سے بہ ظاہر ہمی اور تمھی مرجّح معلوم ہوتے ہیں، مگر ہمیں اور تمھیں کے مقابلے میں یہ نسبتاً کم مستعمل ہیں۔ دو اور لفظوں کی بھی یہی صورت ہے۔ یہ لفظ ہیں: انھی، انھیں۔ یوں ہی، یونہیں۔

"اِن ہی" کے مجموعے کو "انھی" اور "انھیں" دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ اسی طرح "یوں ہی" کی ایک صورت "یونہیں" ہے۔ شوق نیموی نے "یونہیں" کے مقابلے میں "یوں ہی" کو غلط بتایا ہے:

"یونہیں۔ اِس کے املا میں اختلاف ہے کہ واو کے بعد نون چاہیے یا نہیں۔ مگر تحقیق یہ ہے کہ لکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ لفظ مرکّب ہے۔

پہلا جزو "یوں" ہے اور لہجے میں بھی نون باقی رہتا ہے، پھر نہ لکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اور بعض حضرات جو "یونہی" لکھتے ہیں، یعنی آخر میں نون نہیں لکھتے، صحیح نہیں ......" (اصلاح)۔

پھر اِس کے حاشیے میں لکھا ہے :

"کیوں کہ لہجے میں بھی نون ہے، اور اساتذہ نے بھی زمین وغیرہ کے قافیے میں استعمال کیا ہے۔ اور آج تک کسی محقق اہلِ زبان نے 'ابھی' کسی، کے قافیے میں "یونہی" استعمال نہیں کیا۔ اور بعض کا جو یہ خیال ہے کہ کلمۂ حصر ہی ہے، نہ ہیں، یہ محض غلط ہے۔ ہمیں، تھیں میں بالاتفاق نون ہے۔ اِن دونوں لفظوں کا جزوِ اوّل ہم اور تم ہے، اور لفظِ آخر، کلمۂ حصر ہے۔ پس یا تو ہیں کو بھی کلمۂ حصر کہیے، یا یہ کہیے کہ ہی جو کلمۂ حصر ہے، کبھی اُس کے بعد نون زیادہ کرتے ہیں"۔

مگر اُن کا یہ قول انتہا پسندی پر مبنی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ "یونہیں" کو استعمال کیا گیا ہے، مگر اِس بنا پر "یوں ہی" کو غلط کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اصل لفظ تو یہی ہے۔ "یونہیں" تو اِسی کی ایک صورت ہے۔ یہ لفظ عام تحریر میں اِس طرح بھی آتا رہتا ہے۔

غرض اِن دونوں لفظوں کی بھی دو صورتیں ہیں اور دونوں بہ جاے خود صحیح ہیں : انھی، انھیں۔ یوں ہی، یونہیں۔

اِسی سلسلے کا ایک اور لفظ "میں ہی" ہے۔ اِس میں جو اختلاف ہے، اُس کا ذکر کرنے کے بعد، اِن سب لفظوں کے متعلق مجموعی طور پر کچھ کہنا مناسب ہوگا۔

"میں ہی" کے متعلق یہ راے ظاہر کی گئی تھی کہ تمھیں اور ہمیں کے

قیاس پر، اِس کو بھی " مہیں " لکھنا چاہیے۔ بل کہ جلالؔ نے تو یہاں تک غلو کیا کہ " میں ہی " کو غلط قرار دے دیا، اُسی طرح جیسے شوقؔ نے "یوں ہی" کو غلط بتایا ہے۔ جلالؔ نے لکھا ہے:

" مہیں ۔ تحتانیِ معروف اور اخفاے نون کے ساتھ، اک کلمہ ہے کہ فائدہ اپنی ذات کے حصر کے معنی کا دیتا ہے۔ اور جو اِس لفظ کو " میں ہی " پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں، مولفِ ہیچ مداں کے عندیے میں غلط ہے "۔

(سرمایۂ زبانِ اردو)

داغؔ کے شاگرد وجاہت جھنجھانوی نے جلالؔ کے اِس قول پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی کتاب اختلاف اللسان میں لکھا ہے:

" جنابِ جلالؔ کا یہ اجتہاد باقاعدہ ضرور ہے۔ کیوں کہ جب تم ہی، ہم ہی کو " تمھیں " اور " ہمیں " کہتے ہیں تو اِسی قیاس پر میں ہی کو " مہیں " کہنا چاہیے۔ مگر تمھیں، ہمیں کے مقابلے میں یہ لفظ نہایت غیر فصیح معلوم ہوتا ہے، شاید اجنبیّت کی وجہ سے۔ اور سچ پوچھیے تو یہ اجتہاد ایسا ہے جیسے کوئی یہاں، وہاں کے قیاس پر، کہ ان کا مخفّف یاں اور واں آتا ہے؛ کہاں کا مخفّف کاں کرنا چاہے ــ شعراے دہلی و لکھنؤ میں سے اور کوئی اس کا عامل نہیں پایا جاتا، صرف جنابِ جلالؔ اور اُن کے شاگرد لکھتے ہیں "۔

اختلاف سے قطعِ نظر، واقعہ یہ ہے کہ اِس لفظ " مہیں " نے " ہمیں " اور " تمھیں " کی طرح رواج نہیں پایا، اور مرحوم ہوگیا۔ اب اِس لفظ کو عام طور پر " میں ہی " لکھا جاتا ہے اور ضرورت کے مطابق فعلن اور فعل، دونوں وزنوں پر اس کا تلفّظ کیا جاتا ہے۔

جس طرح "میں ہی"، ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے اور پڑھنے میں دونوں طرح آتا ہے (بروزنِ فعلن، اور بروزنِ فَعَل)، اور اِس کے مخفف "مہیں" کو اب کوئی نہیں لکھتا؛ اُسی طرح "یوں ہی" کی بھی اِسی ایک صورت کو مرجّح قرار دینا چاہیے۔ اِس کو بھی فعلن اور فعَل، دونوں اوزان کے مطابق پڑھا جاسکتا ہے۔ جب اصل کے مطابق ایک سادہ لفظ موجود ہے (یوں + ہی)، تو پھر ایک اور صورت کو مرجّح سمجھنے کی کیا ضرورت!

(یہ پھر واضح کردیا جائے کہ یہاں صحیح غلط کا فیصلہ نہیں کیا جارہا ہے، عام تحریر اور نصابی ضرورت کے لحاظ سے صرف ترجیح کا فیصلہ کیا جارہا ہے۔ کل کیا لکھا گیا ہے، اِس سے بحث نہیں۔ آج کیا لکھیں، فی الوقت صرف یہ مقصود ہے۔)

اِسی طرح "انھیں" اور "تمھیں" کے مقابلے میں "انھی" اور "تمھی" کو مرجّح سمجھنا چاہیے۔ یہ بھی اصل سے قریب ہیں اور مستعمل بھی رہے ہیں۔ ضمنی طور پر "جنھیں" اور "انھیں" (بہ یاے مجہول) سے امتیاز کا فائدہ بھی حاصل ہوگا۔ ابتدائی سطح پر، اِس طرح کے امتیازات کی اچھی خاصی اہمیت ہے۔

تبھی، ابھی، کبھی، جبھی، سبھی، وہی، یہی، اور اسی، مجھی، تجھی، کسی، آپی، ایکی؛ تو ایک ہی طرح مستعمل ہیں۔ اور اِس طرح یہ سب کثیر الاستعمال لفظ، ایک قاعدے کے تحت آجاتے ہیں۔ طالب علم کو ابتدائی سطح پر، اِن کی ترکیبی صورت کو سمجھانا، اِس صورت میں آسان ہوگا۔ یہ بڑا فائدہ ہے۔

اب اِن سب لفظوں کی ترجیحی صورت یوں ہوئی:

میں ہی، یوں ہی ، جوں ہی ، تو ہی ، اِنھی ، اُنھی ، تمھی ، تبھی ، ابھی، کبھی ، جبھی ، سبھی ، مجھی ، تجھی ، وہی ، یہی ـــ اِسی ، اُسی ، کسی، آپی ، ایکی ۔

البتہ "یہیں" اور "وہیں" مع نون مستعمل ہیں ۔ اگر کوئی صاحب چاہیں تو ہمیں ، تمھیں اور انھیں بھی لکھ سکتے ہیں ۔ یہ کوئی ایسی پابندی تو نہیں کہ جس کو ماننا حرفِ آخر ہو ۔ ترجیح بہ ہر حال سادگی کو حاصل رہے گی، وہ لفظ کی بناوٹ میں ہو یا کتابت میں ۔

ہائے ملفوظ عام طور پر ساقط نہیں ہوتی ، جس طرح کہ حروفِ علت دب جایا کرتے ہیں یا ساقط ہو جاتے ہیں ، مگر اِس میں بعض مستثنیات ہیں۔ اِن میں دو لفظ وہ اور یہ بھی ہیں کہ شعر میں کبھی اِن کو اِس طرح نظم کیا جاتا ہے کہ ہ تلفظ کا جُز اُس طرح نہیں ہوتی جس طرح کہ ہائے ملفوظ کو ہونا چاہیے ۔ جیسے انشا کے اِس شعر میں یہ :

حیف! تم چاند سا مکھڑا نہ دکھاؤ ہم کو اور یوں ہو یہ شبِ ماہ نصیبِ اعدا

(کلامِ انشا ص ۷)

وہ اور یہ کی اِس طرح کی مثالیں عام ہیں ۔ نظم میں اِن لفظوں کو کسی بھی طرح استعمال کیا جائے ، اِن کے املا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی ۔ یعنی اِن کو ہر صورت میں " وہ " اور " یہ " لکھا جائے گا ۔

ہائے مختفی

(۲)

ہائے مختفی کا کچھ بیان " الف اور ہائے مختفی " کے عنوان کے تحت آچکا ہے ۔ یہ بات سبھی نے کہی ہے کہ ہائے مختفی ، حرف نہیں ، ایک طرح کی علامت ہے اور اِس کا کام یہ ہے کہ حرفِ ماقبل کی حرکت (زبر) کو سہارا دے کر برقرار رکھے ۔ فارسی و اردو میں چوں کہ حرفِ آخر متحرک نہیں ہوتا ؛ اِس لیے ایسے مقامات پر حرفِ آخر کی حرکت کا ٹھہراو اِسی کے سہارے سے ہوسکتا ہے ۔

جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہے ، اردو میں ایسے بیش تر لفظ تلفظ میں اُسی طرح آتے ہیں ، جس طرح وہ لفظ تلفظ میں آتے ہیں جن کے آخر میں الف ہوتا ہے ۔ نظم میں جب یہ لفظ قافیے یا ردیف کے طور پر آتے ہیں ، اُس وقت یہ صورت نمایاں ہوکر سامنے آجاتی ہے ۔ جیسے یہ مطلع :

ادا سے دیکھ لو ، جاتا رہے گلہ دل کا بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

گلہ اور فیصلہ میں اصلاً ہائے مختفی ہے ، مگر یہاں گلہ بروزنِ فَعَل (یا بروزنِ وفا) آیا ہے ۔ یا جیسے یہ مطلع :

چلے چلو ، جہاں لے جائے ولولہ دل کا

دلیلِ راہِ محبّت ہے فیصلہ دل کا

یہاں بھی وہی صورت ہے کہ ولولَہ اور فیصلَہ کا تلفظ " ولولا " اور " فیصلا " کیا جائے گا اور تقطیع میں بھی اِن کو چار حرفی کے بجائے ، پانچ حرفی مانا جائے گا ۔ درمیانِ شعر میں بھی یہ صورت واقع ہوتی ہے اور اِس کی مثالیں عام ہیں ۔ بس فرق یہ ہے کہ ہاے مختفی الف کی طرح تلفّظ میں آتی ہے ، ہاے ملفوظ کی طرح نمایاں نہیں ہوتی ۔ یعنی " ولولہ " کا تلفّظ " ولولا " تو کیا جائے گا ، " ولولَہْ " نہیں کیا جائے گا ۔ اِسی طرح مثلاً جلوہ کا تلفّظ " جلوا " تو ہوگا ، " جلوَہْ " نہیں ہوگا ۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو ایسے مقامات پر ہاے مختفی ، حرفِ علّت کا کردار ادا کرتی ہوئی ملتی ہے اور یہ قابلِ لحاظ بات ہے ۔ اور ہر صورت میں ، ایسے مقامات پر اِس کی حیثیت محض علامت کی سی نہیں ہوتی ، یہ حرفِ علّت کی قائم مقامی کرتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایسے لفظوں کے املا میں اچھی خاصی گڑبڑ رہی ہے جن کے آخر میں الف لکھنا چاہیے کہ اُن کو ہاے مختفی سے بھی لکھا جاتا رہا ہے ، جیسے : " بھروسہ ، معمّہ " وغیرہ ۔ کہ اِن کی صحیح صورت " بھروسا " اور " معمّا " ہے ۔ اِس کی دوسری صورت یہ ہے کہ قافیے میں جب ایسے لفظ جمع ہوں جن میں سے ایک لفظ کے آخر میں الف ہو اور ایک کے آخر میں ہاے مختفی ؛ اِس صورت میں ہاے مختفی کی جگہ الف لکھا جاتا ہے یا یوں کہیے کہ ہاے مختفی کو الف سے بدل دیا جاتا ہے (جیسے : زمانا دل کا ، آنا دل کا) اور اِس سے وہ نسبت ظاہر ہوتی ہے جو اِس کو حروفِ علّت سے ہے ، ذرا دور کی نسبت سہی ۔

جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہوتی ہے ، اُن کو جب اسمِ منسوب

بنایا جاتا ہے تو ہاے مختفی غائب ہو جاتی ہے ، جیسے : تشنہ سے تشنگی۔
مگر اُسی لفظ کو مضاف کیا جائے تو ہاے مختفی باقی رہے گی اور علامتِ اضافت (ہمزہ) کو اُس کے اوپر لکھا جائے گا ، جیسے : تشنۂ محبت ، یا جلوۂ رخسار۔

مختصر یہ کہ ہاے مختفی کی حیثیت اکثر مقامات پر ایک حرف کی سی ہوتی ہے ۔یہی نہیں ، فارسی[1] میں تو یہ ہ ، معنوی تبدیلیوں کی ذمّے دار بھی ہوتی ہے (اور ایسے مقامات پر اُس کی محض اظہارِ حرکت والی حیثیت یک سر بدل جاتی ہے) جیسے : اُفتاد سے افتادہ۔ یہاں جو معنوی تبدیلی ہوئی ہے وہ محض اِس "حرف" کی وجہ سے عمل میں آئی ہے ۔یا جیسے : شاہانہ ، یہاں بھی یہ ہ ، ایک معنویت کی تشکیل کر رہی ہے (شاہانہ ، یعنی بادشاہوں جیسا ، بادشاہوں کے لائق) ظاہر ہے کہ یہاں یہ ہ ، صرف بیانِ حرکت کے لیے نہیں آئی ہے ، یہ ایک لاحقے کے طور پر آئی ہے ۔

مقصود یہ ہے کہ ہاے مختفی محض علامت نہیں ؛ یہ کہیں تو علامت

---

[1] فارسی میں ہاے مختفی کے مسائل کے لیے دیکھیے (۱) المعجم فی معاییرِ اشعار العجم۔ (۲) بست مقالۂ قزوینی (۳) مقالۂ احمد بہمنیار بہ عنوانِ " املای فارسی" مشمولۂ لغت نامۂ دہخدا جلد ۴۰ (۴) مقالۂ ڈاکٹر نذیر احمد بہ عنوان " ہاے مختفی اور اُس سے متعلقہ دستوری و املائی مسائل " (۵) مقالۂ مولانا امتیاز علی خاں عرشی بہ عنوان " امیر خسرو کا فارسی تلفظ "۔ یہ دونوں مقالے مجلّۂ فکر و نظر (علی گڑھ) کے شمارہ ۱ ، ۲ ، ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئے ہیں ۔

کی طرح اظہارِ حرکتِ حرفِ ماقبل کے کام آتی ہے اور کہیں اپنے آپ کو حرف کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ البتہ کسی بھی صورت میں یہ تلفظ میں ہاے ملفوظ کی طرح اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتی۔ جب بھی یہ ایک حرف کی طرح کام میں آتی ہے تو یہ الف کی آواز مستعار لے لیتی ہے اور اِس صورت میں یہ حرفِ علّت کی طرح عمل کرتی ہے۔ ہاے ملفوظ حرفِ صحیح ہے، اور الف حرفِ علّت بھی ہے؛ الف کی آواز مستعار لینے اور ہاے ملفوظ کی صورت میں تبدیل نہ ہونے کا صاف طور پر مطلب یہی ہوا کہ ایسے مقامات پر یہ حرفِ علّت میں بدل جایا کرتی ہے۔ گویا، ہاے مختفی علامت بھی ہے اور حرف (حرفِ علّت) کی قائم مقامی بھی کرتی ہے۔ اور اِس لحاظ سے الف، واو، یے کی طرح اِسے بھی من جملۂ "حروفِ علّت" ماننا چاہیے۔ کیوں کہ جو کام الف سے لیا جاتا ہے، بہت سی صورتوں میں وہی کام اِس ہ سے لیا جاتا ہے۔ فارسی والے بھی اب اِسے حرفِ علّت کے طور پر شمار کرنے پر زور دیتے ہیں۔ اور کبھی یہ لاحقے کے طور پر بھی آتی ہے، جیسے: پنج روزہ، عارفانہ، کشیدہ۔

(۱)

اردو میں ہاے مختفی سے متعلق ضروری باتیں یہ ہیں:

ہاے مختفی، فارسی یا عربی لفظوں کے آخر میں آتی ہے (مستثنیات کے علاوہ، جن کا ذکر "الف اور ہاے مختفی" کے ذیل میں کیا گیا ہے)، جیسے زمزمہ، نغمہ، جادہ، جلوہ، نقطہ، شگفتہ، بُت کدہ، کعبہ، پردہ، مے خانہ وغیرہ۔

عربی، فارسی لفظوں کے سوا، اور سب لفظوں کے آخر میں ہمیشہ الف لکھا جائے گا، جیسے: پتا، پتّا، پتا، بھروسا، کتھا، ڈراما، کمرا، اِکّا وغیرہ۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے "الف اور ہاے مختفی"۔

(۲)

ایسے لفظ ہم قافیہ ہوسکتے ہیں جن میں سے ایک کے آخر میں ہاے مختفی ہو اور دوسرے کے آخر میں الف ہو۔ ایسی صورت میں ہاے مختفی کو الف سے بدل دیا جائے گا، یعنی ہاے مختفی کی جگہ الف لکھا جائے گا، جیسے: روانا ہوگیا، جانا ہوگیا۔ یا جیسے: سہارا ہے، اشارا ہے۔ مطلعے کے علاوہ اور اشعار میں بھی یہی ہوگا، اگر کسی شعر میں کوئی ایسا لفظ قافیے میں آتا ہے جس کے آخر میں ہاے مختفی ہو، تو اُس لفظ کو اُس شعر میں ہاے مختفی کے بجاے، الف سے لکھا جائے گا۔

دو اور صورتوں میں بھی ہاے مختفی، الف سے بدل جاتی ہے۔

(۱) ڈاکٹر صدّیقی مرحوم کے الفاظ میں "ایسے لفظوں میں، جو اردو میں گھل مل گئے ہیں اور اُن کی غیریت محسوس نہیں ہوتی، ہ کی جگہ الف لکھنا جائز ہے، جیسے: مزہ کی جگہ مزا"۔..... "ایسے لفظ جن میں اردو بولنے والوں نے کوئی تصرف کرلیا ہو، جیسے: دوماہا، دوخما (یعنی دوخم والا) وغیرہ"۔

دونوں قسم کے الفاظ کی تعداد اچھی خاصی ہے، جیسے: نقشا، خاکا، بزدلا، تیج محلا، تمنزلا، چوراہا، نمک پارا، تکّا بوٹی وغیرہ۔ "الف اور ہاے مختفی" کے ذیل میں تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ: "بعضے عربی یا فارسی لفظ ایسے ہیں کہ اُن کے آخر

میں ہ آتی ہے، مگر جب اُن کی جمع بناتے ہیں تو اُس مختفی ہ کو الف سے بدلنا ضروری ہو جاتا ہے، یعنی اُن تمام مونث اسموں اور مذکر اسموں کی جمع میں ہ کو الف سے بدل کر، جمع کی علامت لگاتے ہیں، جیسے: بیوہ سے بیوائیں، بیواؤں۔ دایہ سے دایائیں یا دایاؤں۔ قحبہ سے قحبائیں، قحباؤں۔ قابلہ سے قابلائیں، قابلاؤں وغیرہ۔ اور خلیفہ سے خلیفاؤں اور اور علامہ سے علاماؤں "۔ (اردو املا، ہندستانی جنوری ۱۹۳۱ء)

(۳)

ہائے مختفی کے نیچے وہ شوشہ کبھی نہیں لگایا جائے گا جو ہائے ملفوظ (متصل) کے نیچے لگایا جاتا ہے۔ لفظ کے آخر میں جب ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ متصل لکھی جائیں گی تب اِسی شوشے سے مختفی و ملفوظ کا امتیاز ہوتا ہے۔ جیسے: "جگہ" اور "یہ" میں ہائے ملفوظ ہے، اِس لیے اِن میں شوشہ لازماً آئے گا، اور "کعبہ"، "مرثیہ" میں ہائے مختفی ہے، اِس لیے اِن میں اِس شوشے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح ہائے مختفی کے نیچے شوشہ لگانا غلط ہوگا، اُسی طرح ہائے ملفوظ کے نیچے شوشہ نہ لگانا غلط ہوگا۔

(۴)

ہائے مختفی سے پہلے والے حرف پر عموماً زبر ہوتا ہے، جیسے: کعبہ، پردہ، پیمانہ، زمزمہ، واقعہ وغیرہ۔ جب یہ لفظ محرّف ہوں گے، اُس وقت لازمی طور پر، ہائے مختفی، یائے مجہول سے بدل جائے گی اور اُس سے پہلے والے حرف کا زبر، زیر سے بدل جائے گا، جیسے: کعبے میں، پردے پر، عرصے سے، وقفے میں، تین مرثیے، چار واقعے، کعبے گئے تھے، مے خانے ویران ہیں، جلوے بکھر گئے وغیرہ۔

یہ غلط نگاری بہت عام ہوگئی ہے کہ محرّف صورت میں بھی ایسے لفظوں کو اُسی طرح لکھا جاتا ہے جس طرح قائم صورت میں لکھا جانا چاہیے، یعنی: "کعبہ میں"، "پردہ پر"، "عرصہ سے"، "تین مرثیہ"، "چار واقعہ" وغیرہ۔ یہ بالکل غلط لکھاوٹ[1] ہے۔ اِس قاعدے کی پابندی لازم ہے کہ محرّف صورت خواہ جمع کی ہو، جیسے: تین مرثیے؛ خواہ حرفِ ربط یا علاماتِ فاعلی و مفعولی وغیرہ کے واسطے سے ہو، جیسے: مرثیے میں، پردے نے، اِس واقعے کو وغیرہ؛ ایسی سب صورتوں میں ہاے مختفی کی جگہ یاے مجہول لکھی[2] جائے گی اور ماقبلِ ہاے مختفی کا زبر، زیر سے بدل جائے گا۔ یعنی: کعبہ اور کعبے (ک ع ب ہ۔ک ع بِ ے)۔

اِسی طرح، ایسے لفظ جب منادا ہوں گے، تب بھی ہاے مختفی، یاے مجہول سے بدل جائے گی، جیسے:

---

[1] "اردو کے جو مذکّر اسم الف یا اُس کے ہم آواز حرف (مختفی ہ) پر ختم ہوتے ہیں، واحد محرّف اور جمع قائم کی حالت میں اُن کا یہ الف یا ہ بدل کر "یے" ہوجاتی ہے، عام اِس سے کہ لفظ کی اصل ہندستانی ہو یا فارسی یا عربی یا انگریزی یا کچھ اور۔ عام طور پر لوگوں نے عجیب طریقہ اختیار کیا ہے کہ جمع قائم کو تو "یے" سے لکھتے ہیں، مگر واحد کی محرّف حالت میں، تلفّظ کے سراسر برخلاف "ہ" کو برقرار رکھتے ہیں۔ لکھاوٹ کا یہ بے معنی طریقہ غالبؔ کے زمانے میں بھی رائج تھا؛ غالباً اِس وجہ سے کہ لکھنے والے فارسی یا عربی لفظ کی شکل کو بدلنے کی جسارت نہ کرتے تھے۔" (ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی۔ مقدمۂ خطوطِ غالب، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم)

[2] مولانا احسن مارہروی مرحوم نے بھی اِس قاعدے پر زور دیا تھا:

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۰ پر)

اے صرصرِ دہر یہ یاد دے گی   نہ نازاں ہوا اے غنچے! اک مشتِ زر پر

غنچے! تری زندگی پہ دل ہلتا ہے   بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے!

ایک لفظ ہے: ذِمّہ، محرّف صورت میں یہ "ذمّے" ہو جائے گا۔ جیسے: اُن کے ذمّے دس روپے نکلتے ہیں۔ اِسی طرح "ذمّے دار" بھی لکھا جائے گا، یہی صورت "ذمّے داری" کی ہوگی۔ جیسے: اِس بات کی ذمّے داری مجھ پر نہیں۔ یا: ذمّے دار لوگوں کی رائے اِس کے خلاف ہے۔

(۵)

ایک لفظ ہے: کیوں کر۔ اِس کی ایک صورت ہے: کیونکے۔ ایک اور لفظ ہے: کیوں کہ۔ یہ دونوں مختلف لفظ ہیں۔ یہ غلطی بھی عام ہے کہ "کیونکے" (بہ معنی کیوں کر، کس طرح، کیسے) کو "کیونکہ" لکھ دیا جاتا ہے۔ اِس غلطی کی اصلاح ضروری ہے۔ ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے لکھا ہے[1]:

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰۹ سے آگے) "جس لفظ کے آخر میں ہ آئے، تو فاعلیّت، مفعولیّت اور اضافت کی حالت میں اُسے ے سے لکھا جائے۔ جیسے: کسی زمانے میں۔

اِسی طرح حالتِ ترکیبی، یعنی اضافت وعطف میں بھی، عربی و فارسی الفاظ اُسی طرح لکھے جائیں جس طرح بولے جاتے ہیں، مثلاً: لب و لہجے میں، مقدمے بازی میں، وغیرہ"۔ (بہ حوالۂ علمی نقوش، ص ۱۴۳)

[1] یہاں پر نوراللغات کی ایک غلطی کی تصحیح ضروری ہے: "کیونکہ" کے ذیل میں اُس میں لکھا ہوا ہے: "کیونکہ (دہلی)۔ اِس لیے کہ، اِس طرح پر کہ۔ لکھنؤ میں اِس جگہ (بقیہ اگلے صفحے پر)

" "کیونکر" کی جگہ اگلے وقتوں میں "کیونکے" بولتے تھے اور یے کے ساتھ لکھتے تھے۔ ایک دوسرا لفظ ہے "کیونکہ" (یعنی کیوں کہ، جس میں "کہ" کافِ بیانیہ ہے) لوگوں نے "کہ" اور "کے" کے معنوں میں فرق نہ کرکے، "کیونکے" کو "کیونکہ" بنا دیا اور پُرانے اُستادوں سودا، میر، درد وغیرہ کے دیوانوں میں "اصلاح" فرما دی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اصلاح نہیں، تصحیف ہے۔ "کیونکر" کے معنی میں "کیونکے" اب تحریری زبان سے تو گویا خارج ہو گیا ہے، لیکن بعض شہروں کے لوگ بول چال میں بے تکلف استعمال کرتے ہیں۔ پس نہ صرف پرانے اساتذہ کے کلام میں، بل کہ بول چال کی بِنا پر، اِس زمانے کی تحریروں میں بھی ہم اِس لفظ سے کہیں نہ کہیں دو چار ہوں گے۔ اِس لیے یہ یاد رکھنا

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۰ سے آگے) "کیونکر" بولتے ہیں۔ مومن: کیونکہ امیدِ وفا سے ہو تسلّی دل کو؛ فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا۔" مولّف نے "کیونکہ" اور "کیونکے" کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ مومن کے شعر میں "کیونکے" ہے۔ اگر کسی کاتبِ کم سواد نے یہاں "کیونکہ" لکھ دیا تو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دہلی میں "کیونکہ" اِس معنی میں بھی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولّف نے آصفیہ کے اندراج کو غور سے نہیں دیکھا۔ اِس میں صحیح طور پر دونوں لفظوں کو الگ الگ لکھا گیا ہے۔ "کیونکہ" کے ذیل میں اِس میں یہ عبارت ہے: "کیونکہ، برائے علّت، اِس لیے کہ، اِس واسطے کہ، اِس طرح پر کہ، اِس سبب سے کہ"۔ اِس کے بعد "کیونکے" کے ذیل میں لکھا ہے: "کیونکے، تابعِ فعل، دیکھو کیونکر"۔ واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ "کیونکے" اور "کیونکر" ہم معنی ہیں اور یہی صحیح بھی ہے۔ بہ ہر صورت، مولّفِ نور کا یہ لکھنا کہ دہلی میں "کیونکے" کے معنی میں "کیونکہ" ہے؛ صحیح نہیں۔

چاہیے کہ اگر "کر" کا قائم مقام ہو تو "کے"، اور "نہیں" تو "کہ" لکھا جائے۔

جیسے : نہ جانوں کیونکے مٹے داغِ طعنِ بد عہدی (غالبؔ) "۔

(ہندستانی)

اِسی قبیل کا ایک اور لفظ ہے "کاشکے"۔ فارسی کے اِس لفظ کے آخر میں "یے" ہے۔ اِس کو "کاشکہ" یا "کاش کہ" لکھنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ جیسے غالبؔ کے اِس شعر میں :

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے اِدھر ہوتا کاشکے[1] مکاں اپنا

آصفیہ اور نور دونوں میں اِس کو صحیح طور پر "کاشکے" لکھا گیا ہے۔

(۶)

کچھ لفظ ایسے ہیں جن کے آخر میں اصلاً ہائے مختفی نہیں، مگر اُن کے آخر میں ہائے مختفی خواہ مخواہ شامل کردی جاتی ہے، جیسے : "مصرعہ"، "معہ" "موقعہ"، "موضعہ"۔ اِن کی صحیح صورت : مصرع، مع، موقع، موضع ہے۔ بعض اور لفظوں کے ساتھ بھی یہی سلوک کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ جیسے "بابت" کو "بابتہ" لکھنا، کہ صحیح املا "بابت" ہے۔ یا "آیت" کو "آیتہ" بنا دینا، کہ اِس کا املا بھی "آیت" ہوگا۔

(۷)

عربی کا ایک لفظ ہے : "سَنَۃٌ" جو قاعدے کے مطابق "سَنہ" بن گیا،

---

[1] غالبؔ صدی کے سلسلے میں پاکستان میں پچاس پیسے والا ایک ٹکٹ جاری کیا گیا تھا، جس پر غالبؔ کا یہی شعر، اِس طرح ثبت ہے :

" منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱۳ پر)

مگر اِس کا تلفظ وہی رہا جو "سَنہ" کا ہوتا ہے ۔ اصولاً اب اِس لفظ میں ہائے مختفی زائد ہے ، کیوں کہ اِس لفظ کو نونِ مفتوح کے بجائے ، نونِ ساکن کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے ؛ مگر اِس لفظ کی حیثیت ، لفظ سے زیادہ ، علامت کی سی ہو کر رہ گئی ہے ، جیسے : سنہ ۱۹۷۳ء ۔ اِس میں "سنہ" لفظ کے بجائے ، علامت کا کام دے رہا ہے ۔ یہ استثنا ہے اور ایک مستثنا لفظ کی حیثیت سے ، اِس لفظ کی یہی لکھاوٹ اب تک رہی ہے اور آیندہ بھی رہنا چاہیے ۔ ہاں ، "سنہ" میں نون کا نقطہ بھی غائب ہوچکا ہے ۔ نقطے کی ضرورت اب یوں بھی نہیں کہ یہ اب لفظ کے بجائے خاص علامت ہے ۔ لیکن یہ اُس صورت میں ہوگا جب اِس پر اعداد بھی لکھے جائیں ، جیسے : سنہ ۱۹۷۳ء ۔ اعداد کے بغیر یہ لفظ کہیں آئے ، جس طرح کہ انشا کے اُس شعر میں آیا ہے جس کو حاشیے پر لکھا گیا ہے ، تو اِس صورت میں نون پر نقطہ رکھا جائے گا (سنہ) ۔

سِن بہ کسرِ سین ، دوسرا لفظ ہے ، اِس کے معنی ہیں : عُمر ۔ اِسی سے "کم سِن" بنا ہے ۔ میر حسن کا بے مثال شعر یاد آیا :

(پچھلے صفحے کا حاشیہ ۲)

" سَنَۃٌ" کی اصل "سَنْہَۃٌ" تھی ، "جَبْہَۃٌ" کی طرح ۔ پھر اُس کا لام کلمہ حذف کرکے ، اُس کی حرکت نون کی طرف منتقل کر دی گئی تو "سَنَۃٌ" باقی رہ گیا ۔ اور بعض کا قول ہے کہ اِس کی اصل "سَنْوَۃٌ" تھی ، واو کے ساتھ ۔ (اور جس طرح کہ ہا کو حذف کیا گیا) واو کو حذف کردیا گیا ہے ۔" (لغات القرآن ، جلدِ سوم ، ص ۲۳۹) ۔

[1] تس پر نشانی آپ کی ، سنہ ہجری بھی وہی   اِس سے نہ پھریے ، قولِ جواں مرد ہے سو ہے

انشا (کلامِ انشا ، ص ۲۶۶)

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سِن   مرادوں کی راتیں، جوانی کے دن

"سنہ" کی جگہ "سن" لکھنا درست نہیں ہوگا ۔ یہ غلط نگاری بھی بڑھتی جا رہی ہے ۔

کبھی نظم میں اور کبھی کبھار نثر میں بھی یہ لفظ اضافت کے ساتھ آتا ہے، جیسے، ع : سنۂ ہجری میں یہ تاریخ لکھی ہے میں نے ۔ اِس میں "سنہ" مضاف ہے اور "ہجری" مضاف الیہ؛ ایسے مقامات پر بھی اِس لفظ کا یہی املا برقرار رہے گا اور نون کے نیچے اضافت کا زیر لگایا جائے گا۔ یہ طریقِ نگارش، اِس لفظ کے ساتھ مخصوص ہے ۔

اِس لفظ کے سلسلے میں ایک بحث کا حوالہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا۔

جلالؔ نے اپنے لُغت گنجینۂ زبانِ اردو میں، جس کا تاریخی نام گلشنِ فیض ہے، لفظ "سن" کے تحت لکھا تھا:

"سن، سینِ مہملہ مفتوح بہ نون، بہ معنیِ سال آید۔ ع : سنۃ بفتحتین و در آخر تاے موقوفہ ۔ و بہ ضمِ سینِ مہملہ، عضویکہ بےحس و حرکت شدہ باشد ۔ و امر بود از شنیدن" (ص ۵۲۸) ۔

شوقؔ نیموی نے ازاحۃ الاغلاط میں جلالؔ کی اِس تحریر کا حوالہ دیے بغیر لکھا تھا:

"سن، بالفتح، بجاے سنہ بہ معنیِ سال، باوجودِ تفحص، در کلامِ فارسیاں یافتہ نشد، و نہ از ایرانیانِ واردِ ہند مسموع شدہ ۔ آرے صاحبِ بہارِ عجم ازیں شعرِ و آلہ ہروی استناد کردہ : توقف تو دریں سن بکام خواہش باشد ۔ دعاے آنکہ شوی پیرناصواب برآید۔ اما چوں نیک بنگرند، دریںجا سِن بالکسر بہ معنیِ عمر باشد۔ و کسے

رائمی رسد کہ سن را مخفف سنہ گوید ، چہ دریں باب استعمالِ فصحا
پر ضرور ست ۔ کوتاہیِ سخن ، در صحتِ سن بالفتح ، تامل است "۔
جلال کا اردو لغت سرمایۂ زبانِ اردو ، اسی گلشنِ فیض کا اردو ترجمہ ہے ، بعض ترمیموں کے ساتھ ۔ گلشنِ فیض ، فارسی میں ہے ۔ سرمایۂ زبان میں لفظ سن کے وہ معنی نہیں ملتے ("بہ معنیِ سال آید") جو گلشنِ فیض میں لکھے گئے تھے اور جن کو شوق نے حوالے کے بغیر ، نشانۂ اعتراض بنایا تھا ۔ اور اس کا واضح طور پر یہ مطلب ہے کہ جلال نے اس اعتراض کو تسلیم کرلیا تھا اور اسی وجہ سے " بہ معنیِ سال آید " والی عبارت کو نکال دیا ۔
امیر مینائی نے ، نعیم الحق آزاد کے خط کے جواب میں لکھا تھا :

" سن بہ معنیِ سال ، کہیں نہیں نکلتا ۔ فارسی میں تلاش کیا ، کوئی سند قابلِ اعتبار نہ ملی ۔ اِن معنی میں " سنہ " ہے ۔ اردو میں بغیرِ ترکیب اگر سن ، بہ معنیِ سال کوئی کہے تو تاویل ہو سکتی ہے ۔ محققین اس جگہ " سال " کہتے ہیں " ۔ (مکاتیبِ امیر مینائی ، مرتبۂ ثاقب)

(۸)

جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہو ، اور اُن کی جمع بہ قاعدۂ فارسی " ہا " کے اضافے سے بنائی جائے ، جیسے : جامہ ہا ، نامہ ہا ؛ اُس صورت میں علامتِ جمع " ہا " کو علاحدہ لکھا جائے گا ۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہائے مختفی کو حذف کرکے " جامہا " ، " نامہا " وغیرہ لکھا جائے ۔ " نامہا " اور " جامہا " تو " نام " اور " جام " کی جمعیں ہوں گی ۔ " جامہ " اور " نامہ " کی جمع " جامہ ہا " اور " نامہ ہا " ہوگی ۔
دوسری بات یہ ہے کہ اردو میں اس علامتِ جمع کو ہر صورت میں الگ

لکھا جائے گا، لفظ سے ملا کر نہیں لکھا جائے گا[1]، جیسے: شب ہا۔ نامہ ہا۔ نام ہا۔ جامہ ہا۔ جام ہا۔ سال ہا۔ ماہ ہا وغیرہ

(۹)

فارسی میں اسمِ مصدر بنانے کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کچھ ایسے لفظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے، اُن میں "گی" کا لاحقہ شامل کر دیا جاتا ہے، اور ہائے مختفی ختم ہو جاتی ہے؛ اِس لیے ایسے لفظوں میں "گی" سے پہلے ہائے مختفی نہیں لکھی جائے گی۔ جیسے: شعلہ سے "شعلگی" بنے گا، اِس کو "شعلہ گی" نہیں لکھا جائے گا۔ اِسی طرح بندہ سے بندگی، بے مایہ سے بے مایگی، خانہ سے خانگی، خواجہ سے خواجگی بنیں گے۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں۔

آسوزگی، افسردگی، بندگی، بستگی، بے گانگی، بے مایگی، بلند پایگی، تشنگی، بے پردگی، زندگی، خواندگی، شرمندگی، قطرگی، کبیدگی، کشیدگی، کمینگی، شگفتگی، برشتگی، پژمردگی، افسردگی، نغمگی، خواجگی، ہمسایگی، نمایندگی، فرزانگی، دیوانگی، پایندگی، شعلگی، یک بارگی، کہنگی، تازگی، خانگی، بے چارگی، یگانگی، روانگی، پروانگی، خستگی، شکستگی، کارکردگی، غم زدگی،

---

[1] بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ "جامہ ہا" کے بجائے "جاما" لکھنا چاہیے اور وجہ یہ قرار دی ہے کہ ہائے مختفی ہمیشہ لفظ کے آخر میں آتی ہے مگر "جامہ ہا" میں درمیانِ لفظ میں آجائے گی۔ مگر یہ درست نہیں۔ "جامہ ہا" دو مستقل اجزا سے مرکّب ہے: ایک جُز "جامہ" ہے اور دوسرا جُز "ہا"۔ "جامہ ہا" لکھنے کی صورت میں بھی ہائے مختفی، آخرِ لفظ (جامہ) ہی میں رہے گی۔ بہ ہر صورت، اردو میں "جامہ ہا" وغیرہ ہی لکھے جائیں گے۔

اِس سلسلے میں ایک اور بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے۔
"گی" سے پہلے والا حرف اصلاً مفتوح ہوتا ہے۔ "بندہ" میں دال پر زبر ہے، اسی سے "بندگی" بنے گا، ظاہر ہے کہ دال پر زبر باقی رہے گا۔ تلفظ کا حال یہ ہے کہ اِن میں سے بعض لفظ تو اِس طرح زبان پر آتے ہیں کہ زبر کسی حد تک باقی رہتا ہے، جیسے: تشنگی اور نغمگی۔ بعض لفظوں میں سکون کی کیفیت نمایاں ہوجاتی ہے، جیسے: تازگی اور خواندگی۔ اور بعض لفظوں میں آواز میں ہلکی سی لہر زیر کی پیدا ہو جاتی ہے، جیسے: بے مایگی اور نمایندگی ۔ مگر ایسے متعدد لفظ جب شعر میں اضافت کے ساتھ آتے ہیں تب یہ زبر، پوری طرح نمایاں ہوجاتا ہے:

ع : نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضموں غالبؔ۔

ع : شرمندگیِ اہلِ وفا کی کوئی حد ہے۔

تلفظ کے اِن معمولی اور خفیف اختلافات کی جو بھی صورت ہو؛ اصلاً "گی" سے پہلے والا حرف مفتوح ہوتا ہے، اور اُس کا زبر برقرار رہے گا۔ ایسے لفظوں کو اردو میں لکھنے یا بولنے میں یہ مسئلہ سامنے نہیں آتا، مگر جب کسی ایسے لفظ کو مثلاً ہندی رسم خط میں لکھنے کی نوبت آتی ہے، تب یہ سوال اچانک سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً غالبؔ کا یہ مصرع:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم

اِس کو ہندی (یا رومن) رسمِ خط میں جب لکھا جائے گا تو دال کا زبر نمایاں ہوجائے گا اور یہاں پر دال مفتوح (ح) مانی جائے گی، سکون یا زیر کی آواز سے دھوکا نہیں کھایا جائے گا۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی یہاں کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب لفظ

کے آخر میں " یائے لیاقت " شامل ہوگی ، تب بھی ماقبلِ یٔ تو مکسور ہو جائے گا مگر اُس سے پہلے والے حرف کا زبر باقی رہے گا ، جیسے : گفتَنی ، گشتَنی ، دیدَنی ، گذشتَنی وغیرہ)۔

(۱۰)

جن لفظوں کے آخر میں مختفی ہ ہو ؛ ایسے لفظوں کی جمع جب " جات " کے اضافے سے بنے گی تو علامتِ جمع (جات) کو علاحدہ (منفصل) لکھا جائے گا اور مختفی ہ اپنی جگہ پر باقی رہے گی ۔

اب تک یہ رہا ہے کہ ایسے بعض لفظ تو ملا کر لکھے جاتے ہیں ، جیسے : کارخانجات ، صوبجات ۔ اور بعض لفظ علاحدہ علاحدہ لکھے جاتے ہیں ، جیسے : پارچہ جات ، محکمہ جات ۔ اب یہ ایک طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو یا اور کوئی حرف ہو ؛ ہر صورت میں ایسے مرکّبات کے دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ لکھا جائے گا ۔ جیسے :

اسلحہ جات ، بیروں جات ، پارچہ جات ، حوالہ جات ، صوبہ جات ، علاقہ جات ، محکمہ جات ۔

ہائے مخلوط

(۳)

صوتیات کی رُو سے، آواز اصل چیز ہے، اور اِسی اصول کے تحت زبان کے نظامِ اصوات کی شیرازہ بندی کی جاتی ہے؛ مگر اُردو میں، عربی و فارسی کے اثر سے، حرف کا تصوّر بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اور یہ تصوّر جاگزیں ہوچکا ہے۔ صوتیات کی رُو سے، ایک آواز کے لیے دو علامتیں نہیں ہوسکتیں؛ مگر حرف کی بنیاد پر ایسا ہوسکتا ہے، اور اُردو میں یہی صورت ہے۔ اُردو کے حروفِ تہجّی میں کچھ وہ حرف بھی شامل ہیں جن کو صوتیات والے "مُردہ لاشوں" سے تعبیر کرتے ہیں[1]، کیوں کہ وہ عربی (فارسی) کے اثرات کو تو ظاہر کرتے ہیں، مگر صوتیات کے اصول کے تحت زائدِ محض

---

[1] "مصمتوں کے سلسلے میں اُن زائد حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں اور جو ہمارے حروفِ تہجّی اور نظامِ درس کے لیے پیرِ تسمہ پا بنے ہوئے ہیں، میری مراد ذ، ض، ظ، ط، ث، ص، ح وغیرہ سے ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مُردہ لاشیں ہیں جنھیں اردو رسمِ خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اِس لیے کہ ہمارا رشتہ عربی سے ثابت رہے"۔

(ڈاکٹر مسعود حسین خاں: "اردو صوتیات کا خاکہ" رسالۂ اُردوے معلّٰی، لسانیات نمبر) ۔۔۔

ہیں ؛ اِس لیے کہ وہ کسی منفرد آواز کی نمایندگی نہیں کرتے ۔ مثلاً س ، ص ، ث ؛ اِن میں سے دُو حروف : ث اور ص کو فضول قرار دیا جائے گا ، کیوں کہ یہ تینوں حرف ایک ہی آواز کی نمایندگی کرتے ہیں ، اور وہ ایک آواز ، س سے ادا ہوتی ہے ۔ یہی صورت بعض اور حرفوں کی ہے ۔ اِس کے برخلاف ، حرفوں کو اصل ماننے کی وجہ سے ، اِن "زائد" حروف کی گنجایش ہے ، گنجایش ہی نہیں ، اہمیّت بھی ہے ؛ اور اِسی بنا پر اب تک یہ اُردو کے حروفِ تہجّی مانے جاتے ہیں ۔ علمی سطح پر سچّائی ، صوتیات کے پاس ہے اور اُس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا ؛ مگر عملی سطح پر روایت چھائی ہوئی ہے اور اِس کو بھی آسانی کے ساتھ نہ توڑا جا سکتا ہے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے ۔ بہت سے قاعدے قانون ، روایت کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہیں ، اور یہ بھی ایک قانون ہے ۔

ہائے مخلوط کے سلسلے میں بھی قاعدے اور روایت کا اختلاف نظر آتا ہے اور یہ اختلاف بھی ، حرف اور صوت کے اُسی اختلاف پر مبنی ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے ۔ صوتیات کے قاعدے کے مطابق بھ ، تھ وغیرہ مفرد آوازیں ہیں ، مگر روایت کی رُو سے (جو حرف کے تصوّر پر مبنی ہے) یہ مرکّب آوازیں ہیں جو ب اور ھ اور ت اور ھ کے اتصال سے وجود میں آئی ہیں ۔ روایت کے طاقت ور اثر کا یہاں بھی اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے اِن آوازوں کا ذکر کیا ہے ، وہ اُردو والوں کے اِس تصوّر کا ذکر کرنے پر بھی مجبور ہوئے ہیں ۔ اِس سلسلے میں ایک "پرانے استاد" اور ایک "نئے استاد" کے یہاں سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں ۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے ، قواعدِ اردو

میں لکھا ہے :

" اب تک اردو میں یہ سادہ حرف نہیں سمجھے جاتے تھے ، بل کہ اِن میں کا ہر حرف ، دو حرفوں کے میل سے ایک مرکّب آواز خیال کی جاتی تھی ۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ ابتدا میں ہم نے اپنی بول چال فارسی حروف میں لکھنی شروع کی ، فارسی عربی میں یہ آوازیں نہیں، اور نہ اِن کے لیے حروف ہیں ۔ ضرورت کے لیے اِن آوازوں کو دو دو حرفوں کے ذریعے سے ظاہر کرنا پڑا ۔ یوں تو یہ سادہ آوازیں ہیں ، مگر مل کر ایک ہو گئی ہیں "۔ (قواعدِ اردو ، فصلِ اوّل)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے ایک مضمون "اردو حروفِ تہجّی کی صوتیاتی ترتیب " میں لکھا ہے :

" صوتی نقطۂ نظر سے کھ ، چھ ، بھ وغیرہ علاحدہ اور مستقل آوازیں ہیں ، اِسی لیے ہندی رسم الخط میں اِن کے لیے مستقل اور علاحدہ حروف قائم کیے گئے ہیں (ख ، छ ، भ) ۔ اردو والوں نے " ہ " مخلوط کی مدد سے اِس مسئلے کو قدرے سہل بنا لیا ہے ، یعنی ک سے کھ ، ب سے بھ وغیرہ ۔ اور اِس طرح حروف کی تعداد کو محدود رکھّا ہے ، لیکن یہ سہل پسندی ، اِس صوتیاتی مغالطے کا باعث بن گئی ہے کہ " دھ " مرکّب ہے (د + ھ) ۔ جب کہ " دھ " جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے ، ایک مفرد آواز ہے "۔

اِن دو اقتباسات سے اِس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ اِن آوازوں کو اُردو والے اب تک مرکّبِ آوازیں سمجھتے آئے ہیں اور اِسی لیے اُنھوں نے " ہ " کا ایک خاص نام " ہائے مخلوط " رکھّا ہے اور اِسی لحاظ سے

اِس کی صورت (ڑھ) کا تعین کیا ہے۔

اِس سلسلے میں دو باتیں اور بھی قابلِ توجہ ہیں: ہندی میں اِن آوازوں کے لیے حرفوں کی مفرد شکلیں موجود ہیں، مگر رھ، لھ، مھ، نھ، کے لیے کوئی مفرد حرف نہیں ملتا۔ اردو میں اِن کی مثالیں یہ ہیں: تیرھواں، گیارھواں۔ کولھو، کُلھڑ۔ تمھارا، کمھار۔ ننھا، ننھیال ــــ "یھاں، وھاں" میں بھی ہائے مخلوط ہے، مگر اب یہ صورتیں متروک ہیں؛ اور اِن کی جگہ یہاں، وہاں اور یاں، واں، لکھتے اور بولتے ہیں۔ مگر "یھ" کی صورت کو بھی شاملِ فہرست ضرور کیا جائے گا، آواز تو یہ ہر طور ہے، اور آیندہ بعض اور الفاظ میں اِس کا دخل تو ہو سکتا ہے۔

اِن پانچ آوازوں میں بھی ہائے مخلوط ہے۔ "رھ"، "مھ" اور "نھ" میں اِس کا اثر ذرا ہلکا سہی، مگر ہے ضرور۔ اور "لھ" میں تو یہ بھرپور ہے، بالکل دوسری آوازوں کی طرح۔ تو اب ہندی میں اِن آوازوں کو کس طرح لکھا جائے گا؛ صاف بات ہے کہ ر، ل، م، ن کے بعد "ہ" کا ٹکڑا لکھیں گے۔ ہندی میں ایسی پانچ شکلوں کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، اور اُردو والے ایسی سب شکلوں میں "ھ" کی پیوندکاری کا یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اور جس طرح دو مستقل اور متعین حرفوں کو ترکیب دیتے ہیں، اُسی طرح اُن کو دو آوازوں سے مرکب سمجھتے بھی ہیں۔ "ب" اور "ھ" دو مستقل شکلیں ہیں، اِن کو "بھ" لکھا جاتا ہے، تو نظر "ب" اور "ھ" کی اُن مستقل شکلوں کو فراموش نہیں کر پاتی اور ذہن یہی سمجھتا ہے کہ "بھ" کی ایک آواز، دو ٹکڑوں کے میل کا نتیجہ ہے۔ صوتیات کا کہنا برحق، مگر روایت کے اِس اثر کا علاج بہت

مشکل ہے ۔ اردو میں بھی پہلے سے، اِن آوازوں کے لیے مفرد شکلیں ہوتیں، تو شاید یہ صورت پیدا نہیں ہو پاتی ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہندی کی طرح اُردو میں حروف بنیادی طور پر مفتوح نہیں مانے جاتے، یعنی ब (بَ) اردو میں صرف (ب) ہے؛ سوال یہ ہے کہ دھ، ڈھ، لھ، مھ (وغیرہ) کو تلفظ میں کس طرح لایا جائے گا۔

اِس میں کچھ ہرج نہیں کہ اِن آوازوں کے سلسلے میں روایت کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، جس طرح ہم آواز حرفوں والی روایت کو اُس کے حال پر چھوڑنا پڑا ہے ۔ اِس میں، مسعود حسین خاں کے قول کے مطابق "آسانی" ضرور ہے ۔

بہ ہرطور، اردو میں ہائے مخلوط والی آوازیں اور اُن کی تحریری صورت یہ ہے :

بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، رھ، ڑھ، کھ، گھ،
لھ، مھ، نھ، یھ ۔

ہائے مخلوط کو "دوچشمی ہ" بھی کہتے ہیں، اِس لیے کہ اِس کی شکل دو آنکھوں کے مجموعے کی سی ہوتی ہے (ھ) ۔ یہ صورت عربی سے آئی ہے۔ خطِ نسخ میں، اِس کی صورت میں یہ بیضاویت نہیں تھی (خطِ نسخ میں عام طور

لہ ذوق کا شعر یاد آگیا:

ہائے رے حسرتِ دیدار، مری "ہائے" کو بھی لکھتے ہیں ہائے دوچشمی سے، کتابت والے

(دیوانِ ذوق، مرتبہ آزاد۔ محبوب المطابع دہلی، ص ۱۹۲)

پر حرفوں میں چپٹھا پن ہوتا ہے)۔ عربی اور فارسی میں، ہندی کی طرح، ہکار آوازیں ہوتی ہی نہیں؛ اِس لیے وہاں یہ مسئلہ تھا ہی نہیں کہ کس آواز کے لیے، ہ کی کون سی شکل ہونا چاہیے۔ اردو میں، ہندی کے اثر سے، ہکار آوازیں ہیں اور بہت ہیں؛ اِس لیے قدرتی طور پر اُردو میں ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط کی صورتوں میں فرق ہونا چاہیے تھا، مگر ایک زمانے تک اِن دونوں کی کتابت میں لازمی سطح پر، امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا۔ اِس کی وجہ عربی فارسی کا اثر تھا۔ جس طرح اُن دونوں زبانوں میں ہ کی آواز کے لیے ہ اور ھ دونوں صورتوں کو یک ساں طور پر استعمال کیا جاتا تھا، اُسی طرح، بل کہ اِنھی زبانوں کی تقلید میں، اردو میں بھی اُن شکلوں کو کسی امتیاز کے بغیر استعمال کیا جاتا رہا، جب کہ اردو میں ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ایک زمانے تک اردو میں ہائے مخلوط اور ہائے ملفوظ کے لیے کسی ایک صورت کا تعین نہیں تھا۔ عام تحریروں کا کیا ذکر، لُغات میں بھی اِس کا عمل دخل تھا۔ مثلاً امیر مینائی کے لُغت امیر اللغات کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اُس میں صحتِ املا کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی ہے، اور عموماً الفاظ کا صحیح املا ملتا ہے۔ یہاں تک کہ ہمزہ اور ی اور الف و ہائے مختفی میں جس طرح کی غلط نگاریاں عام ہو گئی ہیں، اِس لُغت میں یہ سب بھی نہ ہونے کے برابر ہیں؛ مگر اِس اہتمام کے باوجود، اِس میں ہائے مخلوط اور ہائے ملفوظ کا امتیاز ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ کہیں کچھ ہے، کہیں کچھ۔

جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، فارسی میں "دو چشمی ھ" کی شکل، ہائے ملفوظ

کی جگہ عام طور پر استعمال میں آتی ہے ، اِس لیے کہ وہاں ہکار آوازیں موجود ہی نہیں ۔ فارسی کی کتابیں اب عام طور سے ٹائپ میں چھپتی ہیں اور ٹائپ میں ہ کی اِس شکل (ھ) کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے ۔ اردو ٹائپ میں بھی ، فارسی ٹائپ کی طرح " دوچشمی ھ " کی شکل کو کسی امتیاز کے بغیر استعمال کیا جاتا ہے ، اِس کا اثر یہ ہے کہ عام تحریروں میں بھی کبھی کبھی اِس بے امتیازی کی نمایش نظر آتی ہے ۔ " گھر " کو " گہر " اور " بھولنا " کو " بہولنا " " مجھ کو " کو " مجہکو " اور " ساتھ " کو " ساتہہ " (وغیرہ) لکھنا روا سمجھا جاتا ہے ۔

بیسویں صدی کے شروع سے اِس طرف توجّہ مبذول ہونا شروع ہوئی اور اب ہائے ملفوظ اور ہائے مخلوط کی تقسیم نے مسلّمہ قاعدے کی حیثیت حاصل کرلی ہے ، مگر پچھلی بے امتیازی کے اثرات اب تک کسی نہ کسی سطح پر اپنے آپ کو نمایاں کرتے رہتے ہیں ۔

فنِ خطّاطی میں بھی ہ کی اِن دونوں صورتوں میں امتیاز نہیں کیا جاتا تھا اور اِس سے بھی اِس بے امتیازی کو فروغ ملا ۔ خطّاطی میں املا کے نقطۂ نظر کی حیثیت ثانوی تھی ، وہ لوگ اِس بات کو اہمّیت دیتے تھے کہ نشستِ الفاظ کے لحاظ سے ، کہاں پر کس شکل یا کس اندازِ کشش کی ضرورت ہے ۔ خطّاطی کے اپنے قاعدے قانون ہیں ۔ پھر جب یہ بات ہے کہ املا ہی میں بے امتیازی کا عمل دخل تھا ، تو خطّاطی کی شکایت کیوں کی جائے ۔ البتّہ خطّاطی نے نسخ کی چپٹی (ھ) کو خوش نمائی عطا کی ، اِس کا شکریہ ادا کرنا واجب ہے ۔

اردو میں ، ہندی کے اثر سے ، ہکار آوازیں زبان کا جُز ہیں ۔ اِن آوازوں کے

لیے جن حرفوں کو استعمال کیا جاتا ہے ، اُن میں دوسرا جُز ہاے مخلوط کا ہوتا ہے۔ دو جُز مل کر ایک آواز کی تشکیل کرتے ہیں ۔ اُردو میں اِن آوازوں کے لیے مفرد حرفوں کی شکلیں موجود نہیں ، اِس لیے ھ کے پیوند سے ، اِن آوازوں کی تشکیل ہوتی ہے ؛ اِس بنا پر ، ہاے مخلوط اور ہاے ملفوظ کی شکلوں میں تفریق ، اور اُن کے استعمال میں امتیاز لازم ہے ۔ ذیل میں ہاے مخلوط سے متعلّق ضروری باتیں لکھی جاتی ہیں ۔

(۱)

جن لفظوں میں ایسے حرف ہوں جن میں ہاے مخلوط ، جزوِ حرف کی حیثیت رکھتی ہو ؛ اُن میں اِس کو ، ہاے ملفوظ کی طرح نہیں لکھا جائے گا ، بل کہ وہاں پر " دوچشمی ھ " لکھی جائے گی ۔ اِس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہکار آواز کے لیے ہمیشہ ھ کی شکل کو جُزوِ حرف کی حیثیت سے لکھا جائے گا ، جیسے : گھر ، اُدھار ، پیٹھ ، ساٹھ ، دھرنا ، اُبھرنا ، ڈھنگ بھنگ وغیرہ ۔

اگر ایسے لفظوں میں ہاے ملفوظ یا ہاے مختفی لکھی جائے گی ، جیسے : گہر یا ہاتہہ ؛ تو یہ غلط املا مانا جائے گا ۔

(۲)

جو لفظ ایسے حرفوں پر ختم ہوں جن کا آخری جُز ہاے مخلوط ہو ، تو اُس کے بعد ہاے مختفی کا اضافہ غلط ہوگا ، جیسے : " ہاتھ " کو " ہاتھہ " لکھنا ۔ ایسے لفظوں میں آخری صورت ہاے مخلوط کی ہوگی ، مثلاً :

ہاتھ ، دکھ ، مجھ ، تجھ ، سمجھ ، آنکھ ، دودھ ، بُدھ ، گِدھ ، بیٹھ ، پیٹھ ، سیٹھ ، سونٹھ

اِس غلط نگاری نے اچھی خاصی جگہ بنالی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اِس کی ذمّے داری بڑی حد تک خطّاطی کے سر آتی ہے۔ شاید اِس خیال سے کہ لفظ کا آخری حصّہ ناموزوں یا کم خوب صورت نہ لگے؛ ایسے لفظوں میں ایک ہاے مختفی لکھنے کا ڈول ڈالا گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ "ساٹھ" کے مقابلے میں "ساٹھہ" میں خوش نمائی زیادہ ہے، اور خطّاطی میں اصل حیثیت خوش نمائی کی ہے، اُس کی بنیاد ہی اِسی پر ہے؛ مگر اِس سے صحّتِ املا پر حرف آگیا۔ صحّتِ املا ہی نہیں، لفظ کی صحّت بھی تباہ ہوگئی، کیوں کہ "ساٹھہ" لکھنے کا مطلب تو یہ ہوگا کہ "ٹھ" پر زبر ہے، اور اِس زبر کے اظہار کے لیے ہاے مختفی کو لکھا گیا ہے (ساٹھَہ)۔ ہاے مختفی کا کام ہی یہ ہے کہ حرفِ ماقبل کے زبر کو نمایاں کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔

اُردو کے ٹائپ میں یہ بدعت عام ہے۔ ہاتھ کو "ہاتھہ" اور "آٹھ" کو "آٹھہ" اور "آنکھ" کو "آنکھہ" بنا دینا وہاں عام ہے۔ جب کہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ اِس کی سخت ضرورت ہے کہ اِس غلط نگاری اور غلط نمائی کی طرف خاص طور سے دھیان دیا جائے اور ہاے مختفی کے اِس فالتو بل کہ غلط جوڑ کو قطعاً ختم کردیا جائے۔

(۳)

بہت سے لفظ (اِن میں اسم، مصدر، مشتقات سبھی شامل ہیں) ایسے ہیں جن میں دو ہاے مخلوط لکھی جاتی تھیں۔ لُغات میں بھی اور عام تحریر میں بھی ایسے لفظ کبھی دو ہاے مخلوط کے ساتھ اور کبھی صرف ایک ہاے مخلوط کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ عدمِ تعیّن کی وجہ سے، ایسے

لفظوں کے املا میں بڑی اُلجھن کا سامنا ہوتا ہے۔

لُغات کے باہمی اختلافات کا اندازہ، صرف تین مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے: (۱) نورؔ میں "بھنبھوڑنا" ہے، اور آصفیہؔ میں اِس کو صرف ایک ہائے مخلوط کے ساتھ "بھنبوڑنا" لکھا گیا ہے۔ (۲) اِسی طرح نورؔ میں "بھنبھیری" ہے، اور آصفیہؔ میں "بھنبیری"۔ (۳) نورؔ میں "بھوبھل" ہے اور آصفیہ میں "بھوبل"۔

یا جیسے: آصفیہؔ میں "پھپولا" اور "پھپولے" ہے، اور نورؔ میں "پھپھولا" اور "پھپولا" دونوں صورتیں ایک ہی جگہ ملتی ہیں اور صراحت یا ترجیح کا ذکر نہیں۔

یا جیسے: آصفیہؔ میں، عام تحریر کے مطابق، "بھابی" کو ایک ہائے مخلوط کے ساتھ لکھا گیا ہے؛ نورؔ میں اِس کو "بھابھی" لکھا گیا ہے۔ اور لطیفہ یہ ہے کہ "بھابھی" کے آگے قوسین میں، اِس لفظ کا تجزیہ اِس طرح کیا گیا ہے: (بھا: بھائی۔ بی: زوجہ۔) اِس تجزیے کے بعد کہ یہ لفظ "بھا" اور "بی" سے مرکّب ہے، اِس کو "بھابھی" لکھنے کا کیا جواز ہے؟

یا مثلاً: نورؔ میں "اڑتیس" کی ایک صورت "اڑھتیس" اور "اڑتالیس" کی ایک صورت "اڑھتالیس" بھی بتائی گئی ہے، جب کہ آصفیہؔ میں دونوں گنتیاں ہائے مخلوط کے بغیر (اڑتیس، اڑتالیس) لکھی گئی ہیں۔

یا اِس سے ذرا مختلف ایک مثال: نورؔ میں "پودا" اور "پودھا" دونوں صورتیں ملتی ہیں۔ آخری صورت، قدیم اور اب متروک ہے، اب صرف ایک املا "پودا" مانا جائے گا۔

کچھ لفظ عام تحریر اور لُغات میں مختلف الصّورت ہیں، جیسے: "بھبھوت"

اور "بھبھوکا"، مطبوعات میں دو ہائے مخلوط کے ساتھ بھی ملتے ہیں اور ایک ہائے مخلوط کے ساتھ بھی۔ نور و آصفیہ دونوں میں اِن دونوں لفظوں کو صرف ایک ہائے مخلوط کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

زیادہ مشکل اِسی لیے ہوتی ہے کہ بہت سے لفظوں کو لغات میں دو طرح لکھا گیا ہے اور نہ وضاحت ہے، نہ ترجیح کا ذکر ہے۔ صرف نوراللغات سے ایسی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مندرجۂ ذیل الفاظ کو نور میں دونوں طرح لکھا گیا ہے:

بھٹی، بھٹھی۔ پھپولا، پھپھولا۔ پھوپی، پھوپھی۔ ٹھاٹ، ٹھاٹھ۔
ٹھاٹر، ٹھاٹھر۔ ٹھٹرنا، ٹھٹھرنا۔ ٹھٹا، ٹھٹھا۔ ٹھٹ، ٹھٹھ۔
ٹھٹول، ٹھٹھولیاں۔ ٹھیٹ، ٹھیٹھ۔ ٹھینٹی، ٹھینٹھی۔
ڈھیٹ، ڈھیٹھ۔ گھگل، گھگھل۔ جھنجوڑنا، جھنجھوڑنا۔ جھنجلانا،
جھنجھلانا۔ گھنگور، گھنگھور۔ گھونگا، گھونگھا۔

ہوا یہ ہے کہ بہت سے لفظ جن میں دو ہائے مخلوط جمع ہو گئی تھیں، استعمالِ عام میں رفتہ رفتہ اُن کی دوسری ھ کم زور پڑتی گئی، یہاں تک کہ اب اُس ھ کی آواز نہ ہونے کے برابر رہ گئی۔

اِس سلسلے میں دو باتیں ملحوظ رہنا چاہیے: پہلی بات یہ کہ یہ عمل اُن لفظوں پر پوری طرح اثر انداز ہوا جو بہ ظاہر دو اجزا کا مجموعہ نہیں تھے۔ جن لفظوں کی بناوٹ میں دو اجزا کو دخل تھا، اُن پر یہ عمل اثرانداز نہیں ہو سکا۔ مثلاً: "بھنبھیری"، "بھنبیری" بن گیا، مگر "بھن بھنانا"، "بھن بنانا" نہیں بن سکا۔ "جھن جھن" اُسی طرح رہا، "جھن جھنا" بھی ویسا ہی ہے اور "تھل تھلانا" پر بھی اثر نہیں پڑا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جن مفرد یا مفرد نما لفظوں میں سے ایک ہائے مخلوط نکل گئی، وہ دوسری ھ تھی۔ پہلی ھ برقرار رہی۔ ایسا یوں ہوا کہ تلفظ کا زور پہلی ھ پر مرتکز ہوکر رہ گیا، اور اِس ایک ھ نے، صوتی سطح پر، لفظ کے بھاری پن کو اِس طرح برقرار رکھا کہ دوسری ھ کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اِس وجہ سے وہ تلفظ کے لازمی جُز کی حیثیت سے باقی نہیں رہ سکی۔ بے ضرورت چیز رفتہ رفتہ اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے۔

جن لفظوں کی بناوٹ بہ ظاہر دو ٹکڑوں پر مشتمل تھی؛ اُن میں تلفظ کے لحاظ سے ہر ٹکڑے کی حیثیت یک ساں سطح پر باقی رہی۔ تلفظ میں پہلے ٹکڑے کے ختم پر آواز خفیف سے دباو یا کھٹکے کے ساتھ رُکتی ہے اور پھر دوسرا ٹکڑا تلفظ میں آتا ہے (جھَل جھَل۔ بھِن بھِن۔ کھِل کھِلانا)، اِس طرح صوتی سطح پر بھاری پن کے لیے، دونوں ہائے مخلوط کی مساوی حیثیت اور ضرورت برقرار رہی۔

اِس نظر سے دیکھیے تو ایسے لفظوں کے متعلق فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہ بات پہلے کہی جاچکی ہے کہ لُغات اور عام تحریروں میں کچھ لفظ دو ہائے مخلوط کے ساتھ ملتے ہیں، اور کچھ صرف ایک ہائے مخلوط کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ایسا بھی ہے کہ ایک ہی لفظ، کہیں ایک طرح ہے، کہیں دوسری طرح۔ اِس اختلاف، پچھلے اندازِ نگارش اور اُس سے متعلق بحثوں سے قطعِ نظر کرکے، اب ایسے لفظوں میں یہ تعین ضروری ہے کہ کس لفظ میں ایک ھ لکھی جائے اور کس لفظ میں دو ھ لکھی جائیں۔ اور اِس تعین کے لیے صحیح طریقہ کار یہی ہوگا کہ جو لفظ بہ ظاہر دو اجزا پر مشتمل ہیں، اُن میں دونوں ھ باقی رہیں۔ جن مصادر میں دو ھ

مانی جائیں گی، اُن کے مشتقات میں بھی وہ اُسی طرح باقی رہیں گی۔ باقی لفظوں میں ایک ھ لکھنے کو ترجیح دی جائے گی۔ مستثنیات سے بحث نہیں۔

ایسے لفظوں کی نا تمام فہرست یہ ہے:

(الف) ایسے لفظ جن میں ایک ہائے مخلوط لکھی جائے گی۔

بھابی۔ بھبڑ۔ بھبک۔ بھبکنا۔ بھبکا۔ بھپکا۔ بھبکی۔ بھبوت۔ بھبوکا۔ بھبکانا۔ بھنبوڑنا۔ بھنبیری۔ بھپارا۔ بھٹی۔ بھکاری۔ بھیک۔ بھوبل۔ بھجنگا۔ بھجیا۔ پھپس۔ پھپولا۔ پھپولے۔ پھپوندی۔ پھوپا۔ پھوپی۔ پھپھی۔ پھیپھڑا۔ تھتانا۔ تھوتن۔ تھوتنی۔ ٹھسڑنا۔ ٹھٹکنا۔ ٹھاٹ۔ ٹھاٹر۔ ٹھٹ۔ ٹھٹا۔ ٹھٹک۔ ٹھٹول۔ ٹھٹولی۔ ٹھٹیرا۔ ٹھڈا۔ ٹھڈی۔ ٹھونٹ۔ ٹھنٹ۔ ٹھنڈ۔ ٹھنڈا۔ ٹھیٹ۔ ٹھینٹی۔ چھچھڑا۔ چھچلا۔ چھچورا۔ چھچوندر۔ چھوچک۔ جھانج۔ جھانجن۔ جھجر۔ جھجکنا۔ جھجک۔ جھروکا۔ جھنجری۔ جھنجلانا۔ جھنجلاہٹ۔ جھنجوڑنا۔ جھنجی (کوڑی)۔ چھچلنا۔ چھچلتی۔ چھیچالیدر۔ دھند۔ دھندلا۔ دھندلکا۔ ڈھنڈورا۔ ڈھنڈوریا۔ ڈھونڈنا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ۔ ڈھیٹ۔ ڈھنڈار۔ کھکل۔ کھوکلا۔ کھک۔ کھکوڑنا۔ کھکیڑ۔ کھنکارنا۔ کھنکار۔ کھنکنا۔ گھگو۔ گھگی۔ گھگیانا۔ گھونگٹ۔ گھونگا۔ منجدھار۔ گھنگرو۔ گھنگچی۔ گھنگرالے۔ گھنگریا۔ گھینگرا۔ گھنگنیاں۔ گھنگولنا۔ گھونگر۔

(ب) ایسے لفظ جن میں دونوں ہائے مخلوط لکھی جائیں گی:

بھائیں بھائیں۔ بھڑ بھڑانا۔ بھڑ بھڑ۔ بھڑ بھڑیا۔ بھڑ بھونجا۔ بھر بھرا۔ بھر بھرانا۔ بھر بھراہٹ۔ بھر بھری۔ بھر بھر۔ بھر بھر جلنا۔ بھن بھنانا۔

بھن بھن ۔ بھن بھناہٹ ۔ بھق بھق ۔ بھقر بھقر ۔ بھل بھلانا ۔ بھل بھل ۔
بھل بھل ۔ بچ بچ ۔ بچا بچ ۔ بچ بچانا ۔ پھڑ پھڑانا ۔ پھس پھس پھس پھسا
پھسر پھسر ۔ پھٹ پھٹانا ۔ پھٹ پھٹ ۔ پھٹ پھٹیا ۔ پھد پھدانا ۔
پھر پھرانا پھڑ پھڑانا ۔ پھڑ پھڑاہٹ ۔ پھل جھڑی ۔ چھل چھل چھل چھلانا ۔
تھر تھرانا ۔ تھر تھری ۔ تھک تھکانا ۔ تھل تھلانا ۔ تھل تھل ۔ چھم چھم ۔
چھن چھن ۔ پھن پھنانا ۔ چھو چھو ۔ تھئی تھئی ۔ تھکم تھکا ۔ ٹھسا ٹھس ۔
ٹھن ٹھنا ۔ ٹھن ٹھن ۔ جھر جھرا ۔ جھر جھری ۔ جھک جھک ۔ جھکا جھک ۔
جھل جھل (پتنگ کی) جھل جھلانا ۔ جھل جھل ۔ جھل جھلاہٹ ۔ جھما جھم ۔
جھن جھناہٹ ۔ جھن جھنانا ۔ جھن جھنا ۔ جھن جھنیاں ۔ جھن جھن ۔
دھک دھک ۔ دھڑا دھڑ ۔ دھک دھکی ۔ دھل دھل ۔ دھل دھلانا ۔
کھٹ کھٹانا ۔ کھٹ کھٹ ۔ کھچا کھچ ۔ کھن کھنانا ۔ کھن کھنا ۔ بھیڑ بھڑکا ۔
گھمر گھمر ۔

(۴)

کچھ متفرق لفظ ، (الف) :

مجھ ، تجھ : یہ دونوں لفظ اب ہائے مخلوط کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں مگر ان کا ایک پرانا املا "مج ، تج" بھی ہے ، جو اب متروک ہو چکا ہے ۔ مگر "مجھ سے" اور "تجھ سے" اور "مجھ کو" اور "تجھ کو" کو کبھی تو قاعدے کے مطابق ہائے مخلوط کے ساتھ لکھا جاتا ہے اور کبھی ہائے مخلوط کے بغیر "مجسے" ، "تجسے" ، "مجکو" ، "تجکو" لکھا جاتا ہے ۔ یہ دورنگی ٹھیک نہیں ۔ اِن لفظوں کو صرف ہائے مخلوط کے ساتھ لکھا جائے گا ۔

یعنی : (حاشیہ ص ۳۳۲ پر)

مجھ، مجھ سے، مجھ کو، مجھ میں، مجھ پر ۔ تجھ، تجھ سے، تجھ کو، تجھ میں، تجھ پر ۔

سرھانا : آصفیہ میں "سرہانا" لکھا گیا ہے اور س پر زیر اور ر پر جزم لگا ہوا ہے ۔ مثال میں آتش و داغ کے یہ شعر لکھے گئے ہیں :

عشق ہے آنکھوں کو تلووں سے مجھے ملنے کا ۔۔۔ پائنتی یار کی، ہو میرا سرہانا شب وصل

(آتش)

تیرے مہجور کے پہلو ہی میں پائے ہم نے ۔۔۔ سر بستر کبھی تکیے نہ سرہانے پائے

(داغ)

مگر ان دونوں شعروں میں یہ لفظ، بہ ہائے ملفوظ نہیں، بہ ہائے مخلوط آیا ہے۔ استعمالِ عام میں بھی یہی صورت ہے کہ اِس کو "سرھانا" بولا جاتا ہے۔ لکھنے میں البتہ کبھی "سرھانا" لکھتے ہیں اور کبھی "سرہانا" ۔ مگر یہ وہی کم احتیاطی ہے، جو ایسے اور لفظوں میں بھی دیکھنے میں آتی رہتی ہے ۔

اِس لفظ میں ہائے مخلوط لکھی جائے گی : سرھانا، سرھانے، جیسے :

سرھانے میر کے کوئی نہ بولو ۔۔۔ ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

۱؎ عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب کے حواشی میں لکھا ہے :

"میرزا صاحب تلفظ کے اتباع میں "مجکو" بہ حذفِ ہائے مخلوط لکھا کرتے ہیں ۔ اُن کے دیوانِ اردو کے اُس نسخے میں بھی، جو نواب فخر الدین خاں مرحوم کا نوشتہ ہے، "مجکو" اور "مجسے" تحریر ہے ؛ مگر میں نے صحیح املے کو ترجیح دیتے ہوئے، ہر جگہ "مجھ کو" بنا دیا ہے "۔

(مکاتیبِ غالب، اشاعتِ ششم، ص ۱۲۲)

ہاں نوَر میں اِس کو صحیح طور پر "سرھانا" لکھا گیا ہے ۔

تمھارا : تمھارا ، تمھاری ، تمھارے ؛ یہ سب بہ ہاے مخلوط ہیں ۔ مگر جس طرح "سرھانا" کو "سرہانا" لکھ دیا جاتا ہے ، اُسی طرح اِن لفظوں کو بھی "تمہارا' تمہارے ، تمہاری " لکھ دیتے ہیں ۔ نوَر میں اِن لفظوں کو بہ ہاے مخلوط ہی لکھا گیا ہے ، مگر " تمہارا سر " ، " تمہارا " ، " تمہارے " بھی نظر آتے ہیں ۔ یہ وہی بات ہے کہ بعض لفظوں کو دونوں طرح لکھنے کی عادت پڑ گئی ہے ۔

اِن سب لفظوں کو ہاے مخلوط کے ساتھ لکھا جائے گا : تمھارا ۔ تمھاری ۔ تمھارے ۔

اِسی طرح " اُنھیں " اور " اِنھیں " بھی بہ ہاے مخلوط مستعمل ہیں ، مگر آصفیہ میں " اُنہیں " اور " اِنہیں " لکھا گیا ہے ۔

یہ واقعہ ہے کہ " سرہانا " اور " تمہارا " جیسے لفظوں میں تلفّظ کی ایک ہلکی سی کیفیت ، کبھی کبھی ہاے ملفوظ کا دھوکا سا ضرور دیا کرتی ہے ، یہ بھی ممکن ہے کہ کسی نے کبھی اِن کو بہ ہاے ملفوظ استعمال بھی کیا ہو ؛ مگر عام استعمال میں یہ صرف بہ ہاے مخلوط ہیں ، نظم اور بول چال دونوں میں بہ ہاے مخلوط استعمال کیے جاتے ہیں ۔ اور اِسی طرح استعمال کرنا بھی چاہیے ۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں :

تمھارا ، تمھاری ، تمھارے ــ سرھانا ، سرھانے ــ اُنھیں ، اِنھیں ــ تمھیں ــ کُلھاڑی ، کُلھاڑا ــ منھیار ، منھیاری ، منھیارن ۔ اٹھتّر ، اُنھتّر ۔

(ب) ... لفظ ایسے ہیں جن میں کبھی ایک ہاے مخلوط بھی لکھی جاتی

تھی، مگر اب یہ لفظ عام طور پر ھ کے بغیر ہی مستعمل ہیں۔ چند لفظوں میں اِس کے برعکس صورت پائی جاتی ہے۔ لُغات میں اِن کے دونوں املا ملتے ہیں۔ ایسے بعض لفظ موضوعِ بحث بھی رہے ہیں۔ بہ ہر صورت، اِن کی ایک ہی صورت کو اختیار کرنا چاہیے۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

چیب: آصفیہ میں اِس کو "جیب یا جیبھ" لکھا گیا ہے، مگر کسی طرح کی صراحت نہیں کی گئی ہے، مگر اِس کے متعلقات میں ہر جگہ "جیب" لکھا گیا ہے، اِس سے ترجیح کا مبہم سا اندازہ ہوتا ہے۔

اِس کے برخلاف نور میں اِس کا صرف ایک املا "جیبھ" ملتا ہے۔ اِس کے متعلقات میں بھی اِس لفظ کو اِسی طرح لکھا گیا ہے۔

"جیبھ" پُرانا املا ہے۔ اب یہ لفظ گفتگو اور تحریر دونوں میں ھ کے بغیر مستعمل ہے، اِس لیے اِس کا املا "جیب" مانا جائے گا۔

ہونٹ: یہ لفظ معرضِ بحث میں رہا ہے۔ جلاؔل نے سرمایہ میں لکھا تھا:

"ہونٹ، واو مجہول اور نونِ غنّہ سے، لب کا ترجمہ۔ اِس لفظ کے آخر میں جو بعضے ہاے مخلوط التلفّظ بڑھا کر "ہونٹھ" بولتے ہیں، مولّفِ ہیچ مداں کے عندیے میں نادرست ہے"۔

جلاؔل کے ایک حریف شوقؔ نیموی نے اپنے رسالے اصلاح میں لکھا تھا:

"ہونٹ کے آخر میں متقدمین ہاے مخلوط التلفّظ بھی لکھا کرتے تھے، اور ناسخؔ وغیرہ یہ لفظ ردیفِ ہا میں لائے ہیں۔ مگر فی زمانِنا بعضے بغیر ہاے مخلوط لکھتے ہیں"۔

پھر اِس کے حاشیے ایضاح میں، جلاؔل کے مندرجۂ بالا قول کا حوالہ دے کر لکھا ہے:

"میں کہتا ہوں کہ جب ناسخ وغیرہ نے استعمال کیا ہے ، اور آج تک اہلِ زبان "ہونٹھ" بولتے ہیں ، تو نادرست کیوں ہونے لگا"۔

یادگارِ وطن میں بھی شوق نے اِس بحث کو اٹھایا ہے اور وہاں ناسخ وقلق کے یہ شعر سند میں پیش کیے ہیں :

اے گل جو تو نے پان چبا کر دکھائے ہونٹھ   حسرت سے کیا ہی غنچۂ گل نے چبائے ہونٹھ
(ناسخ)

دانتوں سے جب کہ اُس گلِ تر کے دبائے ہونٹھ   بولا کہ صاحب! اپنے سے سمجھو پرائے ہونٹھ
(قلق)

آصفیہ میں شروع میں "ہونٹ یا ہونٹھ" لکھا ہوا ہے ، مگر اِس کے جملہ متعلّقات میں یہ لفظ "ہونٹھ" لکھا گیا ہے ، اِس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ مولّف کے نزدیک مرجّح صورت "ہونٹھ" ہے ۔

نور میں "ہونٹ ، ہونٹھ" دونوں کو لکھا گیا ہے۔ مگر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ "بغیر ہ کے اب فصیح سمجھا جاتا ہے"۔ یہی بات ٹھیک ہے ۔ اب اِس کا املا "ہونٹ" ماننا چاہیے ۔

تڑپنا : "تڑ ہنا" غالب کے زمانے تک مستعمل رہا ہے۔ خود غالب اِس کو مع ھ لکھا کرتے تھے۔ آصفیہ میں بھی "تڑپ یا تڑپھ" لکھا ہوا ہے ، مگر

---

[1] مولانا امتیاز علی عرشی نے مکاتیبِ غالب کے مقدمے میں لکھا ہے :

"ہائے مخلوط کی کتابت میں شاید فصحائے دہلی کے تلفظ کا لحاظ زیادہ رکھا ہے ، چناں چہ تڑپنا میں ، اُن کے نزدیک بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التّلفّظ ضرور ہے"۔ (ص ۲۲۹)

اِس کے اور متعلقات کو ھ کے بغیر لکھا گیا ہے۔
اب اِس لفظ کا املا تڑپنا، ھ کے بغیر مانا جائے گا۔ اب یہ اِسی طرح مستعمل ہے۔
جانگ، جانگیا: نور میں "جانگ" اور "جانگھ" دونوں املا ملتے ہیں، البتہ "جانگیا" کو ھ کے بغیر ہی لکھا گیا ہے۔
آصفیہ میں اِس کا ایک املا "جانگھ" ملتا ہے۔ "جانگھیا" بھی مع ھ لکھا گیا ہے، مگر اِس کے ساتھ ہی یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ: "بولنے میں جانگیا آتا ہے"۔
ہونٹ وغیرہ کی طرح "جانگ" کا املا بھی ھ کے بغیر ماننا چاہیے۔ "جانگیا" تو ھ کے بغیر مان ہی لیا گیا ہے۔
جھوٹ، ٹھنڈ، بھیک: یہ تینوں لفظ، آخر میں ہاے مخلوط کے اضافے کے ساتھ بھی کبھی استعمال کیے گئے ہیں۔ اور اِسی کا اثر ہے کہ اب بھی کبھی اِن کا املا مع ہاے مخلوط دیکھنے میں آجایا کرتا ہے (جھوٹھ، ٹھنڈھ۔ بھیکھ۔ بھکھاری)۔ رسالۂ اصلاح میں "ٹھنڈھا" کی خاص طور پر تغلیط کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اِس لفظ کو مع ہاے مخلوط لکھ دیا کرتے تھے۔ اور اِسی غلط نگاری کا غالباً یہ اثر ہے کہ نور میں اِس کے دونوں املا ملتے ہیں: "ٹھنڈ۔ ٹھنڈھ"۔ اگرچہ اِس کے سارے متعلقات کو "ٹھنڈ" کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مگر بہ طورِ لغت "ٹھنڈھ" کا اندراج غلط فہمی ضرور پیدا کرتا ہے۔ آصفیہ میں صرف "ٹھنڈ" اور "ٹھنڈا" ہے۔
اِن لفظوں کے آخر میں ھ نہیں لکھی جائے گی، یعنی: جھوٹ، جھوٹا۔

ٹھنڈ، ٹھنڈا، ٹھنڈک ۔ بھیک، بھکاری ۔

پیچ : (چاولوں کا پساو)، نور و آصفیہ دونوں میں اِس کو دو طرح لکھا گیا ہے : "پیچ، پیچھ"۔ استعمالِ عام میں یہ لفظ ھ کے بغیر آتا ہے۔ مثل ہے : "پیچ پی، ہزار نعمت کھائی"۔

اب اِس لفظ کا املا ھ کے بغیر "پیچ" مانا جائے گا۔

پودا : نفس اور سرمایہ میں "پودھا" ملتا ہے ۔ بل کہ سرمایہ میں تو صراحت بھی کردی گئی ہے کہ : "پودھا، دالِ مہملہ مخلوط الہا و الف کے ساتھ"۔

نور میں الگ الگ اِس کی دونوں صورتیں ملتی ہیں : "پودا"۔ "پودھا"۔ گویا مولف کے نزدیک دونوں صورتیں مستعمل ہیں ۔ البتہ آصفیہ میں اِس کی صرف ایک صورت "پودا" ملتی ہے ۔

اب عام طور پر "پَود" اور "پودا" بولتے اور لکھتے ہیں، اِس لیے اِن دونوں لفظوں کا یہی املا ماننا چاہیے ۔

کوند، کوندا : نور میں "کوندا" اور "کوندھا" دونوں املا ملتے ہیں۔ اِسی طرح "کوند" اور "کوندھ"۔ آصفیہ میں "کوندا" ھ کے بغیر لکھا گیا ہے ۔

یہ دونوں لفظ آج کل استعمالِ عام میں ھ کے بغیر آتے ہیں، اور اب اِن کو اِسی طرح لکھنا چاہیے ، یعنی : کوند، کوندا، کوندنا۔

گبرو : نور میں اِس کو مع ھ اور بغیر ھ ، دونوں طرح لکھا گیا ہے : "گبرو۔ گبھرو"۔ البتہ آصفیہ میں اِس کی ایک صورت "گبرو" ملتی ہے ؛ اور اب اِس کا یہی املا مانا جائے گا ۔

(ج) اِس قبیل کے بعض لفظ ایسے بھی ہیں جن کو مع ہائے مخلوط مرجّح ماننا چاہیے۔ جیسے :

گورکھ دھندا : نور میں اِس کے پہلے جُز کو "ھ" کے بغیر لکھا گیا ہے : "گورک دھندا"۔ البتّہ آصفیہ میں دونوں اجزا کو مع ہائے مخلوط لکھا گیا ہے : "گورکھ دھندا"۔ موٴلفِ آصفیہ نے وضاحت بھی کی ہے کہ :

"یہ لفظ گورکھ، یعنی گورکھ ناتھ، اور دھندا، بہ معنی شغل سے مرکّب ہے"۔

سماعت میں یہ لفظ دونوں ہائے مخلوط کے ساتھ آتا ہے۔ جیسا کہ اِس سے پہلے لکھا جاچکا ہے، ایسے جو الفاظ دو اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں، تو بالعموم اُن کے دونوں جُزوں میں ہائے مخلوط لکھی جاتی ہے، اِس لیے کہ تلفّظ میں، دونوں ٹکڑوں میں ہائے مخلوط واضح طور پر آتی ہے۔

اِس لفظ کا املا "گورکھ دھندا" مانا جائے گا۔

سُدھ بُدھ : یہی صورت اِس مرکّب کی ہے۔ یہ بھی دو اجزا پر مشتمل ہے۔ اصلاً دونوں ٹکڑوں میں ہائے مخلوط ہے۔ تلفّظ میں بھی یہ برقرار رہتی ہے۔ نور میں "سدبد" لکھ کر لکھا ہے : "دیکھو سدھ بدھ"۔ مطلب تو موٴلف کا یہی ہے کہ لفظ "سدھ بدھ" ہے، مگر اِس لفظ کے اِس اندراج سے یہ احتمال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شاید ایک صورت یہ بھی ہو۔

آصفیہ میں اِس کی صرف ایک صورت "سدھ بدھ" ملتی ہے، اور یہی صحیح ہے۔ مفرد لفظ "سدھ" بھی مع ہائے مخلوط ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ میرحسن نے ایک خاص انداز سے اِس لفظ کو نظم کیا ہے :

نہ سدھ، بدھ کی لی اور نہ منگل کی لی   نکل شہر سے، راہ جنگل کی لی

سانٹھ گانٹھ : لغات میں " سانٹ " اور " سانٹھ " دونوں صورتیں ملتی ہیں۔
مصدر ہے : سانٹھنا ۔جب یہ لفظ " گانٹھ " کے ساتھ آئے گا تو اِس کو
بھی لازماً مع ہائے مخلوط لکھا جائے گا ۔ یعنی دونوں اجزا میں ہائے
مخلوط آئے گی : سانٹھ گانٹھ ۔

نور میں " سانٹھ ملانا " کے تحت یہ شعر لکھا ہوا ہے :

ماں جو اُس حور کی تھی بِس کی گانٹھ گھر میں سب سے ملا رہی تھی سانٹھ

رگھا : فارسی کا لفظ " کارگاہ " ہے ، اُس کا مخفف ہوا : کارگہ ۔ اِسی کی ایک
صورت ہوئی : کرگہ ۔ اِسی رعایت سے ، آصفیہ میں اِس کا یہی املا
ملتا ہے : " کرگہ ۔ کارگاہ ۔ وہ گڑھا جہاں جُلا ہے بیٹھ کر کپڑا بُنتے ہیں "۔
نور میں اِس کو " کرگا " لکھا گیا ہے ۔ اِس کا یہی املا نفائس میں ملتا
ہے ۔ تلفظ میں اب ، گاف کے بعد ہ کی آواز لازمی طور پر آتی ہے ،
مگر اِس فرق کے ساتھ کہ ہائے ملفوظ کی جگہ ، ہائے مخلوط نے لے لی
ہے ، یعنی بول چال میں " کرگھا " آتا ہے ۔ اِس بِنا پر ، اب اِس لفظ
کا یہی املا (کرگھا) ماننا چاہیے ۔

گھچ پچ : آصفیہ و نور دونوں میں پہلے جُز کو مع ھ اور بغیر ھ ، دونوں طرح لکھا
گیا ہے : گچ پچ ۔ گھچ پچ ۔ سماعت میں پہلا ٹکڑا مع ہائے مخلوط آتا ہے۔
اِس کی صوتی حیثیت متقاضی ہے کہ اِس کا املا " گھچ پچ " مانا جائے ۔

چُبھنا : چبھن ، چبھونا ، چبھنا وغیرہ مع ہائے مخلوط ہی تلفظ میں آتے ہیں۔
نور میں اِن سب کو مع ہائے مخلوط ہی لکھا گیا ہے ، مگر آصفیہ میں
اِن کو ھ کے بغیر " چُبنا ، چبونا ، چُبانا " لکھا گیا ہے ۔ مولف نے ہر جگہ
مصدر و مشتقات کو ھ کے بغیر لکھا ہے ، جیسے : " پھانس چُبنا "۔ مگر یہ

استعمالِ عام کے خلاف ہے۔
مصادر و مشتقات، سب کو صرف مع ہائے مخلوط لکھا جائے گا: چبھن، چبھنا، چبھونا۔

ہاتھ، ہتھ: "ہاتھ" کے آخر میں متفقہ طور پر ہائے مخلوط ہے۔ شاعروں نے اِس کو بات، رات کا ہم قافیہ کیا ہے، مگر یہ استعمال شاعری تک محدود رہا، اصل لفظ پر اثر نہیں پڑا۔

اِس کا مخفف "ہتھ" ہے۔ یہ کئی مرکبات کا پہلا جز ہوتا ہے۔ اصولاً ایسے سب مرکبات میں "ہتھ" لکھا جانا چاہیے، مگر استعمالِ عام میں، بعض مرکبات میں ھ ساقط ہو کر رہ گئی ہے۔ لُغات میں بھی اِس اختلاف کا سراغ ملتا ہے، مگر صراحت کے ساتھ نہیں۔ بس اِس حد تک کہ ایسے بعض مرکبات کو مع ھ اور بغیر ھ، دونوں طرح لکھ دیا گیا ہے، اور بعض مرکبات کو صرف مع ھ لکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ استعمال میں یہ مرکبات دونوں طرح آتے رہے ہیں[1]، مگر بعض میں ہائے مخلوط کے نہ ہونے نے، ترجیح حاصل کر لی ہے۔

وہ مرکبات جن میں ہائے مخلوط شامل رہی ہے اور اب بھی شامل رہنا چاہیے، یہ ہیں:

ہتھ پھول۔ ہتھ پھیری۔ ہتھ چھُٹ۔ ہتھ نال۔

درجِ ذیل مرکبات میں بھی پہلا جُز "ہتھ" ہے، مگر یہ اب مفرد لفظوں کی طرح بن کے رہ گئے ہیں، یعنی اِن کی ترکیبی بناوٹ اِس طرح نمایاں

---

[1] صندل سی وہ کلائیاں، اپنے گلے میں ہوں   ہتھ پھیریاں نصیب ہوں چندن سی ران پر (رضا)

نہیں رہی، جس طرح مندرجۂ بالا مرکّبات میں نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
اِن الفاظ میں ہائے مخلوط کا وجود، رفتہ رفتہ معدوم کی حد تک پہنچ گیا۔
یہ لفظ ہیں۔
ہتیلی۔ ہتیار۔ ہتکڑی۔
آصفیہ میں " ہتیلی، ہتھیلی " دونوں طرح لکھا گیا ہے، یہاں توصراحت
کا پتا نہیں چلتا، مگر اِس کے جملہ متعلّقات میں " ہتیلی " لکھا گیا ہے،
اِس سے ترجیح کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نور میں بھی اِس کو دونوں
طرح لکھا گیا ہے۔ متعلّقات اور عبارت میں کہیں " ہتیلی " ہے اور کہیں
" ہتھیلی "۔ مگر " ہتھیلی " کے ذیل میں لکھا ہے: " دیکھو ہتیلی "۔ اِس
سے یہ ضرور خیال کیا جا سکتا ہے کہ موئّف کی نظر میں مرجّح لفظ
" ہتیلی " ہے۔
" ہتیار " کو آصفیہ میں اصل کے مطابق " ہتھیار " لکھا گیا ہے، مگر نور میں
" ہتھیار "، " ہتیار " دونوں املا ملتے ہیں۔
" ہتکڑی " کو آصفیہ میں " ہتکڑی یا ہتھکڑی " لکھا گیا ہے۔ نور میں بھی
دونوں املا ملتے ہیں۔
جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، اِن الفاظ کا املا ہائے مخلوط کے بغیر مرجّح مان
لینا چاہیے، یعنی: ہتکڑی۔ ہتیار۔ ہتیلی۔
ہتیا لینا: اِس کی اصل صورت ہے: ہتھیا لینا۔ اِسی طرح " ہتھیانا " بھی
اصلاً مع ہائے مخلوط ہے۔ آصفیہ و نور دونوں میں اِس کو صرف مع ہائے
مخلوط " ہتھیا لینا " لکھا گیا ہے۔
بول چال اور تحریر (خاص طور سے اخباری زبان) میں ہائے مخلوط سا قط

ہو چکی ہے، اس لیے اسے بھی اب ھ کے بغیر مرجح ماننا چاہیے، یعنی: ہتیانا، ہتیا لینا۔

ہتّا۔ ہتّی: ہتّا کے معنی ہیں: "دستہ، موٹھ، قبضہ، گرفت، قابو، داؤ، باری"۔ آصفیہ میں اِس کو دو طرح یعنی "ہتّا" اور "ہتّھا" لکھا گیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا گیا ہے کہ: "صحیح: ہتّھا"۔ نور میں بھی اِس کو دونوں طرح لکھا گیا ہے، مگر آصفیہ کی طرح، صحیح غلط کی صراحت نہیں کی گئی ہے۔

یہ لفظ بھی عام استعمال میں ہاے مخلوط کے بغیر ہے۔ اور اب اِس کا املا بھی ھ کے بغیر مرجح ماننا چاہیے، یعنی: ہتّا۔ ہتّی۔ ہتّے۔ ہتّے لگنا، ہتّے چڑھنا، ہتّے پر سے اکھڑ گیا۔

نہتا: اِس کو بھی دو طرح، یعنی "نہتّا" اور "نہتّھا" لکھا گیا ہے۔ اِس کا آخری جُز اصلاً "ہتّھا" ہے، مگر استعمالِ عام میں یہ لفظ بھی ہاے مخلوط کے بغیر آتا ہے۔ اب اِس کا املا بھی ھ کے بغیر مرجح مانا جائے گا، یعنی: نہتّا۔

ہاتھی، ہتھنی: اِن دونوں لفظوں میں ہاے مخلوط ہے، اور رہنا چاہیے۔

پھوہڑ: نور میں اِس لفظ کا یہی املا ہے، مستعمل بھی اِسی طرح ہے، مگر آصفیہ میں "پھوہڑ یا پھوئڑ" لکھا گیا ہے۔ یہ حقیقی اختلاف نہیں، محض لہجے کا ایسا اختلاف ہے جو چنداں قابلِ لحاظ نہیں۔ اِس لفظ کا املا "پھوہڑ" مانا جائے گا۔

پاڑ: (جس پر بیٹھ کر معمار کام کرتے ہیں) نور میں اِس کو "پاڑھ" اور "پاڑ" دونوں طرح لکھا گیا ہے اور مثال میں انشا کا یہ شعر لکھا گیا ہے:

سب اُس کو سرو باندھے ہیں، تو اُس کو تاڑ باندھ
بوسے کی گر طلب ہے تو گرد اُس کے پاڑ باندھ

انشا کے شعر میں بھی "پاڑ" آیا ہے ۔ ویسے بھی یہ لفظ تلفظ میں ھ کے بغیر ہی آتا ہے ۔ اب اِس کا ایک املا "پاڑ" ماننا چاہیے ۔ ہاں، آصفیہ میں اِس کو صرف "پاڑ" لکھا گیا ہے ۔

پھول گوبھی : آصفیہ و نور میں اِس کو "پھول گوبی" لکھا گیا ہے ۔ پہلے اِس لفظ کا تلفظ یا املا کیا تھا ، اِس سے بحث نہیں ؛ اب عام طور پر "گوبھی" اور "پھول گوبھی" کہا جاتا ہے اور اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔

جماہی : نور و آصفیہ دونوں میں اِس کو بہ ہائے ملفوظ اور بہ ہائے مخلوط، دونوں طرح لکھا گیا ہے : "جماہی ۔ جمھائی" ۔ نور میں اِس لفظ سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے ، اُس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ اب اِس کا املا کیا ہو ۔ نور کی عبارت یہ ہے :

"جماہی ۔ جمھائی : ... امیر نے سیاہی ، الٰہی کے قافیے میں کہا ہے ؎
سوالِ مے کہیں ساقی سے تیرے مست کرتے ہیں ٭ کھلا ہوگا کبھی منہ تو کھلا ہوگا جماہی سے ..."۔

البتہ مولفِ آصفیہ نے "جماہی" کو اہلِ دہلی کا مستعمل لفظ بتایا ہے ۔ اُنھوں نے لکھا ہے :

---

[1] نور میں "جماہی لینا" کے تحت یہ شعر لکھا ہوا ہے :

مُنہ کھولتا ہوں میں کہ پلا دے کوئی شراب   ہر دم جمائیاں نہیں لیتا خمار سے

مصرعِ ثانی میں "جمائیاں" چھپا ہوا ہے ۔ یہ کاتب صاحب کی کرامت معلوم ہوتی ہے ۔

"آج کل دہلی والے جماہی اور اہلِ پورب جمھائی بولتے ہیں۔"

اِس سے ترجیح ظاہر ہے۔ جلالؔ نے صاف طور پر لکھا ہے کہ اِس لفظ کا املا "جماہی" ہے۔

"اور بعضے جو اِس لُغت کو بہ جاے ہاے ہوّز، ہمزہ کے ساتھ، یعنی "جمائی" بولتے ہیں، غلط بولتے ہیں، کس واسطے کہ اِس لفظ کو شعراے ثقاتِ اردو زبان شاہی اور راہی وغیرہ کے قافیے میں لاتے ہیں۔"

(سرمایہ)

اِس لفظ کا ایک املا جماہی مانا جائے گا۔

اَژہَر، اَژدھر: آصفیہ میں اِس کی صرف ایک صورت "اَژہَر" ملتی ہے۔ نور میں "اَژہَر" اور "اَژدھر" دونوں طرح لکھا گیا ہے۔ سُننے میں یہ لفظ دونوں طرح آیا ہے۔ ہاں دیہات میں اِس کا ایک تلفظ "اَرْدُہ" (ہاے ملفوظ کے ساتھ) بھی ہے۔

اِس کا املا، استعمال کے مطابق ہوگا۔ جہاں پر جس طرح استعمال کیا گیا ہے، یا جو شخص جس طرح بولے، اُسی کے مطابق اِس کو لکھا جائے گا۔ ویسے زیادہ تر یہ لفظ ہاے مخلوط کے ساتھ سننے میں آتا ہے: اَژدھر۔

باڑ۔ باڑھ: "کانٹوں یا جھاڑی کی احاطہ بندی" کے معنی میں، آصفیہ میں دونوں صورتیں (باڑ۔ باڑھ) ملتی ہیں۔ نور میں اِس معنی میں باڑھ لکھا گیا ہے اور باڑ کو دہلی سے متعلق بتایا گیا ہے۔

باڑھ کے کئی معنی ہیں، جیسے: تلوار کی دھار، دریا کی طغیانی، کئی بندوقوں یا توپوں کے ایک ساتھ فیر، درازیِ قد، نمو، بالیدگی۔

اِن دونوں لفظوں میں امتیاز کی حد بندی مناسب ہے۔ "کانٹوں یا

جھاڑی کی احاطہ بندی "کے معنی میں باڑ (ھ کے بغیر) کو مرجح قرار دینا چاہیے۔ جیسے: کھیت کی باڑ۔ باڑا اور باڑی میں بھی ھ موجود نہیں، اور یہی بات بنائے ترجیح ہے۔

باقی سارے معانی میں باڑھ لکھنا چاہیے، جیسے: تلوار کی باڑھ، دریا باڑھ پر ہے وغیرہ۔ کسی کا مصرع یاد آیا، ع:

سچ کہا ہے: باڑھ کاٹے، نام ہو تلوار کا

ہمزہ

ہمزہ، حرف بھی ہے اور علامت بھی۔ مثلاً "نغمۂ عندلیب" یا "جلوۂ یکتا" میں یہ علامتِ اضافت ہے، اور جیسے "آئینہ، گئے، سائل، بائبل، انشاءاللہ، علاءالدین، مسئلہ" وغیرہ میں یہ حرف ہے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے الف، واو، یے؛ کبھی حروفِ صحیح ہوتے ہیں اور کبھی حروفِ علّت۔ مقصد یہ ہے کہ ہمزہ کی یہ دُہری شخصیت کچھ نئی چیز نہیں۔

یہ دل چسپ بات ہے کہ ایک طرف تو اردو کے حروفِ تہجی کی فہرست میں، عملاً اِس کو (بہ طورِ حرف کے) یے سے پہلے جگہ دی جاتی ہے، مگر اصولاً اِس کو حرف کی حیثیت سے نہیں مانا جاتا۔ اِس کو یوں دیکھیے کہ لُغات میں ہمزہ کو حرف کی حیثیت سے کسی علاحدہ فصل میں جگہ نہیں دی جاتی۔ مثلاً الف کے باب میں، الف مع ب، الف مع ہاے ہوز وغیرہ کی فصلیں ملیں گی، مگر "الف مع ہمزہ" کی فصل نہیں ملے گی، بل کہ ہمزہ کو یے کی فصل میں شامل سمجھا جائے گا، یعنی جن لفظوں میں دوسرا حرف ہمزہ ہے، جیسے: آئینہ، آئے، آؤ وغیرہ؛ اُن کو یے کی فصل میں لکھا جاتا

ہے۔ مثال کے طور پر، امیر اللغات میں "آیا، آئی، آئے، آئین، آئینہ" کو "فصلِ الفِ ممدودہ مع یاے تحتانی" میں لکھا گیا ہے۔ یہی صورت اور لُغات میں ہے (نور، آصفیہ وغیرہ)۔ یہ دل چسپ ہی نہیں، عجیب بل کہ پریشان کُن صورتِ حال ہے، کیوں کہ اِس سے لازم آتا ہے کہ جس طرح "آیا" میں دوسرا حرف یؔ ہے، اُسی طرح "آئین"، "آئینہ" اور "گئے" میں بھی دوسرا حرف یؔ ہے اور اِس کا غیر صحیح ہونا عیاں ہے۔

اُردو میں ہمزہ مستقل حرف کی حیثیت رکھتا ہے اور اِسی حیثیت کے ساتھ بے شمار الفاظ میں پایا جاتا ہے۔ آواز کے لحاظ سے یہ الف کا ہم جنس ہے، دونوں کی آواز میں کچھ فرق نہیں، البتّہ محلِّ استعمال میں فرق ہے۔ اُردو میں ہم آواز حرف اچھی خاصی تعداد میں ہیں؛ اِس لیے ہمزہ اور الف کا ہم آواز ہونا، نہ تعجّب کی بات ہے نہ پریشانی کی۔

ہمزہ کے حرف ہونے سے، تاریخ گوئی کی شریعت میں شدّومد کے ساتھ انکار کیا گیا۔ متعدّد اربابِ فن نے لکھا ہے کہ ہمزہ کوئی حرف ہی نہیں، محض علامت ہے، اِس کو "خطِ منحنی" قرار دیا گیا؛ اِس سے اِس خیال کو اور تقویت ملی کہ ہمزہ حرف نہیں، محض علامت ہے۔ حرف ہوتا تو اِس کے عدد شمار کیے جاتے۔ شوق نیموی نے یادگارِ وطن میں اِس پر مفصّل بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی تحدید کے بغیر یہ خیال درست نہیں۔ ہمزہ حرف ہے اور متعدّد تاریخوں میں اِس کا ایک عدد شمار کیا گیا ہے۔ یہ ایک عدد، اِس پر دلالت کرتا ہے کہ ہمزہ کو الف کا ہم جنس مانا گیا ہے۔ جس طرح جؔ اور چؔ کے ایک ہی عدد ہیں اور جس طرح دالؔ اور ڈالؔ کے عدد بھی ایک ہی ہیں؛ اِسی طرح الف و ہمزہ دونوں کا ایک عدد شمار کیا گیا ہے۔ تاریخ گوئی کی طرح، قواعد میں

بھی اِس کے حرف ہونے سے انکار کیا گیا ہے ۔ مثلاً مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے قواعدِ اردو میں لکھا ہے :

"ہمزہ (ء) اِسے غلطی سے حروف میں شامل کر لیا گیا ہے ۔ یہ درحقیقت یؔ اور واؔو کے ساتھ وہی کام دیتا ہے جو مد الفؔ کے ساتھ، یعنی جہاں یؔ کی آواز کھینچ کر نکالنی پڑے، اور قریب دو یؔ کے ہو، یا جہاں واؔو کی آواز معمول سے بڑھ کر نکالی جائے ؛ وہاں بہ طور علامت کے اِسے لکھ دیتے ہیں ۔ یہ ہمیشہ یؔ یا واؔو کے ساتھ آتا ہے ، جیسے : کئی ، نئیں ، کھاؤں ۔

الفِ ممدودہ شروع میں آتا ہے (اور بعض عربی الفاظ میں درمیان میں بھی) لیکن ہمزہ ، یؔ یا واؔو پر درمیان اور آخر میں آتا ہے ۔ بعض جگہ یہ یؔ کا قائم مقام ہوتا ہے ، جیسے : پائیاں ۔ کبھی خفیف الفؔ کی آواز دیتا ہے ، جیسے : ہیئت "۔ (قواعدِ اردو ، طبعِ چہارم ، ص ۱۲)

یہ نہایت درجہ عجیب منطق ہے کہ ایک حرف موجود ہے اور وہ دراصل موجود نہیں ۔ اِسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً ایک لفظ ہے : مسئلہ ، اِس میں ہمزہ بجائے خود کام کر رہا ہے ، یہاں نہ الفؔ ہے ، نہ واؔو اور نہ یؔ ؛ اِسے کیا کہا جائے گا ؟ ۔ اصل بات یہ ہے کہ عربی میں الفؔ اور ہمزہ کی جو تفریق ہے ، کہ متحرک الفؔ بھی ہمزہ ہے اور ہمزہ (ء) تو ہمزہ ہے ہی ؛ اُس کے اثرات فارسی و اردو دونوں میں کئی طرح ظاہر ہوئے ہیں ۔ فارسی والے اِس تقلید میں متحرک الفؔ کو ہمزہ لکھنے لگے ، اور اردو والوں نے ہمزہ کو حرف ماننے سے انکار کر دیا ۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ حروفِ تہجّی کے جو قاعدے پڑھائے جاتے تھے ، اُن

میں ہمزہ کو حرف کی حیثیت سے جگہ دی جاتی تھی ۔ عربی قواعد کے لحاظ سے ممکن ہے کہ "ذکاء اللہ" میں ہمزہ، واؤ کا قائم مقام ہو (ذکاؤ اللہ)، مگر اردو میں وہ قائم مقامی کی خدمت سے آزاد ہے، اِس لیے کہ اُردو میں ایک آواز کے لیے دو حروف "ؤ" کو جمع نہیں کیا جا سکتا؛ اِس لیے یہاں ہمزہ، مستقل حرف کی حیثیت رکھتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ عربی کے بہت سے مصادر اور جمعوں کے آخر میں ہمزہ ہوتا ہے، جو اردو میں تلفظ میں نہ آنے کی وجہ سے، ساقط ہو گیا ہے ۔ جیسے: ابتداء، انتہاء، شعراء، علماء وغیرہ ۔ ہمزہ اگر حرف نہیں ہے تو "علماء" کے آخر میں پھر کیا چیز ہے جس کو ساقط کیا جائے، اور مثلاً "ان شاء اللہ" میں اِسے کیا کہیں گے؟ ۔ کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "رائفل" میں تھی تو ی، مگر اُس کی جگہ ایک علامت کو دے دی گئی ہے، جس کو ہمزہ کہتے ہیں ۔

مختصر یہ کہ اردو کے حروفِ تہجی کی فہرست میں ہمزہ کو مستقل حرف کی حیثیت سے شامل کیا جائے گا، اِس لیے کہ یہ ایک مستقل حرف کی طرح استعمال میں آتا ہے ۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مثلاً "لیے" میں ی لکھی جائے گی، ہمزہ نہیں لکھا جائے گا؛ تو ہم اِس طرح اُس کے حرف ہونے کا اعلان کرتے ہیں، اور یہ اعلان بالکل صحیح ہے ۔ اور اب اردو کا جو لغت مرتب کیا جائے گا، اُس میں اور حروف کی فصلوں کی طرح، ہمزہ کی فصل بھی ہوگی، جیسے "گئے" کو "گاف مع ہمزہ" کی فصل میں لکھا جائے گا (وغیرہ) ۔

فارسی والے اب ہمزہ کو اپنے حروفِ تہجی میں شمار نہیں کرتے، اِس کو وہ عربی سے مخصوص قرار دیتے ہیں ۔ یہاں تک لکھا گیا ہے کہ درمیانِ لفظ میں جہاں بھی ہمزہ ہو، سمجھ لیا جائے کہ یہ لفظ فارسی کا نہیں ۔ یہ صحیح

ہے کہ فارسی الاصل لفظوں میں، ہمزہ جزوِ لفظ نہیں ہوتا، جیسے: پاییز، پایین، آیینہ، می گویی وغیرہ۔ مگر اُردو میں "آیین اور آیینہ" نہیں، "آئین" اور "آئینہ" لکھا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ بے شمار افعال و اسما میں یہ حرف، جزوِ لفظ کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے، جیسے: لائے، لکھنؤ، رائفل؛ اِس لیے، فارسی والے اپنے لیے جو بھی کہیں؛ اردو میں اِس کو حرف مانا جائے گا، اِس لیے کہ اُردو میں مثلاً "لکھنؤ" کو نہ "لکھنیو" لکھا جا سکتا ہے، نہ "لکھن او"۔ اِسی طرح "علاء الدین" کو "علای الدین" نہیں لکھا جا سکتا، نہ "علاو الدین" لکھا جائے گا۔ پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ہمزہ کوئی حرف نہیں۔

یہ بات مان لینا چاہیے کہ اردو میں ہمزہ مستقل حرف کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور اِسی حیثیت سے الفاظ کا جُز ہوتا ہے۔ حروفِ تہجّی کی پُرانی ترتیب میں اِس کو ہ کے بعد جگہ دی جاتی رہی ہے اور اِس ترتیب کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

یہ بات بھی مان لینا چاہیے کہ ایک صورت ایسی بھی ہے جب یہ علامتِ اضافت کی صورت میں آتا ہے؛ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہوتی ہے، اضافت کی صورت میں ایسے لفظوں میں اُس ہائے مختفی پر ہمزہ لکھا جاتا ہے۔ صرف اِس صورت میں یہ اضافت کی علامت بن کر آتا ہے۔ اِس صورت کے علاوہ، اور کسی بھی جگہ یہ علامت (اضافت کی ہو یا کسی اور طرح کی) کی حیثیت سے نہیں آتا۔ باقی ہر جگہ یہ مستقل حرف ہوتا ہے۔

انجمن نے اصلاحِ املا کی جو کمیٹی بنائی تھی، اُس نے یہ سفارش بھی کی تھی کہ

ہمزہ کو یؔ اور واؔو کے اوپر لکھنے کے بجاے، اُن سے پہلے لکھا جائے۔ یعنی: آءو، آءی، جاءو، جاءے، رعناءی وغیرہ۔ یہ نہایت مناسب بات تھی۔ آخر "گئے" وغیرہ میں ہمزہ کو یےؔ سے پہلے لکھا ہی جاتا ہے۔ مگر واؔو اور یؔ پر ہمزہ لکھنا اِس قدر عام ہو چکا تھا کہ اِس تجویز نے قبولِ عام نہ پایا۔ ڈاکٹر صدیقی مرحوم آخر تک اپنی تحریروں میں اُس طرح لکھتے رہے (آءی، جاءو وغیرہ)۔ انجمن کی بعض مطبوعات میں بھی جگہ جگہ اِس کی مثالیں نظر آتی ہیں، لیکن مجموعی حیثیت سے یہ طریقہ رائج نہیں ہو سکا، اگرچہ نہایت مناسب طریقہ تھا۔

عربی کے طریقِ کتابت کے اثر سے، اردو کے اکثر لفظوں کا املا بھی اِس طرح متعین ہو گیا ہے کہ ہمزہ کے لیے، یؔ یا بؔ کی طرح کا ایک شوشہ درکار ہوتا ہے، جیسے: بائبل، قائل، رائفل، آئینہ، سائیں، گئے، مسئلہ وغیرہ۔ یہ بات عجیب ضرور ہے کہ ایک مکمل حرف کو لکھنے کے لیے، ایک دوسرے حرف کے سے شوشے کا سہارا لیا جائے؛ مگر یہ املا اب اردو کا مروّج اور متعارف املا ہے اور اِسے اِسی طرح رہنا چاہیے۔

اِس سلسلے میں ایک یہ بات دھیان میں رہنا چاہیے کہ جب واؔو اور یےؔ (منفصل) سے پہلے ہمزہ آتا ہے، تو ہمزہ کو واؔو اور یےؔ کے اوپر لکھا جاتا ہے اور اِس کے لیے کوئی شوشہ نہیں بنایا جاتا، جیسے: آؤ، جاؤ، آئے، جائے، وغیرہ کہ اِن کو "آئو" یا "آئے" نہیں لکھا جاتا۔ اور اِس میں کسی طرح کا اختلاف نہیں پایا جاتا؛ مگر جب یؔ کے ساتھ ہمزہ آتا ہے تو کبھی تو واو اور یے کی طرح اِس کو یؔ کے اوپر لکھا جاتا ہے، جیسے: کوئی، سوئی۔ اور اکثر یؔ کے ساتھ ایک شوشہ شامل کیا جاتا ہے اور اُس شوشے پر ہمزہ

لکھا جاتا ہے ، جیسے : رعنائی ، آئی ، لائی ۔ دونوں طریقے مستعمل ہیں ۔ نصابی کتابوں میں ایک لکھاوٹ کو اختیار کرنا چاہیے ۔ اور یؔ کے ساتھ ہمیشہ شوشہ لانا چاہیے ، یعنی : کوئی ، رعنائی ، بنائی ، لائی ، پائی ، لمبائی ، ڈوئی وغیرہ۔ اِس لیے کہ یہ لکھاوٹ زیادہ رائج ہے ۔

جس قدر بے احتیاطی بل کہ غلط نگاری ، ہمزؔہ کے لکھنے میں نظر آتی ہے، اُس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اِس حرف کے سلسلے میں کوئی قاعدہ قانون ہئی نہیں ۔ اب حال یہ ہے کہ کہانیوں اور کہاوتوں کے ایک کردار " خواہ مخواہ " یا " خدائی فوج دار " کی طرح ، یہ حرف جہاں دیکھیے ، وہاں براجمان ملے گا اور اکثر مقامات پر اِس کا وجود ، غلط املا کا سبب بن جاتا ہے ۔ ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے لکھا ہے :

" اِس بات کو نہ بھولنا چاہیے کہ ہمزؔہ ، الفؔ کا قائم مقام ہے ۔ پس جب دو حرفِ علّت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو اُن کے بیچ میں ہمزؔہ آ سکتا ہے ، نہیں تو نہیں ۔ اِس لیے آؤ ، جاؤ ، گیت گاؤ ، دو لڑکے آئے ، آپ آئے ، میں آؤں تو کیا لاؤں ، میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں وغیرہ میں ہمزؔہ لکھنا چاہیے ۔ مگر بناو سنگار ، بھاو تاو ، نبھاد ، گھاو ، کڑھاو ، میں ہمزؔہ کی ضرورت نہیں ۔ اِسی طرح چاے ، گاے ، راے ، ہاے ، ہاے واے ، میں ہمزؔہ نہ چاہیے ۔ یہی حال دیو ، سیو ، ریو و ریا ، وغیرہ کا ہے ۔ اِن لفظوں میں الف ے ، الف و ، یا ے / ی و ، مل کر ایک آواز (ڈیڑھ آواز ، کہہ لیجیے) دیتے ہیں ، اِس لیے اِن کے درمیان ہمزؔہ کی گنجایش نہیں ۔

(ب) لیےؔ اور دِیےؔ (دونوں معنوں میں) " اس نے دو سو روپے دِیے ،

اور دو گھوڑے لیے "، "اُس نے اپنے لیے چار جوڑے موزے لیے اور اپنے بھائی کے لیے ایک ہی جوڑ"، "سینکڑوں دیے جل رہے ہیں؛ دیوالی کی بہار ہے"۔

اِسی طرح "چاہیے، دیجیے، لیجیے" وغیرہ میں بھی ہمزہ نہیں آنا چاہیے۔ اور اِسی طرح تھالیوں، گالیوں وغیرہ میں۔

ہمزہ اُسی وقت آئے گا جب حرفِ ماقبل پر زبر یا پیش ہو۔ اگر ماقبل مکسور ہے تو ہمزہ نہ آئے گا، یَ آئے گی: گئے، گئی؛ مگر کیے، دیے، لیے[1]۔

ہمزہ کا سب سے زیادہ غلط استعمال اِس طرح ہوتا ہے کہ یَ کی جگہ ہمزہ لکھ دیا جائے، یا غیر ضروری طور پر یَ اور واو کے ساتھ ہمزہ کو جمع کر دیا جائے، خاص طور پر اُس صورت میں جب لفظ کا آخری ٹکڑا واو یا ے یا ی ہو؛ کہ اکثر صورتوں میں اِن حرفوں کے ساتھ ایک عدد ہمزہ کو بھی نتھی کر دیا جاتا ہے، گویا لفظ کی صورت کو مسخ کر دیا جاتا ہے۔ کبھی غیر ضروری طور پر الف کے ساتھ اُس کو منسلک کر دیا جاتا ہے، جب کہ دونوں حرف ہم آواز ہیں۔

غلطی سے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ جب لفظ کے آخر میں یَ یا ے ہو، تو اضافت کی صورت میں اُس یَ یا ے پر ہمزہ ضرور لکھنا چاہیے، ورنہ اضافت

---

[1] یہ ٹکڑا اُسی مقالے کا جُز ہے جو ہندستانی میں چھپا تھا، اور جس کے حوالے اِس سے پہلے بھی کئی جگہ آئے ہیں۔ مرحوم نے اپنے ایک طویل مکتوب میں، اِس اقتباس کو نقل کر کے بھیجا تھا۔ یہاں پر یہ اقتباس مطبوعہ مقالے کے بجائے، اُس خط سے نقل کیا گیا ہے۔

کا حق ادا نہیں ہوگا ۔ یہ غلط نگاری کی انتہا ہے کہ اضافت کے ایک زیر کے لیے ، دو حرف (ی اور ہمزہ) اکٹھا کیے جائیں ۔

ہمزہ کے اِن مسائل کو چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے : ہمزہ اور الف ، ہمزہ اور ہائے مختفی ، ہمزہ اور واو اور ہمزہ اور یَی (ہمزہ اور یے اِسی میں شامل ہے) ۔ تفصیلات اِن عنوانوں کے تحت پیش کی جائیں گی ۔

ہمزہ اور الف

اُردو میں الف اور ہمزہ کو دو مستقل مگر ہم آواز حرفوں کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے اور اِسی بِنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ اِن دونوں حرفوں کو ایک جگہ جمع نہیں کیا جا سکتا ، یعنی ایک آواز کے لیے ، اِن دو حرفوں کو ایک ساتھ استعمال نہیں کیا جانا چاہیے ۔یہی وجہ ہے کہ اُردو میں " تأمّل "کے بجاے " تامّل " لکھا جانے لگا ، اور اِسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ " جرأت "عربی املا ہوا ، اُردو میں " جرات " یا " جرئت " لکھنا چاہیے ۔ ایک آواز کے لیے دو حرفوں کو یک جا نہیں کیا جائے گا ۔

ﻟﻪ یہی وجہ ہے کہ اضافت کی صورت میں یِ یا یے پر ہمزہ لکھنا غلط ہے ۔یعنی" زندگیٔ جاوید" یا " ابتدائے عشق " لکھنا درست نہیں ، کیوں کہ اضافت کی ایک آواز کے لیے ، دو حرف یِ اور ہمزہ یک جا ہو گئے ہیں اور یہ سرتا سر غلط ہے ۔صحیح املا ہوگا: "زندگیِ جاوید" اور "ابتداے عشق "۔

اور اِسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ جب لفظ کے آخر میں یے یا واو ساکن ہو ، جیسے :

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۷ پر)

عربی میں، لغوی سطح پر، الف کی متحرک صورت کو، ہمزہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب یہ ساکن ہوتا ہے، تب الف کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اِسی لیے عربی میں "تأمل" اور "أکرم"[1] لکھا جاتا ہے۔
اُردو میں کئی آوازیں ایسی ہیں جن کے لیے، ایک سے زیادہ حرف ہیں۔ یہ عربی کا اثر ہے۔ وہاں اِن آوازوں میں فرق تھا، یہاں کے لہجے میں یہ فرق تو باقی نہیں رہا، رہ بھی نہیں سکتا تھا، مگر مختلف حرفوں

راے، گاو، مَے؛ تو اُس یے یا واو پر ہمزہ لکھنا غلط ہے، کیوں کہ اُس صورت میں ایک آواز کے لیے دو حرف یک جا ہوں گے۔ ایسے ہی مقامات پر یے پر ہمزہ لکھنے کو غالب نے "عقل کو گالی دینا" سے تعبیر کیا ہے۔ اِس کی مفصل بحث "ہمزہ اور ی" اور "ہمزہ اور واو" کے عنوانات کے تحت آئے گی۔

[1] "اعلم انّ الالفَ عَلیٰ ضَربینِ: لینیّۃ وتسمیٰ الفاًوَ متحرکۃٌ تسمیٰ همزۃً" (صراح۔ باب الالف اللینیۃ)۔
"الألفُ إمّا ساکنۃ کما فی قامَ، ویقالُ لها اللینیۃ وَإمّا متحرکۃ ویقالُ لها الهمزۃ" (المنجد، ص ا)۔

[2] اذا وقعت الهمزۃ اوّلاً کُتبت بصورۃِ الالفِ ابداً، نحو: أسماء وَإکرام۔ وَکذاالاول المتصل به غیرہ نحو: بأجمل ولأفضل"۔
(مقدمۃُ المنجد، فی کتابۃ الهمزۃ)

عربی میں ہمزہ کی کتابت کے قواعد کے لیے دیکھیے: مقدمۃُ المنجد۔ فارسی میں ہمزہ کے لیے دیکھیے: احمد بہمنیار کا مقالہ بہ عنوانِ "املای فارسی"، لغت نامۂ دہخدا، جلد ۲۴، ص ۱۵۹ تا ص ۱۶۸ تک۔

کی شکلیں ضرور باقی رہیں، کیوں کہ لفظ وہیں سے آئے تھے اور اپنے املا کو ساتھ لیتے آئے تھے ــــــ ہمزہ اور الف کے سلسلے میں، اُردو میں ایک دوسرے انداز سے اِس فرق کو ملحوظ رکھا گیا، اِس طرح کہ لفظوں کے درمیان میں، الف کی آواز کے لیے، ہمزہ کو استعمال کیا گیا۔ جیسے: گئے، لکھنؤ، رعنائی، لائے۔ الفاظ کے شروع سے تو ہمزہ کو بالکل ختم کردیا گیا اور ہر جگہ الف کو استعمال کیا گیا اور دو تین لفظوں کو چھوڑ کر، آخرِ الفاظ سے بھی اِس کو اُڑا دیا گیا، جب کہ عربی میں، لفظوں کے شروع اور آخر میں اِس کا عمل دخل بہ کثرت ہے۔ عربی کے نہ معلوم کتنے مصدر، جمعیں اور مفرد الفاظ ایسے ہیں جن کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہے، جیسے: "ابتداء، انتہاء، املاء، انشاء، شعراء، علماء، حکماء، شئ، جُزء" وغیرہ۔ اُردو میں (اور اکثر جگہ فارسی میں بھی) اِن لفظوں کے آخر سے ہمزہ کو یک سر اُڑا دیا گیا، اور ابتدا، انتہا، املا، انشا، شعرا، حکما، علما، شے، جُز (وغیرہ) لکھے اور بولے جاتے ہیں۔

اُردو میں جو ہمزہ کو لفظوں کے بیچ میں، الف کی جگہ پر استعمال کیا گیا، اُس سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بے شمار لفظ، غیر ضروری ٹکڑوں میں تقسیم ہونے سے بچ گئے اور اِس طرح اُردو املا کی خصوصیات ایسے لفظوں میں محفوظ رہیں۔ جیسے ایک لفظ ہے: گئے، اِس میں اگر ہمزہ نہ لکھا جائے تو پھر اس کو "گ اے" یا "گاے" لکھنا پڑے گا، اور دونوں صورتیں پریشان کُن ہیں۔ یا جیسے: لکھنؤ، کہ اِس کو "لکھن او" یا "لکھناو" لکھنا ہوگا یا جیسے: نئی، کہ اِس کو "ن ای" یا "نای" لکھا جائے گا۔ اور یہ سب صورتیں صبر آزما، بل کہ انتشار آفریں ہیں۔

اِس سے اُردو میں ہمزہ کی اہمیّت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔
اِس سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اُردو میں ہمزہ کی حیثیت محض علامت کی سی نہیں، یہ مستقل حرف کی حیثیت سے استعمال میں آتا ہے۔ اِس کو الف کے متبادل حرف کی حیثیت سے شمار میں لانا چاہیے اور اِس لحاظ سے، اُردو کے حروفِ تہجّی میں اِس کو مستقل جگہ دینا چاہیے۔

(۱)

کچھ لفظ ایسے ہیں جن کے بیچ میں الفِ مفتوح ہے۔ یہ سب عربی کے لفظ ہیں۔ عربی کے لحاظ سے اِس الف پر ہمزہ بھی لکھا جانا چاہیے، مگر اردو میں اِس قبیل کے اکثر لفظ ہمزہ کے بغیر ہی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے: تامّل، کہ عربی میں "تأمّل" لکھا جائے گا، مگر اُردو میں سبھی "تامّل" لکھتے ہیں ــــ مگر اِس فہرست کا ایک لفظ ایسا ہے جس کو کبھی تو (اُردو کے مطابق) صرف الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے، اور کبھی (عربی کے موافق) الف پر ہمزہ بھی بنادیا جاتا ہے۔ یہ لفظ ہے: جرات، کہ اِس کو بعض لوگ "جرأت" بھی لکھتے ہیں۔
جیسا کہ لکھا جاچکا ہے، اُردو میں الف اور ہمزہ، دو حرف ہیں اور اِن دونوں کو ایک ہی آواز کے لیے جمع نہیں کیا جا سکتا، اِس لیے خواہ لفظ "جرات" ہو یا اِس قبیل کے اور الفاظ ہوں؛ سب میں صرف الف لکھا جائے گا۔ ایسے لفظوں کی فہرست یہ ہے:

تاثّر، تاخّر، تاسّف، تامّل، تاہّل، توَام، جرأت،
متاثّر، متاخّر، متاسّف، متامّل، متاہّل، توامان[ل]، متاخّرین،

ل احاشیہ ص ۳۰۴ پر

متاثّرین ، تاثّرات ، تامّلات ۔

اُردو لُغات کی صورت یہ ہے کہ نور میں تاسّف ، تامّل ، تاہّل ، توام، متاسّف ، متاخّر ، متامّل ، متاہّل ؛ موجود ہیں اور یہ سب ہمزہ کے بغیر لکھے ہوئے ہیں ۔ آصفیہ میں تاثّر ، تاسّف ، توام ، متاثّر ، متاخّر، متاہّل ؛ موجود ہیں اور یہ سب لفظ ہمزہ کے بغیر ہیں ، صرف ایک لفظ " تأمّل " مع ہمزہ لکھا ہوا ہے ۔ اور لفظ " جرأت " آصفیہ و نور دونوں میں مع ہمزہ ہے ۔

جب اِس قبیل کے اور سب لفظ ہمزہ کے بغیر لکھے جاتے ہیں ، تو پھر اِس ایک لفظ میں یہ اختلافِ نگارش کیوں رہے کہ کوئی شخص ، عربی کے لحاظ سے " جرأت " لکھے اور کوئی شخص ، ایسے اور الفاظ پر قیاس کر کے " جرات " لکھے ۔ اِس لفظ کو بھی اردو کے املا کے مطابق " جرات " لکھنا چاہیے۔

(۲)

ایک لفظ ہے : قراءَت ، بروزنِ ہدایت ؛ اِس میں کچھ جھگڑا نہیں ۔ اِس کی ایک اور صورت جو رائج ہوگئی ہے ، " قرأت " یا " قرءَت " یا " قرأت " ہے ۔ ذوق کا مصرع ہے : کبھی مَیں قاریِ قرآن بہ علمِ قرءَت ۔ اصل لفظ ہے : قراءَت ، اِس اعتبار سے اِس کو " قرءَت " ہونا چاہیے۔ قراءت ، وناءت ، براءت ؛ یہ ایک ہی انداز کے لفظ ہیں ۔ اِن میں ایک لفظ ذرا مختلف انداز سے لکھا جاتا ہے ، یعنی : دنائت ، جب کہ عربی

آہ و نفس اور اشک کا معدنِ نشو ہے جسد ———— دیکھ لے یاں تو توأماں آتش و باد و آب و خاک

(انشا (کلامِ انشا ، ص ۳۰۰)

میں یہ بھی "دناءۃ" ہے اور باقی دو لفظ "قراءت" اور "براءت" لکھے جاتے ہیں۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِن سب کو ایک ہی طرح لکھا جائے۔ فارسی کی بعض جدید کتابوں میں اِن لفظوں کا املا قرائت، دنائت بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ احمد بہمنیار نے "املای فارسی" میں لکھا ہے:

"وقتی کہ ہمزہ میانِ الف وتاءِ زاید باشد کہ باوجود مفتوح بودن بصورت یاء باعلامت ہمزہ نوشتہ می شود، و این رسم الخط خاص فارسی است، مانند قرائت و دنائت و اسائت"۔

(لغت نامۂ دہخدا، جلد ۴۰، ص ۱۶۷)

قرارت یا قرائت اور دنارت یا دنائت اور برارت یا برائت؛ اِن میں کچھ فرق نہیں، دونوں صحیح ہیں۔ کسی بھی طرح لکھا جا سکتا ہے۔ اِسی طرح قرءت یا قرئت۔

(۳)

ہیئت، اِس کو "ہیأت" بھی لکھا جاتا ہے۔ غیاث اور آصفیہ میں اِس کی یہ صورت ملتی ہے۔ المنجد میں "ھیئۃ" ہے اور اِس کی جمع "ہیئات" ہے۔ اُردو میں اِس کو "ہیئت" لکھا جائے گا، اور اِس کی جمع "ہیئات" ہوگی۔ ایک لفظ ہے: مِرآت، بروزنِ مشکات، اِس کے معنی ہیں: آئینہ، آرسی۔ اِس کو کبھی "مرأت" اور کبھی "مرآت" بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ اِس کا صحیح املا "مِرآت[1]" ہے، مع الفِ ممدودہ۔

---

[1] ہیئت آنکھوں کی نہیں وہ رہی روتے روتے — اب تو گرداب سے آتے ہیں نظر پانی میں

میر (کلیات، مرتبۂ آسی، ص ۴۰۴)

اِسی طرح "سَیِّآت" اور مُنشآت بھی الفِ ممدودہ کے ساتھ لکھے جائیں گے۔

(۴)

منشا، عربی میں "منشأ" ہے، مگر اردو میں بروزنِ دریا مستعمل ہے۔ اضافت کے لیے، حسبِ معمول، اِس کے آگے یاے مجہول کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: منشاے کردگار۔

پُرانی تحریروں میں یہ لفظ عربی املا کے موافق بھی استعمال ہوا ہوگا۔ اِس کی ایک مثال اِس وقت میرے سامنے ہے: برہانِ قاطع مع رسائلِ متعلقہ۔ مرتبۂ قاضی عبدالودود صاحب میں، ص ۲۴۸ پر "منشأِ برتری" ملتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ غالبؔ نے بھی اِسی طرح لکھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسی بعض اور مثالیں بھی مل جائیں۔ قدیم تحریروں سے قطعِ نظر، اب اِس کا املا "منشا" ہوگا اور بہ صورتِ اضافت "منشاے" لکھا جائے گا۔

اِسی قبیل کا ایک اور لفظ ہے: نَشْأ۔ یہ اِس صورت میں تو نہیں، البتہ "نَشْأتین" اور "نَشْأۃ الثانیہ" یا "نَشْأۃِ ثانیہ" کی صورت میں مستعمل رہا ہے، مثلاً اوجؔ کا یہ شعر، جو نور میں درج کیا گیا ہے:

لہ مولوی نذیر احمد صاحب نے ایک خط میں لکھا ہے:

"یاد آیا کہ تم نے کسی خط میں "المسلمُ مرآۃُ المسلم" کو "مراۃ المسلم" لکھا ہے۔ "مرآۃ" اصل میں "مفعلۃ اوزانِ آلہ میں سے ہے۔ مفعل، مفعلۃ، مفعال۔ مادّہ: رأی۔ مصدرِ مجرّد: رؤیۃ۔ مرأیۃ کی ی بہ وجہ تحرّک و فتحِ ماقبل، الف ہوگئی: مرآۃ، یعنی دیکھنے کا آلہ، وہ کیا ہے؟ آئینہ"۔ (موعظۂ حسنہ، ص ۸۱)

شہرہ ہو نشأتین میں اِس کارزار کا
موجِ شراب کام کرے ذوالفقار کا۔

"نَشْأۃ" کے معنی ہیں: نئے سرے سے پیدا ہونا۔ مجازاً: عالم، دنیا۔"نشأتین" کے معنی ہیں: دونوں عالم۔"نشأتین" تو اب مستعمل نہیں، قدیم تحریروں میں بس یہ محفوظ ہے۔ البتہ "نشأۃ الثّانیہ" یا "نشأۃِ ثانیہ" اب بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں۔ یہ خاص لفظ ہیں۔ عربی سے منقول جز سمجھ کر، کوئی صاحب "نَشْأَۃُ الثّانیہ" لکھنا چاہیں تو ضرور لکھیں، مگر اِس صورت میں اِس کو عربی کا ٹکڑا قرار دے کر، عربی کے اندازِ نگارش کے مطابق ہی لکھنا ہوگا —— عام لوگوں کے لیے مناسب، بل کہ ضروری ہوگا کہ اُردو املا کے مطابق، اِس کو "نَشأتِ ثانیہ" لکھیں۔ اِسی طرح "نشاَتین" لکھا جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ ہمزہ اور الف کو جمع نہیں کیا جائے گا۔

(۵)

عربی کی بہت سی جمعیں اور مصدر ایسے ہیں جن کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہے اور اُس سے پہلے الف ہے، جیسے: ابتداء، املاء، انشاء، ہَواء، علماء وغیرہ۔ اُردو میں، ایسے سب لفظوں میں صرف آخر کا الف لکھا جائے گا، ہمزہ بالکل نہیں لکھا جائے گا۔ اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ ہمزۂ آخر، تلفظ میں نہیں آتا۔ اضافت کے لیے، ایسے لفظوں کے آخر میں یے کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے:

ابتدا، انتہا، اِخفا، املا، انشا، اقتدا، اکتفا، ارتقا، ابتلا،
شعرا، حکما، علما، وزرا، اُمرا، ادبا، صلحا، اقربا، انبیا۔

بہ صورتِ اضافت :

ابتدائے عشق ، اخفائے راز ، املائے صحیح ، شعرائے نام دار ، حکمائے حاذق ، انبیائے برحق ۔

عطف کی صورت میں :

ابتدا و انتہا ، اخفا و اظہار ، شعرا و علما ، اُمرا و وزرا ، املا و انشا ، انبیا و اولیا ۔

یہی صورت ہوگی ایسے عام الفاظ کی جن کے آخر میں عربی میں ہمزہ ہے ، کہ اُردو میں وہ سب ہمزہ کے بغیر لکھے جائیں گے ۔ صرف دو لفظ "مبدء" اور "سوء" مستثنا ہیں کہ یہ مع ہمزہ لکھے جائیں گے ۔ اضافت کی صورت میں ہمزہ مکسور ہو جائے گا ۔ اِن کا بیان " ہمزہ اور ی " کے تحت آئے گا ۔

ہمزہ اور واو

(۱)

جن لفظوں کے آخر میں واو ہو، اور واو سے پہلے کوئی حرفِ علّت ساکن ہو؛ اِس صورت میں واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ عام تحریروں میں، کبھی تو اِس واو کو صحیح طور پر ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے اور کبھی اُس پر ایک عدد ہمزہ مسلّط کردیا جاتا ہے، جب کہ اُس کا محل ہوتا ہی نہیں۔ وہ جو اِک نُحوسی پڑگئی ہے، یہ اُسی کا کرشمہ ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایسی صورت میں واو اور اُس سے پہلے والا حرف، دونوں ساکن ہوتے ہیں۔ اگر واو پر ہمزہ لکھا جائے تو آخری حرف واو اور اُس سے پہلے والے حرف کے بیچ میں ایک مزید متحرّک حرف کا اضافہ ہوجائے گا اور اِس طرح لفظ کی صورت ہی بدل جائے گی، بل کہ یوں کہیے کہ صورت مسخ ہوجائے گی۔

---

[1] مولّفِ نوراللغات نے اقسامِ واو کے تحت لکھا ہے:

(بقیہ حاشیہ ص ۳۶۶ پر)

جیسے ایک لفظ ہے: پاو (سیر کا چوتھائی حصّہ)۔ یہاں آخری حرف واو ہے اور اُس سے پہلے الف ہے۔ اگر اِس کو "پاؤ" لکھا جائے تو وہ تین حرفی لفظ (پاو)، اب چار حرفی بن گیا (پاء و) اور اب یہ پانا مصدر کا فعل ہوگیا، جاؤ، آؤ، کھاؤ کی طرح۔ یعنی ایک لفظ جو اسم تھا، فعل میں تبدیل ہوگیا۔
یہ بات ملحوظ رہے کہ ایسے لفظوں میں واو تلفظ میں نصف سے بھی کچھ کم آتا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ واو سے پہلے جو حرفِ علت ہوتا ہے، آواز اُس کے کھنچاو میں اِس طرح آمیز ہوجاتی ہے یا ڈوب جاتی ہے کہ آخری حرف پر، جو بہ جاے خود حرفِ علت ہے، اُس کا زور کم ہوجاتا ہے اور آواز کی کشش میں بوے ضمّہ شامل ہوجاتی ہے، بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ واوِ مجہول کی سی ایک ہلکی سی کیفیت نمایاں ہوجاتی ہے۔
ذیل میں ایسے کچھ لفظ لکھے جاتے ہیں؛ اِن سب میں، اور اِن کی قبیل کے اورسب الفاظ میں، واو پر ہمزہ کبھی نہیں لکھا جائے گا:

"اِس حرف کی چار قسمیں ہیں: معروف، مجہول، موقوف، معدول۔..... (ج)
واو موقوف: آخر میں اُن اسماے ہندی کے واقع ہوتا ہے جن میں واو کے قبل الف ہو، جیسے: بھاو تاو۔ یہ واو کبھی امر کے بعض صیغوں کے آخر میں آکر، اُن کو مصدر کر دیتا ہے، جیسے: بناو، بہاو۔ کبھی کلماتِ ہندی کے آخر میں نسبت کے واسطے آتا ہے، جیسے: پچھیاو (پچھم کی ہَوا)....."۔ (جلدِ چہارم، بیانِ واو)
واضح رہے کہ موقوف اُس حرف کو کہیں گے جس کے ماقبل متحرک حرف نہ ہو۔ "بھاو" میں واو موقوف ہے، لیکن اِس کو اگر "بھاؤ" لکھا جائے تو یہاں واوِ موقوف باقی نہیں رہے گا۔

الاؤ ، اودبِلاو ، بھاو ، بھاوتاؤ ، پاو ، پُلاو ، تاو ، چاو ، راو ر جیسے ہیمنت راو ، یا جیسے : راو بیرندر سنگھ) ، راوچاو ، کڑھاو (بڑی کوھائی) ، گاو (گاے) ، گھاو ، واو ، لمباو ، چوڑاو ، پچھیاو ، رہواو ، پتھراو ، سُتھراو ، ناوٗ[1] ، برتاو ، سبھاو ، بیچ بچاو ، باو (ہَوا ۔ جیسے : باوگولا) ، تلاو ، دریاو (جیسے : سائنسی علم دریاو ہے) ، پڑاو ۔

(۲)

بہت سے حاصل مصدر بھی اِسی انداز کے ہیں ، جیسے : بچاو ، بہاو ، دباو ، وغیرہ ۔ اِس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ایسے افعال میں ہمیشہ ہمزہ آئے گا ، مگر حاصل مصدر ہمیشہ ہمزہ سے محفوظ رہیں گے ۔ جیسے ایک مصدر ہے : گھٹانا ، اِس سے فعل بنے گا : گھٹاؤ ، اور حاصل مصدر بنے گا : گھٹاو ۔ "جوڑ گھٹاو" میں یہی حاصل مصدر[2] ہے ۔

یا جیسے گھمانا اور پھرانا ، دو مصدر ہیں ، اِن سے فعل بنیں گے : گھماؤ اور پھراؤ ۔ اور اِن کے حاصل مصدر ہوں گے : گھماو اور پھراو ۔ اِنھی سے ایک مرکب بنا

---

[1] اِس کی جمع "ناووں" اور "ناویں" بنے گی ۔ انشا کا شعر ہے :

ایسا ہی گُنی میں ہوں کہ سب ناووں کے ملّاح دریا پہ ملیں مجھ سے ، تو گُن نذر پکڑ کر

(کلامِ انشا ، ص ۹۳)

[2] بحر لکھنوی نے لکھا ہے :

" و داوِ مجہول در آخرِ امرِ حاضر برائے جمع تعظیماً آید ، چوں : آؤ ، جاؤ ..... وگاہے برائے حاصل بالمصدر ، چوں : دکھاو ، بچاو ، چڑھاو ، سجھاو " ۔ (بحر البیان)

ہے : گھماو پھراو ۔ یا جیسے دبانا سے دباؤ فعل ہوگا اور دباو حاصل مصدر ہوگا۔ مثلاً یہ جملہ : ذرا زور سے دباؤ ؛ اِس میں " دباؤ " فعل ہے ۔ اور مثلاً یہ جملہ : لڑکے ماں باپ کا دباو نہیں مانتے ؛ اِس میں " دباو " حاصل مصدر ہے ۔

یہ دو جملے ہیں : (۱) دہی جماؤ ۔ (۲) چوک میں آج بڑا جماو ہے ۔ پہلا "جماؤ" فعل ہے اور دوسرا "جماو" (ہمزہ کے بغیر) حاصل مصدر ہے ۔ یا جیسے : مجھ کو میرے دوستوں سے بچاؤ ۔ اور اپنا بچاو خود کرو۔

ایسے کچھ حاصل مصدر یہ ہیں :

اُلجھاو ، اٹکاو ، بناو (بناو سنگار) بہاو ، بچاو ، بھراو ، بہکاو ، پتاو ، پھنساو ، تناو ، ٹکراو ، ٹھہراو ، جُھکاو ، جماو ، چڑھاو ، (اُتار چڑھاو ۔ دریا چڑھاو پر ہے) چُواو ، چھڑکاو ، چُناو ، چلاو (چل چلاو) ، چھنٹاو ، دباو ، ڈلاو ، ڈھلاو ، رکاو ، کساو ، کٹاو (جیسے دریا کا کٹاو) ، گٹھاو ، گُھماو (گھماو پھراو) گھٹاو ، گراو ، گھراو (مزدوروں نے مینجر کا گھراو کیا) ۔ لداو (جیسے : لداو کی چھت) ، نبھاو ، لگاو ۔

...ب کا معروف شعر ہے :

لاکھوں لگاو ، ایک چُرانا نگاہ کا لاکھوں بناو ، ایک بگڑنا عتاب میں

...س میں " لگاو " اور " بناو " دونوں حاصل مصدر ہیں ؛ اگر اِن کو " لگاؤ " ...ور " بناؤ " لکھا جائے ، تو یہ فعل بن جائیں گے ، اور شعر کے معنی ہی ...پٹ ہو جائیں گے ۔

جیسے تلوار کی تعریف میں میر انیس کا یہ بے مثال شعر :

اشراف کا بناو، رئیسوں کی شان ہے شاہوں کی آبرو ہے، سپاہی کی جان ہے
یہاں بھی "بناو" حاصل مصدر ہے اور فعل "بناؤ" سے الگ ہے۔ ہاں،
"بناؤ بگاڑو" میں فعل "بناؤ" آئے گا۔ اِن جملوں کو دیکھیے:

گیہوں کا بھاؤ تیز ہے۔ واؤ پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ راؤ صاحب آج
آئے تھے۔ ایک پاؤ شکر لے آؤ۔ بریانی اور پلاؤ میں فرق ہے۔
چُناؤ ہوگیا۔ کوٹ میں بھراؤ اچھا نہیں پڑا۔ پچھیاؤ چل رہا ہے۔

اوپر کے جملوں میں خط کشیدہ جملوں کا املا غلط ہے۔ صحیح صورت
یہ ہوگی:

گیہوں کا بھاو تیز ہے۔ واو پر ہمزہ نہیں آئے گا۔ کوٹ میں بھراو
اچھا نہیں پڑا۔ ایک پاو شکر لے آؤ۔ بریانی اور پلاو میں فرق
ہے۔ چُناو ہوگیا۔ راو صاحب آج آئے تھے۔ پچھیاو چل رہا ہے۔

(۳)

بگاڑو، لڑاکو، اُجاڑو کی طرح کے جتنے اسمِ فاعل ہیں (اور بعض اسمِ
مفعول بھی)، اُن کے آخر میں واوِ معروف ہوتا ہے۔ قابلِ لحاظ بات یہ
ہے کہ واو اور الف کے بیچ میں ایک اور حرف ہوتا ہے، جس پر پیش
ہوتا ہے ـــــ اِس طرح کے کچھ اسمِ فاعل ایسے بھی ہیں جن میں واو
اور الف کے بیچ میں، کسی اور حرف کے بجائے، ہمزہ ہوتا ہے،
جیسے: کماؤ، اُڑاؤ (واوِ معروف کے ساتھ)۔

اِس طرح کے جتنے اسمِ فاعل ہیں، ظاہر ہے کہ اُن سب میں واو پر ہمزہ
لکھا جائے گا۔ اصل میں تو ہمزہ، واو سے پہلے آنا چاہیے، یعنی "کماؤ"
کو "کماءُو" لکھا جانا چاہیے، "اُجاڑو" کی طرح، مگر شروع ہی سے

یہ طریقہ چل نکلا ہے کہ ہمزہ کو عموماً واو اور یے کے اوپر لکھا جاتا ہے، اِس لیے اِس کا املا "کماؤ" ہوگا۔ خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ ایسے جتنے حاصل مصدر ہیں، اُن پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ اِس کے برخلاف، اِس طرح کے جس قدر اسمِ فاعل (یا اسمِ مفعول) ہیں، اُن سب پر ہمزہ لازماً لکھا جائے گا۔ تلفّظ میں ایسے لفظوں میں، واوِ معروف کی آدھی سے کچھ زیادہ آواز نکلتی ہے۔ جیسے:

کماؤ پوت، ہاتھی ڈباؤ پانی، ٹِکاؤ کپڑا، جڑاؤ زیور، بِکاؤ مال[1]، اُٹھاؤ چولھا (وہ آدمی جو ایک جگہ نہ ٹکے، مارا مارا پھرے)، پِیاؤ پر بھیڑ لگی ہے۔ جُتاؤ زمین، وہ تو بڑے لُٹاؤ ہیں، باپ کی ساری پونجی برباد کردیں گے، وہ بناؤ نہیں، بگاڑو ہیں۔

اب مختصراً اِن تینوں قاعدوں کو پھر دُہرایا جاتا ہے:

(الف) ایسے حاصل مصدر جن کے آخر میں واو ہو، اور اُس سے پہلے الف ہو، اُس واو پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا، جیسے: بناو، بچاو، گھماو، دباو، لگاو وغیرہ۔

(ب) ایسے اسمِ فاعل (اور بعض اسمِ مفعول) جتنے ہیں، اُن میں واو پر ہمزہ ضرور آئے گا، اور یہاں واوِ معروف ہوگا، جیسے: بکاؤ (بکاءُو)، پِلاؤ (پلاءُو) جیسے: پلاؤ جانور وغیرہ

---

[1] ایک کوڑی کو نہ لیجے، جو فروشندہ کہے ہے بکاؤ، کوئی زنبیلِ عمرو لیتا ہے؟
انشا (کلامِ انشا، ص ۲۶۲)

(ج) ایسے افعال پر ہمزہ ضرور آئے گا، جیسے: آؤ، جاؤ، بناؤ، لاؤ، پاؤ، کھاؤ، اُڑاؤ، کماؤ، جماؤ، اُگاؤ۔ اور یہاں واوِ مجہول کی آواز نکلے گی۔

(۴)

مندرجۂ ذیل الفاظ میں بھی واو ساکن ہے اور اُس سے پہلے نونِ غنہ ہے، اور یہاں بھی ہمزہ نہیں آئے گا:

گانو، پانو، چھانو، دنو، کھڑانو، ٹھانو، اانو۔

پہلے دونوں لفظوں (گانو، پانو) کی جمع اِس طرح بنے گی کہ لفظ کے آگے "وں" کا اضافہ کیا جائے گا، یعنی دو واو یک جا ہو جائیں گے، پہلا واو اصل لفظ کا جز ہوگا، اور دوسرا واو جمع کا۔ اِس جمع کے واو پر ہمزہ لکھا جائے گا:

گانو گانوؤں

پانو پانوؤں

کھڑانو کی جمع "کھڑانووں" اور "کھڑانویں"[1] بنے گی۔

(۵)

ذیل کے الفاظ میں بھی آخری حرف واو ہے۔ اِس سے پہلے یِ ساکن ہے، یہاں بھی ہمزہ نہیں آئے گا:

دیو (مہادیو۔ بلدیو، بے دیو، دیوتا، دیو کی نندن، دیو...)، خدیو، جنیو، گیو (معروف ایرانی پہلوان کا نام)، غزیو، سیو،

---

[1]

مُنہ پہ جوگی کے، کھڑانویں وہ پٹک مارے ہے بس توکل پہ فقط باندھ کمر لیتا ہے

(انشا (کلامِ انشا، ص ۲۶۵)

ریو (مکر)

میر انیسؔ کے ایک مرثیے کا ایک بند یاد آگیا، جس میں اِس فہرست کے چار لفظ: دیو، خدیو، گیو، جنیو؛ بہ طورِ قافیہ یک جا ہو گئے ہیں:

نے وہ تہمتنی تھی، نہ وہ زور گیو کا   مُنہ پھر گیا، تمانچۂ ضیغم سے، دیو کا
ظالم، شکار ہو گیا گیہاں خدیو کا   کافر وہ تھا، تو ہاتھ بھی مارا جنیو کا
نکلی بغل سے تیغ عجب کرّ و فر کے ساتھ
اک ہاتھ تن کے ساتھ گرا، ایک سر کے ساتھ

دیو کی جمع دیووں ہو گی۔ یہاں جمع کے لیے "ون" کا اضافہ کیا جائے گا۔ (دیوتا کی جمع دیوتاؤں ہو گی اور دیوی کی جمع دیویوں بنے گی) اِسی طرح خدیو کی جمع خدیووں آئے گی۔

(۶)

مندرجۂ ذیل الفاظ کا تلفّظ، مندرجۂ بالا الفاظ کے تلفّظ سے ذرا سا مختلف ہے؛ یہ سب لفظ بھی ہمزہ کے بغیر لکھے جائیں گے:

(الف) پیو (پیا کی ایک صورت)، جیو (جیسے: شیخ جیو) [۱]، نیو، میو (۱۔ ایک نام ۲۔ میوات کے رہنے والے لوگ)، کرفیو، ریویو۔

(ب) بیورا، تیورا، نیولا، جیوڑا، سیوڑھا، دیوی، دیوتا، سیوتی، ریوتی، کیوڑا، ڈیوڑھا، پیوسی، بیوہار، بیوپار، تیوہار، بیوپاری، دیوِ لالی، نیوتا، چیونگم۔

---

[۱] اِس منھوے پن پہ میٹھے کس قدر ہیں شیخ جیو   تو ندتم اُن کی نہ سمجھو ہے یہ مٹکا راب کا
انشا (کلامِ انشا، ص:)

اِن کی جمع کی صورت یہ ہوگی :

تیوہار :	تیوہاروں	میو :	میوؤں
تیورا :	تیوروں	ڈیوڑھا :	ڈیوڑھوں
نیولا :	نیولوں	دیوتا :	دیوتاؤں
نیوتا :	نیوتوں	دیونی :	دیونیوں
نیو :	نیوؤں	بیوپاری :	بیوپاریوں

(۷)

سِوا ، ہَوا ، سُوا ؛ یہ تین لفظ بہ طورِ مثال لکھے گئے ہیں ۔ پہلے لفظ میں واو سے پہلے والے حرف پر زیر ہے ، اور دوسرے لفظ میں ماقبلِ واو مفتوح ہے؛ اِن دونوں لفظوں میں واو کا تلفّظ صاف اور واضح ہے ۔ اِس طرح کے لفظوں کے املا میں عموماً غلطی نہیں ہوتی ۔ تیسرے لفظ میں واو سے پہلے والے حرف پر پیش ہے ؛ اِس طرح کے لفظوں میں واو کی آواز صاف صاف نہیں نکلتی ، اُس طرح جیسے ہَوا اور دَوا اور سِوا جیسے لفظوں میں نکلتی ہے ، بل کہ ایسے لفظوں میں الف اور واو کی آواز ایک دوسرے میں آمیز ہوجاتی ہے ، اور جس طرح یاے مخلوط کی آواز نکلتی ہے ، اُسی طرح یہ واو تلفّظ میں آتا ہے ۔ اِس کو آسانی کے لیے ، یاے مخلوط کی طرح ، واوِ مخلوط کہا جا سکتا ہے ۔ ایسے لفظوں کے لکھنے میں کبھی کبھی یہ غلطی ہوجاتی ہے کہ واو پر ہمزہ بھی لکھ دیا جاتا ہے ، حالاں کہ یہ درست نہیں ۔ ایسے سب لفظوں میں صرف واو لکھا جائے گا ، ہمزہ ہرگز نہیں آئے گا ۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں :

(الف) بُوا ، سُوا ، تھُوا ، جُوا ، پھُوا ، جوالا ، جوالامکھی ، سوارت ،

کوالٹی ، کواٹر، گوّالا ، جُوار ، جُواری ، دُوار ، گنوارا ، بھُوار ، پھُوارا ، چھُوارا ، چُواچندن ، پوائنٹ ، جُوائس ، چُوائس ۔

(ب) ہُوا ، چھُوا ، مُوا ، چُوا ، چھُوانا ، بُوانا ، چُوانا ۔

یہ چار لفظ : ہُوا ، مُوا ، چھُوا ، چُوا ؛ فعل ہیں ۔ ہُوا کی دوسری صورتیں ہیں : ہوئی ، ہوئے ، ہوؤں ۔ اِن سب صورتوں میں ہمزہ آتا ہے ، اُسی طرح جس طرح ایسے اور فعلوں کے مشتقات میں آتا ہے ، مگر ہُوا کو ہمزہ کے بغیر ہی لکھا جاتا ہے ۔ یہ استثنا ہے ۔ یہی صورت باقی تین افعال کی ہے کہ اُن کے مشتقات میں بھی ہمزہ آتا ہے ، اِس طرح :

ہوا ، ہوئی ، ہوئے ، ہوؤں (مارے ہوؤں)۔

مُوا ، موئی ، موئے ، موؤں۔

چھُوا ، چھوئی[1] ، چھوئے۔

چُوا ، چوئی ، چوئے۔

ہُوا کے سلسلے میں ڈاکٹر صدیقی مرحوم نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا تھا :

▪ ہونا (مصدر) ، ہو (مادّہ اور وہی امر) ۔ مضارع : ہو اور ہوئے (ہووے) ۔ اِس قبیل کے اور فعل : بونا ، چبھونا ، دھونا ، ڈھونا ، رونا ، سونا ، کھونا وغیرہ ، جن کے مصدر ، امر اور مضارع اُسی طرح ہیں جیسے ہونا کے ، لیکن ماضی میں فرق ہے کہ مثلاً بویا ، دھویا وغیرہ کے "ہو"

---

[1] چھوئی موئی ، ایک مشہور پودے کا نام ہے ، اُس کی پتّیوں کو ذرا چھوا نہیں کہ وہ مری نہیں (پرانی زبان میں : موئی نہیں) یعنی سمٹ کر بند ہو جاتی ہیں ۔

کا ماضی "ہویا" نہیں ہے، "ہُوا" ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہیے کہ "ہونا" وغیرہ کا ایک عام قاعدے کے مطابق ماضی بنتا ہے اور "ہو" کا عام قاعدے کے خلاف (یعنی قاعدے سے مستثنا ہے)۔ اِس پر تعجّب نہ کرنا چاہیے، اِس لیے کہ اکثر زبانوں میں امدادی فعلوں کی گردان قاعدے کے خلاف ہوتی ہے۔

ہو سے ہُوا، ہوئے، ہوءی، ہوءیں (ہوئیں)۔

ہو کا و پوری آواز دیتا ہے اور مشتق صیغوں میں و محض اظہارِ ضمّہ کے لیے رہ گیا ہے اور اگلے حرف الف سے مل کر ہمزہ اور الف (یا ی یا ے) دونوں آوازیں ایک جان ہو جاتی ہیں۔ بہ خلاف اِس کے "کیا" میں یا الگ سے آواز دیتا ہے۔ اِس قسم کے فرق اِس درجہ خفیف ہیں کہ اِن کے لیے موجودہ کتابت کے سوا کوئی صورت پیدا نہیں کی جاسکتی"۔ (مکتوب ڈاکٹر صدّیقی بہ نامِ راقم الحروف)

اصول اور قاعدہ جو بھی کہتا ہو، یہ واقعہ ہے کہ "ہُوا" ہمزہ کے بغیر مستعمل ہے، اور اُس کی یہی متعارف صورت رکھی جائے گی۔ "ہؤا" اجنبی معلوم ہوتا ہے اور تلفّظ کے لحاظ سے بھی ہمزہ اِس میں زائد ہے۔ اِن سب فعلوں کی وہی صورتیں صحیح مانی جائیں گی، جن کو اوپر لکھا جاچکا ہے۔ یعنی: ہوا، ہوئی، ہوئے، ہوؤں۔ اِسی طرح اور فعل۔ یہ فعل تلفّظ میں کسی طرح آئیں، یعنی خواہ "ءو" اور "ءے" اور "ءی" کا اشباع ہو، یا اُس کے برعکس صورت ہو؛ بہ ہر صورت میں اُن کو لکھا جائے گا، مع ہمزہ۔

(۸)

ذیل میں جو لفظ لکھے جا رہے ہیں، یہ سب، اور اِن کی طرح کے اور لفظ بھی، اِن سب میں واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا:

(الف) باولا، باولے، باولی، اُتاولا، اوتاولی، اوتاولے، راوٹی، چھاونی، گھناونی، گھناونا، سُناونی، گاودی، ساونی، سانولا، بکاولی، باوٹا، پھاوڑا، امراوتی۔

(ب) بچھوا، بسوا، بھکوا، بتھوا، بھڑوا، بلوا، بُلوا، بندھوا، بروا، بھگوا، بچوا، بٹوا، پُتوا، پٹوا، پُروا، پکھوا، پھگوا، پچھوا، پوّا، پڑوا، تلوا، تُلواں، تھُوا، تمبکوا، ٹھلوا، ٹلوا، جُموا، جروا، جھوّا، جُوا، جُڑواں، چھٹوا، چھٹوّا، چوّا، چروا، چکوا، چندوا، چرکوا، دُھوانسا، رُوانسا، دوا، رحموا، کنکوا، کھوّا، ہوّا، گلوّا، کوّا، للوا، ملوا، گیہواں، گھروا، کھڑوا، سروا، سُتواں، لہرُوا، گڑوا، کڑوا، کچھوا، کلوا، مٹروا، منگلوا، کھاروا، مُنوا، کہروا، نلوا، مُہوا، نتھوا، نکوا، مردوا، مال پوا۔

(ج) سُوَر، کُنور، پرمیشور، راجیشور، کملیشور۔

جن اسموں میں آخری حرف الف ہے، اور اُس سے پہلے واو ہے؛ اُن کی جمع اِس طرح بنے گی کہ الف ہٹ جائے گا اور "وں" "یا "ے" کا اضافہ کیا جائے گا۔ محرّف صورت میں بھی "ے" کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: بچھوا کی جمع بچھوے اور بچھووں بنے گی۔

اِس کے برخلاف، جن اسموں کے آخر میں واوِ معروف ہے، اور اُس سے پہلے کوئی حرفِ صحیح ہے؛ اُس صورت میں جمع کے لیے "ؤں" (ءوں) کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: بچھوُ سے بچھوؤں، چاقو سے چاقوؤں،

اور ہندو سے ہندوؤں ۔ مزید وضاحت کے لیے ذیل میں اِن لفظوں کی اِن صورتوں کو پیش کیا جاتا ہے ۔

(الف)

ٹھُوا	ٹھُوے	ٹھُووں
سُوا	سُوے	سُووں
پُھوا	پُھوے	پُھووں
پسوا	پسوے	پسووں
بھکوا	بھکوے	بھکووں
ہوّا	ہوّے	ہوّوں
جھوّا	جھوّے	جھوّوں
بھڑوا	بھڑوے	بھڑووں
مرُدوا	مرُدوے[1]	مرُدووں
مال پُوا	مال پُوے[2]	مال پُووں
کھڑوا	کھڑوے	کھڑووں
بٹوا	بٹوے	بٹووں
کنکوّا	کنکوّے	کنکوّوں
کوّا	کوّے	کوّوں

---

[1] باجی کہتی ہیں کہ اک مردوے پر غش ہے تو مفت ایسا بھی کسی شخص پہ بہتان ہو، نوج
انشا (کلامِ انشا، ص ۲۰۴)

[2] کھلا کے مال پوے، ترتراتے موہن بھوگ گروجی، چیلوں کو اپنے بھنڈ کرتے ہیں
انشا (کلامِ انشا، ص ۱۶۲)

چڑاوا	چڑاوے	چڑاووں
جُوا	جُوے	جووں
بتھوا	بتھوے	—
تلوا	تلوے	تلووں
کچھوا	کچھوے	کچھووں

ایک لفظ ہے : بھوں (ابرو کے معنی میں)، اس کی جمع بھویں اور بھووں آئے گی۔

کرتے ہیں مسجدوں میں شکوۂ مستاں، زاہد یعنی آنکھوں کا، بھووں سے یہ گلہ کرتے ہیں
(منیر)

بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں (داغ)

"بھوآں" جمع کی پرانی صورت ہے۔

(ب)

بچھو	بچھوؤں	ہندو	ہندوؤں
بہو	بہوؤں	سادھو	سادھوؤں
پلّو	پلّوؤں	اُلّو	اُلّوؤں

لہ "بھوں کی جمع "بھویں" ہوتی ہے۔ ہندی میں بھوں کے آخر کا نونِ غنہ محض اعراب کا کام دیتا ہے، کوئی حرف نہیں ہے؛ اس لیے اس کی جمع اس طرح بنائی گئی ہے گویا لفظ کے آخر میں وَ ہے، ں نہیں"۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم۔ (قواعدِ اردو، طبعِ چہارم، ص ۴۶)

بازو	بازوؤں	خالو	خالوؤں
پہلو	پہلوؤں	آلو	آلوؤں
تمبو	تمبوؤں	آنسو	آنسوؤں
جادو	جادوؤں (جادوئی)	بابو	بابوؤں
چلّو	چلّوؤں	ڈاکو	ڈاکوؤں

یہ بات دھیان میں رہے کہ "ڈاکوؤں" جیسی جمعوں میں، پہلے واو کی آواز کچھ دبی ہوئی سی نکلتی ہے۔

ہاں لفظ سُوا جس کی جمع سوے اور سووں ہوگی، اِس کا اسمِ مونث سوئی ہے۔ اور جمع سوئیاں اور سوئیوں ۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ اِس میں اصلاً واوِ معروف کی آواز نکلتی ہے، یعنی تلفّظ کے لحاظ سے یہ سُوا سے[1] مختلف ہے۔ شاعری میں بعض جگہ اِس کو بروزنِ فَعَل بھی نظم کیا گیا ہے، مگر یہ شاعری کی بات ہے۔

(۹)

جس طرح بٹوا، چھٹوا اور شور، کنور اور دیو، جنیو جیسے لفظوں میں واو کی آواز، یاے مخلوط کی طرح، نصف کے قریب نکلتی ہے؛ اِسی طرح عربی کے کچھ لفظ ایسے ہیں جن کے تلفّظ میں بھی وہی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔ اِن سب لفظوں میں بھی واو پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائے گا۔ ایسے کچھ

---

[1] تارِ بخیہ کیوں ہمارے زخم تک آتا نہیں سوئی کے ناکے کو رو کا کس گریباں چاک نے

دکھا کے غیر کو مژگاں کی سوئیاں کیا کیا مرے جگر میں وہ لیتا ہے چٹکیاں کیا کیا

لفظ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں ۔ یہ خیال رہے کہ اِن سب لفظوں میں واو سے پہلے والا حرف مضموم ہے ۔ یہ لفظ اور اِن کی قبیل کے اور سب لفظ، سب میں صرف واو لکھا جائے گا :

موافق ، موافقت ، مواصلت ، موثّر ، موخّر ، مودّب ، موذّن ، مورّخ ، موقّر ، موکّد ، موکّل ، مولّف ، مولّفہ ، مونّث ، مویّد ، مواخذہ ، موازنہ ، موسّس ، موفّق ، موجّل ، موجّہ ، موشّح ، مورّخہ ۔

موثّر ، مونّث ، موخّر جیسے لفظوں کو بہت سے لوگ مع اضافۂ ہمزہ "مؤثّر ، مؤخّر ، مؤنّث" لکھا کرتے ہیں ۔ عربی میں جو بھی صورت ہو ، اردو املا کے لحاظ سے یہ غلط لکھاوٹ ہے ۔ ایک حرف (واو) کی جگہ دو حرف (ء و) کیوں لکھے جائیں گے ؛ اِن سب لفظوں کو ہمزہ کے بغیر لکھا جائے گا ۔ اِن لفظوں کی (اردو) جمع اِس طرح بنے گی کہ "وں" کا اضافہ کیا جائے گا۔ ہمزہ یہاں بھی نہیں آئے گا :

موذّنوں ، مورّخوں ، موکّلوں ، مولّفوں ، مویّدوں ، موسّسوں ۔

(۱۰) انگریزی وغیرہ کے ایسے لفظ جن میں الف اور واو یک جا ہیں ، جیسے : پاونڈ ، اِن سب میں بھی واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا ، جیسے :

الاونس ، ساونڈ ، گراونڈ ، کمپاونڈ ، کمپاوڈر ، پاوڈر ، راونڈ ، پاونڈ ، ساوتھ ، ماوتھ ، ماوزی تنگ ، چاو اِن لائی ، اکاونٹ ، اناونسر ، اکاونٹنٹ ، باونڈ ،

یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ایک حرفِ علّت کی جگہ ، دو حرفِ علّت نہیں آئیں گے ۔ کوئی لفظ ہو ، اور کسی زبان کا ہو ، اصول یہی رہے گا ۔

(۱۱)

رئیس کی جمع عربی کے قاعدے سے " رُؤَسا" ہوگی (حکما اور علما کے وزن پر)۔ یعنی ایک واو، اُس پر ہمزہ اور ہمزہ پر زبر۔ اِس املا کو عربی سے مخصوص سمجھنا چاہیے۔ اردو میں سادہ طور پر رُءَسا لکھا جائے گا۔ جن صاحب کو یہ صورت پسند نہ ہو، وہ زیادہ سادگی کے ساتھ اردو کی جمع "رئیسوں" استعمال کریں۔

(۱۲)

بعض ناموں میں کبھی صرف ہمزہ لکھا جاتا ہے اور کبھی واو پر ہمزہ لکھا جاتا ہے۔ جیسے: ثناء اللہ اور ثناؤ اللہ۔ اِس سے قطعِ نظر کرکے، کہ عربی میں کیا صورت ہے،[1] اردو میں ایسے سب ناموں میں صرف ہمزہ لکھا جائے گا۔ جیسے:

بہاءاللہ، بہاءالدین، علاءالدین، ثناءاللہ، ثناءالحق، ضیاءالدین، ضیاءاللہ، عطاءاللہ، عطاءالرحمان، بقاءاللہ، ذکاءاللہ، وغیرہ۔

(۱۳)

عطف کی صورت میں واو پر ہمزہ کسی جگہ نہیں آئے گا۔ جیسے ایک مرکب ہے: جلال و جمال، اِس کے املا میں، یا اِس طرح کے اور مرکبات کے املا میں غلطی واقع نہیں ہوتی؛ مگر جب مرکبِ عطفی کے پہلے جز کا آخری حرف الف، ہائے مختفی، ی، یے یا واو ہو؛ تب اکثر یہ غلطی ہو جاتی ہے کہ واو پر ایک عدد ہمزہ کو مسلط کر دیا جاتا ہے، جو بالکل فالتو ہوتا ہے اور اِس طرح

---

[1] انتظامِ رُءَسا اُس سے ہوا ایسا کچھ — منتظم رشتے میں جس طرح سے ہوں دُرِّ عدن
انشا (کلامِ انشا، ص ۳۲۸)

املا غلط ہو جاتا ہے ۔

یہ بات خاص طور سے ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ واوِ عطف سے پہلے اگر الف ، یاے معروف ، یاے مجہول ، یا واو یا ہاے مختفی ہو ؛ اِس صورت میں بھی واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا ، اور اِس واو کو اُسی طرح لکھا جائے گا جس طرح مثلاً جاہ و منصب ، جلال و جمال ، خوب و زشت وغیرہ میں لکھا جاتا ہے ۔

ذیل میں اِن پانچوں حرفوں کی نسبت سے کچھ مثالیہ مرکّبات لکھے جاتے ہیں۔

(الف) ایسے مرکّبات جن میں واوِ عطف سے پہلے الف ہے :

دنیا و دین ، جزا و سزا ، وفا و جفا ، خطا و درگذر ، جفا و جور ، آقا و غلام ، خدا و رسول ، دعا و دوا ، ادا و ناز ، فنا و بقا ، ادا و قضا ، ادا و غمزہ ، املا و انشا ، اخفا و اظہار ، ابتدا و انتہا ، آبا و اجداد ، دنیا و مافیہا ، تمنّا و حسرت ، عطا و کرم ، انبیا و اولیا ، ہوا و ہوس ، علما و شعرا ، فردا و دوش ، ایما و اشارت ۔

(ب) ایسے مرکّب جن میں واوِ عطف سے پہلے یاے معروف ہو ۔

زندگی و موت ، بندگی و خواجگی ، آزادی و گرفتاری ، ترقّی و تنزل ، تجلّی و تحیّر ، عاجزی و غرور ، عاشقی و خودداری ، بندگی و مجبوری ، بےچارگی و ذلّت ، بے مایگی و افلاس ، رعنائی و زیبائی ، گرمی و سردی ، خوبی و زشتی ، نیک نامی و بدنامی ، مولوی و ملّا ، پیری و صد عیب ، تسلّی و تشفّی ۔

(ج) ایسے مرکّبات جن میں واوِ عطف سے پہلے یاے مجہول ہو :

مے و جام ، نے و نغمہ ، پیاپے و ہردم ، مے و مینا ۔

(د) وہ مرکّب جن میں جُزوِ اوّل کے آخر میں ہائے مختفی ہے:

گذشتہ و آیندہ، نغمہ و رقص، کعبہ و بت خانہ، نالہ وزاری، جلوہ و پردہ، پیمانہ و جام، سادہ و پُرکار، آہستہ و تیز، افسردہ و پژمردہ، دیدہ و شنیدہ، نالہ و فریاد، افسانہ و افسوں، کرشمہ و ناز، پاکیزہ و لطیف، جادہ و منزل، کلمہ و کلام، افسانہ و حقیقت، پروانہ و شمع، نامہ و پیغام، آشیانہ و قفس، بندہ و آقا، خواجہ و غلام، مرثیہ و غزل، مدرسہ و خانقاہ، مے خانہ و مسجد۔

(ہ) ایسے مرکّب جن میں واوِ عطف سے پہلے بھی واو ہوتا ہے: یعنی دو واو ایک جا ہوتے ہیں۔ پہلا واو، لفظ کا آخری جُز ہوتا ہے اور دوسرا عطف کا واو ہوتا ہے:

جستجو و تلاش، آرزو و تمنّا، گیسو و رُخ، بازو و سینہ، جادو و اعجاز، ہندو و مسلمان، سبو و جام، ہلاکو و چنگیز، اردو و فارسی، گفتگو و خموشی، ابرو و چشم، نشو و نما، ابرو و مژگاں، آبرو و منصب، پہلو و رخ، دیو و دد، خدیو و فغفور، ریو و ریا۔

ایک بار پھر اِس بات کی تکرار کردی جائے کہ اُوپر پانچ عنوانات کے تحت جس قدر مرکّبات آئے ہیں، اُن میں عطف کے واو کے ساتھ ہمزہ نہیں آئے گا۔ اِس انداز کے باقی مرکّبات کو اِن پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ اِس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ مرکّبِ عطفی میں واو پر، یا واو سے پہلے والے حرف پر، ہمزہ کہیں نہیں آئے گا۔ بعض مثالیہ شعر:

لیا چھین ابرو و مژگاں نے عام و خاص کا جوڑا بنی وہ چشم، سعدِ ابنِ ابی وقاص کا جوڑا

انشا (کلامِ انشا، ص ۴۳)

ہیں ترے ابرو و مژگان و نگاہ و چشم ، آہ ! طائرِ دل کو ، کمان و ناوک و تیر و قفس
(انشا ، کلامِ انشا ، ص ۱۰۶)

بزم ، داغِ طرب و باغ ، کشادِ پرِ رنگ شمع و گل تا کے و ، پروانہ و بلبل تا چند
(غالب ، دیوانِ غالب ، نسخۂ عرشی ص ۳۹)

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں نالۂ مرغِ سحر ، تیغِ دو دم ہے ہم کو
(غالب ، دیوانِ غالب ، نسخۂ عرشی ، ص ۱۹۵)

مطلعِ تازہ ہوا موجۂ کیفیّتِ دل جامِ سرشارِ مے و غنچۂ لب ریزِ بہار
(غالب ، دیوانِ غالب ، نسخۂ عرشی ، ص ۵)

خوں ہوا دردِ دو عالم سے ، تمنّا کا دماغ بزمِ یاس ، آنسو ، پیدائی و اخفا رنگیں
(غالب ، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ، ص ۷)

مانگنے کی ہے ترے دَور میں سائل کو قسم چاہیے گو اُسے تخت کے و اقلیمِ ختن
(انشا ، کلامِ انشا ، ص ۳۳۰)

گر شیخ اُسنے نغمۂ لبّیک کو ، بھولے آوازِ نے و بین و دف و چنگِ خرابات
(انشا ، کلامِ انشا ، ص ۶۲)

سادہ و پُرکارتر ، غافل و ہشیار تر مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سنبل ہنوز
(غالب ، دیوانِ غالب ، نسخۂ عرشی ، ص ۴۳)

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل زنہار! اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے
(غالب ، دیوانِ غالب نسخۂ عرشی ، ص ۲۳۰)

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ یہ جنّتِ نگاہ ، وہ فردوسِ گوش ہے
(غالب ، دیوانِ غالب ، نسخۂ عرشی ، ص ۲۳۰)

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی
(ایضاً ، ص ۲۳۲)

جس طرف دیکھیے، چراغاں ہے   شیشہ و شمع ہی نمایاں ہے
میرؔ (کلیاتِ میرؔ، مرتبۂ آسی، ص ۸۴)

کر چمن زارِ دست و دل کی سیر   ہیں نہاں آج آشنا و غیر
میرؔ (کلیاتِ میرؔ، مرتبۂ آسی، ص ۸۱)

شریکِ مشورۂ کارخانۂ عالم   کیا ہے تجھ کو، قضا و قدر ہیں تیرے مشیر
میرؔ (کلیاتِ میرؔ، مرتبۂ آسی، ص ۷۹)

(۱۴)

گاے اور گاو، دونوں لفظوں میں ہمزہ نہیں۔ پہلے لفظ کے آخر میں یے ہے اور دوسرے لفظ کے آخر میں واو۔ اردو میں گاو کی ایک صورت گئو بھی مستعمل ہے۔ اِس میں ہمزہ اور واو دونوں کی آوازیں آمیز ہو جاتی ہیں، اور جس طرح مئی، چکنئی، بڑھئی وغیرہ میں "ی" کی آواز نکلتی ہے؛ اُسی طرح گئو میں "و" کی آواز نکلتی ہے۔ آصفیہ میں اِس لفظ کے کئی مرکبات کو لکھا گیا ہے، مگر ہر جگہ اِس کا املا "گؤ" ملتا ہے، اصولاً یہ املا غلط نہیں، مگر اچھا یہ ہے کہ اِس کو "گئو" لکھا جائے، جس طرح مئی اور مغلئی لکھا جاتا ہے کہ اِن لفظوں میں ہمزہ کا شوشہ، یِ سے پہلے آتا ہے، یِ کے اوپر ہمزہ نہیں آتا؛ اُسی طرح لفظ "گئو" کو بھی لکھنا چاہیے، اِس طرح:

گئو، گئو دان، گئو شالا، گئو ہتیا، گئو پُتر،
گئو لوچن، گئو گھاٹ۔

گئو دان، گئو شالا اور گئو ہتیا میں لفظ گئو کا تلفظ کبھی "گو" بھی

کیا جاتا ہے ۔ اردو میں یہ لفظ دونوں طرح سُننے میں آیا ہے ، یعنی : گَو ، اور گئو ۔ مگر آخری صورت میں زیادہ مستعمل ہے ، اِسی لیے "گئو" کو مرجّح قرار دیا گیا ہے ۔ آصفیہ میں بھی یہ لفظ مع ہمزہ ہے ۔ البتہ فارسی کا لفظ "گوسالہ" ہمزہ کے بغیر ہے ، اور اِس کو اِسی طرح لکھا جائے گا ۔

ہمزہ اور ہائے مختفی

ہمزہ کو علامتِ اضافت کے طور پر صرف ایک صورت میں استعمال کیا جائے گا، اور یہ صورت اُسی وقت واقع ہوگی جب لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو۔ اور کسی بھی صورت میں اضافت کے لیے ہمزہ کو علامتِ اضافت کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ایسے مقامات پر ہمزہ کی حیثیت محض علامتِ اضافت کی ہوگی اور اُس کو مختفی ہ کے اوپر لکھا جائے گا۔ جیسے: کعبۂ دل، جلوۂ دوست۔ چوں کہ ایسے لفظوں میں ہمزہ، اضافت کی علامت ہوگا، اِس لیے اُس کو مکسور فرض کر لیا جائے گا، اُس کے نیچے زیر نہیں لگایا جائے گا۔ کیوں کہ زیر بھی تو علامت ہی ہے، اور یک ساں علامتوں کو جمع نہیں کیا جائے گا۔ بعض مثالیں:

تیرا پیمانۂ مے، نسخۂ ادوارِ ظہور — غالب

مسطرِ موجۂ دیباچۂ درسِ اسرار — ״

قبلۂ نورِ نظر، کعبۂ اعجازِ مسیح — ״

مژدۂ دیدۂ نخچیر ہے، نبضِ بیمار — ״

ساز ہا مفت بریشم کدۂ نالۂ زار　　　　غالبؔ

نازپروردۂ صد رنگ تمنا ہوں، و لے　　　　"

تشنۂ خونِ دو عالم ہوں بہ عرضِ تکرار　　　　"

آیتِ رحمتِ حق، بسملۂ مصحفِ ناز　　　　"

ایسے لفظوں میں اضافت کی صورت میں ہائے مختفی اپنے حرفِ ماقبل کی حرکت کو سہارا دینے کے بجائے، علامتِ اضافت (ہمزہ) کے لیے سہارا فراہم کرتی ہے، کیوں کہ کسی ایسے سہارے کے بغیر، علامتِ اضافت اپنی جگہ نہیں بنا سکتی۔ چوں کہ علامتِ اضافت کے سبب سے لفظ کا آخری صوتی ٹکڑا متحرک ہوتا ہے؛ اِس لیے حرفِ ماقبلِ ہائے مختفی کو سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیوں کہ اِس صورت میں وہ درمیانی حرف میں تبدیل ہوجاتا ہے، (تشنۂ = تَ شْ نَ ءُ) اور درمیانی حرف کی حرکت کو اپنے قیام یا اُستواری کے لیے کسی ایسے سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

قدیم فارسی میں ایسے لفظوں کے آخر میں اضافت کے لیے "ي" لکھی جاتی تھی، یعنی: خانہ ی من، جلوہ ی خدا، یہی ي، مختصر ہوکر ء کی صورت میں نمایاں ہوئی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا مقالہ: ہائے مختفی اور اُس سے متعلقہ دستوری و املائی مسائل۔ مشمولہ مجلّۂ فکر و نظر ۷، ۲، ۱۹۶۱ء) فارسی میں جو بھی صورت ہو، اردو میں شروع ہی سے یہ علامتِ اضافت، ہمزہ کے نام سے اور ہمزہ کی حیثیت سے آئی ہے اور اب اِسے ہمزہ ہی کہا جائے گا۔

مختصر یہ کہ، مختفی ہ، علامتِ اضافت کے طور پر زیر کو قبول نہیں کرتی

اند یہاں پر اِس کا حرف نہ ہونا ، اِس عدمِ قبول کی وجہ ہے ۔ زیر کے بجائے ، وہ اضافت کی دوسری علامت ، ہمزہ کو قبول کرتی ہے اور اُس کے قیام کے لیے سہارا فراہم کرتی ہے ۔ گویا ایسے مقامات پر یہ " بے جان علامت " میں تبدیل ہوجاتی ہے اور دوسری علامت کی نشست (SEAT) کے کام آتی ہے ۔

یہ بات خاص طور پر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اضافت کی صورت میں تو ایسے لفظوں میں ہائے مختفی پر ہمزہ آئے گا (جیسے : تشنۂ کربلا) مگر عطف کی صورت میں مختفی ہ پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائے گا ، بل کہ لفظ کے بعد ، قاعدے کے مطابق ، عطف کا واو آئے گا ، جیسے : تشنہ و گرسنہ ، جلوہ و پردہ ، کعبہ و بت خانہ ، پیمانہ و صراحی ، نغمہ و رقص ، جذبہ و فکر ، گذشتہ و آیندہ ، افسردہ و پژمردہ ، افسانہ و افسوں وغیرہ ۔

چوں کہ عطف کا واو یہاں پر موجود ہوتا ہے ، (جو بہ یک وقت حرفِ علت بھی ہے اور علامتِ عطف بھی) اِس لیے اُس سے پہلے یا اُس کے ساتھ کسی اور علامت کی ضرورت نہیں ۔ اِس طرح مثلاً " افسانۂ و افسوں " لکھنا غلط ہوگا ۔ اِس لیے کہ یہاں " ہمزہ " فالتو بھی ہے اور غلط بھی ۔ اِس کی ضرورت ہی نہیں ۔ اضافت کی صورت میں جو کام " ہمزۂ اضافت " انجام دیتا ہے ، ترکیبِ عطفی کی صورت میں وہی کام " واوِ عطف " انجام دیتا ہے ۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ ایسے عطفی مرکبات میں ہائے مختفی ، اپنے اصل کردار ہی کو ادا کرتی ہے ، یعنی وہ حرفِ ماقبل کی حرکت کو حسبِ معمول سہارا فراہم کرتی ہے ، اور اِس لیے اِس کو

حسبِ معمول لکھا جائے گا۔

عطف کا واو یوں تو متحرک ہوتا ہے یعنی اُس پر زبر ہوتا ہے (فارسی میں)، مگر اُس وقت جب کہ وہ دو جملوں کے بیچ میں آتا ہے یا جب وہ دو لفظوں کے بیچ میں آتا ہے تو اُس کا زبر غائب ہو جاتا ہے اور پیش کی ہلکی سی کیفیت (بوے ضمہ) کو قبول کر لیتا ہے اور اِن دونوں صورتوں میں (یعنی وہ مفتوح ہو یا مضموم) اظہارِ حرکت کے لیے اُس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مختصر یہ کہ (۱) جب کسی لفظ کے آخر میں مختفی ہ ہوگی تو اضافت کی صورت میں اُس مختفی ہ پر ہمزہ لکھا جائے گا۔ یہ ہمزہ اضافت کی علامت کی حیثیت سے آئے گا، جیسے: نشۂ دولت، نغمۂ فردوس، جلوۂ مہتاب۔

(۲) عطف کی صورت میں ایسے لفظوں کے آگے عطف کے واو کا اضافہ کیا جائے گا، اور مختفی ہ پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ جیسے: نغمہ و رقص، پاکیزہ و لطیف، غنچہ و گُل۔

ہمزہ اور ی

(۴)

ہمزہ کا سب سے زیادہ غلط استعمال یاے معروف و مجہول کے ساتھ ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں ی ساکن ہے یا متحرک، اور وہاں کسی اور حرف کی نہ ضرورت ہے، نہ گنجایش؛ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یا تو ی کے اوپر ایک ہمزہ بھی لکھ دیا جاتا ہے، یہ سوچے اور دیکھے بغیر کہ وہاں اُس کی ضرورت ہے یا نہیں، یا پھر ی کو سرے سے غائب کر دیا جاتا ہے، اور اُس کی جگہ ہمزہ کو دے دی جاتی ہے۔ اِس سہل انگاری، بے احتیاطی اور کم نظری نے وباے عام کی سی حیثیت اختیار کرلی ہے اور اِس طرح غلط نگاری کی نہایت بُری مثالیں عالمِ وجود میں آتی رہتی ہیں۔ اِس طرف خاص طور سے توجّہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ ہمزہ اور ی کے محلِّ استعمال کو واضح طور پر سمجھا جائے اور صحیح اندازِ نگارش کو اختیار کیا جائے۔ اِس سلسلے میں سب سے پہلے اردو افعال کا بیان کیا جائے گا۔

(۱)

پیا ، سِیا ، جیا ، لیا ، کیا ، دِیا ؛ یہ سب ماضی کے فعل ہیں ، اِن میں یؔ سے پہلے والے حرف پر زیر ہے ۔ قاعدہ یہ ہے کہ اِس طرح کے فعل ، جن کے ماضی کے صیغے میں یؔ سے پہلے حرف مکسور ہو ؛ اُن میں واحد اور جمع کے صیغوں میں ہمزہ کبھی نہیں آئے گا ، جیسے : دیا ، دیے ۔ اور جیا ، جیے ، جییں ، جیو ۔

تصریفی صورت میں یہ اِس طرح لکھے جائیں گے ۔

پینا : پیا ، پیئے ، پییں ، پیو ، پیے گا ، پییں گے ، پیو گے ۔

سینا : سِیا ، سیے ، سییں ، سیو ۔ سیے گا ، سییں گے ، سیو گے ۔

جینا : جیا ، جیے ، جییں ، جیو ۔ جیے گا ، جییں گے ، جیو گے ۔

کرنا : کیا ، کیے ۔

دینا : دیا ، دیے ۔

---

[1] مثال کے طور پر انشا کی دو غزلوں کے کچھ مصرعے پیش کیے جاتے ہیں :

ع : مے پیے ، قشقہ دیے ، کعبے میں ناقوس لیے ۔ ع : ناصحا ! گرچہ بہت خرقۂ سالوس سیے ۔

ع : دیکھنے پاوے تو حسرت سے نہ طاؤس جیے ۔ ع : جس کے شعلے نے جلا سیکڑوں فانوس دیے ۔

ع : خوش ہو سب اہلِ خرابات نے پابوس کیے ۔ ع : اے برہمن ! جو دہان و لبِ ناقوس سیے

ع : کیا قیامت ہوئی گر بے دہلِ کوس جیے ۔ ع : اپنے آنکھوں ہی میں انشا نے تو افسوس پیے ۔

(کلامِ انشا ، ص ۲۱۷)

یا جیسے میر کا یہ مصرع :

اپنی پلکوں سے سییں عشاق کے زخمِ جگر

(کلیات ، مرتبہ آسی ، ص ۵۰۷)

لینا : لیا ، لیے ۔

ہمزہ صرف اُس صورت میں آئے گا جب یؔ سے پہلے والے حرف پر زبر ہو، یا الفؔ یا واوِ ساکن ہو، جیسے: گیا، گئے۔ بعض مثالوں سے اِس کی وضاحت ہو سکے گی ۔

گیا :	گئے		
لایا :	لائے	لاؤ	لائیں
پایا :	پائے	پاؤ	پائیں
گایا :	گائے	گاؤ	گائیں
کھایا :	کھائے	کھاؤ	کھائیں
آیا :	آئے	آؤ	آئیں
دھویا :	دھوئے	دھوؤ	دھوئیں
بویا :	بوئے	بوؤ	بوئیں
کھویا :	کھوئے	کھوؤ	کھوئیں

ایک بار پھر اِس قاعدے کی تکرار کر دی جائے کہ :

(الف) جب ماضی کے صیغے میں یؔ سے پہلے ایسا حرف ہو گا جس پر زیر ہوگا، تو تصریفی صورت میں ہمزہ کبھی نہیں آئے گا ۔ جیسے : پیے (پ یِ ے)، پییں ، پیو ۔ یا جیسے : جیا ، جِیے (جِ یِ یے) جییں ، جیو ۔

(ب) اگر یؔ سے پہلے والے حرف پر زبر ہوگا ، یا ساکن حرف ہوگا ، تب تصریف کی صورت میں ہمزہ آئے گا ۔ جیسے گیا ، گئے ۔ دھوئے ، دھوئیں ، دھوؤ ۔ یا جیسے : لایا ، لائے ، لائیں ، لاؤ ۔

فائدہ :

" لیے " فعل کے طور پر آئے یا حرفِ جار کے طور پر ؛ دونوں صورتوں میں ایک ہی طرح لکھا جائے گا ، یعنی : اُس نے گھوڑے لیے ۔ اور: میرے لیے گھوڑے لاؤ ۔ " لیے " کو اکثر " لئے " لکھا جاتا ہے ، یہ بالکل غلط لکھاوٹ ہے ۔ صحیح املا " لیے " ہوگا ۔ کیوں کہ یہ قاعدہ ہے کہ جب بھی یؔ سے پہلے والا حرف مکسور ہوگا تو لازمی طور پر ہمزہ نہیں آ سکتا ، ہمیشہ یؔ آئے گی ۔

(۲)

فعل کی تعظیمی صورت میں (یہ فعلِ امر کی ایک صورت ہوتی ہے) ، ہمیشہ لفظ کے آخر میں دو یؔ آئیں گی ۔ جیسے : پیجیے (پ ی ج ِ ی ے) ۔ لیجیے (ل ی ج ِ ی ے) اِن کو " پیجئے " اور " لیجئے " لکھنا غلط ہوگا ۔ تعظیمی افعال میں یؔ کی جگہ پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا ۔

ایسے کچھ فعل یہ ہیں :

مریے ، اُبھریے ، بھریے ، اُتریے ، بکھریے ، بکھیریے ، اُتاریے[1] ، اُبھاریے ، ماریے ، جوڑیے ، چھوڑیے ، توڑیے ، لڑیے ، چڑھیے ، کھینچیے ، کھنچیے ، لیجیے ، پیجیے ، دیجیے ، کیجیے[2] ، لکھیے ، پڑھیے ،

---

[1] مثال کے طور پر انشا کے کچھ مصرعے پیش کیے جاتے ہیں :

[1] ع: جی چاہتا ہے ، شیخ کی پگڑی اُتاریے   ع : دروازہ کھلنے کا نہیں ، گھر کو سدھاریے

ع: ٹک آپ بھی تو اِس گھڑی سینہ اُبھاریے   ع : بس سوں کھینچ جائیے ، یاں دم نہ ماریے

ع: بگڑے ہوئے کو ، آہ ، کہاں تک سنواریے   ع : دن ہنس کے کاٹ ڈالیے ، ہمت نہ ہاریے

(کلامِ انشا ، ص ۲۰۰)

[2] (بقیہ حاشیہ ص ۳۹۵ پر)

بڑھیے ، چلیے ، اٹھیے ، بیٹھیے ، نکلیے ، بدلیے ، برتیے ، برسیے ، بچیے ، خریدیے ۔

اِس سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ جن مصدروں میں علامتِ مصدر "نا" سے پہلے "الف" یا "واو" ہوتا ہے ، جیسے : آنا اور بونا ؛ ایسے مصدروں سے جو تعظیمی فعل بنیں گے ، اُن میں بھی قاعدے کے مطابق آخر میں دو "یَ" (یے) آئیں گی ، مگر پہلی "یَ" سے پہلے والے حرف (یعنی آخر سے تیسرے حرف) کی جگہ پر "ہمزہ" آئے گا ۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ "ہمزہ" اُس لفظ کا جُز ہوتا ہے ، "یَ" کی جگہ پر نہیں آتا ۔ جیسے : جائیے (جا+یِ+یے) لائیے (لا+یِ+یے) آئیے (آ+یِ+یے) بوئیے (بو+یِ+یے) کھدئیے (کھو+یِ+یے) دوسرے مصدروں میں یہاں پر کوئی اور حرف ہوتا ہے ، جیسے : بھیجیے (بھیج+یِ+یے) ، اِسی طرح آئیے (آ+یِ+یے)۔ ہر صورت میں ، ایسے افعال کے آخر میں دو "یَ" آئیں گی ۔ ایسے کچھ فعل یہ ہیں ۔

آئیے ، لائیے ، جائیے ، پائیے ، کھائیے ، سوئیے ، بوئیے ،

ع : مشہور ہے کہ چوٹ کو پانی سے دھاریے ع : اے شیخ صاحب! آپ نہ شیخی بگھاریے

ع : باتیں اِدھر کو کیجے ، اُدھر آنکھ ماریے ع : پوتھی کو اپنی کھولیے ، کچھ تو نہ بچاریے

ع : بانگِ جرس کی طرح کہاں تک پکاریے (کلامِ انشا ، ص ۲۶۱)

؎ اِس کی ایک صورت "کریے" بھی ہے ، جیسے :

ع : کیا بیاں کریے ، کہ شرم آتی ہے عرضِ حال سے

میر (کلیاتِ میر ، مرتبہ آسی ۔ ص ۷۵۰)

ع : خاک بر سر ، زندگانی کب تلک کریے بسر میر (۰۰۰۰۰۰)

کھوئیے ، بُھلائیے ، چھپائیے ، کھلائیے ، لٹائیے ، اُڑائیے ، اُٹھائیے ، لکھائیے ، روئیے ، چبھوئیے ۔

بس یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ تعظیمی افعال کے آخر میں ہمیشہ اور ہر صورت میں ی۔ی آئیں گی ۔

فعلِ امر کی ایک صورت آئیو ، جائیو ، لیجیو ، کیجیو بھی ہے ۔ اِن کو کبھی دعا کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے ، جیسے : عمر میں زیادتی ہوجیو وغیرہ ۔ امر کی اِسی صورت سے ، تعظیمی صورت آئیے ، کیجیے وغیرہ بنتی ہے ، اور اِس صورت میں واؤ کی جگہ یے کا اضافہ کیا جاتا ہے ۔ یعنی کیجیو اور کیجیے ۔ (کی ج یو = کی ج ی یے) ، ہمزہ کا تو ویسے بھی یہاں گزر نہیں ہو سکتا ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بابائے اُردو مولوی عبدالحق (مرحوم) کی کتاب قواعدِ اردو کی متعلقہ عبارت کو نقل کردیا جائے ۔ اِس سے بعض اور امور کی وضاحت میں بھی مدد ملے گی :

• ادب اور تعظیم کے لحاظ سے امر کی کئی صورتیں ہیں :

علاوہ معمولی صورت کے ، ایک یہ ہے : جائیو ، آئیو ۔ مگر یہ صورت معمولی درجے کے لوگوں یا خدمت گاروں وغیرہ سے گفتگو کرنے میں استعمال کی جاتی ہے ۔ البتہ ہوجیو ، رہیو وغیرہ دعا کے لیے استعمال ہوتے ہیں ، جیسے : دولت و اقبال میں ترقی ہوجیو ۔ مگر اس کا استعمال بھی اب کم ہوتا جاتا ہے ۔

دوسری صورت یہ ہے : آئیے ، جائیے ، لائیے ۔ یہ ادب اور تعظیم کے لیے بڑے لوگوں سے گفتگو کرتے وقت استعمال ہوتی ہے ۔

بہ ظاہر یہی صورت بعض اوقات خصوصاً نظم میں مضارع کے لیے

استعمال ہوتی ہے، اسے امر نہ سمجھا جائے؛ جیسے: رہیے اب ایسی جگہ
چل کر، جہاں کوئی نہ ہو۔

نوٹ: امر میں جو "یے" کا استعمال ہوا ہے، اس کی اصل یہ بتائی
گئی ہے کہ پراکرت میں "جا"، نہ صرف امر میں بل کہ حال و مستقبل کے
بنانے کے لیے بھی اضافہ کیا جاتا ہے اور یہی "جا" بعد میں "یے"
سے بدل گیا"۔ (قواعدِ اردو۔ طبعِ چہارم، ص ۲۰۸)۔

امیر اللغات میں اِن افعال کے سلسلے میں صحتِ املا کو خاص طور پر ملحوظ
رکھا گیا ہے اور ہر جگہ دو یے لکھی گئی ہیں، جیسے: "اپنی ران کھو دیجیے
آپ لاجوں مریے" (ص ۳۲)۔ "اپنے کیے" (ص ۳۳)۔ "اپنے من سے
جانیے" (ص ۳۸) "لیجیے" (ص ۹۰۔ ۱۰۵)۔ "جائیے، کھائیے" (ص ۴۰)
"روکیے، رکھیے، دیکھیے، کہیے، کھیلیے" (ص ۳۸) اسی طرح "لیے" ہر جگہ
صحیح طور پر لکھا ہوا ملتا ہے

کتابت کی بدنظمی اور لکھنے والوں کی سہل انگاری نے یہ خلفشار پھیلایا ہے کہ
تعظیمی افعال میں آخری یے سے پہلے ہمزہ جڑ دینے کی غلط روش چل نکلی،
ورنہ مختلف پیرایوں میں اِس بات کو لکھا گیا ہے کہ ایسے افعال میں دو یے
ہیں۔ میں یہاں پر صرف چار حوالے پیش کرنے پر اکتفا کروں گا: (۱) مؤلفِ
نور اللغات نے مقدمۂ کتاب میں جہاں متروکات سے بحث کی ہے،
وہاں لکھا ہے: "بیجیے، دیجیے، لیجیے، کیجیے وغیرہ کی ایک یے گرانا[۱]، اور

---

[۱] مصنف تو یہ کہتا ہے کہ بیجیے، لیجیے وغیرہ افعال میں دو یے ہیں، مگر کتابت کی
ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ اِن افعال کو لکھا گیا ہے ہمزہ کے ساتھ: "بیجئے، لیجئے"

(بقیہ حاشیہ ص ۳۹۸ پر)

بروزنِ فعلن استعمال کرنا غیر فصیح ہے ۔ جی چاہا کہ سیرِ دشت کیجے ؛ ہے ابر، شرابِ ناب پیجے ۔ (مقدمہ جلدِ اوّل ص ۱۲) ۔ یعنی "کیجیے" کی ایک یِ گرا کر "کیجے" نظم کرنا متروک ہے ۔ اِس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ اِن افعال میں اصلاً دو یِ ہیں ۔

(۲) شوق نیموی نے اِسی بات کو اصلاح میں لکھا ہے :

"پیجیے ، دیجیے ، لیجیے ، کیجیے " کی ایک یِ گرانا اور بروزنِ فعلن استعمال کرنا غیر فصیح ٹھہرا ہوا ہے "۔

(۳) بحرؔ نے اپنے رسالے بحر البیان میں "حرفِ جیم " کے تحت لکھا ہے :

"حرفِ جیم در شش کلمہ برائے رفعِ ثقالت می آید ، چوں : کیجیے ، دِیجیے ، و پیجیے ، ودیجیے و ہوجیے و سیجیے ۔ بہ جہتِ آنکہ اجماعِ سہ تحتانی شدہ است و خواندنِ آں دشوار ، لہٰذا حرفِ جیم واقع شدہ ، کلمہ فصیح گردید۔

... و اگر لفظ کیجیے را ، کریے خوانند ، خلافِ محاورۂ فصحاست "۔

صاف طور پر یہ مطلب ہوا کہ "کیجیے" وغیرہ میں ، جؔ کے بعد ، دُو یِ ہیں (کی جِ یِ یے) ۔ مصنف کے نزدیک ایسے افعال میں اصلاً تین یِ یک جا ہو گئی تھیں ، پہلی یِ کی جگہ جؔ آگیا ، رفعِ ثقالت کے لیے ، اب دُو یِ رہ گئیں ۔ مولوی عبد الحق (مرحوم) نے بھی یہی بات لکھی ہے ۔ (قواعدِ اُردو،

اِس طرح تو صرف ایک یِ باقی رہ گئی جو مقصودِ مصنف کے خلاف ہے۔ اِس سے کتابت کے پھیلائے ہوئے انتشار کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ البتہ اصلاح کی جو عبارت اِس کے بعد نقل کی جا رہی ہے ، اُس میں کتابت کی اِس ستم ظریفی نے دخل نہیں پایا اور اصلاح میں اِن افعال کو دو یِ کے ساتھ ہی لکھا گیا ہے

بحثِ فعلِ حال)۔

(۴) مولانا احسن مارہروی نے لکھا ہے :

" دیکھیے " کے ۹ ۵ عدد ٹھیک ہیں ۔ تاریخ میں مکتوبی عدد لیے جاتے ہیں۔
" دیکھیے " میں " کھ " کے بعد دو یاے تحتانی تلفظاً بھی ہیں اور تحریراً
بھی ؛ لہذا اِس کو جائز سمجھیے ۔ ناواقف ایک یاے تحتانی سمجھتے ہیں،
یہ اُن کی غلطی ہے "۔ (بہ حوالۂ علمی نقوش ، ص ۲۲۳)

۳

ایسے بہت سے (مفرد و مرکّب) لفظ ہیں جن کے آخر میں الف یا واو ہے،
ایسے لفظوں میں ئی (ءی) کا لاحقہ شامل کرکے ، اسمِ مصدر ، اسمِ فاعل وغیرہ
بنالیا کرتے ہیں ، جیسے : رعنائی ۔ یہاں آخری حرف ی ہے اور اُس سے پہلے
ء ہے ۔ یہ اردو کا خاصّہ ہے ؛ فارسی والا اِس ہمزہ سے مانوس نہیں ، وہ
اسے رعنایی (ي ي) لکھنا پسند کرے گا ۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں :

(الف) رعنائی ، بے پروائی ، خودرائی ، جادوئی ، یک سوئی ، کم روئی ،
بدخوئی ، بے وفائی ، کج ادائی ، تنہائی ، بُرائی ، اچھائی ، ہرجائی ،
حلوائی ، سودائی ، شیدائی ، جُدائی ، یک جائی ، ملائی ، میرزائی ،
پُروائی ، مصطفائی ، مجتبائی ، عیسائی ، موسائی ، مولائی ، تبرّائی ،
تماشائی ، تمنّائی ، آشنائی ۔

(ب) فارسی کے وہ امرِ حاضر، جن کے آخر میں یے ساکن ہوتی ہے ، جیسے :
آرائے ، پیمائے ؛ اُردو میں عام طور پر یے کے بغیر مستعمل ہیں ۔ اُن سے
پہلے جب کوئی اسم آتا ہے تو یہ اسمِ فاعل بن جاتے ہیں ، جیسے : عالم آرا ،
بادیہ پیما ۔ (اصلاً : عالم آرائے ۔ بادیہ پیمائے ۔ فارسی میں دونوں طرح

مستعمل ہیں، اِن کے آگے ئی (ءی) کا لاحقہ شامل کرکے، اِن کو بھی اسمِ مصدر بنا لیا جاتا ہے، جیسے: عالم آرائی۔

شناسا، توانا، بینا بھی اسمِ فاعل ہیں (امر کے آگے الفِ فاعلی کا اضافہ کیا گیا ہے)۔ ایسے اسما کے ساتھ بھی ئی کا لاحقہ شامل ہوکر، اسمِ مصدر کا فائدہ دیا کرتا ہے۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

شناسائی، بینائی، توانائی، پذیرائی، مشکل کُشائی، دل رُبائی،
عالم آرائی، خودنمائی، محفل آرائی، کرم فرمائی، فرماں روائی،
حاجت روائی، قافیہ پیمائی، بادیہ پیمائی، عزّت افزائی، قدرافزائی،
دل رُبائی، خودستائی، نقاب کشائی، زیبائی، بدگوئی۔

(۴)

(الف) اوپر جس قدر الفاظ آئے ہیں، اُن سب کے آخر میں یِ ہے۔ اِن کے علاوہ، اور بہت سے لفظوں کے آخر میں بھی یائے ساکن ہوتی ہے، جیسے: زندگی، بے خودی، بندگی وغیرہ؛ جب یہ لفظ مضاف یا موصوف ہوں گے، اُس صورت میں یِ کے نیچے اضافت کا زیر آجائے گا، جیسے: زندگیِ عشق، شناسائیِ دیرینہ۔

اضافت کا قاعدہ بہت سادہ اور صاف ہے کہ لفظ کے آخری حرف پر زیر آجاتا ہے۔ جیسے: مشکل سے، مشکلِ حیات، یا جمال سے جمالِ دوست۔ یا ماہ سے، ماہِ کامل۔ یا بخشش سے بخششِ عام۔ اِن لفظوں کے لکھنے میں غلطی بھی نہیں ہوتی۔ مگر جن لفظوں کے آخر میں یائے ساکن ہوتی ہے، اضافت کی صورت میں، اُس یِ پر خواہ مخواہ اور بالکل غلط طور پر ہمزہ لکھ دیا جاتا ہے اور اِس طرح ایک فالتو علامت بڑھا دی جاتی ہے۔

حالاں کہ اور لفظوں کی طرح یہاں بھی ہمزہ کا محل نہیں ہوتا، جس طرح اور لفظوں کا آخری حرف مکسور ہو جاتا ہے، اُسی طرح ایسے لفظوں میں یِ پر زیر آ جائے گا۔

اِس قاعدے کی خلاف ورزی بہت ہوتی ہے، اِس لیے اِس بات کو خاص طور پر ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جن لفظوں کے آخر میں یِ یا ےِ ہو (خواہ اصلی یعنی جزوِ لفظ ہو، خواہ اضافی ہو)، اضافت کی صورت میں، وہ یِ مکسور ہو جائے گی، اُس پر ہمزہ ہرگز نہیں لکھا جائے گا۔ مثلاً: "مبتلائے غم" "رعنائیٔ خیال" یا "مرضیٔ خدا" یا "زندگیٔ عیش" لکھنا غلط ہو گا کیوں کہ یہاں ہمزہ فالتو ہی نہیں، غلط بھی ہے، ایک آواز کے لیے دو حرف یک جا نہیں کیے جائیں گے۔ صحیح املا: "مرضیِ خدا" "مبتلاے غم" "زندگیِ عیش" "رعنائیِ خیال" ہو گا۔ ایسے مقامات پر یِ پر ہمزہ لکھنا، غالبؔ کے الفاظ میں "عقل کو گالی دینا[1] ہے"۔

---

[1] غالبؔ نے تفتہ کو لکھا تھا:

"دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو..... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو، یاے تحتانی تین طرح پر ہے:

جزوِ کلمہ: (مصرع) ہمای برسرِ مرغاں ازآں شرف دارد

(مصرع) اے سرِنامہ نامِ تو عقل گرہ کشای را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یاے تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے۔ اِس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے۔ (بقیہ حاشیہ ص ۴۰۲ پر)

بہ طورِ مثال کچھ مرکّب لکھے جاتے ہیں :

زندگیِ فانی ، والیِ ملک ، بندگیِ خدا ، خرابیِ بسیار ، خوبیِ قسمت ، معزولیِ ناز و ادا ، نرمیِ گفتگو ، سردیِ کشمیر ، گرمیِ نشاطِ تصوّر ، جوانیِ بہار ، کرسیِ صدارت ، آزادیِ وطن ، مرضیِ جناب ، مزدوریِ عشرت گہِ خسرو ، مخموریِ عیش ، مجبوریِ افلاس ، صراحیِ مے ، فدویِ خاص ، کمیِ دولت ، زیادتیِ دولت ، کج رویِ فلک ، کج خرامیِ منافق ، سواریِ ریل ، فارسیِ جدید ، تیاریِ امتحان ، کم فرصتیِ دُنیا۔

رعنائیِ خیال ، زیبائیِ شام و سحر ، یکتائیِ محبوب ، بے وفائیِ عزیزاں ، بے نوائیِ اہلِ علم ، گدائیِ شہرت ، خدائیِ فرعون ، جدائیِ حبیب ، شناسائیِ اہلِ علم ، آشنائیِ دوروزہ ، کارفرمائیِ دولت ، کج ادائیِ دوست ، بے مایگیِ ہنر ، ہمسائگیِ رقیب[1] ۔

دوسری تحتانی مضاف ہے ۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے ۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے ؛ جیسے "آسیای چرخ" یا "آشنای قدیم" ـــ توصیفی ، اضافی ، بیانی ، کسی طرح کا کسرہ ہو ، ہمزہ نہیں چاہتا ۔ "فدای توشوم" ، "رہنمای توشوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے"۔ (خطوطِ غالب ، مرتّبہٗ منشی مہیش پرشاد مرحوم ۔ ص ۲۳)

[1] چند مثالیہ مصرعے :

ع : اب وہ رعنائیِ خیال کہاں (غالب)

ع : کشتۂ افعیِ زلفِ سیہِ شیریں کو (")

ع : اُف ری تپ گرمیِ محبّت (مومن)

(باقی حاشیہ ص ۴۰۳ پر)

(ب) اِن لفظوں کی جمع ، لفظ کے آگے " اں " یا " وں" بڑھانے سے بنے گی ، جیسے :

زندگی : زندگیاں زندگیوں
بندگی : بندگیاں بندگیوں
رعنائی : رعنائیاں رعنائیوں
یکتائی : یکتائیاں یکتائیوں
شناسائی : شناسائیاں شناسائیوں
بے مایگی : بے مایگیاں بے مایگیوں
کج خرامی : کج خرامیاں کج خرامیوں
زیادتی : زیادتیاں زیادتیوں
بے وفائی : بے وفائیاں بے وفائیوں

(ج) اِس قاعدے کے ذیل میں ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ وہ لفظ جن کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے ، اضافت کی صورت میں ، ایسے لفظ یائے مشدّد کے ساتھ بھی استعمال کیے جاتے ہیں ۔ یہ استعمال شاعری

ع : تھی برہمیِ زلفِ پریشاں کی شکایت (مومن)
ع : ذرا ہو گرمیِ صحبت تو خاک کر دے چرخ (")
ع : اتنی بھی تابِ دوریِ خورشید طلعتاں (")
ع : ہے سراسر رویِ عالمِ ایجاد اُسے (غالب)
ع : جلوہ ہے ساقیِ مخموریِ تابِ دیوار (")
ع : تنگیِ حوصلہ گردابِ دو عالم آداب (")

میں عام ہے۔ جیسے ذوق کا یہ مصرع: سردیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک۔
یا جیسے یہ مصرع: زندگیِ بے وفا! تجھ سے محبت کیا کریں۔
جس طرح غیر مشدّد حرف پر اضافت کا زیر آتا ہے، اُسی طرح مشدّد حرف پر آتا ہے؛ مگر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ ویسے یّ پر ہمزہ لگانے میں کسی حدتک محتاط ہوتے ہیں، وہ بھی یاے مشدّد پر ہمزہ ضرور لگا دیا کرتے ہیں، اور یہ عجیب تر بات ہے۔ ہمزہ کا اِس قدر غلط استعمال اپنی مثال آپ ہے۔ "زندگیِ عشق" کو "زندگیٔ عشق" لکھنا جس قدر مہمل ہے، اُس کی تو وضاحت کی بھی ضرورت نہیں۔ اِس کا سیدھا سا مطلب یہ ہوا کہ اِس کو "زندگی ءِ عشق" پڑھا جائے، ورنہ مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا؛ مگر مشکل یہ ہے کہ "زندگی ء" کوئی لفظ نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔
صاف اور سادہ بات یہ ہے کہ آخرِ لفظ میں جب یّ مشدّد ہوگی، تو اُس پر لازماً تشدید لکھی جائے گی، اور یہ مشدّد یّ، مکسور ہو جائے گی۔ ہمزہ کا یہاں کچھ کام نہیں۔ جیسے غالب کا یہ مصرع: اے اسدؔ، ہے مستعدِّ شانۂ گیسو شدن۔ اِس میں دال مشدّد ہے؛ دال پر تشدید لکھ کر، اُس کے نیچے اضافت کا زیر لگا دیا جائے گا: مستعدِّ۔ اِسی طرح اِس مصرعے میں: "پاسبانیِّ طلسمِ گنجِ تنہائی عبث"۔ پاسبانی کی یّ مشدّد ہے، اُس پر بھی تشدید لکھ کر، اُس کے نیچے اضافت کا زیر لگا دیا جائے گا: "پاسبانیِّ"۔ ہمزہ نہ وہاں آئے گا نہ یہاں۔
بعض اور مثالیں:

ع: ہے عرق ریزیِّ خجلت جوششِ طوفانِ عجز (غالب)
ع: کروں گر عرضِ سنگینیِّ کہسار اپنی بے تابی (")

ع : ہے ہوسِ محمل بہ دوشِ شوخیِ ساقیِ مست (غالب)

ع : سرخیِ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک (ذوق)

س : یقین ہست کہ بیگانگیِ عرفی را
بہ دوستیِ سخن ہای آشنا بخشند (عرفی)

ع : سرخیِ رنگِ رُخ سے چمک اور بڑھ گئی

ع : آشنائیِ غیر سے کیا کام

ع : پارسائیِ صاحبانِ حرم

(د) سعی ، وحی ، نہی ، نفی جیسے لفظ ، جن میں ی موقوف ہے ؛ اضافت (اور عطف) کی صورت میں اِس ی پر بھی ہمزہ نہیں آئے گا ، حسبِ معمول ، یہاں بھی ی پر زیر آئے گا ۔ جیسے : نفیِ غیر ، وحیِ آسمانی ، وحی و الہام ، نفی و اثبات ۔

ع : سعیِ لاحاصل مداواے مریضِ عشق ہے (ناسخ)

ع : نہیِ مے خواری کرے جس دم وہ محبوبِ خدا (")

ع : بینش بہ سعیِ ضبطِ جنوں ، نو بہار تر (غالب)

ع : گر کرے یوں امر ، نہیِ بوتراب آئینے پر (")

(۵)

(الف) کچھ لفظوں کے آخر میں یاے مجہول ، جزوِ لفظ کی حیثیت سے آتی ہے ، جیسے : راے ، چاے ، گاے ، بجاے وغیرہ ۔ پہلا لفظ راے ہے ، اِس میں آخری حرف ے ہے ، اِس سے پہلے الف ہے ، دونوں حرف ساکن ہیں ، مجموعی طور پر یہ تین حرفی لفظ ہے ؛ اب اگر اِس کو " رائے " لکھا جائے تو یہ چار حرفی ہوجائے گا ۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت ٹھیک نہیں ہوگی ۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے الفاظ پر ایک ہمزہ بھی لکھ دیا جاتا ہے ، (جیسے: رائے ، چائے ، گائے) یہ غلط ہے ۔ جس طرح سعی اور وحی میں یِ ساکن ہے ، اُسی طرح راے اور گاے میں یے ساکن ہے ؛ ہمزہ نہ وہاں آئے گا نہ یہاں ۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں :

راے ، چاے ، گاے ، بجاے ، سواے ، سہاے ، سراے ، وائسراے ، واے ، ہاے ، براے ، آبناے ، اُپاے ۔

(ب) جب ایسے لفظ مضاف یا موصوف ہوں گے ، اُس صورت میں بھی ہمزہ نہیں آ سکتا ۔ جس طرح زندگی کی یاے معروف پر اضافت کا زیر آتا ہے اور " زندگیِ " پڑھا جاتا ہے ، اُسی طرح راے کی یاے مجہول مکسور فرض کر لی جائے گی ؛ ہمزہ نہ یاے معروف پر آئے گا نہ یاے مجہول پر ۔ ہاں ، اِس یاے مجہول کے نیچے زیر لگانے کی ضرورت نہیں ۔ جیسے :

راے عالی ، براے خدا ، سراے روح اللہ خاں ، بجاے خود ، سواے خدا ، تنگ ناے غزل ، آبناے باسفورس ، وائسراے ہند ، ہماری گاے ، گرم چاے ، جگدیش سہاے ، رام سہاے ، راے بہادر ، پرمود راے ، ہاے ہاے ، ہاے واے ۔

ع : براے حلِ مشکل ہوں زپا افتادۂ حسرت

ع : سواے بے کسی ، اب کوئی آسرا نہ رہا

ع : بہ قدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگناے غزل

ع : بجاے غنچہ و گل ، ہے ہجومِ خار و خس یاں تک

ع : دنیا بھی عجب سراے فانی دیکھی

ع : پوچھی جو راے بلبلِ شیدا بہار میں

(ج) پاے (پیر)، پاے (پاییدن مصدر کا امر) جاے (جگہ)، سواے؛
یہ لفظ مع یاے آخر اور بغیرِ یا، دونوں طرح استعمال کیے جاتے ہیں۔
جیسے: پابند اور پاے بند۔ سوا تیرے، اور سواے تیرے۔ اِن الفاظ
کو خواہ مفرد حالت میں مع یے استعمال کیا جاے، یا اضافت کی
غرض سے مع یے لکھا جائے؛ ہر صورت میں صرف یے لکھی جائے گی،
ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ جیسے:

پابند، پاے بند۔ پامال، پاے مال، پاے مالی۔ پابوس،
پاے بوس، پاے بوسی۔ پاے دان۔ پاے تخت[1]۔ پاے درگل۔
پاے دار، پاے داری (پایدار)۔ جاداد[2]، جاے داد۔ جاے گاہ۔
جاے ادب۔ جانشین، جاے نشین۔ پازیب، پاے زیب[3]۔
پاجامہ، پاے جامہ[4] (پایجامہ)۔

---

[1] اِس لفظ کے سلسلے میں یہ صراحت کرنا ہے کہ اس کو "پایۂ تخت" لکھنا ٹھیک نہیں۔
رشکؔ کا شعر ہے: پاے تخت شہانِ حُسن ہے دل ؛ ایک ہوتا تو کہتے شاہ آباد۔
یہ شعر نور سے ماخوذ ہے۔

[2] جاداد بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت   غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
(غالب)

[3] فقط موتیوں کی پری پاے زیب   کہ جس کے قدم سے گُہر پائے زیب
(میرحسن، مثنوی سحرالبیان)

[4] جھلک پایجامے کی دامن سے یوں   نظر آئے آئینے میں برق جوں
(میرحسن، مثنوی سحرالبیان)

سر بہ وقتِ ذبح، اپنا اُس کے زیرِ پاے ہے   یہ نصیب، اللہ اکبر! لوٹنے کی جاے ہے
(ذوق)

شورِ حشر اُس فتنہ قامت کے حضور   سایہ آسا ہو گیا ہے پاے مال
(غالب)

شامِ فراقِ یار میں، جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ
ماہ کو در تسبیحِ کواکب، جاے نشینِ امام کیا
(غالب)

یقیں کہ خواجہ خضر تھے. بچھا کے جاے نماز   جو بیٹھے جاتے تھے اک بوڑھے گھاگ پانی پر
انشا (کلامِ انشا، ص ۹۸)

کر رہا صیاد جلدی سے، کہ جاے رحم ہے   دیکھ تو ظالم، بھلا یہ صیدِ دل گیرو قفس
انشا (کلامِ انشا، ص ۱۰۶)

نکلی مستعمل نہایت، ورنہ شب   چاندنی کی جاے، بچھتی ماہ تاب
میر (کلیات، مرتبۂ آسی ص ۷۷۲)

ع: پر طاؤس سے، دل پاے بہ زنجیر آیا   (غالب)

ع: نہ امیروں کو پاے بندیِ عدل   (مومن)

(۶)

مَے، نَے، شَے کی طرح کے کچھ لفظ ہیں، جن میں یے سے پہلے والا حرف مفتوح ہے؛ یہ لفظ مفرد صورت میں آئیں یا اضافت کی صورت میں، ہمزہ کسی بھی صورت میں نہیں آئے گا۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں:

مَے، نَے، لَے، کَے، قَے، درپَے، پے درپے، پیاپے، پَے، شَے، جَے، ہَے ہَے، طَے، رَے (ایک شہر کا نام)،

اَبھے ، اَجے ۔

مےِ صاف ، شےِ لطیف ، پےِ عذرِ کرم ، درپےِ آزار ، پےِ عبرت ، شےِ دیگر ۔

ع : پےِ عذرِ کرم ، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا (غالب)

ع : پاسے طاؤس ، پےِ خامۂ مانی مانگے (")

ع : یہ مے تند نہیں موج خرامِ اظہار (")

ع تپشِ دلِ شکستہ پےِ عبرت آگہی ہے (")

ع : ضعف سے نقشِ پےِ مور ہے طوقِ گردن (")

عطف کی صورت میں بھی ، صرف عطف کا واو لکھا جائے گا ، ہمزہ اِس صورت میں بھی نہیں آئے گا ، جیسے :

ع : مے و معشوق سے توبہ ابھی کیوں کر کرلیں

ع : نے و نغمہ و رقص و مینا و جام

ع : حسابِ مے و رامش و رنگ و بوے

ع : شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند (غالب)

فائدہ :

(الف) ایسے لفظ جن کے آخر میں یاے معروف (ي) ہو ؛ اضافت کی صورت میں ي پر زیر لگایا جائے گا ، جیسے زندگیِ عیش ۔ مگر جب لفظ کے آخر میں یے ہوگی ، خواہ وہ لفظ کا جز ہو ، جیسے : راے ، یا وہ اضافت کے طور پر بڑھائی گئی ہو ، جیسے : گیسوے سیاہ ، پرواے قوم ؛ دونوں صورتوں میں یے پر زیر نہیں لگایا جائے گا ۔

(ب) ہاں ، جن لفظوں کے آخر میں یے ہو اور اُس کا حرفِ ماقبل مفتوح ہو ، جیسے : مے ، شے ؛ ایسی یے پر اضافت کا زیر لگایا جائے گا ۔ جیسے :

بے صاف ، شے لطیف ۔

(ج) اُردو میں رواج یہ رہا ہے کہ اضافت کی علامت کے طور پر یے کا اضافہ کیا جاتا ہے ، جیسے : ابتداے عشق ۔ فارسیِ جدید میں چوں کہ یاے مجہول کو تسلیم نہیں کیا جاتا ، اِس لیے وہاں علامتِ اضافت کے طور پر یاے معروف کا اضافہ کیا جاتا ہے ، یعنی " ابتداے عشق " کو فارسی والا " ابتدای عشق " لکھے گا ۔ مگر اردو میں اِس کی تقلید نہیں کی جائے گی اور یہاں اضافت کی علامت کے طور پر یے لکھی جائے گی ۔ چوں کہ یے کی حیثیت ایسے مقامات پر علامتِ اضافت کی ہوتی ہے ؛ اِس لیے اُس کے نیچے اضافت کا زیر بھی نہیں آئے گا ، ورنہ تکرارِ علامت کی قباحت لازم آئے گی ۔

(۷)

جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے ، اضافت کی صورت میں ، اُن کے آگے یاے مجہول کا اضافہ کیا جائے گا ، جیسے : دنیاے محبت ۔ ہمزہ کا یہاں بھی کچھ کام نہیں ۔ ایسے کچھ مرکبات یہ ہیں :

دنیاے رنگ و بو ، انتہاے شوق ، ابتداے عشق ، تماشاے اہلِ کرم ، تقاضاے شوق ، شہداے کربلا ، علماے دین ، تمناے دل ، صلاے کرم ، مبتلاے غم ، ہواے شوق ، دواے دردِ دل ، خداے بزرگ و برتر ، انبیاے کرام ، دعاے ترقیِ دولت ، مدعاے دل ، قباے زہد ، سزاے قید ، ہماے سعادت ، شرفاے قوم ، انشاے بے نظیر ، املاے فارسی ۔

ع : تماشاے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ع: تقاضائے بیہودۂ مے فروش

ع: گل کی جفا بھی دیکھی، دیکھی وفائے بلبل

ع: جفائے آسماں بھی شکوہ سنجِ بے نیازی ہے

ع: جلوے میں تیرے ہے تسخیرِ ہوائے دیدار

ع: تیرا صحرائے طلب، محفلِ پیمانہ شکار

(۸)

اِسی طرح جن لفظوں کے آخر میں واو (معروف یا مجہول) ہوتا ہے، اضافت کی صورت میں، اِن الفاظ کے ساتھ بھی، یے کا اضافہ کیا جائے گا۔ ہمزہ یہاں بھی نہیں آئے گا، جیسے:

بوئے گل، خوش بوئے وفا، گیسوئے حور، پہلوئے غیر، جادوئے بنگال، سوئے دار، روئے حبیب، جوئے کہستاں، کوئے ملامت، آرزوئے مسرت، آبروئے وفا، چارسوئے دہر، رنگ و بوئے گلستاں، جستجوئے غم، گفتگوئے رشک، خوئے بد، گوئے سبقت۔

ایک وضاحت:

ایک طریقہ یہ بھی رہا ہے (کم سہی) کہ شعر میں جب واو کو کھینچ کر نہ پڑھا جائے، تو اُس کے آگے یے بہ طورِ علامتِ اضافت بڑھانے کے بجائے، واو پر زیر لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً جلال نے داغ کے دیوان کی تاریخ کہی تھی: "بوِ گلزارِ داغ آئی آج"۔ مگر امیر مینائی نے ایک خط میں اِس سے اختلاف ظاہر کیا ہے (مکاتیبِ امیر مینائی مرتبۂ ثاقب)۔ میرا خیال ہے کہ اِس میں کچھ بُرائی نہیں، مگر ایک استثنا کے ساتھ کہ دو حرفی لفظوں کو اِس سے الگ رکھا جائے۔ دو حرفی لفظ خواہ بہ اظہارِ واو پڑھا جائے یا بہ اخفائے

واو ؛ ہر صورت میں اُس کے آگے یا ے علامتِ اضافت لکھی جائے گی، جیسے:

ع : اُس کو ڈر کچھ نہیں مُنہ سوے خدا ہے جس کا

ع : سوے قبلہ تب روے پُر نور تھا

اور دوسرے لفظوں میں اگر واو کھینچ کر پڑھنے میں نہ آتا ہو، تو یہ جائز ہوگا (لازم نہیں) کہ واو پر زیر لگا دیا جاے۔ جیسے یہ دو مصرع:

جلوۂ خرشید سے ہے گرم پہلوے ہلال (غالب)

دُکھنے لگے پہلوِ فراشی (اثر لکھنوی)

پہلے مصرع میں واو اچھی طرح پڑھنے میں آرہا ہے اور دوسرے مصرع میں یہ صورت نہیں۔ بعض ایسے مصرعے، جن میں واو پر اضافت کا زیر لگایا جاسکتا ہے:

گیسوِ تاب دار کو اور بھی تاب دار کر (اقبال)

قبلہ و ابروِ بُت، یک رہِ خوابیدۂ شوق (غالب)

جُز بہرِ دست و بازوِ قاتل دعا نہ مانگ (")

عکسِ چشمِ آہوِ رم خوردہ ہے داغِ شراب (")

زانوِ آئنہ پر مارے ہے دستِ بیکار (")

میں گرفتارِ خمِ گیسوِ صیاد رہا (مومن)

طلسمِ جادوِ بابل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں (")

بہ ظاہر اِس اندازِ نگارش میں کچھ ہرج نہیں۔ مگر اِس کو لازم نہیں قرار دیا جا سکتا، بس اِس کو جائز کہا جائے گا۔ ویسے ذاتی پسند کے لحاظ سے میں اِس انداز کو زیادہ مناسب سمجھتا ہوں۔

واو سے پہلے والے حرف پر حرکت ہو یا سکون، دونوں صورتوں میں واو پر اضافت کا زیر آئے گا۔ یائے علامتِ اضافت کا اضافہ نہیں کیا جائے گا، جیسے: سروِ باغ، دیوِ سیاہ، پیروِ فکر۔

ع: خوابِ گرانِ خسروِ پرویز یک طرف (غالبؔ)

ع: ہو جو بلبل پیروِ فکرِ اسدؔ (")

ع: بہار در گروِ غنچہ شہر جولاں ہے (")

ع: مصرعِ سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب (")

ع: دیوِ ظلمت کھا گیا خورشید کو

ع: خدیوِ جہاں، بانیِ عدل و داد

فائدہ:

شاعری میں جہاں اور بہت سی آزادیاں روا رکھی گئی ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اضافت کے زیر کو اِس حد تک کھینچا جا سکتا ہے کہ ایک حرف کے اضافے کا فائدہ حاصل ہو جائے؛ مگر آواز کی یہ کشش، صرف پڑھنے میں آتی ہے، لکھنے میں اِس کا کچھ اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ جیسے یہ مصرع:

تماشائے بہ یک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

اِس مصرع میں دو جگہ یہ صورت واقع ہوئی ہے، یہ حصّے خط کشیدہ ہیں۔ تقطیع میں "بردنِ" کو "بردنے" فرض کر لیا جائے گا۔ اِسی طرح "تماشائے" میں ایک کی جگہ دو یے مان لی جائیں گی، مگر اِس سے املا پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ تو اب قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں کوئی بھی حرف ہو، ب، ج، ل، یا و، ی، یے؛ ہر صورت میں اشباع کا اثر، املا پر نہیں پڑے گا۔ جیسے یہ مصرعے:

مثال : یہ مے تند نہیں موجِ خرامِ اظہار

مثال : پئے عذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا

مثال : سعیِ لاحاصل مداواے مریضِ عشق ہے

مثال : سبز ہے موجِ تبسم بہ ہواے گفتار

مثال : اے اسد ہم خود اسیرِ رنگ و بوے باغ ہیں

مثال : خیالِ دود تھا سر جوشِ سوداے غلط فہمی

مثال : آتشِ موے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک

مثال : بجاے غنچہ و گل، ہے ہجومِ خار و خس یاں تک

مثال : عکسِ چشمِ آہوِ رم خوردہ ہے داغِ شراب

مثال : نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں

مثال : بہار در گروِ غنچہ شہر جولاں ہے

فائدہ :

اس قاعدے کی تکرار کر دی جائے کہ جب لفظ کے آخر میں الف، واو، ی، یا ے ہوگی تو کسی بھی صورت میں، اضافت کے لیے ہمزہ نہیں آئے گا۔ اضافت کے لیے ہمزہ صرف ایک صورت میں آتا ہے، جب کہ لفظ کے آخر میں ہاے مختفی ہو۔ جیسے : نامۂ شوق، کعبۂ مقصود۔ اور کسی بھی صورت میں علامتِ اضافت کے طور پر ہمزہ نہیں آئے گا۔

(۱) جب لفظ کے آخر میں یاے معروف ہوگی تو اضافت کے لیے، اُس پر زیر آجائے گا۔ جیسے : رعنائیِ خیال، زندگیِ شوق۔

(۲) جب یہ یاے معروف مشدّد ہوگی تو یّ کے اوپر تشدید لکھی جائے گی۔ اور معمول کے مطابق اُس پر زیر لگایا جائے گا۔ جیسے : زندگیِ فانی ،

آشنائیِ غیر، بے گانگیِ عرفی۔

(۳) جب لفظ کے آخر میں الف یا واو (معروف یا مجہول) ہوگا، اضافت کی صورت میں، یائے مجہول کا اضافہ کیا جائے گا۔ یہ یائے مجہول، علامتِ اضافت کی حیثیت سے آئے گی، اِس لیے اِس پر زیر نہیں لگایا جائے گا۔ جیسے: مبتلاے عشق، انتہاے شوق، گیسوے شام، پہلوے غیر، گوے سبقت۔

(۴) جن لفظوں کے آخر میں واوِ معروف ہو اور شعر میں وہ خوب کھینچ کر نہ پڑھا جائے؛ تو یہ جائز ہوگا کہ اُس کے آگے علامتِ اضافت (یے) کا اضافہ کرنے کے بجاے، اُس واو پر زیر لگا دیا جائے۔ جیسے: گیسوِ تاب دار کو اور بھی تاب دار کر۔

شرط یہ ہے کہ یہ لفظ دو حرفی نہ ہو۔ دو حرفی لفظوں کے آگے ہر صورت میں یے کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: نظرے سوے کہستاں، نہیں غیرِ شیشہ ساماں (غالب)

(۵) جن لفظوں کے آخر میں یے ہو، اور اُس کا حرفِ ماقبل مفتوح ہو؛ تو اُس یے پر اضافت کا زیر لگایا جائے گا۔ جیسے: مےِ دوشینہ، شےِ دیگر۔

(۶) جن لفظوں کے آخر میں واو ہو، اور اُس کا حرفِ ماقبل مفتوح یا ساکن ہو، یا مکسور ہو؛ اِن صورتوں میں اُسی واو پر اضافت کا زیر لگایا جائے گا، اُس کے آگے علامتِ اضافت (یے) کا اضافہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے: دیوِ سیاہ، پیروِ فکرِ اسد، گاوِ زمین۔

(۷) جن لفظوں کے آخر میں یے جزوِ لفظ ہو، ایسے لفظوں میں یے پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ جیسے: راے، چاے۔

اضافت کی صورت میں بھی اِس یے پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا ، اور نہ اِس پر زیر لگایا جائے گا ، اِس کو یائے علامتِ اضافت کی طرح مکسور فرض کر لیا جائے گا ۔ جیسے : رائے عالی ، سرائے کُہنہ ، چائے گرم ۔

فائدہ :

یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ آئے ، جائے جیسے افعال میں ہمزہ آتا ہے ۔ آوے ، جاوے اِن کی پُرانی صورت ہے ، واو کی جگہ ہمزہ نے لے لی ۔ (آوے = آءے)

یہ بات بھی لکھی جا چکی ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں الف ہوتا ہے ؛ اضافت کی صورت میں اُن کے آگے یائے مجہول کا اضافہ کیا جاتا ہے ۔ یہ یے علامتِ اضافت کی حیثیت سے آتی ہے ، اِسی لیے اِس پر زیر نہیں لگایا جاتا ۔ اِس علامتِ اضافت پر ہمزہ کبھی نہیں آئے گا ۔ جیسے : فدائے لکھنؤ ۔ اِس کو " فدائے لکھنؤ " لکھنا غلط ہو گا ۔

شاعروں نے ایسے الفاظ کو ہم قافیہ کیا ہے جن میں سے ایک فعل ہے ، جس میں یے سے پہلے ہمزہ لازماً آتا ہے اور دوسرا ایسا اسم ہے ، جس کے آخر میں یائے علامتِ اضافت شامل کی گئی ہے ، جس پر ہمزہ نہیں لکھا جا سکتا ۔ مثلاً ناسخ کے اِس مطلع کو لیجیے :

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ مجھ پر فدا ہے ، میں فدائے لکھنؤ

یک جگہ "چھڑائے" ہے جس میں حرفِ آخر (یے) ساکن ہے اور اُس سے پہلے ہمزہ ہے جو متحرک ہے (چھڑاءے) ، اور دوسری جگہ " فدائے " ہے ، جس میں حرفِ آخر ساکن کے بجائے ، موقوف ہے ۔ یعنی اُس سے پہلے الف

ہے جو ساکن ہے (چھڑاءِے = فداے)۔ اصولاً یہ تقفیہ درست نہیں ہوسکتا۔ ناسخ کے اِس مطلعے پر یہی اعتراض کیا گیا ہے۔ شوق نیموی نے اصلاح میں لکھا ہے:

" فائدہ: حرفِ مکتوبی کا قافیہ اُس غیر مکتوبی کے ساتھ جو تلفّظ میں ہو، درست نہیں۔" ملے عاشق " کا قافیہ " دلِ عاشق "، " سنوارے وطن " کا قافیہ " بہارِ وطن " جائز نہیں۔ شعرا نے اِس قسم کے تقفیے سے بہت احتیاط کی ہے، مگر نہایت تعجّب ہے کہ بعض الفاظ میں کچھ ایسا دھوکا کھا گئے کہ ... مثال کے لیے ایک شعر لکھا جاتا ہے، ناسخ:

آسماں کی کیا ہے طاقت جو چھڑائے لکھنؤ
لکھنؤ مجھ پر فدا ہے، میں فداے لکھنؤ

ظاہر ہے کہ "چھڑائے" میں الف کے بعد ہمزہ اور ہمزہ کے بعد ے ہے۔ اور " فداے " میں الف کے بعد صرف ایک یے ہے، جس کو بہ وجہِ اضافت کسرہ ہے اور کسرے کی وجہ سے وہ یے، لہجے میں ہمزہ سے بدل گئی ہے اور اُس کسرے کا اشباع کیا گیا ہے، جس سے دوسری یے صرف تلفّظ میں پیدا ہوگئی ہے، اُس کو کتابت سے کچھ علاقہ نہیں۔ پس جس طرح " سنوارے چمن "، " سارے چمن " کا قافیہ " بہارِ چمن " درست نہیں، اُسی طرح " چھڑائے لکھنؤ " کا قافیہ " فداے لکھنو " از روے انتظامِ شاعری درست نہیں ہوسکتا "۔

فی الوقت مجھے اِس سے سروکار نہیں کہ اِس طرح کے قافیے جمع کرنا چاہیے یا نہیں؛ شاعری میں بہت سی آزادیوں کو روا رکھا گیا ہے، اِسے بھی ایک طرح کی آزادی سمجھا جاسکتا ہے۔ قواعد کی شریعت جو کچھ بھی کہے، مجھے

املا کے نقطۂ نظر سے یہ کہنا ہے کہ ایسے مقامات پر ہمیشہ ایسے دو مختلف الفاظ کو، اُن الفاظ کے مسلّمہ املا کے مطابق ہی لکھا جائے گا۔ یعنی "چھڑائیے" کو مع ہمزہ لکھا جائے گا اور "فداے" کو بغیر ہمزہ۔ ایسا نہیں ہوگا کہ "فداے" کی رعایت سے "چھڑاے" ہمزہ کے بغیر لکھا جائے، اور نہ یہ ہوگا کہ "چھڑائے" کی رعایت سے "فدائے" لکھا جائے۔ اور جس طرح "فوراً" (مع تنوین) کا قافیہ "گلشن" مانا جا سکتا ہے، اُسی طرح "چھڑائے" کا مکتوبی قافیہ "فداے" مانا جائے گا۔ ("فوراً" کے قافیے کا ذکر تنوین کے عنوان کے ذیل میں آئے گا)۔

ایسی ہی ایک اور مثال: غالبؔ کی وہ غزل، جس کا مطلع ہے:

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

اِس غزل میں مطلعے اور مقطعے سمیت ۹ شعر ہیں۔ شروع کے آٹھ اشعار میں ہر جگہ آئے، ستائے، اٹھائے، چھپائے وغیرہ افعال بہ طورِ قافیہ آئے ہیں۔ مقطع یہ ہے:

غالبِؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجیے ہاے ہاے کیوں

ظاہر ہے کہ آئے اور ستائے اور ہاے کے تقفیے میں وہی بات ہے جو ناسخ کے مذکورۂ بالا مطلعے میں ہے (ستاءے = ہاے)۔ یہاں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ اور سب شعروں میں، افعال کو جو بہ طورِ قافیہ آئے ہیں، مع ہمزہ لکھا جائے گا (آئے، ستائے)، اور مقطعے میں "ہاے ہاے" کو ہمزہ کے بغیر لکھا جائے گا۔

مختصر یہ کہ جہاں بھی یہ صورت واقع ہوگی، وہاں صحتِ املا کے نقطۂ نظر سے اِسی قاعدے پر عمل کیا جائے گا۔ جیسے مثنوی سحرالبیان کا یہ شعر جو "داستان بدرِ منیر کی تعریف" کے تحت آیا ہے :

نقط موتیوں کی پری پاے زیب   کہ جس کے قدم سے گہر پائے، زیب

پہلے مصرعے میں "پاے" ہمزہ کے بغیر ہے۔ پازیب یا پاے زیب، دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ پا یا پاے کے معنی ہیں : پانو۔ دوسرے مصرعے میں "پائے" فعل ہے، جو پانا سے بنا ہے اور اِس میں ہمزہ ہے۔ املا میں اِس اختلاف کو ملحوظ رکھا جائے گا اور پہلے مصرعے میں "پاے زیب" لکھا جائے گا اور دوسرے مصرعے میں "پائے زیب" لکھا جائے گا۔
اِس سلسلے میں امیراللغات کے ایک اندراج کا ذکر ضروری ہے، اُس میں "آئے" پر یہ حاشیہ لکھا گیا ہے :

"آے، بروزنِ فاع، اور آئے، بروزنِ فعلن، دونوں طرح درست ہے۔ قلق ؎ : لب پہ جُرات کی جب حکایت آے ؛ دلِ نامرد میں حرارت آے۔

صبا ؎   اثر ایسا کہاں سے نالۂ شب گیر میں آئے

کہ جس سے فرق جورِ آسمانِ پیر میں آئے" (ص ۲۰۹)

امیر کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ فعل فعلن کے وزن پر نظم ہو تب اِس کو اصل کے مطابق مع ہمزہ "آئے" لکھا جائے، اور جب یہ فاع کے وزن پر آئے تو اِس کو (مخفّف فرض کرکے) ہمزہ کے بغیر "آے" لکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اِس فعل کی تخصیص نہیں، ایسے سبھی افعال اِسی ذیل میں آئیں گے ــــ مگر جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ قول قابلِ قبول نہیں۔

ضرورتِ شعری کی بنا پر، ایسے افعال پڑھنے میں کسی طرح آئیں، لکھے جائے گا اُن کو اصل کے مطابق مع ہمزہ۔ یعنی آئے، آئیں، آؤ، جائے جائیں، جاؤ۔ اگر امیر کے قول کو مان لیا جائے تو "آؤ" کو "آو" لکھنا پڑے گا (اس صورت میں جب کہ یہ شعر میں بروزنِ فع نظم ہو اور یہ استعمال عام ہے)۔ اسی طرح "آئیں" کو، جب وہ بروزنِ فاع نظم ہو، (اور یہ استعمال بھی عام ہے) "آیئں" لکھنا ہوگا اور اِن میں سے کوئی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اردو کے افعال، نظم میں اکثر صورتوں میں اِس طرح نظم ہوتے ہیں کہ آخری حرف یا آخری دو حرف ساقط ہو جاتے ہیں، مگر اِس خالص ضرورتِ شعری کی وجہ سے، ایسے لفظوں کے املا پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ پڑنا چاہیے۔

(۱۰)

یہ بات پہلے لکھی جا چکی ہے کہ عربی کے جن الفاظ کے آخر میں اصلاً ہمزہ ہوتا ہے، وہ اردو میں عموماً ہمزہ کے بغیر مستعمل ہیں، جیسے: علما، شے، ابتدا وغیرہ۔ مگر دو لفظ اِس سے مستثنا ہیں: ایک مبدء اور دوسرے سوء (جس کے معنی ہیں: بُرا)۔ اِن دونوں میں ہمزہ باقی رہتا ہے اور یہ استثنا ہے۔ اضافت کی صورت میں اِسی ہمزہ پر زیر آ جائے گا۔ جیسے:

علمائے سوء۔ سوءِ ظن[۱]، سوءِ اتّفاق، سوءِ ہضم، سوءِ مزاج،

---

[۱] کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں   یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں
(غالب)

سوءِ تنفّس[1]، سوءِ ادب[2]، سوءِ ترکیب[3]، مبدءِ فیض، مبدءِ فیاض[4]، مبدءِ اوّل[5]، مبدءِ کل[6]

(۱۱)

جن لفظوں کے آخر میں یائے معروف ہوتی ہے، جیسے: زندگی، کباڑی؛ جمع کے لیے اُن کے آگے "ون" یا "الف نون" بڑھایا جاتا ہے اور اِس کا ذکر آچکا ہے۔ جیسے: زندگی: زندگیاں، زندگیوں۔ یا کباڑی: کباڑیوں۔

---

[1] اے شرق، سوءِ تنفّس میں خدا کا دم بھر — چونک غفلت سے، یہی وقت ہے ہشیاری کا
(نور اللغات)

[2] "میں نے زیادہ اصرار کرنا سوءِ ادب سمجھ کر قبول کر لیا" (مولوی نذیر احمد صاحب، موعظۂ حسنہ، لاہور اڈیشن، ص ۱۴۸)۔

[3] "خلط مبحث، اطنابِ ممل، سوءِ ترکیب، تباہیِ روزمرّہ، غلطیِ فہم، اِس سے مجھے کچھ کام نہیں"۔ غالب (قاطعِ برہان و متعلقہ رسائل، ص ۱۹۶)

[4] جواہر سے ملاتا کون یاں اعراض کا جوڑا — یہ ہے باندھا ہوا خود مبدءِ فیاض کا جوڑا
انشا (کلامِ انشا، ص ۴۴)

زہے نسائمِ فیضانِ مبدءِ فیاض — نمود جس سے ہوئے سب جواہر و اعراض
انشا (کلامِ انشا، ص ۱۱۰)

[5] درود، آئنۂ دل کو مثلِ صیقل ہے — کہ وہ ہی مبدءِ اوّل سے نورِ اوّل ہے
انشا (کلامِ انشا، ص ۳۸۱)

[6] یوں ارکان جاویں مل، مبدءِ کل کے ساتھ بل — کوئی نہ جانے، تھے کہاں آتش و باد و آب و خاک
انشا (کلامِ انشا، ص ۳۰۲)

(الف) اِسی طرح ایسے لفظ جن میں یؔ کے بعد الفؔ ہوتا ہے اور یؔ سے پہلے والے حرف پر زیر ہوتا ہے ، جیسے : کباڑیا ، بھیڑیا ؛ محرّف صورت میں ، نیز جمع کے لیے ، اِن میں الفؔ کی جگہ ےؔ آ جاتی ہے ، جیسے : بھیڑیا ؛ بھیڑیے ۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اِس صورت میں دو یؔ یک جا ہو جاتی ہیں ، پہلی یؔ جو جزوِ لفظ ہوتی ہے اور دوسری ےؔ کا اضافہ کیا جاتا ہے (بھیڑِ ي یے) ، ہمزہؔ اِس پر نہیں آ سکتا ۔
نیز جب جمع کے لیے " وں " کا اضافہ کیا جائے گا ، تب بھی ہمزہ کا گزر نہیں ہوگا ۔ مثال کے طور پر ایسے کچھ لفظوں کی محرّف اور جمع کی صورتیں لکھی جاتی ہیں ، ایسے باقی الفاظ کو ، اِنھی پر قیاس کیا جا سکتا ہے :

کباڑیا	کباڑیے	کباڑیوں
کباریا	کباریے	کباریوں
پہاڑیا	پہاڑیے	پہاڑیوں
توبیا	توبیے	توبیوں
ٹٹپونجیا	ٹٹپونجیے	ٹٹپونجیوں
دِیا (چراغ)	دِیے	دِیوں
بہروپیا	بہروپیے	بہروپیوں
پُرَبیا	پُرَبیے	پُرَبیوں
بالشتیا	بالشتیے	بالشتیوں
جانگیا	جانگیے	جانگیوں
ڈاکیا	ڈاکیے	ڈاکیوں
ڈوریا	ڈوریے	ڈوریوں

چوگوشیا چوگوشیے چوگوشیوں

کن میلیا کن میلیے کن میلیوں

ب) جن لفظوں میں یَ سے پہلے حروفِ علّت کے سوا اور کوئی ساکن حرف ہوگا، جیسے: نوسِکھیا، بَنیا؛ اُن کو بھی اِسی طرح لکھا جائے گا۔ نیز اُن حرفوں میں الف سے پہلے یّ مشدّد ہوگی؛ اُن کا بھی یہی حکم ہوگا، جیسے:

بنیا بنیے (بن یَ یے) بنیوں

نوسِکھیا نوسکھیے نوسکھیوں

لہریا لہریے لہریوں

بھگتیا بھگتیے بھگتیوں

نچنیا نچنیے نچنیوں

پُرَبیا پُرَبیے پُرَبیوں

دُھنیا دُھنیے دُھنیوں

دَھنیا دَھنیے دَھنیوں

پہیا پہیے پہیوں

بھیّا بھیّے بھیّوں

ٹیّا ٹیّے ٹیّوں

ہنسیا ہنسیے ہنسیوں

(ج) جو لفظ الف کے بجائے، ہائے مختفی پر ختم ہوتے ہیں، اور اُس سے پہلے یَ ہے، اور یَ سے پہلے والا حرف مکسور ہے، جیسے: مرثیہ، تعزِیہ؛ ایسے لفظوں میں بھی محرّف صورت میں، ہائے مختفی کی جگہ یے کا اضافہ کیا جائے گا، اور یہاں بھی دو یَ یک جا ہو جائیں گی؛ پہلی

یؔ تو لفظ کا جز ہوگی اور دوسری یےؔ کا اضافہ کیا جائے گا ، جیسے : مرثیہ ، مرثیے (مرثِ یؔ یے) ۔ اور جیسا کہ اِس سے پہلے والے لفظوں میں ہوا تھا ؛ اگر یؔ سے پہلے کوئی حرف ساکن ہے ، تب بھی یہی صورت رہے گی ، جیسے : بخیہ ، بخیے (بخْ یؔ یے) ۔ ایسے کچھ الفاظ :

مرثیہ	مرثیے	مرثیوں
تعزیہ	تعزیے	تعزیوں
تجزیہ	تجزیے	تجزیوں
تصفیہ	تصفیے	تصفیوں
تعمیہ	تعمیے	تعمیوں
زاویہ	زاویے	زاویوں
حُلیہ	حُلیے	حلیوں
جغرافیہ	جغرافیے	جغرافیوں
قافیہ	قافیے	قافیوں
انشائیہ	انشائیے	انشائیوں
دہریہ	دہریے	دہریوں
بخیہ	بخیے	بخیوں

(۱۲)

اِس سلسلے میں دو طرح کے لفظ مستثنیات کے ذیل میں آتے ہیں اور اِن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے ۔

(الف) عربی اور فارسی کے کچھ لفظ ایسے ہیں جن میں آخری حرف ہائے مختفی ہے ، اُس سے پہلے یؔ ہے اور یؔ سے پہلے الف ساکن ہے ، جیسے : پیرایہ ، حمایہ ؛

ایسے لفظوں میں محرّف صورت اور جمع کی صورت میں، یؔ برقرار رہے گی اور یہ استثنا ہے۔

اُردو کا اصل رجحان تو یہ ہے کہ بیچ میں اگر الفؔ ساکن ہو اور اُس کے بعد جو حرف ہو اُس پر زیر ہو، تو الفؔ کے بعد یؔ نہیں، ہمزہؔ آتا ہے، جیسے: سائل، جائے، لائے، سائکل، پائپ ـــ زبر ہو تو یؔ آئے گی، جیسے: گھایل، پایل۔ اِن کو زیر سے پڑھیے تو ہمزہؔ آجائے گا، یعنی: گھائل، پائل ـــ مگر فارسی عربی کے ایسے لفظ جن کے آخر میں ہائے مختفی ہو، اِس قاعدے سے مستثنا رہیں گے۔ یہ استثنا اُسی قسم کا ہے جیسے مان لیا گیا ہے کہ لفظ فارسی یا عربی کا ہو تو اُس کے آخر میں ہائے مختفی آئے گی، نہیں تو الفؔ آئے گا، جب کہ اکثر صورتوں میں دونوں طرح کے لفظوں کا تلفّظ ایک سا ہوتا ہے۔ ہر زبان میں مستثنیات ناگزیر ہیں اور بعض اعتبارات سے ضروری ہیں۔

ایسے لفظ بہت زیادہ نہیں۔ زیادہ استعمال ہونے والے لفظ یہ ہیں:

سرمایہ	سرمایے	
ہم سایہ	ہم سایے	ہم سایوں
پیرایہ	پیرایے	پیرایوں
سایہ	سایےؔ	سایوں
چوپایہ	چوپایے	چوپایوں
پایہ	پایے	پایوں

لہ "اپنے سایے سے" (امیر اللغات ص ۳۲)

آیہ[1] (آیت کی ایک صورت) آیے

کرایہ کرایے کرایوں

ایک بات یہ بھی ہے کہ اضافت اور عطف کی صورت میں، ایسے لفظوں میں یَ باقی رہتی ہے، جیسے: سایۂ ابرِ بہار، سرمایہ و محنت؛ اِس طرح اِن لفظوں میں یَ کا وجود، تلفظ میں کھٹک پیدا کرتا رہتا ہے۔ اِسی طرح اِن لفظوں کی بعض اور صورتوں میں بھی یَ اپنے آپ کو دُہراتی رہتی ہے، جیسے: سایہبان، ہم پایہ، ہم سایگی؛ اِن وجوہ سے نظر اور تلفظ، دونوں ایسے لفظوں میں یَ کے وجود کے خوگر ہیں۔ مَیں ایک مثال سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا:

مقدمۂ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی میں ایک جملہ یوں لکھا ہوا ہے:
"اُنھیں بار بار مختلف پیرایوں میں باندھتے تھے" (ص ۱۱۶)۔ یہاں نگاہ "پیرایوں" سے مانوس معلوم ہوتی ہے اور پڑھتے وقت تلفظ میں جو کیفیتِ اظہار پیدا ہوتی ہے، وہ بھی مانوس سی ہوتی ہے۔ اگر یہاں "پیراؤں" لکھا ہوتا، تو نگاہ، اجنبیت کے احساس سے دوچار ہوتی اور تلفظ میں بھی وہ بات نہ رہتی۔

یہ کیفیت بعض اور الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ لفظ دو طرح کے ہیں (۱) وہ لفظ جن کا آخری حرف "یے" ہے، جیسے: رائے، وائسرائے،

---

[1] حرزِ جاں، قوتِ دل، آیۂ رحمت سمجھوں ہاتھ آجائے جو بازوے بتاں کا تعویذ
تو وہ ہے مصحفِ ناطق کہ وصف بچ رہتا کرور آیے اگر تیری شان میں آتے
دونوں شعر نور سے ماخوذ ہیں۔

سرائے، گائے۔ (۲) فارسی کے کچھ وہ لفظ جن کے آخر میں واو یا الف ہے؛ لیکن جن کو فارسی میں اضافہ، یے کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: مو (موے) رو (روے) کو (کوے) اوّل الذکر الفاظ کی جمع کبھی "وں" کے اضافے سے بنتی ہے، جیسے: گایوں، سرایوں۔ اور کبھی آخر کی "یے" نکل جاتی ہے اور "ؤں" کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: "وائسراؤں"۔ دوسری قسم کے الفاظ کو عموماً مع "یے" استعمال کیا جاتا تھا، جیسے: بدخویاں، خوش رویوں، غالیہ مویوں وغیرہ۔ اور اب تک یہ سیّال حالت میں ہیں، کبھی "بدخوؤں" لکھا جاتا ہے اور کبھی "بدخویوں"۔ ذیل کے نقشے سے اختلافِ استعمال معلوم ہوگا:

گائے	گائیں	گایوں	
رائے	رائیں	رایوں	
وائسرائے		وائسراؤں	
سرائے	سرائیں	سرایوں	سراؤں
بدخو		بدخویوں	بدخوؤں
خوش رو		خوش رویوں	
شمع رو		شمع رویوں	
آبلہ پا	آبلہ پائی	آبلہ پایوں	آبلہ پاؤں

اِس طرح کے کچھ نہ کچھ اختلافات ہمیشہ رہیں گے، اِن سے الجھنا نہیں چاہیے۔ اِن کو نظر میں رکھنا چاہیے۔ اور یہ بات سیاقِ عبارت سے معلوم ہوتی ہے کہ کہاں پر کس صورت کو رکھا جائے۔ زبان میں مکمل یک سانیت کی امید رکھنا نہ مناسب ہے نہ ممکن۔

(ب) مستثنا لفظوں کی دوسری قسم، فارسی کے کچھ حاصل مصدر، بعض اسم فاعل، اسمِ مفعول اور چند اسمِ مصدر ہیں۔ فارسی کے کچھ مصدر ایسے ہیں جن کے امر میں (اور وہی مادّہ بھی ہوتا ہے) آخری حرف یے ہوتا ہے، جیسے: آرائے، نمائے، پیمائے۔ اِن کے مصدر ہیں: آراستن، نمودن، پیمودن۔ حاصل مصدر بنانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ امر کے آگے شِن کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اِس طرح نمائے سے نمایش، آرائے سے آرایش، پیمائے سے پیمایش بنیں گے۔

اسم فاعل بنانے کے لیے امر کے آگے "ندہ" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اِس طرح آرائے سے آرایندہ اور نمائے سے نمایندہ اسمِ فاعل ہوں گے۔ نمایندہ کی جمع نمایندگان آئے گی اور اِس سے اسمِ مصدر نمایندگی بنے گا۔ اِس کا مضارع ہوگا: نماید۔ نمائے کی آخری یے، جو لفظ کا جُز ہے، ہر جگہ باقی رہے گی۔

اِسی طرح شایستن مصدر کا اسمِ مفعول ہوگا: شایستہ۔ اسمِ حالیہ ہوگا: شایاں۔ مضارع ہوگا: شاید۔ اور شایستہ سے شایستگی بنے گا۔ حرفِ یا چوں کہ جزوِ لفظ ہے، اِس لیے وہ ہر جگہ باقی رہے گا۔

اِس طرح کے کچھ حاصل مصدر، اسمِ فاعل وغیرہ اردو میں عام طور پر استعمال میں آتے رہتے ہیں اور اِن سب میں، اصل کی رعایت سے، یَ لکھی جائے گی، ہمزہ نہیں لکھا جائے گا۔ ایسے لفظوں کی ناتمام فہرست یہ ہے:

آرایش، آزمایش، افزایش، آسایش، آلایش،

ہ امیر اللغات میں آرایش، آزمایش، آسایش، افزایش؛ اسی طرح (بقیہ حاشیہ ص ۴۲۹ پر)

بخشایش ، پیمایش ، ستایش ، فرمایش ، کشایش ،
گنجایش ، نمایش ۔

شاید ، باید و شاید ، شایستہ ، شایستگی ، ستایش گر ،
ستایش گری ، ستایشی ۔ آیندہ[1] (زمانۂ آیندہ) ، پایندہ ،
پایندہ باد ، پایندگی ۔ نمایندہ ، نمایندگان ، نمایندگی ۔ فرمایشی ،
نمایشی ، آزمایشی ، آرایشی ۔

مندرجۂ ذیل چار لفظ ایسے ہیں جو حقیقت میں حاصل مصدر نہیں ، حاصل
مصدروں کے قیاس پر نئے لفظ بن گئے ہیں ۔ اِن کو خلافِ قاعدہ حاصل
مصدر کہا جا سکتا ہے ۔ اِن کو بھی اُسی طرح لکھا جائے گا ، جس طرح ایسے
حاصل مصدروں کو لکھنا چاہیے ۔ یہ لفظ ہیں :
پیدایش ، رہایش ، فہمایش[2] ، زیبایش ۔

(مع ی) لکھے ہوئے ہیں اور آلایش اِس طرح لکھا ہوا ہے کہ نیچے ی کے نقطے ہیں
اور اوپر ہمزہ بھی بنا ہوا ہے : "آلائش" ۔ ظاہر ہے کہ یہاں کتابت کی غلطی ہے ۔

[1] "آیندہ" بھی امیر اللغات میں صحیح طور پر (مع ی) لکھا ہوا ہے ۔

[2] مرزا غالبؔ اِس لفظ سے بہت ناراض تھے ۔ میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط
میں بہت جل کے لکھا ہے :

"فہمایش کا لفظ میاں بُدھا ولد میاں جمّا اور لالہ گنیشی داس ولد لالا
بھیروں ناتھ کا گھڑا ہوا ہے ۔ میری زبان سے تم نے سنا ہے ؟ اب تفصیل
سنو : امر کے صیغے کے آگے شین آتا ہے ، تو وہ امر ، (بقیۂ حاشیہ ص ۴۳۰ پر)

رایگاں اور شایگاں ؛ اِن دونوں لفظوں میں بھی یَ ہے اور اِن کو اِسی طرح (مع یَ) لکھا جائے گا۔

شایَد ، بایَد اور بایَست ؛ اِن لفظوں میں بھی یَ ہے اور اِن کو بھی اِسی طرح لکھا جائے گا۔" باید و شاید " عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اِن دونوں لفظوں میں یَ مفتوح ہے۔ قاعدے کے لحاظ سے بھی (مفتوح ہونے کی وجہ سے) یہاں یَ آئے گی۔" بہ قدرِ بایست " بھی کبھی کبھی تحریر میں آجاتا ہے۔ جیسے :" اِس نسخے کی تصحیح میں بہ قدرِ بایست سعی نہیں کی گئی" (عرشی صاحب۔ مقدمۂ دیوانِ غالب، ص ۱۱۵) اِس لفظ" بایست" میں یَ پر زیر ہے۔

اضافہ :

ریڈیو پر ایک کپڑا مل کے اونی کپڑوں کے اشتہار میں، ایک نیا اور

معنیِ مصدری دیتا ہے اور اِس کو حاصل بالمصدر کہتے ہیں۔ سوختن مصدر، سوزد مضارع، سوز امر، سوزش حاصل بالمصدر۔ اسی طرح ہیں خواہش و کاہش و گزارش و گدازش و آرایش و پیرایش و فرمایش۔ فہمیدن فارسی الاصل نہیں ہے، مصدرِ جعلی ہے ؛ " فہم " لفظ عربی الاصل ہے۔" طلب" لفظ عربی الاصل ہے۔ ان کو موافقِ قاعدۂ تفریس" فہمیدن" و" طلبیدن" کر لیا ہے ..... خیر، یہ فرض کیجیے کہ جب ہم نے مصدر اور مضارع اور امر بنایا تو اب حاصل بالمصدر کیوں نہ بنائیں۔ سنو، حاصل بالمصدر" فہمش،، اور" طلبش" چاہیے۔" فہم " تھا صیغۂ امر،" فہمد" میں سے نکلا تھا الف اور یے کہاں سے لایا ؟" فہمائے " تو نہیں جو " فہمایش " درست ہو۔ کہیں" فرمایش ،،کو اِس کا نظیر گمان نہ کرنا۔ وہ مصدرِ اصلیِ فارسی " فرمودن " ہے ؛" فرماید" مضارع ،" فرمائے" امر، حا[illegible] مصدر" فرمایش "۔

(خطوطِ غالب، مرتبۂ مہیش پرشاد، مرحوم ل، ص ۲۵۴)

دل چسپ لفظ سُننے میں آتا رہا ہے ، یہ لفظ ہے : گرمایش ۔ "آرام اور گرمایش کے لیے" لفظ دل چسپ ہے اور اپنے مفہوم کو پوری طرح ادا کر رہا ہے اور اِس لحاظ سے اِسے قبولیت کا خلعت مل جانا چاہیے ۔ اوپر جو چار حاصل مصدر نما لفظ لکھے گئے ہیں ، اُنھی میں اِس کو بھی شامل کرنا چاہیے۔ جس طرح "پیدا" سے "پیدایش" بنا ہے ، اُسی طرح "گرما" سے "گرمایش" بن گیا ہے ۔

وضاحت :

"سرمایہ دار" ، "سایہ دار" اور "کرایہ دار" ؛ واحد اور جمع دونوں صورتوں میں اِسی طرح لکھے جائیں گے ۔ جیسے : (۱) "وہ بڑا سرمایہ دار ہے" اور "سرمایہ داروں نے ہر طرف جال پھیلا رکھا ہے"۔ (۲) "سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھو"۔ اور "ہر طرف سایہ[1] دار درخت لگے ہوئے ہیں"۔ (۳) "اچھا کرایہ دار آج کل کہاں ملتا ہے" اور "کرایہ داروں نے ساری عمارت کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے"۔

مفرد صورت میں ، محرّف ہوکر ، یہ لفظ قاعدے کے مطابق یے سے لکھے جائیں گے ۔ جیسے : "سرمایہ کم ہے"۔ اور "سرمایے کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا"۔ "آپ کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رہے"۔ اور "یہاں آکر سایے میں بیٹھو"۔ "کرایہ بڑھ گیا ہے"۔ اور "کرایے میں اضافہ ضروری ہے"۔

---

[1] کیوں میاں بلند رتبہ سرِ راہ کے درخت — ہیں کیسے سایہ دار مری آہ کے درخت
(انشا: کلامِ انشا، ص ۶۲)

یہ سایہ دار درختوں کی دیکھیے قسمت — کہ یاں برابری اُن سے ارنڈ کرتے ہیں
(انشا: کلامِ انشا، ص ۱۶۱)

اِس کے برخلاف ، ایک اور مرکّب " ذمّہ دار" استعمالِ عام میں " ذمّے دار" بن گیا ہے اور یہی صورت " ذمّے داری " کی ہے ۔ اِس مرکّب کو محرّف صورت ہی میں لکھا جائے گا ۔ جیسے : " ہم اُن کے فعلوں کے ذمّے دار نہیں"۔ اور " ذمّے دار لوگوں نے یہ بات کہی ہے "۔ اور " اُنھوں نے اپنی ذمّے داری کو پورا نہیں کیا "۔

فائدہ :

ولایت ، کفایت ، عنایت ، پنچایت ، حمایت ، حکایت جیسے لفظ ، جن میں آخری حرف (ت) سے پہلے یؔ (مفتوح) ہے ؛ جب اِن کے آگے اسمِ منسوب یا اسمِ فاعل بنانے کے لیے یؔ کا اضافہ کیا جائے گا ، تب بھی اصل لفظ میں موجود یؔ اپنی جگہ پر برقرار رہے گی ، اِس لیے کہ وہ جزوِ لفظ ہے اور اِس یؔ کے اضافے سے لفظ میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ہے کہ اِس یؔ پر کوئی اثر پڑے ۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ اضافۂ یاؔ کی صورت میں کچھ لوگ ، پہلی یؔ کو ہمزؔہ سے بدل دیتے ہیں ، یعنی ولایتی کو " ولائتی " اور حمایتی کو " حمائتی " لکھتے ہیں ۔ یہ غلط ہے ۔ پہلی یؔ جو جزوِ لفظ ہے ، وہ اِس صورت میں اپنی جگہ پر محفوظ رہے گی ، اور اِن کی صحیح کتابت ہوگی : ولایتی ، کفایتی ، عنایتی ، پنچایتی ، حمایتی (وغیرہ) ۔

(۱۳)

عربی میں بابِ تفعیل کے کچھ مصدر ایسے بھی ہیں جن میں دو یؔ یک جا ہیں ، جیسے : تعیین ، تخییل ، تزیین ۔ ایسے جو مصدر اردو میں (کم یا زیادہ) استعمال ہوتے ہیں ، اُن کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ۔ ایسے بعض مصدر جو اردو میں زیادہ مستعمل ہیں ؛ اُن میں یہ تصرّف ہوا ہے کہ پہلی یؔ ، ہمزہ

سے بدل گئی ہے، تلفظ میں بھی اور تحریر میں بھی۔ املاً اِن مصدروں میں دو یؔ ہیں، مگر عام استعمال میں، ایک ہمزہ اور ایک یؔ ہے۔ ایسے مصدر یہ ہیں: تخئیل، تزئین، تذئیل، تغئیر، تمئیز۔

دو مصدروں کی صورت یہ ہے کہ یہ اردو میں نسبتاً کم مستعمل ہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اِن میں یؔ اور ہمزہ کی یہ تبدیلی اُس طرح اثرانداز نہیں ہو سکی۔ یہ مصدر ہیں: تبیین، تعیین۔

اور ہاں، "تمییز" بھی کم استعمال میں آیا ہے اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ فارسی ہی میں اِس سے ترش ترشا کر ایک مختصر اور سبک صورت "تمیز" عالمِ وجود میں آگئی اور اردو میں خاص طور پر اِس کا رواج بڑھ گیا۔

مختصر یہ کہ اِن مصادر میں سے، پانچ مصدروں نے تو تحریر و تقریر دونوں میں پہلی یؔ کو ہمزہ سے بدل لیا ہے، اِس لیے اب اِن مصدروں میں یؔ اور ہمزہ کا اجتماع مان لیا جائے گا، اور اِن کو اِسی طرح لکھا جائے گا:

تخئیل، تزئین، تذئیل، تمئیز، تغئیر۔

اور دو مصدر، پُرانے املا کے مطابق ہی لکھے جائیں گے، یعنی اِن میں دونوں یؔ برقرار رہیں گی۔ یہ دو مصدر ہیں: تعیینؔ، تبیین۔

لہ ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی مرحوم کی راے یہ تھی کہ بابِ تفعیل سے آنے والے ایسے سب مصدروں میں لازماً دونوں یؔ لکھی جانا چاہیے۔ میرے استفسار کے جواب میں مرحوم نے لکھا تھا:

"تفعیل کے وزن کے لفظ فارسی اور اردو میں دو تین سو کے قریب ہیں، اور جن کا عؔ کلمہ یؔ ہے، وہ دس بارہ سے زیادہ نہیں: تبیین، تخییل،

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۱۴۴

"یَل" اردو کا ایک لاحقہ ہے ؛ جیسے : مریل ، اَڑیل ، دَڑھیل ۔ اِس میں یَ پر زبر ہے ، اِس لیے وہ تلفّظ میں پوری طرح ساتھ دیتی ہے ۔ ایسے سب لفظوں میں یَ لکھی جائے گی ، ہمزہ نہیں آئے گا ، جیسے :

اڑیل ، سڑیل ، کڑیل ، مریل ، ہریل ، دڑھیل وغیرہ ۔

وضاحت :

اِس قاعدے کی حیثیت کُلیے کی سی ہے کہ جب بھی درمیانِ لفظ میں یَ مفتوح ہوگی ، تو اُس جگہ پر یَ ہی آئے گی ، ہمزہ کبھی نہیں آئے گا ۔ جیسے : مریَل میں یَ پر زبر ہے ۔ اگر اِس کو (بالفرض) زیر کے ساتھ پڑھا جائے تو پھر اِس کی یَ ، ہمزہ سے بدل جائے گی ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اِس

تذییل ، تزیین ، تغییر ، تمییز وغیرہ ۔ اِس وزن کے لفظ بہت بڑی تعداد میں مختلف علوم کی اصطلاحیں بھی ہیں ، جن کے ماہر اور طلبہ انھیں بلاتکلّف استعمال کرتے آئے ہیں ، وہ اِس تصرّف کو کیوں کر مانیں گے ، جب کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو بولنے والے یَ کا تلفّظ بہ خوبی کرسکتے ہیں ۔ ایران یا ہند کے عوام کی زبانوں پر آکر "تمییز" سے "تمیز" ہوگیا ، تو یہ تو ہوا نہیں کہ لکھے پڑھے لوگ اسے مان گئے ہوں ، یہ البتّہ ہوا کہ "تمیز" ایک نیا لفظ بن گیا (سلیقے اور صفائی کے معنی پر) ۔ "تزیین" اگر "تزین" (یا تزئین) ہوا تو وہ عوام تک رہا ۔ لکھے پڑھے "تزیین" بولتے اور لکھتے رہے ۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ لفظ تفعُّل کے وزن پر ہیں اور تفعُّل مُطاوع (REFLEXIVE) ہے تفعیل کا "۔ (مکتوب بہ نامِ راقم الحروف)

وضع و انداز کے لفظوں میں ، اگر حرف مفتوح ہے تو وہ لازماً ےَ ہے اور اگر مکسور ہے تو ہمزہ ہے۔

اِس کی ایک دل چسپ مثال لفظ "گھائل" ہے۔ قدما اِس کو "گھایَل" بھی سمجھتے تھے اور بادل ، چھاگل وغیرہ کا ہم قافیہ کرتے[1] تھے۔ بعد کو یہ لفظ زیادہ تر بِالکسر استعمال ہونے لگا۔ جن لوگوں نے اِس کو بِالکسر استعمال کیا، اُنھوں نے اِس کو "گھائِل" لکھا اور سائل ، قائل وغیرہ کے قافیے میں لائے۔
اِسی قماش کا ایک اور لفظ ہے "پایَل" اور "پائِل" ، کہ زبر سے کہیے تو یہ "پایَل" (مع ےَ) ہے اور زیر سے بولیے تو "پائِل" (مع ہمزہ) ہے۔ یہی صورت "نایَک" ، "نائِک" اور "سہایَک" ، "سہائِک" کی ہے۔ زبر سے پڑھیے تو "نایَک" ہے۔ زیر سے پڑھیے تو "نائِک" ہے۔ اِسی طرح ناریَل میں چوں کہ ےَ مفتوح ہے ، اِس لیے اِس کو لازماً مع ےَ لکھا جائے گا۔

(۱۵)

ذیل میں انگریزی کے کچھ لفظ لکھے جارہے ہیں ؛ اِن میں اور اِن کی قبیل کے اور الفاظ میں (خواہ وہ کسی زبان کے ہوں) آخر سے پہلے والے حرف کی جگہ پر ےَ لکھی جائے گی ، ہمزہ نہیں آئے گا۔ اور وجہ وہی ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ےَ مفتوح ہے ، اور اُس کے حرفِ ماقبل پر زیر ہے ، جو ےَ سے موافق حرکت ہے:

کیشیَر ، جونیَر ، سینیَر ، پانیَر ، برگیڈیَر ، میَر ، ہیَر ڈریسر ،

---

[1] رسالۂ اصلاح میں اِس لفظ پر مفصّل بحث کی گئی ہے۔ معیارِ فصاحت میں بھی اِس لفظ سے متعلق اختلافات کا حوالہ دیا گیا ہے۔

ہیر، ہیر، بیئر، شکسپیر، بودلیر، جولیس، ایریر، سووی نیر،
انڈین، ایرانین، ایشین، السیشین، آرین، کمیڈین،
وکٹورین، اِٹالین، بلغارین، رشین، کسٹوڈین، چمپین،
شامپین، لائبریرین، پویلین، سویلین۔

(۱۶)

اوپر جو لفظ لکھے گئے ہیں، اُن میں "ی" مفتوح ہے؛ اِس قاعدے کی یہاں پھر تکرار کی جاتی ہے کہ جب اِس حرف پر زیر ہوگا تو وہاں "ی" نہیں ہوگی، "ہمزہ" ہوگا۔ جیسے:

(الف) رائفل، جائفل، بائبل، سائکل، لائٹ، پائپ، ٹائپ،
نائلون، سائز، فنائل، کرائم، مائکل، پرائوٹ، ڈائرکٹر،
ڈائرکشن، امپائر، ڈائرکٹری، لائبریری، ڈِزائن، سائڈ، موبائل،
وائن، ڈائنامیٹ، سائن بورڈ، جوز فائن، ٹائل، آئل، پائلٹ،
مائنس، سائنس، نائٹروجن، ہائڈروجن، مزائل، رفائن،
بائکاٹ، ٹرائل، ٹائلٹ، سائلنسر، سائکالوجی، اجوائن،
رسائن، ڈائن، چائنا، وائنا، پائن ایپل۔

اِس قاعدے کے تحت، اِس طرح کے لفظوں کے املا کا تعین بہ آسانی کیا جاسکتا ہے۔

(ب) اِسی طرح عربی کے بہت سے اسمِ فاعل بھی ہمزہ سے لکھے جائیں گے[۱]، جیسے:

---

[۱] مولوی نذیر احمد صاحب نے رسالۂ رسم الخط میں لکھا ہے:

"جو الفاظِ عربی، اردو میں مستعمل ہیں، اُن میں اکثر فاعل کے صیغے ہیں، جیسے:

قائل ، سائل ، مائل ، شائق ، قائم ، دائم ، صائم ، لائق ،
فائق ، تائب ، نائب ، صائب ، غائب ، دائر ، زائر ، سائر ،
طائر ، حمائل ، ضائع ، شائع ، فائز ، حائز ، متشائم ، عائد ،
زائد ، مطمئن ۔
لئیم ، رئیس ، لئیق ۔

لائق ، شائق ؛ تو یہ ہمزہ بہ قاعدۂ عربی اصل میں یٓ ہے ، اسی واسطے یٓ
لکھ کر ، اوپر ہمزہ بنا دیا جاتا ہے ، جس سے معلوم ہو کہ اصل میں یٓ اور تلفظ
میں ہمزہ ہے "۔ (رسم الخط ، اشاعتِ پنجم)
اِس عبارت کے سمجھنے میں مجھے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ ایسے الفاظ میں یٓ کے نقطے
بھی لگانا چاہیے اور اوپر ہمزہ بھی لکھنا چاہیے ۔ میں نے اپنے شبہے کو صدیقی صاحب
مرحوم کی خدمت میں پیش کیا ، مرحوم نے جواب میں لکھا تھا :
" مولانا کے اِن فرمودات سے آپ نے یہ کیوں کر استنباط کر لیا کہ اِس صورت
میں " یٓ اور ہمزہ دونوں لکھنا چاہیے " ؟ وہ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ آؤ ،
کھاؤ وغیرہ اور رائی ، کائی وغیرہ کے سے کچھ لفظ (عربی کے) اردو میں مستعمل
ہیں " جیسے لائق اور شائق ..." الخ ۔ اِس سے اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ
اِن لفظوں میں جس شوشے کے اوپر ہمزہ بنایا گیا ہے وہ یٓ کا شوشہ ہے
..... اِس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی حیات میں یہ اشاعت
نکلی ہوتی تو ہمزہ اور یٓ کے نقطے ، دونوں اُس میں ہوتے ، لیکن خوش قسمتی
سے میرے پاس اُن کے اخیر زمانے کی ایک چیز یعنی حمائلی تقطیع کا قرآنِ مجید
ہے ..... جس کے سرِ آغاز میں یہ اعلان ہے کہ یہ (بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸ پر)

(ج) عربی کی جمعوں میں بھی ہمزہ آئے گا، جیسے :

مسائل، فضائل، شمائل، رسائل، وسائل، دلائل، قبائل، عجائب، غرائب، حقائق، شقائق، دقائق، کوائف، طوائف، وظائف، نظائر، بصائر، جزائر، دوائر، ذرائع، وقائع، صنائع، بدائع، شرائط، نتائج، جرائد، فوائد، عقائد، عمائد، قصائد، شدائد، نفائس، نقائص، فرائض، خزائن، قبائح، لوائح، قرائن، دفائن، ملائک، عزائم، جرائم۔

(د) کچھ متفرق لفظ :

اشاعت اُن کی نگرانی میں ہوئی ... آپ کے اطمینان کے لیے میں نے ایک بار پھر اُس حمائل کی ورق گردانی کی اور ایک مثال بھی ایسی نہ پائی جس میں وزنِ فاعل کے الف کے بعد ہمزہ کے ساتھ نیچے ي کے نقطے بھی لگائے گئے ہوں۔ مثلاً یہاں صرف دو لفظوں کا حوالہ دیا جاتا ہے :

(۱) قائل ۔ الاعراف، آیت ۴ : قائلون ..... قائم ۔ آل عمران، آیت ۳۹ : فنادتہُ الملائکۃ وھو قائمٌ یصلّی فی المحراب؛ ...۔

غرض عربی قاعدے کے مطابق ہمزہ کا تلفظ ي کا سا نہیں ہے، نہ ہمزہ کے ساتھ دو نقطے لازم۔ فاعل کے مماثل ایک وزن جمع کا بھی ہے : فعائل ۔ اِس کے واحد عموماً مونث ہیں ۔ جریدۃ، ج جرائد ۔ جزیرۃ، جزائر ۔ رِسالۃ، رسائل ۔ ذبیحۃ، ذبائح ۔ ذریعۃ، ذرائع ۔ صحیفۃ، صحائف ۔ مصیبۃ، مصائب ۔ حاجۃ، حوائج ۔ حُرّۃ (آزاد عورت) حرائر، ضمائر"۔

(مکتوب بہ نامِ راقم الحروف، مکتوبہ ۲۰ فروری/۷ مارچ ۱۹۶۱ء)

ذائقہ ، معائنہ ، طائفہ ، دائرہ ، جائزہ ، قائمہ ، زائچہ ، کائنات ، -
آئنہ ، آئینہ ، آئین ، تائید ، پائیں ، پائنتی ، کائیاں ، دائیں ،
بائیں ، گسائیں ، پائل ، گھائل ، رائتا ، چرائتا ۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جہاں جہاں ہمزہ آیا ہے ، وہاں وہاں اُس پر زیر ہے اور یہی پہچان ہے اِس کی کہ یہاں ہمزہ آئے گا ۔ ایک لفظ ہے " گایک " اِسے دو طرح بولا جاتا ہے ۔ جب زبر سے بولا جائے گا تو اِس کو " گایک " لکھا جائے گا اور جب زیر سے بولا جائے گا تو اِس کا املا " گائک " ہوگا ۔

(۱۷)

ایک لفظ ہے : " چمپئی " ۔ یہ اصل میں فاعلن کے وزن پر ہے ، بولنے میں فعلن کے وزن پر معلوم ہوتا ہے ، مگر اِس کو لکھا جائے گا اِسی طرح ۔ اِس میں ی سے پہلے ہمزہ ہے (چ مُ پَ ءِ ی) ۔ ایسے متعدّد لفظوں میں ، حرفِ ماقبلِ ہمزہ اور ی کی آواز میں ، ہمزہ کی آواز اِس طرح مخلوط ہوجاتی ہے کہ واضح طور پر اور علاحدہ ، اِس کا تعیّن کرنا مشکل ہے ۔ ایسے کچھ لفظ یہ ہیں :

چمپئی ، فالسئی ، اگرئی ، سرمئی ، مرزئی ، بھٹئی ، بڑھئی ،
بھل منسئی ، گجئی ، بھئی (بھائی کی ایک صورت) گھئی (چولھے
کی) ، جئی ، تُرئی ، چکئی ، زئی ، ارئی ، رَغل زئی ، کسنئی ، گرئی ،
(مچھلی کی ایک قسم) ، مکئی ، مئی (ایک مہینا) ، ڈھئی (ڈھئی
دینا) ، باجپئی ، کچئی ، مغلئی ، چکنئی ۔

یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایسے لفظوں میں ہمزہ ، ی سے پہلے آتا ہے ، اِس لیے اِس کو لکھا بھی جائے گا ی سے پہلے ، اور اِس بنا پر ی سے پہلے

اِس کا شوشہ بنانا ضروری ہے ۔ یعنی "مغلئ" یا "مئ" نہیں لکھا جائے گا، بل کہ "مغلئی" اور "مئی" لکھا جائے گا۔ آخر کی یؔ سے پہلے، ہمزہ کا شوشہ ضرور بنایا جائے گا۔

(۱۸)

ہمایوں، کمایوں، بدایوں؛ اِن لفظوں میں واؤ سے پہلے یؔ ہے۔

(۱۹)

انگریزی کے ایسے بہت سے لفظ اردو میں مستعمل ہیں، جن کو لکھتے وقت، بار بار یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ فلاں حرف کے بعد یؔ لکھنا چاہیے، یا اُس پر زیر مان لینا کافی ہوگا۔ صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی ایک طریقہ متعین نہیں، کوئی شخص ایک طرح لکھتا ہے، کوئی دوسری طرح۔ جیسے: ایک لفظ ہے: اڈیٹر۔ بعض لوگ الفؔ پر زیر کافی سمجھتے ہیں اور کچھ لوگ الف کے بعد یؔ کا اضافہ کرتے ہیں (اِڈیٹر۔ ایڈیٹر)۔ مگر اِس پر اتفاق ہے کہ ڈ کے بعد یؔ ہے —— اِس سے یہ اصول ہاتھ آیا کہ ایسے لفظوں میں، جب حرف پر گہرا دباو ہو، تب اُس کے بعد یؔ لکھنا چاہیے، اور جب یہ دباو ہلکا ہو، تب اُس پر زیر کافی ہوگا۔ اِس طرح ایسے لفظوں کے متعلق فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ ایسے کچھ لفظ مثال کے طور پر لکھے جاتے ہیں، باقی لفظوں کو آسانی کے ساتھ قیاس کے دائرے میں لایا جا سکتا ہے:

اِڈیٹر، اِڈیشن، اِڈیشنل، اِمپائر، اِگزامنر، اِگزیکیوٹو، اِڈی ٹوریل، اِڈیسن، پبلشر، پرائیوٹ، کلاسکی، کلاسکل، کیرکٹر، ڈائرکٹر، ڈِزائن۔

اِس کے برخلاف ، درجِ ذیل لفظ مع اضافۂ یا سُننے میں آتے ہیں :
پریسیڈنٹ ، پالیسی ، یونی ورسٹی ، کیمپ ، پروفیسر، ایڈوکیٹ ۔

(۲۰)
کوئلا ، آصفیہ میں اِس کو "کوئیلا" لکھا گیا ہے ۔ اِس میں یَ زائد ہے ۔
"کوئلا[1]" ہونا چاہیے ۔
لفظ ہے آیینہ، اِس کی مخفف صورت آئنہ ہوگی ۔ یعنی یَ تخفیف میں
آجائے گی اور ہمزہ باقی رہے گا ۔
جمع کا ایک قاعدہ :
بُرقع ، موقع ، مطلع ، مقطع ، مصرع ، موضع ، مجمع ، مقنع ، مطبع ۔
مندرجۂ بالا نو لفظوں کی جمع کیسے بنائی جائے گی اور محرّف صورت میں
اُن کو کیسے لکھا جائے گا ، اِس میں اختلاف ہے ۔ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے
کہ محرّف صورت میں اور جمع کی صورت میں ، عام قاعدے کے مطابق ،
اِن لفظوں کے آگے یے کا اضافہ نہیں کیا جائے گا ، بل کہ ع سے پہلے

---

[1] آج کل زیادہ تر "کوئلا" اور "کوئلے" بولتے اور لکھتے ہیں ، مگر اِس کی ایک
صورت "کولا" بھی ہے اور یہ لفظ اِس صورت میں بھی مستعمل رہا ہے :

گرگُر سے لکھے جو ایک وصلی پر اور سکھاوے وہ لفظ، اے پیارے
کوئلے سے ملے یہ وصلی کو کہ وہ کالے ہوں حرف بھی سارے

انشا (کلامِ انشا ، ص ۴۴۵)

سروِ آزاد کئی ، حقّہ کش افیونی سے بیچے اک ادھی کو ، اور کولے لیے ڈھاک کے مول

انشا (کلامِ انشا ، ص ۱۲۶)

والے حرف کو زیر دینا کافی ہوگا۔ بحرؔ لکھنوی نے ، بحرالبیانؔ میں لکھا ہے:

"برائے اسمِ مذکر، حرفِ یائے مجہول ... بہ شرطیکہ در آخرِ اسمِ مذکر الف باشد یا ہائے مختفی ، و اگر در آخرِ آں اسمِ مذکرؔ، حرفِ عین است ، پس حرفِ ماقبل را کسرہ دہند، چوں مصرع و مطلع و مجمع، قس علیٰ ھٰذا "۔

جلالؔ نے لکھا ہے:

"اور کبھی اسمِ مفرد مذکر کو، جس کے آخر میں الف ہے ، حالتِ جمع میں بھی بہ صورتِ مفرد پڑھتے ہیں ، یعنی بجائے الف ، یائے مجہول نہیں لاتے ، جیسے : دریا ، صحرا..... اور یہی صورت جس اسم کے آخر میں عینِ مہملہ ہو ، جیسے : مطلع ، مصرع ، اُس کی بھی ہے۔لیکن وہ جمع کی صورت میں درحالتِ فاعلیّت ، ماقبلِ عین مکسور پڑھا جائے گا۔ اور حالتِ مفعولیت میں آخرِ لفظ میں عین کو باقی رکھیں گے اور واو نون جمع کا زیادہ کردیں گے "۔ (مفید الشعرا)

اِس کے برخلاف ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے میرے استفسار کے جواب میں لکھا تھا:

" عربی " بُرْقُع " اردو میں " بُرقَع " ہوگیا (ق کے زبر سے)۔ ع اردو میں قائم مقام الف کا ہے ، اِسی لیے " ضِلْع " سے اردو میں " ضِلَع " ہوا اور " مَوْقِع " سے " مَوْقَع "۔ جن لفظوں میں ع کا ماقبل عربی میں مفتوح تھا ، وہ اپنے حال پر رہے : مقطَع ، مطلَع ؛ اور جو خود عربی میں دو طرح سے رائج ہیں ، جیسے: "موضَع " اُن میں اردو نے زبر کو اختیار کرلیا زیر سے کچھ واسطہ نہیں ۔ یہ سب مثالیں واحد قائم کی تھیں۔ مذکر کا

واحد محرّف اپنے آخر میں بجائے الف کے ، یے رکھتا ہے ۔ اِس لیے ع ا
کے بعد یے کا لانا ضروری ہوا ۔ چنانچہ بُرقعے کے ، بُرقعے میں وغیرہ ۔
اِسی طرح جمع مذکر محرّف : برقعوں ، ضلعوں ، مطلعوں ، مقطعوں وغیرہ "۔
(مکتوب بہ نام راقم الحروف)

اِس پر سب متفق ہیں کہ " ون " کے ساتھ " مطلعوں ، مصرعوں " ہی لکھا جائے گا ، اگرچہ عین یہاں تلفظ میں نہیں آتا —— اِسی طرح محرّف صورت میں ع کے بعد یے لکھنا چاہیے ۔ یہ آسان اور سادہ صورت ہے اور اب اِسی کو مرجّح سمجھنا چاہیے کہ ایسے سب لفظوں میں یے کا اضافہ کیا جائے گا ، یعنی : مصرعے ، موقعے ، بُرقعے ، مطلعے ، مقطعے وغیرہ ۔ جیسے : مجمعے میں ، موقعے پر ، مطلعے سے ، مقطعے تک ، اچھّے مطلعے ، بُرے مقطعے وغیرہ ۔
اِس سے یک سانیت کے علاوہ ، یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا کہ " بُرقع " اور " بُرقعے " میں بہ آسانی امتیاز کیا جا سکتا ہے ، اور یہ طریقہ ، اُردو کے عام قاعدے سے مطابقت بھی رکھتا ہے ۔

امالے کی ایک صورت :

عربی کے بابِ انفعال کے جو مصدر اردو میں مستعمل ہیں ، اور جن کے آخر میں الف بھی ہے (اردو کے لحاظ سے) ، جیسے : املا ، انشا ، اِخفا وغیرہ ، اُن میں امالہ نہیں ہوتا ۔ یعنی الف ، یے سے نہیں بدلتا ۔ اِن میں خاص طور پر ایک قابلِ ذکر لفظ ہے : املا ۔ اِس کو غلطی سے کچھ لوگ " املے " لکھ دیا کرتے ہیں ؛ جیسے : " املے کی غلطی " ۔ یہ ٹھیک نہیں ۔ املا ہو یا انشا ؛ دونوں لفظ اِسی طرح رہیں گے ۔ جس طرح " اِنشے کی کاپی " نہیں لکھا جائے گا ، اُسی طرح " اِملے کی کاپی " نہیں لکھا جائے گا ۔ " املا کی غلطیاں " ، " املا کی کاپی "

"املا کی درستی"، "املا کی صحت" وغیرہ لکھا جائے گا۔

روپیا، روپے:

"روپیا" اِس لفظ کا تلفظ کئی طرح کیا جاتا ہے، مگر اِس کو لکھا ایک ہی طرح جاتا ہے۔ اِس کا پُرانا املا "روپیہ" ہے۔ جمع کی صورت میں اِس کو "روپیے"، "روپے" اور "رُپے" لکھا جاتا ہے۔

جمع کی صورت میں اِس کا عمومی تلفّظ "روپے" (واو غیر ملفوظ) ہے۔ اور اب اِس کو اِسی طرح لکھنا چاہیے۔ رشک کا شعر ہے:

کب مجھے رکھّے گی مفلس ہمّتِ شاہِ جنوں
دولت اِن داغوں کی، اشرفیاں، روپے ہو جائے گی

"نَے، لَے، قافیے ہیں" (مقدمۂ نفس اللغۃ)

"روپئے پیسے" عام طور پر بولنے میں آتا ہے۔ "روپے" میں واو عموماً غیر ملفوظ رہتا ہے، مگر لکھا جائے گا، اور یہ محض اِس لیے ہے کہ یہ لفظ اپنی اصل "روپا" اور واحد قائم "روپیا" سے بالکل بے تعلق نہ ہونے پائے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اب تک اِس کو واو کے ساتھ ہی لکھا جاتا رہا ہے، اور یہ اِس کی متعارف صورت ہے اور ساتھ ہی اصل سے قریب بھی؛ اِن دو وجوہ کی بنا پر، یہ املا مرجّح ہے۔ "وں" کے ساتھ اِس کو "روپوں" لکھا جائے گا۔

گنتیاں

گیارہ سے اٹھارہ تک کی گنتیوں کے آخر میں ہائے ملفوظ ہے ، اِس لیے اِن کے آخر میں ہمیشہ ہ لکھی جائے گی ۔ بعض علاقوں میں یا کچھ لوگوں کے تلفظ میں اِن کی صورتیں " بارا ، تیرا ،، اور" باراں ، تیراں " بھی پائی جاتی ہیں ، مگر ادبی زبان میں اب اِن اعدادِ معیّن کی صحیح صورت یہ ہے :

گیارہ ، بارہ ، تیرہ ، چودہ ، پندرہ ، سولہ ، سترہ ، اٹھارہ ۔

لہ مکاتیبِ غالب مرتبۂ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے تبصرے میں ، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے ، مقدمۂ کتاب کا ایک جملہ : " سلامی گیارا ضرب توپ کے بجاے ، تیرا ضرب مقرر کی گئی ،، نقل کرکے لکھا ہے :

" گیارا اور تیرا صحیح نہیں ۔ ۱۱ سے ۱۸ تک سب گنتیوں میں ہ اصلی اور ملفوظ ہے ، اِس لیے الف لکھنا درست نہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ بعضے لوگ خاص کر لفظ کے آخر کی ہ کا تلفظ بہت ہلکا سا کر دیتے ہیں ۔ دلّی والوں کو اکثر سنا ہے کہ " گناہ " کو " گنا " بولتے ہیں ۔ بعضے لوگ " باراں " ، " تیراں " وغیرہ

جب یہ گنتیاں (اعدادِ معیّن)، اعدادِ ترتیبی میں تبدیل ہوں گی، تو ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط سے بدل جائے گی۔ یعنی: بارہ، بارھواں، بارھویں۔ البتّہ اٹھارہ عام طور سے ترتیبی صورت میں ھ کے بغیر ہی بولا اور لکھا جاتا ہے۔ قاعدے سے تو اِس کو بھی "بارھواں" کی طرح "اٹھارھواں" ہونا چاہیے تھا، مگر تلفّظ میں ہائے مخلوط ساتھ نہیں دیتی، اور یہ استثنا ہے۔

ایک بات یہ ذہن میں آتی ہے کہ اٹھارہ میں ایک ہائے مخلوط پہلے ہی آچکی ہے، آواز اُس پر ہلکی سی ٹھوکر کھاتی ہے؛ اِس لیے ایک اور ھ تلفّظ کا جُز نہیں بن سکی۔ یہ صورت اِس سلسلے کی آٹھوں گنتیوں میں سے کسی اور میں نہیں پائی جاتی کہ عدد کے دونوں اجزا میں ھ ہو، اِس لیے

بولتے ہیں۔ (ہندستانی۔ جولائی ۱۹۳۶ء)۔ نیز اپنے مقالے اردو املا میں لکھا ہے:
"گنتی کے لفظوں میں (گیارہ سے اٹھارہ تک) اخیر کا حرف ہ ہے۔ بعضے لوگ اِن کے آخر میں "اں" لکھ دیتے ہیں، اِس لیے کہ بعض خطّوں میں "گیاراں"، "باراں" وغیرہ بولتے ہیں... کبھی کبھی اِس طرح لکھ بھی جاتے ہیں، مگر یہ درست نہیں"۔

لہ پروفیسر عبدالقادر سروری (مرحوم) نے "دکنی زبان" کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں:

"گیارہ سے سولہ تک کے اعداد میں آخری ہ، مختفی ہوکر، غیر ملفوظ ہو جاتی ہے اور ان کی صورت: گیارا، بارا، تیرا، چودا، پندرہ، سولا ہو جاتی ہے"۔

(اردوے معلّیٰ (دہلی) لسانیات نمبر، ص ۹۶)

کربل کتھا کے مخطوطے میں (مخزونہ ذخیرۂ اشپرنگر، ٹیوبن گن، جرمنی۔ اِس کا عکس پیشِ نظر ہے) "گیارہ، بارہ، تیرہ، چودہ، سترہ، اٹھارہ" لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ (اِس نسخے کے کاتب کا احوال معلوم نہیں)۔

اِسے مستثنا صورت کی حیثیت[1] سے ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اب اعدادِ ترتیبی کی صورت یہ ہوئی :

گیارھواں ، گیارھویں ، بارھواں ، بارھویں ، تیرھواں ،

تیرھویں ، چودھواں ، چودھویں[2] ، پندرھواں ، پندرھویں ، سولھواں ،

سولھویں ۔ سترھواں ، سترھویں ۔ اٹھارواں ، اٹھارویں ۔

اعدادِ استغراقی :

اِن کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ عددِ معیّن کے آگے "وں" بڑھا دیتے ہیں، جیسے : چاروں ، پانچوں وغیرہ ۔ صرف "دونوں" مستثنا حیثیت رکھتا ہے۔ اِس قاعدے کی رو سے ، زیرِ بحث اعداد کی صورت بارہوں ، تیرہوں وغیرہ ہونا چاہیے ۔ پُرانے شاعروں نے اِن کو اِس طرح استعمال بھی کیا ہے ، جیسے :

چودہوں علم و سب اعلال وذکا و دانش — فی المثل ہوویں بہم یہ بھی اگر بیسوں ایک

تو بھی حیدر کی ثنا کر نہ سکیں کچھ، گو ہوں — بارہوں بُرج یہ اور آٹھ پہر، بیسوں ایک

---

[1] فیلن کے لغت میں بھی اِس کا یہی املا ملتا ہے (اٹھارواں) ۔ البتہ میر امّن کی کتاب گنجِ خوبی کے مخطوطے میں (جس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ یہ اُنھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ، مخزونہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن) "اٹھارھواں" ملتا ہے ۔

[2] جب کہ دیکھا کہ چھوڑتا ہی نہیں — تب تو ٹھہری کہ بوسے دیں گے دس

گن کے دس لے لے، گیارھواں نہ سہی — مجھے پیسے ، کرے جو اور ہوس

انشا (کلامِ انشا ، ص ۱۰۵)

[3] چودھویں رات کے چاند، اِس پہ نہ ہونا مغرور — کہ تو سویا ہے، بچھا مجھ سے بہت دور، پلنگ

انشا (کلامِ انشا ، ص ۱۲۶)

پنج تن ؛ چودہوں معصوم و حق، انشاء اللہ رکھیں الطاف کی سب تجھ پہ نظر بیسوں ایک
انشا (کلامِ انشا، ص ۱۲۳)

ہیں وہ جو بارہوں بروج، چرخ کو جن سے ہے عروج
حکم میں جن کے ہر زماں آتش و باد و آب و خاک
انشا (کلامِ انشا، ص ۳۰۱)

اے رشکؔ، اُنھی کا بلبلِ بُستانِ مدح ہوں جو بارہوں ہیں گلشنِ خیر البشر کے پھول
رشکؔ (نور)

مگر اب استعمالِ عام میں یہ اعدادِ استغراقی بھی بہ ہاے مخلوط آتے ہیں، بول چال میں بھی اور تحریر میں بھی؛ اِس لیے اب اِن اعداد کو بہ ہاے مخلوط مرجّح قرار دیا جائے گا، اِس طرح:

گیارھوں، بارھوں، تیرھوں، چودھوں، پندرھوں، سولھوں، سترھوں، اٹھاروں۔

اٹھارہ کی مستثنا حیثیت اِس صورت میں بھی برقرار رہے گی۔

فائدہ:

اکثر اعدادِ معیّن کو "وں" کے اضافے سے، اعدادِ استغراقی بنالیا جاتا ہے، جیسے: پانچوں، دسوں، بیسوں، تیسوں، چالیسوں، پچاسوں وغیرہ۔ اِس سلسلے میں اِس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دس، بیس، پچاس، سیکڑا، ہزار، لاکھ، کروڑ، ارب اور کھرب کو "وں" کے اضافے سے، اعدادِ غیر معیّن کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی: دسوں، بیسوں، پچاسوں، سیکڑوں، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں، کھربوں۔ یہ اعدادِ جمع ہیں جو غیر معیّن تعداد کو ظاہر کرتے ہیں۔
اِس طرح دسوں، بیسوں اور پچاسوں؛ یہ تین عدد، اعدادِ استغراقی بھی ہیں

اور اعدادِ جمع بھی ہیں ۔

دسوَں اور بیسوَں کی ایک صورت " دسیوں " اور " بیسیوں " بھی ہے اور اِس صورت میں یہ دونوں عدد ، صرف اعدادِ جمع کے طور پر آتے ہیں ــ جیسے : دسیوں مکان اور بیسیوں سوالات ۔

(۲)

اُنیس سے اڑتالیس تک کی گنتیوں میں ، سَ سے پہلے یَ ہے ۔ بیس ، تیس ، چالیس میں تو لوگ عام طور پر یَ لکھتے ہیں ، مگر اور گنتیوں میں ، خاص کر اکتالیس سے اڑتالیس تک ، کبھی کبھی یَ کو غائب کردیا جاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ تلفّظ میں کبھی کبھی یَ پوری طرح آواز نہیں دیتی ، اُس سے دھوکا ہوجایا کرتا ہے اور " اکتس " ، " اکتالس " ، " بیالس " وغیرہ قلم سے نکل جاتا ہے ۔

لکھنے میں ہمیشہ اِن اعداد میں سَ سے پہلے یَ لکھی جائے گی ۔ جیسے :

اکّیس ، بائیس ، تیئیس ، چوبیس وغیرہ ۔

اکتیس ، بتّیس ، تینتیس ، چونتیس وغیرہ ۔

اکتالیس ، بیالیس ، تینتالیس ، چوالیس وغیرہ ۔

یہ بات واضح کردی جائے کہ یہاں شاعری سے بحث نہیں ۔ شاعری میں لفظوں کو کبھی تخفیف کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا ہے ۔ اِس کا تعلق ضرورتِ شعری سے ہوتا ہے اور وہاں ، اکثر صورتوں میں ، الفاظ کا املا ، استعمال کے مطابق اختیار کیا جاتا ہے ۔ جیسے : مصرع : اک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے ۔ یہاں " اک " کی جگہ " ایک " لکھنا غلط ہوگا ، مگر اِس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ اِس لفظ کو ہر جگہ " اک " لکھا جائے ۔

یا جیسے یہ مصرع: سنہ بیالس میں کہی تھی گاندھی جی نے ایک بات ۔ یہاں "بیالس" ضرورتِ شعری کا کرشمہ ہے، مگر اِس سے یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ ایسے مقامات کے علاوہ، اور مقامات پر بھی اِس کو "بیالس" لکھا جائے ۔

(۳) (الف)

۳۴، ۳۴، ۳۵، ۳۷، ۴۵، ۴۷، ۶۵: اِن سات اعداد کو جب لفظوں میں لکھا جائے گا تو یہ خیال ضرور آئے گا کہ اِن میں نونِ غنّہ ہے یا نہیں؟

لُغات میں صورت یہ ہے کہ نوؔر میں ۳۳، ۳۵، ۳۴ کو مع نوؔن اور بغیرِ نون دونوں طرح لکھا گیا ہے، ترجیح کا ذکر نہیں ۔ اِس کے برخلاف ۴۳، ۳۷، ۴۷، ور ۶۵ کو صرف مع نوؔن لکھا گیا ہے ۔ اور ۴۳، ۳۷، ۴۷ کے ذیل میں یہ صراحت بھی کی گئی ہے کہ اِن میں نوؔن موجود ہے ۔

آصفیہ میں ۳۵، ۳۷، ۴۵، ۴۷، ۶۵ کو صرف مع نوؔن لکھا گیا ہے اور ۳۳ اور ۳۴ کو دونوں طرح لکھا گیا ہے:

"تینتیس یا تیتیس" اور "تیتالیس یا تینتالیس"۔

تلفظ میں عموماً یہ سب مع نوؔن آتے ہیں ۔ لغت نویسوں نے بھی زیادہ اعداد کو مع نوؔن ہی لکھا ہے؛ اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ اِن سب اعداد کو اب صرف مع نونِ غنّہ لکھا جائے، یعنی:

تینتیس، چونتیس، پینتیس، سینتیس، پینتالیس، سینتالیس، پینسٹھ ۔

(ب) سیکڑا اور سیکڑوں میں اصلاً نوؔن شامل نہیں ۔ آصفیہ و نور میں مرجّح صورت نوؔن کے بغیر ہے ۔ صاحبِ نوؔر نے "سیکڑا" لکھ کر یہ صراحت کردی ہے: "دہلی میں کاف سے پہلے سیکڑا اور سیکڑوں میں نوؔن غنّہ کی

آواز نکالتے ہیں "۔ گویا لکھنؤ میں بغیرِ نون ہے۔ آصفیہ میں پہلے "سیکڑا" ہے اور پھر "سینکڑا" لکھ کر لکھا گیا ہے: "دیکھو سیکڑا"۔ عبارت میں ہر جگہ نون کے بغیر ہے۔ اگر کوئی شخص "بارہ" کو "باراں" کہے تو اِس سے لفظ کی ایک اور مستقل صورت نہیں بن جائے گی، یہی حال "سیکڑا" کا ہے۔ جس طرح "باراں، تیراں" لہجے کا کرشمہ ہے، اُسی طرح "سینکڑا" میں نونِ غنہ کی آواز بھی لہجے کی کارفرمائی ہے، اِس سے لفظ کی مستقل صورت اِس طرح نہیں مانی جائے گی۔

سیکڑا، سیکڑوں، سیکڑے؛ اِن سب کو نونِ غنہ کے بغیر لکھا[1] جائے گا۔

(۴)

۶۹ سے ۸۰، تک کی گنتیوں میں سے بعض میں ہائے مخلوط آتی ہے، بعض میں ہائے ملفوظ، اور بعض میں ہ آتی ہی نہیں۔ اِن میں سے بعض اعداد کے لکھنے میں کبھی کبھی غلطی ہو جایا کرتی ہے۔ جیسے: ہائے مخلوط کی جگہ ہائے ملفوظ شامل کرنا، مثلاً "اُنھتّر" کو "انہتّر" اور "اکھتّر" کو "اکہتّر" لکھنا۔ یا اِسی طرح کی کوئی اور غلطی کرنا۔ اِن گنتیوں کی صحیح صورت یہ ہے:

اُنھتّر، ستّر، اکھتّر، بہتّر، تہتّر، چوہتّر، پچھتّر، چھہتّر، ستتّر
اٹھتّر۔

---

[1] مولانا احسن مارہروی نے لکھا ہے:

"سینکڑوں، جھونٹ، سونچ میں نون نہیں چاہیے"۔

(رسالہ فصیح الملک، اگست ۱۹۰۵ء۔ بہ حوالہ علمی نقوش، ص ۲۱۸)

وضاحت :

(الف) "ستتر" اور "ستتر" میں ، اِن کے ساتھ کے اور اعداد کے برخلاف ہ کہیں پر نہیں آتی ۔ لُغات میں اِن کو اِسی طرح لکھا گیا ہے (نور ، آصفیہ) تلفظ میں بھی ہ کی آواز سُننے میں نہیں آتی ۔

(ب) چھیتر کو نور و آصفیہ میں "چھہتر" لکھا گیا ہے ۔ اِس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ " چھے " کا املا "چھہ" یا "چھ" قرار دیا گیا تھا ۔ ظاہر ہے کہ "چھہ" سے "چھہوں" اور "چھہتر" بننا چاہیے ۔ مگر جیسا کہ لفظ "چھے" میں بہ تفصیل مذکور ہوگا ؛ اِس لفظ کا مرجّح املا "چھے" ہے اور اِس لحاظ سے "چھیوں" اور "چھیتر" صحیح املا مانا جائے گا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ چھیالیس چھیاسٹھ ، چھیاسی ، چھیانوے ؛ سب میں "چھ" کے بعد یؔ ہے ، اور یہ بڑی دلیل ہے "چھیتر" کے صحیح ہونے کی ۔ ہاں ، یہ کہ دیا جائے کہ چھیالیس، چھیاسٹھ ، چھیتر ، چھیاسی ، چھیانوے ؛ اِن سب اعداد میں یؔ کی حیثیت ، تلفّظ کے لحاظ سے ، یاے مخلوط کی سی ہے ۔

(۵)

مندرجۂ ذیل گنتیوں کے آخر میں ایسے حرف آتے ہیں ، جن کا آخری جُز ہاے مخلوط ہے :

آٹھ ، اُنسٹھ ، ساٹھ ، اکسٹھ ، باسٹھ ، تریسٹھ ، چونسٹھ ، پینسٹھ ، چھیاسٹھ ، سرسٹھ ، اڑسٹھ ۔

اِن میں سے ایک عدد میں ذرا سا اختلاف ہے ۔ نور میں چھیاسٹھ کی جگہ "چھَسٹھ" کو مرجّح بتایا گیا ہے : "چھسٹھ ہندی میں : چھیاسٹھ" ممکن ہے کبھی یا اب بھی بعض لوگ اِس طرح بولتے ہوں ، مگر عام طور پر

اردو میں اِس لفظ کی وہی صورت رائج ہے جس کو ہندی سے مخصوص بتایا گیا ہے۔
آصفیہ میں اِس کو "چھیاسٹھ" لکھا گیا ہے؛ یہی مروّج بھی ہے، اور اِسی کو اختیار کیا جائے گا۔

(۶)

اعدادِ ترتیبی :

"پہلا" اور "دوسرا" سے لے کر "اٹھتّرواں" اور "اٹھتّرویں" تک اعدادِ ترتیبی کے لکھنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی، اِس طرح :

گیارھواں ، گیارھویں   بیسواں ، بیسویں
اکّیسواں ، اکّیسویں   تیسواں ، تیسویں
اکتیسواں ، اکتیسویں   چالیسواں ، چالیسویں
اکتالیسواں ، اکتالیسویں   پچاسواں ، پچاسویں
اکّیاونواں ، اکّیاونویں   ساٹھواں ، ساٹھویں
اکسٹھواں ، اکسٹھویں   ستّرواں ، ستّرویں
اکھتّرواں ، اکھتّرویں   اٹھتّرواں ، اٹھتّرویں

البتّہ ۷۹ سے ۹۹ تک کچھ اُلجھن محسوس ہوسکتی ہے۔ یہ اُلجھن محض اِس لیے محسوس ہوتی ہے کہ ۷۹ سے لے کر ۹۹ تک کے اعداد، اعدادِ ترتیبی کی صورت میں عموماً استعمال میں نہیں آتے رہے ہیں، اِس بنا پر نامانوس پن کا احساس ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں طریقہ یہ رہے گا کہ ۷۹ سے ۸۹ تک کے اعداد میں "واں" اور "ویں" کو منفصل لکھا جائے گا اور یہ اِس لیے ہے کہ (اور اعدادِ ترتیبی کی طرح) اِن کو ملا کر لکھنے میں، عددی وضاحت ذرا کم ہو جاتی ہے اور پہلی نظر

میں کچھ اُلجھن بھی ہو سکتی ہے اور بعض مواقع پر کسی طرح کا التباس بھی ہو سکتا ہے ۔ اِن اعداد کی صورت یہ ہوگی ۔

اُناسی واں ، اُناسی ویں ۔ اسّی واں ، اسّی ویں ۔ اکیاسی واں ،
اکیاسی ویں ۔ بیاسی واں ، بیاسی ویں ۔ تراسی واں ، تراسی ویں ،
چوراسی واں ، چوراسی ویں ۔ پچاسی واں ، پچاسی ویں ۔ چھیاسی واں ،
چھیاسی ویں ۔ ستاسی واں ، ستاسی ویں ۔ اٹھاسی واں ، اٹھاسی ویں ۔
نواسی واں ، نواسی ویں ۔

یہ خیال رہے کہ اِن سب اعداد میں اعدادِ متعین کی ”ی“ تلفظ میں بہت خفیف ہو کر آتی ہے ۔ یعنی ” اکیاسی واں “ کا تلفظ ” اکیاسواں “ کی طرح ہوتا ہے ؛ مگر اِس ”ی“ کو لکھا ضرور جائے گا ، اور یہ دفعِ التباس کے لیے ہوگا ۔ جیسے ”پچاسی واں“ کو اگر ” پچاسواں “ لکھا جائے اور تشدید لکھنے میں رہ جائے (تشدید کا التزام یوں بھی بہت کم ہے ، اِس لیے تشدید کے چھوٹ جانے کا خاصا امکان ہے) ، تو اِس کو ” پچاسواں “ (۵۰ واں) بھی سمجھا جا سکتا ہے ۔

” نوّے “ کا عدد ، عددِ ترتیبی کی صورت میں کہیں میری نظر سے نہیں گزرا ۔ بہ ہر صورت ، کتابت میں اِس کی صورت ” نوّے واں “ اور ” نوّے ویں “ ہوگی ۔ مناسب یہ ہوگا کہ اِس عدد کے سلسلے میں ، متعارف طریقے کے بجاے ، یہ طریقہ اختیار کیا جائے کہ عدد کو ہندسے کی صورت میں لکھ کر ، ” واں “ اور ” ویں “ کو اُس کے ساتھ لکھا جائے ، یعنی : ” ۹۰ واں “ اور ” ۹۰ ویں “ ، کیوں کہ ” نوّے واں “ اور ” نوّے ویں “ غیر مانوس صورت ہے ۔ اِسی طرح ۷۹ سے ۸۹ تک کی گنتیوں کو بھی اِسی طرح لکھنا مناسب ہوگا ، یعنی : ۷۹ واں ، ۸۰ واں ، ۸۱ واں ، ۸۲ واں وغیرہ ۔

۹۱ سے ۱۰۰ تک کے اعداد کو اِس طرح لکھا جائے گا :

اکیانواں ، اکیانویں ۔ بانواں ، بانویں ۔ ترانواں ، ترانویں ۔ چورانواں، چورانویں ۔ پچانواں ، پچانویں ۔ چھیانواں ، چھیانویں ۔ ستانواں، ستانویں ۔ اٹھانواں ، اٹھانویں ۔ ننانواں، ننانویں۔ سوواں، سوویں۔

اِس کے بعد ، ۱۰۱ ، ۱۰۲ ، ۱۰۳ ، ۱۰۴ ؛ اِن چاروں اعداد کو اِسی طرح لکھا جائے گا :

ایک سو ایک واں ۔ ایک سو دو واں ۔ ایک سو تین واں ۔ ایک سو چار واں۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ اِن چاروں اعداد ، یعنی ایک، دو، تین، چار کی ترتیبی صورت : "پہلا ، دوسرا ، تیسرا ، چوتھا " ہے ، مگر " ایک سو پہلا" یا " ایک سو دوسرا " یا " ایک سو تیسرا" لکھنا ، کچھ مناسب نہیں نظر آتا ۔ اِس کو یوں دیکھیے کہ اگر انگریزی کے طریقے کے مطابق "۱۰۱ واں ،، یا " ۱۰۳ واں" لکھا جائے تو پڑھنے والا اِس کو " ایک سو پہلا " اور " ایک سو تیسرا " کبھی نہیں پڑھے گا ، " ایک سو ایک واں " اور " ایک سو تین واں " ہی اُس کی زبان سے نکلے گا ۔

زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ سَو کے بعد اعدادِ ترتیبی کو اِس طرح لکھا جائے کہ ہندسے کے ساتھ " واں " یا " ویں " بڑھا دیا جائے ۔ جیسے : ۱۰۱ واں ، ۱۰۲ ویں ، ۱۰۵ واں ، ۲۰۴ واں ، ۳۱۵ واں وغیرہ ۔ یہ آسان بھی ہے اور سادہ بھی، اور مختصر نویسی کا فائدہ بھی ضمنی طور پر حاصل رہے گا ۔

(۷)

بعض گنتیوں کا جو املا بعض لُغات میں لکھا ہوا ہے ، اب وہ عموماً اُس طرح مستعمل نہیں ۔ نفس اللغۃ اور امیر اللغات میں ۵۱ ، ۸۱ ، ۹۱ کو

" اکاون "، " اکاسی "، " اکانوے " لکھا گیا ہے، اِس فرق کے ساتھ کہ نفس میں " اکّاون " اور " اکّاسی " ہے اور امیر اللغات میں " اکاون " اور " اکّاسی "۔ آصفیہ و نور دونوں میں مجھے یہ گنتیاں " الف مع کاف " کی فصل میں نہیں ملیں، البتہ ۸۲، ۸۶، ۹۶ کو اِن دونوں لغات میں یؔ کے ساتھ لکھا گیا ہے، یعنی: بیاسی، چھیاسی، چھیانوے۔ زیرِ بحث اعداد (۵۱، ۸۱، ۹۱) ایک زمانے میں کس طرح مستعمل تھے، اِس سے بحث نہیں۔ اب اِن اعداد کو، بیاسی، چھیاسی، چھیانوے کی طرح، اکثر لوگ بہ اضافۂ یؔا استعمال کرتے ہیں۔ تلفّظ میں یؔ کی آواز کبھی زیادہ کبھی کم نمایاں ہوتی ہے؛ اِس لیے اب اِن اعداد کا املا مع یؔ مرجّح مانا جائے گا، یعنی اکّیاون۔ اکّیاسی۔ اکّیانوے ـــــ فیلن کے لُغت میں بھی اِن تینوں اعداد کو اِسی طرح یعنی مع یؔ لکھا گیا ہے۔ میر امّن کی کتاب گنجِ خوبی میں " اٹھتیسواں " آیا ہے۔ (دیکھیے مقدّمۂ گنجِ خوبی، شائع کردۂ شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی) یہ بھی پُرانی صورت ہے، اب " اڑتیس " اور " اڑتیسواں " ہی مستعمل ہے۔

(۸)

اُناسی (یا اُنّاسی)، استی، اکّیاسی، بیاسی، تراسی، چوراسی، پچّاسی، چھیاسی، ستّاسی، اٹھّاسی، نواسی، نوّے، اکّیانوے، بانوے، ترانوے، چورانوے، پچّانوے، چھیانوے، ستّانوے، اٹھّانوے، ننّانوے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مندرجۂ بالا اعداد میں سے بعض ایسی گنتیاں، جن میں یؔ شامل نہیں، اُن کو خواہ مخواہ بہ اضافۂ یؔا لکھ دیا جاتا ہے، جیسے: " پچیاسی، پچیانوے، ننیانوے "۔ اِن سب کا صحیح املا وہی ہے جو اوپر لکھا

گیا ہے۔

(۹)

چھٹے: اِس لفظ کا املا ایک زمانے میں "چھہ" تھا، مگر اِس کو اکثر لوگ "چھ" لکھا کرتے تھے اور یہ لکھاوٹ اب بھی دیکھنے میں آتی رہتی ہے؛ جب کہ "چھ" کوئی لفظ ہی نہیں ہوا۔ اِس کے ساتھ جب تک کوئی اور حرف شامل نہ کیا جائے، اُس وقت تک یہ کسی حرکت کو قبول کر ہی نہیں سکتا۔ جیسے: پوچھ ایک لفظ ہے، اِس کا جزوِ آخر "چھ" ہے، جزوِ لفظ کی حیثیت سے تو یہ آ سکتا ہے، ایک لفظ کی حیثیت سے کیسے آ سکتا ہے؟

جلالؔ نے سرمایہ میں لکھا ہے:

"چھہ، جیمِ فارسی مخلوط الہا اور ہاے ہوّزِ مظہرہ کے ساتھ۔ عددِ معروف۔ ف: شش۔ ع: ستّۃ۔ اور کبھی اِس لفظ کو بجاے ہاے مظہرہ، ہاے مختفیہ کے ساتھ بھی بول جاتے ہیں، اور یہی فصیح ہے، یعنی ہاے مظہرہ کی جگہ، ہاے مختفیہ سے بولنا"۔

جلالؔ نے جو اِس کو آغازِ عبارت میں "ہاے ہوّزِ مظہرہ" کے ساتھ لکھا ہے، (یعنی: چھِہ)، تو اِس لفظ کا یہ تلفّظ کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ اُن کے حریف شوقؔ نیموی نے اپنی کتاب یادگارِ وطن میں بجا طور پر اِس پر اعتراض کیا ہے (ص ۸۰)۔

مشکل یہ ہے کہ نوراللغات و آصفیہ دونوں میں اِس لفظ کا املا "چھ" ملتا ہے، اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے؛ "چھ" کوئی لفظ ہی نہیں ہو سکتا۔ اصل میں دونوں مؤلفین کا مقصود "چھہ" ہوگا۔ مگر یہ غلط املا اچھا خاصا پھیل گیا ہے اور بغیر سوچے سمجھے اِس کی نقل ہو جاتی ہے۔

نور میں لکھا ہے :

"چھ ، ہاے مظہرہ کی جگہ ہاے مختفیہ سے بولنا فصیح ہے ۔ دہلی میں تلفظ: چھے"۔

یہ دراصل جلالؔ کی عبارت کی نقل ہے ۔ اِس کے علاوہ مولّف نے یہ جو لکھا ہے کہ "دہلی میں تلفظ چھے" ہے ، یہ صحیح نہیں ۔ آصفیہ میں "چھے" کے صرف یہ معنی لکھے گئے ہیں :

"چھے ، اسم مونث ، (ہندو) بربادی ، نقصان ، شکست ۔ جیسے : رام کی جَے ، راون کی چھے"۔

عددِ زیرِ بحث کے معنی میں اُس میں بھی اِس لفظ کا وہی غلط املا ملتا ہے جو نور میں ہے ، یعنی : "چھ"۔

اِس بحث سے قطعِ نظر کرکے ، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب اِس لفظ کو چِھ ، یا چَھ ، یا چِھہ ، یا چھہ ، شاید ہی کوئی بولتا ہو ۔ اب اِس لفظ کا تلفّظ کچھ اِس طرح کیا جاتا ہے کہ حرفِ اوّل میں بوے کسرہ شامل ہوتی ہے ، بل کہ اُس کی طرف جھکاو زیادہ ہوتا ہے ؛ اِس لحاظ سے بھی ، اور یوں بھی کہ "چھہ" میں ہاے مختفی کا کیا دخل ؛ اِس کو یا تو "چھا" لکھا جائے گا یا "چھہ" ، اور یہ دونوں صورتیں مستعمل نہیں ؛ اِس کے بجاے اب اِس کو "چھے" کی طرح بولا جاتا ہے اور اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدّیقی مرحوم نے لکھا تھا :

"پانچ کے بعد کے عدد کو لوگ عام طور پر "چھ" مختفی ہ کے ساتھ لکھتے ہیں ، حالاں کہ اِس لفظ کا فصیح تلفّظ "چھے" ہے ۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ اِس طرح نہ لکھا جائے"۔ (ہندستانی)

مختصر یہ کہ اِس لفظ کا املا "چھے" مانا جائے گا ۔ اور "دونوں" ، "تینوں"

کے ساتھ "چھیوں" لکھا جائے گا۔ یہاں پر "ی"، یائے مخلوط کی حیثیت سے تلفظ میں آئے گی۔ اِس کو "چھہوں" نہیں لکھا جا سکتا۔ "چھہوں" اُس صورت میں ہو سکتا تھا جب کہ اصل لفظ کو "چھہ" (آخر میں ہائے ملفوظ) مانا جاتا، اور ایسا نہیں ہے؛ اِس لیے "چھے" اور "چھیوں" لکھے جائیں گے اور اِسی وجہ سے "چھیاسٹھ" اور "چھیتر" دونوں میں "ی" لکھی جائے گی۔

(۱۰)

دونوں: ڈاکٹر صدّیقی مرحوم نے لکھا ہے:

"بعض لوگ "دونوں" کو "دونو" بغیر نونِ غنّہ (ں) کے لکھتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ صحیح ہے: دونوں۔ جیسے: "تینوں"، "چاروں"، "پانچوں"، "چھیوں"، "ساتوں" وغیرہ۔" (ہندستانی)

بہت سے پُرانے مخطوطات میں یہ لفظ نونِ غنّہ کے بغیر ملتا ہے۔ اُس زمانے میں اور بھی متعدّد الفاظ کو، جن میں نونِ غنّہ ہے، نونِ غنّہ کے بغیر لکھا جاتا تھا، جیسے: "ماں" کی جگہ "ما"۔ اور "میں نے" کی جگہ "مینے"۔ اِسی طرح "دونوں" کی جگہ "دونو" لکھا جاتا تھا۔ یہ اِس لفظ کا پُرانا اور متروک املا ہے۔ اب لازماً "دونوں" لکھا جائے گا۔

(۱۱)

چھماہی: یہ لفظ عام طور پر تلفظ اور تحریر میں اِسی طرح، یعنی درمیانی "ی" کے بغیر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ "چھماہی" کا تعلق مُردوں سے بھی ہوتا ہے اور اِس معنی میں یہ خاص لفظ ہے۔ غالبؔ کے اِن شعروں میں یہ لفظ اِنھی معنی میں آیا ہے:

رسم ہے مُردے کی چھما ہی ایک   خلق کا ہے اِسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قیدِ حیات   اور چھما ہی ہو سال میں دو بار

بسے "چھما ہی" کے وہی معنی ہیں جو "شش ماہی" کے ہوتے ہیں۔ یہ لفظ "ہی" کی طرح کا ہے۔ اِس لفظ کو اِسی طرح، یعنی "چھما ہی" لکھا جائے گا۔

لفظوں کو ملا کر لکھنا

انجمن ترقیِ اردو نے اصلاحاتِ املا کے تحت جو تجویزیں منظور کی تھیں ؛ اُن میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے۔ تجویزؔ یہ تھی :

"مرکّب لفظ جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں ، آپس میں ملا کر نہ لکھے جاویں ، بل کہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جائیں ۔ البتہ اُن کے درمیان فاصلہ صرف اُتنا ہو ، جتنا ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں ، جیسا کہ اِن مثالوں سے واضح ہوگا ، جیسے : آج کل ، بن مانس ،

لہ مولانا احسن مارہروی نے رسالۂ فصیح الملک میں لکھا تھا :

"جو الفاظ الگ الگ لکھے جانے میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے اور جن کی ترکیب بھی جداگانہ ہے ، اکثر جدا جدا لکھے جائیں ، جیسے : آئیں گے، ہوں گے ، جس کی ، آپس میں ، غرض کہ ، بل کہ ، کیوں کہ ، علاحدہ ، حال آں کہ ، چناں چہ ، چوں کہ ، کون سی ، اِس واسطے کہ ، دل چسپ ، دل کش ، ہم سر ، کم یاب ، دست یاب ، خوب صورت وغیرہ"۔ (بہ حوالۂ علمی نقوش ، ص ۱۴۱)

پن ڈبی، کل جگ، کل منہا، کل دار، شاہ نامہ، شاہ جہاں آباد،
شاہ جہاں پور، جے پور، اودے پور، فرخ نگر، ناگ پور، کان پور۔
دل لگی، گل کاری، پھل کاری۔

بعض مفرد لفظ دو طرح لکھے جاتے ہیں: بی بی اور بیبی، دُل دُل اور دلدل؛
اِن کی منفصل لکھاوٹ اختیار کی جائے، اِس طرح: کھل بلی، جُھٹ پٹا،
جُھن جُھنا، گُن گُنا، ہل چل، گُل گُلا، رس گُلّا، لس لسا، کھٹ کھٹانا،
کھٹ کھٹاہٹ، کھن کھنانا، کھن کھناہٹ، دانتا کل کل، جھن جھٹ۔
"فارسی لفظ بہ، نہ، چہ، کہ، بے وغیرہ جو خود فارسی میں بھی کبھی دوسرے
لفظ سے ملاکر اور کبھی الگ لکھے جاتے ہیں؛ اردو عبارت میں الگ
لکھے جائیں۔ جیسے:

بہ خوبی، بہ ہر حال، بہ کمالِ شفقت، بہ دولت، نہ خورد، نہ گفت،
چہ کنم، چہ می گوئی، چہ می گوئیاں، حال آں کہ، بل کہ، چوں کہ، چناں چہ،
غرض کہ، تا وقتے کہ، بہ شرطے کہ، بے شک، بے تحاشا، بے محابا وغیرہ"۔

(روداد کمیٹی اصلاحِ رسمِ خط۔ اردو، جنوری ۱۹۴۴ء)

فارسی میں شروع سے اِس طرف رجحان رہا ہے کہ مرکبات کو ملاکر لکھا جائے۔
اور اب تو یہ، املاے فارسی کے مسلمہ قواعد میں سے ہے۔ وہاں "دانش کدہ"
لکھنا ٹھیک نہیں۔ اِس طرح لکھ دیا جائے تو بہ قولِ ڈاکٹر صدیقی مرحوم: "پانچ
میں سے پورے پانچ نمبر کاٹ لیے جائیں گے"۔ فارسی کی تقلید میں، اردو
میں بھی لفظوں کو ملاکر لکھنا، وباے عام کی طرح پھیل گیا۔ بل کہ ہمارے
زمانے کے بعض حضرات تو اِس قدر غلو کرتے ہیں کہ "چلیگا"، "لکھینگے" اور
"اٹھینگے" لکھنا ضروری سمجھتے ہیں

اردو میں شوشے، جوڑ، نقطے، حرفوں کے مختلف الصّورت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، حروفِ متشابہ؛ یہ سب کچھ اِس قدر اور اِس طرح ہے کہ اِن سب کے ساتھ لفظوں کو ملا کر لکھنا، نگاہ کو مزید آزمایش میں مبتلا کرنا اور طالب علم کو حیران کرنا ہے۔ لکھنے اور پڑھنے کی آسانی اِس میں ہے کہ لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے، بل کہ جو مرکّبات اب مفرد لفظوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور اُن کو آسانی کے ساتھ ٹکڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے؛ اُن کو بھی الگ الگ لکھا جائے۔ جیسے: جھن جھٹ اور مُجھن مُجھن، دُل دُل اور بی بی۔ اِس سے لکھنے میں سادگی اور پڑھنے میں آسانی پیدا ہوگی، اور اِن دونوں کی اہمیّت اور ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ زبان صرف اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں ہی کے لیے نہیں ہوتی، وہ طالب علموں اور کم خواندہ لوگوں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی "نیکبخت" کے پڑھنے میں کوئی اُلجھن محسوس نہیں کرے گا، مگر ابتدائی درجوں کے طلبہ اور معمولی سطح کے آدمیوں کو، اِس کے لکھنے اور پڑھنے میں، اُلجھن سے آنکھیں چار کرنا پڑیں گی۔

انگریزی یا دوسری یورپی زبانوں کے ایسے طویل یا نسبتاً طویل لفظوں کو، جو کسی خرابی کے بغیر، ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں؛ اگر ٹکڑوں میں لکھا جائے، تو املا کی صحت، تلفّظ کی صحت، اور لکھنے کی آسانی؛ یہ تینوں چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں۔ جیسے: گِل کرسٹ، یونی ورسٹی، کان فرنس، پارلی منٹ، کانس ٹی ٹیوشن۔

مختصر نویسی، اردو تحریر کا امتیازی وصف ہے، مگر اِس کو ایک حد کے اندر رہنا چاہیے۔ اگر اِس سے تلفّظ اور کتابت، دونوں کو اُلجھن ہوتی ہو،

تو اِس سے فائدہ ؟ اور اگر اِس طرح نہ لکھنے سے دونوں آسانیاں ہاتھ آتی ہوں اور لفظ پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو، تو کیا بُرائی ہے ۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ایسے حرف بھی تو ہیں جو اپنے بعد آنے والے حرف سے ملا کر لکھے ہی نہیں جا سکتے ؛ جب یہ حرف بیچ میں آ جاتے ہیں تو لفظ خود بہ خود ٹوٹ جاتا ہے اور دو یا زیادہ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے ، جیسے : فرفرا اور پڑھاؤں گا ۔ جو لوگ " لکھینگے " لکھنے پر اصرار کرتے ہیں ، وہ " پڑھاؤں گا " کو کس طرح لکھیں گے ؟ اور " پڑھ رہا ہوں " کو کیا " پڑھرہاہوں " لکھنا پسند کریں گے ؟ اور کیا " کمقسمت " لکھنا گوارا کریں گے ؟

مختصر یہ کہ (الف) دو لفظوں کو ملا کر نہیں لکھا جائے گا ، خواہ وہ اسم ہوں ، جیسے خوب صورت ، کہ اِس کو " خوبصورت " نہیں لکھا جائے گا ۔ اور خواہ فعل ہوں ، جیسے : جائے گا ، چل گیا ، لکھیں گے ۔ اگر " جائیگا " یا " لکھینگے " لکھا جائے گا تو اِس کو قابلِ اعتراض سمجھا جائے گا ۔ ہر صورت میں ، افعال کے ساتھ اُن کے ایسے لاحقوں کو الگ لکھا جائے گا ۔

(ب) اسموں کے ساتھ جو سابقے آتے ہیں ، اُن کو بھی عموماً الگ لکھا جائے گا ۔ جیسے : بہ خوبی ، اَن پڑھ ، بے ڈھنگا ، بے دخلی ۔

(ج) کہ ، چہ وغیرہ کو بھی الگ لکھا جائے گا ، جیسے : کیوں کہ ، بل کہ ، چناں چہ ۔

(د) جو مفرد لفظ آسانی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکتے ہیں ، اُن کو علاحدہ علاحدہ لکھا جائے گا ، جیسے : بی بی ، دل دل ، کھل بلی ۔

(ہ) انگریزی کے لفظوں کو جہاں تک ممکن ہوگا ، اِس طرح لکھا جائے گا کہ زیادہ سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو سکیں ۔

اردو میں مرکبات کی تعداد بہت ہے ۔ اِس کے علاوہ ، سابقوں اور لاحقوں

سے مرکّب ہونے والے الفاظ کی بھی بڑی تعداد ہے ۔ ذیل میں ، مثال کے طور پر ، ایسے لفظوں کی (نا تمام) فہرست پیش کی جاتی ہے جن کو الگ الگ لکھنا چاہیے ۔ اِس فہرست کے اصل مخاطب طلبہ ہیں ؛ اِسی بنا پر ، اِس بات کا لحاظ رکھّا گیا ہے کہ مختلف قسم کے مرکّبات کی اِتنی مثالیں ضرور جمع کر دی جائیں کہ وضاحت کا حق ادا ہو جائے ۔ اِس فہرست کو اِسی نظر سے دیکھنا چاہیے :

(۱)

بے اثر ، بے باق ، بے باک ، بے باکی ، بے بدل ، بے بس ، بے بسی ، بے بصر ، بے بہرہ ۔

بے تاب ، بے تابی ، بے تامّل ، بے ترتیب ، بے تکا ، بے تکان ، بے تکلّف ، بے تمیز ، بے توفیق ، بے ٹھکانا ، بے ثمر ، بے ثبات ، بے جان ، بے جِلد ، بے جرم ، بے جوڑ ، بے چون ، بے چارہ ، بے چارگی ، بے حجاب ، بے حجابی ، بے حد ، بے حساب ، بے حرمت ، بے حرمتی ، بے حس ، بے حسی ، بے حقیقت ، بے حمیّت ، بے حواس ، بے حیا ، بے حیائی ، بے خبر ، بے خبری ، بے خرد ، بے خواب ، بے خوابی ، بے خود ، بے خودی ۔

بے داغ ، بے دلیل ، بے دام ، بے دخل ، بے دخلی ، بے درد ، بے دردی ، بے دریغ ، بے درنگ ، بے دست و پا ، بے دل[1] ، بے دم[2] ، بے دماغ ، بے دماغی ،

---

[1][2] جب یہ لفظ (یا اِس طرح کے اور لفظ) تخلّص کے طور پر آئیں گے ، تو متّصل لکھے جائیں گے ۔ جیسے ع : طرزِ بیدؔل میں ریختہ کہنا ۔ ویسے منفصل لکھے جائیں گے ، جیسے ع : ہم ہیں بے دل ، دل اپنے پاس نہیں ۔ بیخود ، بیتاب ، بیکل ، بینوا ، بیخبر ، بیصبر ، جیسے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۶ پر)

بے دید۔ بے ڈول ، بے ڈھب ، بے ڈھنگا۔

بے راہ ، بے راہ روی ، بے رحم ، بے رحمی ، بے رخی ، بے رنگ ، بے رنگی ، بے ریا ، بے ریائی ۔ بے زبان ، بے زبانی ۔

بے سامان ، بے سامانی ، بے سروساماں ، بے سکون ، بے سدھ ، بے سُرا ، بے سواد ، بے سود ۔ بے شائبہ ، بے شرم ، بے شرمی ، بے شعور ، بے شبہہ ، بے شمار ۔

بے صبر ، بے صبری ، بے ضابطہ ، بے طاقت ، بے طاقتی ، بے طرح ، بے طلب ، بے طَور ، بے عمل ، بے علم ، بے غرض ، بے غرضی ، بے عزّت ، بے عزّتی ، بے عقل ، بے عقلی ، بے عنوانی ، بے عیب ، بے غم ، بے غمی ، بے غیرت ، بے غیرتی ۔ بے فائدہ ، بے فکرا ، بے فیض ۔ بے قابو ، بے قاعدہ ، بے قرار ، بے قراری ، بے قرینہ ، بے قصور ۔

بے کم و کاست ، بے کراں ، بے کرانی ، بے کس ، بے کسی ، بے تاج و تخت ، بے کمال ، بے گمان ، بے گنتی ، بے گھرا ، بے لاگ ، بے لگام ، بے لوث ، بے مایہ ، بے مائگی ، بے مثل ، بے محابا ، بے محل ، بے مروّت ، بے مروّتی ، بے مزہ ، بے مصرف ، بے معنی ، بے منّت ، بے موت ، بے موسم ، بے موقع ، بے مہار ، بے نام ، بے نوا ، بے نوائی ، بے نہایت ، بے نقط ، بے نیاز ، بے نظیر ، بے نمک ۔

بے وجہ ، بے وقت ، بے وقعت ، بے وقوف ، بے وقوفی ، بے وفا ، بے وفائی ، بے ہُنر ، بے ہنگم ، بے ہنری ، بے ہنگام ، بے ہوش ، بے ہوشی ۔

الفاظ بہ طورِ تخلّص جب بھی آئیں گے تو اُن کو ، مفرد لفظ کے طور پر ، ہمیشہ متّصل لکھا جائے گا ۔

(۲)

بہ نظرِ اصلاح ، بہ ارادۂ شاگردی ، بہ دستور ، بہ جہت ، بہ سبب ،
بہ شرطے کہ ، بہ حُسن و خوبی ، بہ ہر صورت ، بہ ہر حال ، بہ خدا ، بہ موجب ،
بہ راہِ کرم ، بہ ہمہ وجوہ ، بہ دل ، بہ یک کرشمہ ، بہ خیر و عافیت ،
بہ سرو چشم ، بہ آسانی ، بہ افراط ، بہ حکم ، بہ خوبی ، بہ درجہا ،
بہ دل و جان ، بہ ذاتِ خود ، بہ صد ادب ، بہ قدرِ ضرورت ،
بہ قیدِ حیات ، بہ طرزِ میرؔ ، بہ رنگِ غالبؔ ، بہ طورِ خود ، بہ مراتب ،
بہ مشکل ، بہ غور ، بہ ہزار دقت ، بہ نفسِ نفیس ، بہ دقّت ،
بہ دشواری ، بہ کوششِ بسیار ، بہ قیمت ، بہ عافیت ، بہ اعزازِ تمام ،
بہ ناز و نعمت ، بہ اندازِ خاص ، بہ کارِ خاص ، بہ کارِ خویش ، بہ سواریِ ریل ،
بہ قولِ خود ، بہ خطِ غالبؔ ۔

"بہ" خواہ کسی معنی میں آئے ، اِس کو عموماً علاحدہ لکھا جائے گا ۔ البتہ چند لفظ ایسے ہیں ، جو مفرد لفظ کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ، اُن کو اِس قاعدے سے مستثنا سمجھا جائے گا ۔ جیسے : بہم ، بغیر ، بعینہٖ ، بفضلہٖ ، بجز ، بجائے ؛ یہ لفظ مستثنا الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ شاید دو چار اور ایسے لفظ ہوں ۔ بس اِس سے زیادہ نہیں ۔

(۳)

دو لفظوں کے درمیان میں بھی یہ حرف آتا ہے ، اور اِس صورت میں بھی اِس کو علاحدہ لکھا جائے گا ۔ جیسے :

دم بہ دم ، دم بہ خود ، روز بہ روز ، دن بہ دن ، ماہ بہ ماہ ، سال بہ سال ، جاں بہ لب ، سر بہ سجدہ ، زر بہ کف ، خنجر بہ دست ، نام بہ نام ، منزل بہ منزل ، جا بہ جا ، سر بہ فلک ، تن بہ تقدیر ، سر بہ کف ،

رو بہ راہ ، رنگ بہ رنگ ، نو بہ نو ، دست بہ دست ، لب بہ لب ، خم بہ خم ، لمحہ بہ لمحہ ، لحظہ بہ لحظہ ، قدم بہ قدم ، سر بہ زانو ، سر بہ کف ، صدا بہ صحرا ، سر بہ فلک ، پا بہ رکاب ، کو بہ کو ، شہر بہ شہر ، ملک بہ ملک ، یم بہ یم ، صحرا بہ صحرا ، پا بہ گِل ، پا بہ زنجیر ، حرف بہ حرف ، لفظ بہ لفظ ، ٹکٹ بہ دست ، رو بہ قبلہ ۔

نہ کہو ، نہ کرتے ، نہ جاتے ، نہ پوچھو ، نہ پوچھ ، نہ ہوا ، نہ دیکھا ، نہ گیا۔
دیکھیں گے ، آئے گا ، جائے گا ، لکھیں گے ، پوچھ لیا ، رکھ لیا ، پائے گا ، پائیں گے ، پڑھ لیا ، پڑھ لو ، پڑھیں گے ، پڑھے گا ، کہہ دیا ، کہہ رہا ہے ، کہے گا ، کہیں گے ، چڑھ گیا ، چڑھ جا ، چڑھ رہا ہے ، پڑھ رہا ہے ، پڑھ لیا ہے ، آئے گا ، آئیں گے ، دیکھ لیا ، دیکھ رہا ہے ، دیکھیں گے ، دیکھے گا ۔
ان کو ، اُس کو ، مجھ کو ، تجھ کو ، سب کو ، تم کو ، ہم کو — اس کا ، ان کا ، اس کے ، اُن کے ، سب کے — اُس نے ، سب نے ، میں نے ، کس نے ، تم نے ، ہم نے ، اُنھوں نے ، جس نے ، کس نے ، کسی نے ، — اس سے ، سب سے ، مجھ سے ، ہم سے ، تم سے ، اُن سے ۔
اس میں ، مجھ میں ، تجھ میں ، سب میں — اُس پر ، مجھ پر ، تم پر ، تجھ پر ، ہم پر — جس کا ، جس کو ، جس سے ، جس وقت ، جن کا ، جن کو ، جن سے — جب تک ، اب تک ، کب تک ، مجھ تک ۔
اسموں کے ساتھ جو سابقے آتے ہیں ، اُن میں سے اکثر کو علاحدہ لکھا جائے گا ۔
چند سابقوں سے مرکب الفاظ کی کچھ مثالیں یہ ہیں :

(۱)

اَن جان ، اَن گھڑ ، اَن گنت ، اَن پڑھ ، اَن دیکھا ، اَن کہی ، اَن گنا برس ، اَن داتا ، اَن مِل ، اَن مول ، اَن میل ، اَن ہونی ۔

(۲)

شاہ رگ ، شاہ توت ، شاہ زادہ ، شاہ نواز ، شاہ جہاں ، شاہ باز ، شاہ رخ ، شاہ کار ، شاہ راہ ۔

شہ زور ، شہ توت ، شہ زادہ ، شہ زادی ، شہ باز ، شہ رخ ، شہ سوار ، شہ تیر ، شہ رگ ، شہ زور ، شہ پر ، شہ کار ۔

(۳)

ہم شیر ، ہم رنگ ، ہم زاد ، ہم دوش ، ہم دم ، ہم نشین ، ہم عصر ، ہم راز ، ہم جنس ، ہم داستان ، ہم قدم ، ہم راہ ، ہم رشتہ ، ہم نام ، ہم زبان ، ہم سایہ ، ہم سر ، ہم سفر ، ہم صفیر ، ہم عناں ، ہم نفس ، ہم وطن ، ہم نوا ، ہم پایہ ، ہم بستر ، ہم چشم ، ہم قلم ، ہم دگر ، ہم زلف ، ہم کلام ، ہم کنار ، ہم رکاب ، ہم سِن ، ہم شکل ، ہم قوم ، ہم نوالہ ، ہم پیالہ ، ہم پیشہ ، ہم سبق ۔

اکثر لاحقوں کو بھی علاحدہ لکھا جائے گا ۔ جیسے :

بیش تر ، کم تر ، خوب تر ، خوش تر ، پیش تر ۔

اِس سلسلے کے مرکبات میں ایک لفظ بہتر مستثنا لفظ کی حیثیت رکھتا ہے ، یہ ایسے مفرد لفظ کی صورت میں ڈھل چکا ہے کہ اِس کو الگ کرکے لکھنا ، اجنبیت کو دعوت دینا ہے ۔ اِس کو " بہتر " ہی لکھا جائے گا ۔ (یہ مرکب ہے " بہ " اور " تر " سے ۔)

فن کار ، قلم کار ، دست کار ، دست کاری ، خام کار ، کاشت کار ، حرام کار۔
غارت گر ، آہن گر ، ستم گر ، فسوں گر ، کاری گر ، بازی گر ، صورت گر، قلعی گر۔
ستم گار ، گنہ گار ، گناہ گار ، فراموش گار ، خواست گار ، کام گار، خدمت گار، طلب گار۔
نیل گوں ، مے گوں ، آب گوں ، گل گوں ۔
ریگ زار ، طرب زار ، زعفران زار۔
باغ بان ، فیل بان ، گاڑی بان ، نگہ بان ، نگاہ بان ، جہاں بان ، کشتی بان ، پشتی بان ۔
اِس قبیل کے مرکّبات میں ایک لفظ " پاسبان " مستثنا لفظ کی حیثیت رکھتا ہے ، اِس کو اِسی طرح لکھا جائے گا۔

پری وش ، ماہ وش ۔
نام ور ، طالع ور ، سخن ور۔
اِس سلسلے کے دو لفظ " جانور " اور " تاجور " اِسی طرح لکھے جائیں گے ۔
خوف ناک ، ہیبت ناک ، نم ناک ، تاب ناک ، غم ناک ، شرم ناک ، خواب ناک ، وحشت ناک ، ہول ناک ۔
رزم گاہ ، خواب گاہ ، آماج گاہ ، نشست گاہ ، کمیں گاہ ، دست گاہ ، آرام گاہ ، تخت گاہ ، زیارت گاہ ، عبادت گاہ ، نمائش گاہ ، آشوب گاہ ، صبح گاہ ، قیام گاہ۔
غم کدہ ، عشرت کدہ ، بُت کدہ ، آتش کدہ ، مے کدہ ، صنم کدہ ، ماتم کدہ ، ظلمت کدہ ، عبرت کدہ ۔
توپ خانہ ، مے خانہ ، غم خانہ ، بُت خانہ ، غسل خانہ ، صنم خانہ ، فیل خانہ ،

درزی خانہ ، خُم خانہ ، شراب خانہ ، جیل خانہ ، ڈاک خانہ ، پاگل خانہ ، مال خانہ ، برف خانہ ، خس خانہ ، نعمت خانہ ، بندی خانہ ، کتب خانہ ، دیوان خانہ ، دولت خانہ ، مہمان خانہ ، باورچی خانہ ، پری خانہ ، غریب خانہ ۔

خاص دان ، پان دان ، اُگال دان ، گُل دان ، نمک دان ، تاب دان ، روشن دان ، خاک دان ، شمع دان ، قلم دان ، آتش دان ۔

دانش مند ، عقل مند ، صحت مند ، غیرت مند ، عقیدت مند ، فتح مند ، غرض مند ، سعادت مند ، حاجت مند ، ہوش مند ، دولت مند ، ضرورت مند ، احسان مند ، خواہش مند ۔

"کہ" اور "چہ" کے مرکبات کو بھی علاحدہ لکھا جائے گا ۔ جیسے :

کیوں کہ ، جب کہ ، چوں کہ ، چناں چہ ، بل کہ ، بہ شرطے کہ ، غرض کہ ، باوجودے کہ ۔

اوپر کئی ایسے "مرکبات" کا ذکر آیا ہے جو مفرد لفظوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں ، اور اُن کو ملا کر لکھنا ہی مناسب ہوگا ۔ بات یہ ہے کہ فارسی کے اثر سے مرکبات کو ملا کر لکھنے کا رواج رہا ہے ؛ اِس رسم کتابت کے اثر سے ، یہ ہونا ہی تھا کہ بعض لفظوں میں ملحقات ، جزوِ لفظ بن جائیں ۔ ایسے لفظوں کو مستثنیات کے ذیل میں رکھا جائے گا ۔ باقی الفاظ کو لازماً الگ الگ لکھا جائے گا ۔

چند لاحقے ایسے ہیں کہ وہ جن الفاظ کے ساتھ آئے ہیں ، اُن کا جز بن کے رہ گئے ہیں ، اور اب ایسے مرکبات ، مفرد لفظ معلوم ہوتے ہیں ۔ اِن لاحقوں سے مرکب الفاظ کو ، ملا کر ہی لکھا جائے گا ، اِن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) بازیچہ ، باغیچہ ، غالیچہ ، دیگچہ ، بیلچہ ، کفچہ ، نیمچہ ۔
(۲) خاکسار ، (خاکساری) ، شرمسار ، شاخسار ، سبکسار ، نگونسار ، سنگسار ۔
(۳) لڑکپن ، بچپن ، چھٹپن ۔
(۴) ایلچی ، مشعلچی ، دیگچی وغیرہ ۔
(۵) سرمگیں ، شرمگیں ، غمگیں ، اندوہگیں ، خشمگیں ۔
(۶) بزرگوار ، سوگوار ، شاہوار ، راہوار (وغیرہ)

کچھ عام مرکّبات ۔ اِن سب کو ، اور اِن کی طرح کے اور سب مرکّبات کو ہمیشہ الگ الگ لکھا جائے گا (مستثنیات سے قطعِ نظر) ۔

گل بدن ، گُل دُم ، گُل کار ، گُل کاری ، گل رنگ ، گل گشت ، گل کدہ ، گل گونہ ، گل چہرہ ، گل قند ، گل فام ، گل پھڑا ، گل برگ ، گل مُچھّے ، گل ریز ، گل دان ، گل چیں ، گل عذار ، گل بانگ ، گل پوش ، گل پوشی ، گل پاشی ، گل بازی ، گل چھرّے ، گل کار ، گل ذار ، گُل رخ ، گَل تکیہ ، گل زمین ، گل فروش ، گُل گیر ، گل میخ ۔

نیم خواب ، نیم روز ، نیم باز ، نیم وا ، نیم گرم ، نیم جان ، نیم کش ، نیم رخ ۔

یک بار ، یک سالہ ، یک روزہ ، یک جا ، یک مشت ، یک سو ، یک سوئی ، یک چشم ، یک جہتی ، یک قلم ، یک دل ، یک رنگ ، یک رُخ ، یک سر ، یک لخت ، یک ساں ، یک سانی ۔

غلط نامہ ، طلاق نامہ ، ماہ نامہ ، سال نامہ ، حکم نامہ ، نرخ نامہ ، سپاس نامہ ، شاہ نامہ ، سوال نامہ ، اعمال نامہ ، بیع نامہ ، فال نامہ ۔

آج کل ، آں حضرت ، ان شاء اللہ ، آبِ حیات ، آب خورا ، آب کاری ، آب دیدہ ، امام باڑا ، اہل مد ، اہل کار ، اہلِ بیت ۔

بن باس ، بال چھڑ ، بانک پن ، پیش خدمت ، پنج تن ، پنج شاخہ ، پنج روزہ ، پنج گانہ ، پچھل پائی ، پنج محلا ، تپج رنگا ، پن چکی ، پن سیری ، پیش قدمی ، پاک دامن ، پھول باغ ۔

تن دہی ، تان سین ، تلخ کام ، تنگ دل ، تنگ دست ، تل شکری ، تل چھٹ ، ٹنک بندی ، تب خالہ ، تل پٹ ، تام بوٹ ، تال کٹورا ۔

جواں مرد ، جواں مرگ ، جواں سال ، جل ترنگ ، جم جاہ ، چت کبرا ، چھول داری ، حرام کار ، چابک دست ۔

خوب صورت ، خوب رو ، خوش حال ، خوش خبری ، خوش رو ، خوں بہا ، خوش خط ، خوش بو ، خان خاناں ، خوش رنگ ، خوش آواز ، خوش وقت ، خوش دل ، خان صاحب ۔

دھرم شالا ، دست کار ، دیوان جی ، دل رُبا ، دل کش ، دل کشی ، دل چسپ ، دل دادہ ، دل دار ، دل داری ، دل دہی ، دم دار ـــ ذی روح ، ذی شان ، ذی علم ، ذی عزّت ۔

رس گلّا ، رسالت مآب ، راج پوت ، راج دُلارا ، راج دوت ، راج کمار ، راج دھانی ، رحم دل ، رس بھری ، راج پال ،

زبان داں ، زیاں کار ، سبک دست ، سبک سر ، سبک دوش ، سیم بر ، سمن بر ، سمن زار ، سرخ رو ، سنگ دل ، سنگ ریزہ ، سیم تن ، سال گرہ ، سکھ پال ، سی پارہ ، ست نجا ، سیاہ کاری ، سنگ راخ ، شش جہت ، شب خون ، شمع رو ، شش ماہی ، شب رنگ ، شب چراغ ۔

صاحب دل ، صاحب قراں ، صبح دم ـــ طالب علم ، طلب گار ، عن قریب ،

عالی جناب ، عالی جاہ ، عالی شان ۔

قزل باش ، قلم رو ، قلم تراش ، قلم دان ، قلم کار ۔ فضول خرچ ، فرماں روا ، فی صد ، فسوں کار ، فیل زور ، فیل پا ۔

کج کلاہ ، کج خرام ، کام ڈانی ، کل جگ ، کن ٹوپ ، کن سلائی ، کس طرح ، کس قدر ، کس وقت ، کون سا ، کاشت کار ، کام روپ ، کم رو ، کم سن ، کم ظرف ، کج رفتار ، کارخانہ جات ، کارواں سرا ، کم زور ، کم بخت ۔ گراں بار ، گراں بہا ، گراں جان ، گم نام ، گم راہ ، گم کردہ ، گراں مایہ ، گراں خواب ۔

لکھ پتی ، لن ترانی ، لم ڈھگو ، لم ڈورا ، لال باغ ۔

مُغ بچہ ، محل سرا ، من جملہ ، من جانب ، مشک بو ، ماہ رو ، ماہ تاب ، ماہ تابی ، میاں صاحب ، مال زادی ، مال دار ، مُلک وار ، من چلا ، من گھتا ، میاں جی ، میگھ دوت ، میگھ راج ، ماہ رخ ، من موجی ۔

نان خورش ، نین سکھ ، نازک خیال ، نیک بخت ، نمک حرام ، نم گیرا ، نوش دارو ، نیک نام ، نازک بدن ، نیل کنٹھ ، نوش جان ۔ ولی عہد ، ہر دل عزیز ، ہنس مکھ ، ہفت خواں ۔

فارسی کے اسمِ فاعل سماعی ، اسمِ مفعول سماعی وغیرہ (اور اُن کے قیاس پر اردو میں بنے ہوئے ایسے مرکّبات) بہ کثرت مستعمل ہیں ؛ فارسی میں اُن کو ملا کر لکھا جاتا ہے ، مگر اردو میں ہمیشہ ، امکان کی حد تک ، اُن کو الگ الگ لکھنا چاہیے ۔ ایسے کچھ لفظ اوپر آ بھی چکے ہیں :

آب چک ، اشک بار ، اورنگ زیب ، ایمان دار ، آب دار ، آدم خور ، آتش باز ، آب دوز ، آب گیر ، آب پاشی ، آدم زاد ۔ بُت گری ، باج گزار ، بغل گیر ، برف باری ۔ پیش بندی ، پاس داری ، پری زاد ، پیش رفت ،

پیش رو ، پاک باز، پیام بر ، پیچ دار ، پائے مال ، پھول دار ، بھڑک دار ، پہرے دار ، پیش کش ، پیچ کش ، پان فروش ۔
تاج دار ، تھانے دار ، ٹھاٹ دار ، تابع دار ، تاب دار ، تحصیل دار ، تحویل دار ، تن زیب ، تہ بند ، تک بندی ، تاج پوشی ، تن دہی ۔
جمع بندی ، جاں کنی ، جاں سپار ، جہاں دیدہ ، جاں باز ، جعل ساز ، جاں فزا ، جاں فرسا ، جاں کاہ ، جنگ جو ، جہاں گیر ، جہاں گرد ، جاں سوز ، جہاں سوز ، جواب دہی ، جاں بخش ، جی دار ، جانب دار ، جان دار ، جال دار ، جاں فشانی ، جوڑی دار ۔
حرام خور ، حرام کاری ، حرام زادہ ، حق دار ، حکم راں ـــ چوڑی دار ، چمک دار ، چوکی دار ، چوکی داری ـــ خان زادہ ، خوں شدہ ، خم دار ، خوں بار ، خاک روب ، خوش گو ، خوں خوار ، خوش نما ، خوش نویس ، خوش خط ، خوں ریز ، خوں چکاں ، خوش خرام ، خوش گوار ، خوش دل ، خوش مزاج ، خوں فشاں ، خوش خوانی ۔
دل خراش ، دل نواز ، دل چسپ ، دل دار ، دل داری ، دل کش ، دل کشی ، دل رُبا ، دل ربائی ، دل شکن ، دل بر ، دل بری ، دست یاب ، دم ساز ، دل دوز ، دل ستاں ، دل ستانی ، دل گداز ، دل آرام ، دل جو ، دل بند ، دل آرا ، دل خواہ ، دل فریب ، دل پذیر ، دل فروز ، دل نشیں ، دست گیر ، دل گیر ، دل فگار ، دل آویز ، دل کشا ، دل سوز ، دل گرفتہ ، دل دادہ ، دل شکستہ ، دل جوئی ، دل دہی ، دل تنگی ، دل بستگی ، دست رس ، داغ دار ، دم دار ، دوست دار ، دین دار ، دعوے دار ، دھاری دار ، دامن دار ، دیانت دار ، داستان گو ، دست گرداں ، دروغ گو ـــ ڈگری دار ، ذیل دار ۔
راہ بر ، رہ بر ، رہ بری ، رہ نما ، راہ نما ، رہ نمائی ، رہ زن ، راہ گیر ، راہ گذر ،

رہ گذر ، رنگ دار ، رنگ ریز ، رکاب دار ، راست گو ، رسال دار ، راہ داری ، رست خیز ، ریش خند ، رعب دار ۔ زبان زد ، زخم دار ، زبان داں ۔

سنگ ساز ، سخن داں ، سنگ تراش ، سال خوردہ ، ستم دیدہ ، ستم گار ، سپاہ گری ، سخن گو ، سمجھ دار ۔۔۔ شراب خوار ، شب گیر ، شیخ زادہ ، شب گرد ، شب خون ، شب دیگ ، شان دار ، شاہ زادہ ، شاہ نواز ، شاہ خرچ ، شاہ نور ، شاہ میر ، شاہ کار ، شاہ راہ ، ، شاہ جہاں ، شاہ رخ ، شہ کار ، شہ رُخ ، شہ زور ، شہ پر ، شہ زادہ ، شہ تیر ، شہ سوار ، شہ سواری ، شہ توت (البتہ نام کے طور پر لفظ "شہباز" کو متصل لکھا جائے گا) ۔

صاحب زادہ ، صوبے دار ، ضلع دار ۔ طبع زاد ، طرح دار ، طرف دار ، عمل دار ، عمل داری ، عرق ریزی ، علم دار ، عالم گیر ، عالم تاب ، عشق بازی ، عرض داشت ، عیال دار ، ۔ غزل خواں ، غم گسار ، غم خوار ، غم دیدہ ، غزل سرا ، غزل گو ۔

قلم زد ، قانون گو ، قلم تراش ، قرض دار ، قدم بوس ، قرض خواہ ۔ فیض یاب ، فتح یاب ، فرماں بردار ، فسوں ساز ۔

کان کن ، کوہ کن ، کج رو ، کام یاب ، کام یابی ، کم یاب ، کف گیر ، کام دار ، کام دانی ، کج روی ، کش مکش ، کمان دار ۔۔۔ گوش مالی ، گل فروش ، گل بار ، گھنڈی دار ، گل گیر ، گل ریز ، گل فشانی ، گم شدہ ۔

لب ریز ، لائسنس دار ، لیپ دار ، لچک دار ، لعاب دار ، لس دار ، لوچ دار ۔

موج زن ، مے کش ، مے خانہ ، مے خوار ، ماہ تاب ، ماہ تابی ، مے نوش ، مزاج داں ، مے گسار ، ماتم دار ، مال دار ، مہمان داری ، مزے دار ، مال گزاری ، مبارک باد ، ملک زادہ ۔

نام جو ، نام دار ، نام زد ، نام زدگی ، نواب زادہ ، نخل بند ، نعل بند ، نقش بند ،

نقش بندی ، نیم کش ، نمک خوار ، نم دار ، نقاب دار ، نگہ داشت ۔
وضع دار ، ہیچ مداں ۔
آدمیوں اور شہروں کے نام ، جیسے :
جگن ناتھ ، جے رام ، رام داس ، رام ناتھ ، من سکھ ، رام چندر ، نول کشور ، بیج ناتھ ، بھگوان داس ، کالی داس ، کالی چرن ، بال مکند ، بال کرشن ، لال خاں ، من موہن ، ہر چرن داس ، موہن لال ، جانکی داس ، سنت رام ، رام دھن ، مول چند ، دھرم پال ، پرس رام ، ہری چند ، رام سروپ ، رام دیال ، رام ناتھ ۔
کان پور ، جے پور ، شاہ جہاں پور ، جام نگر ، گورکھ پور ، جودھ پور ، بھاگل پور ، بھرت پور ، برہان پور ، شاہ گنج ، علی گڑھ ، ناگ پور ، مبارک پور ، فتح پور ، غازی پور ، گول کنڈہ ، رکاب گنج ، کالی کٹ ، چندی گڑھ ۔
کچھ متفرق لفظ ، اِن میں مفرد لفظ بھی ہیں اور مفرد نما مرکب لفظ بھی :
پُھل واری ، کھل بلی ، جُھٹ پُٹا ، جُھن جُھنا ، جَھن جَھناہٹ ، ہل چل ، گُل گُلا ، لس لسا ، کٹ کھنا ، لس تگّا ، دانتا کِل کِل ، جَھن جَھٹ ، قُل قُل ، جوے بار ، ہفت خوان ، گچ گچا ، خش خاش ، ڈھل مل یقین ، مالی خولیا ، شالی مار ، امل تاس ، مان سون ، جھک جھک ، کھٹ کھٹ ، کھٹ پٹ ، کم بخت ، لِب لِبا ، لِب لِباہٹ ، لق لق ، چپ چپاہٹ ، کن کریٹ ، دَل دَل ، دُل دُل ، بی بی ، بک بک ، بَھل بَھل ، شری مان ، شری متی ، سیتل پاٹی ، بھل جھل ، جل تھل ، پَن چھتّا ، بھٹ کٹیا ، پن بھتا ، تام لوٹ ، مَل مَل ، بل چل ، تِک تِک ، لال ٹین ، گِٹ پِٹ ، قرم ساق ، چھم چھم ، چُٹ پٹ ، ٹُم ٹُم ، چھول داری ، دھم دھم ، ذیابی طس ، ذی قعدہ ، سی مرغ ، بن سلوچن ،

چھل بل ، بھل بھل ، لق لقا ، کھٹ کھٹا ، زم زم ، کن سلائی ، کن میلیا ، پل پلا ، چپ چپاہٹ ، پگ ڈنڈی ، پچھل کاری ، الل ٹپ ، تل تلی ، من منا ، کھن کھجورا۔

اوپر جس قدر لفظ لکھے گئے ہیں ، اُن سب کو بے تکلّف الگ الگ لکھا جا سکتا ہے ۔ حرفوں کا ملا کر لکھا جانا ، اُردو کی اہم خصوصیت ہے ، مگر اِس خصوصیت کو وبال نہیں بننا چاہیے ۔ بہت سے حرفوں کا مجموعہ ، کبھی کبھی اُلجھن کا مجموعہ بھی بن سکتا ہے ۔ ایسے لفظ خاصی تعداد میں ہیں جن میں کئی کئی حرفوں کو مِلا کر لکھا جاتا ہے ، اور اِن میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کی جا سکتی ، مگر اِس فہرست میں مزید اضافے کیوں کیے جائیں ؟ اگر کچھ لفظوں کو ، مناسب اجزا میں تقسیم کر کے ، لکھا جا سکتا ہے ، اور اِس عمل سے لفظ کی صورت اِس طرح متاثر نہیں ہوتی کہ کسی مزید اُلجھن کا اضافہ ہو ؛ تو منفصل نویسی کو مرجّح سمجھنا چاہیے ۔

ایسے مصدر بھی کچھ نہ کچھ مل جائیں گے جن کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے لکھا جا سکتا ہے ، جیسے : ہپ ہپانا ، لپ لپانا ، بھل بھلانا ۔ اِس میں شک نہیں کہ ایسے مصدروں کی تعداد کم سے کم ہوگی ۔ مصدروں کو اور اُن کے مشتقات کو عموماً ایک لفظ کے طور پر لکھا جاتا رہا ہے اور اب یہی مانوس و متعارف صورت ہے ۔ اِس میں خواہ مخواہ دخل اندازی نہیں کرنا چاہیے ۔ مثلاً "مسکرانا" کو "مس کرانا" لکھا جائے تو لفظ کی صورت ہی بدل جائے گی ۔ اِسی طرح "تم تمانا" "سن سنانا" وغیرہ کا حال ہے کہ اِن کو "تمتمانا" اور "سنسنانا" لکھا جاتا ہے اور اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔ "تم تمانا" متعارف مصدر کے بجائے ، کوئی نیا لفظ معلوم ہوگا ــــ اصول یہ ہے کہ مصدر ہو یا اسم یا فعل ؛ اگر منفصل لکھاوٹ سے اُس لفظ پر کسی طرح کا اثر نہ پڑتا ہو (اور اثر پڑنے کا مطلب یہ ہے کہ لفظ

کی صورت اِس طرح نہ بگڑتی ہو کہ وہ اجنبی ہو کے رہ جائے ، یا کوئی معنوی سقم پیدا ہوتا ہو) تو پھر جہاں تک ہو سکے ، اُس کو سادہ ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا چاہیے ۔

کچھ مرکّبات ایسے ہیں کہ وہ مفرد لفظوں کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں ، ایسے لفظوں کو اُسی طرح لکھا جائے گا جس طرح وہ لکھے جاتے ہیں ۔ جیسے : کرخندار ، شبنم اور زمیندار ۔ یہ لفظ مرکّب ہیں ، مگر اب یہ مفرد لفظ معلوم ہوتے ہیں اور اگر اِن کو توڑ کر لکھا جائے تو لفظ کی صورت پر اجنبیّت کا رنگ پھر جائے گا ، اِس لیے اِن لفظوں کو رسمِ عام کے مطابق ہی لکھا جائے گا ، اور یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا ایسے اور الفاظ کے ساتھ بھی ، اور اِس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے گا ۔

انگریزی کے ایسے لفظ جو اردو کے مرکّب لفظوں کی طرح کثیر الحروف ہیں ، اُن کے لکھنے میں اِس بات کا لحاظ رکھا جائے گا کہ ممکن حد تک اور اِس کے ساتھ مناسب کا لفظ بھی شامل کر لیجیے ، یعنی ممکن اور مناسب حد تک ، اُن کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے گا ۔ اِس طرح ایک بڑا فائدہ یہ بھی حاصل ہوگا کہ تلفّظ کے لحاظ سے بھی خاصی آسانی حاصل ہو جائے گی ۔ اِس کا اہتمام کیا بھی گیا ہے ۔ میرے سامنے اِس وقت عتیق صدّیقی صاحب کی کتاب " گل کرسٹ اور اُس کا عہد " ہے ، اِس کتاب میں فاضل مصنّف نے اِس کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ انگریزی کے ناموں کو متعدد ٹکڑوں میں تقسیم کرکے لکھا جائے اور یہ واقعہ ہے کہ اِس سے تلفّظ کے لحاظ سے بہت آسانی پیدا ہو گئی ہے ۔ اِس کتاب سے ایسی چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :

گل کرسٹ ۔ گراہم بے لی ۔ رین کنگ ۔ فرانسس کس ترون سس ۔

ڈے وِڈمل ۔ لی ڈن ۔ گرامے ٹی کا اِن ڈوس ٹانی ۔ کرک پیٹ رک ۔
کرانی کل پریس ۔ ہیے رِس ۔ بے کِن زی ۔ اِس کاٹ ۔ ہاگ سَن ۔
ایسے بہت سے لفظ ہیں جن کو بہ آسانی ٹکڑوں میں تقسیم کرکے لکھا جاسکتا ہے۔
جیسے :

پارلی منٹ ، ٹرانس پورٹ ، سرٹی فکٹ ، ٹیلی ویژن ، ٹم ٹم ،
ٹم پریچر ، ٹاون ہال ، ٹیلی گرام ، یونی ورسٹی، پوسٹ مین، ری پبلک،
ڈپارٹ منٹ ، پوسٹ کارڈ ، پوسٹ ماسٹر ، ڈِس پنسری ،
انسٹی ٹیوٹ ، فاس فورس ، کان فرنس ، لیجس لیٹو ، سنڈی کیٹ ،
کن ڈی ڈیٹ ، ڈیلی گیٹ ، اکنالج منٹ ، کانسٹی ٹیوشن یا
کانس ٹی ٹیوشن ، ٹیلی فون ، ٹیلی گراف ، اے ڈی کانگ، جنٹل مین،
ورک شاپ ۔

سائنس وغیرہ کی بہت سی لمبی لمبی اصطلاحیں کبھی کبھی اردو تحریر میں استعمال کرنا پڑتی ہیں ؛ اُن کو تو لازماً منفصل لکھنا چاہیے ۔ یہاں اُس لکھاوٹ سے بحث نہیں جو خطوں میں یا نجی تحریروں میں استعمال میں آتی ہے ۔ ایسی تحریروں میں تو قلم کی روانی پر کوئی روک نہیں لگائی جا سکتی ۔ بحث اُس لکھاوٹ سے ہے جو طباعت کے لیے استعمال کی جاتی ہے ، خاص طور سے نصابی ضرورتوں کے لیے ۔ اُس میں اِن امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا ۔

نقطے، شوشے، حرفوں کے جوڑ

اور

نسخ و نستعلیق کی بعض خصوصیات

صحیح املا کے لیے یہ ضروری ہے کہ لفظ میں حرفوں کا تعیّن اور ترتیب ٹھیک ٹھیک ہو؛ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حرفوں کے جوڑ پیوند درست ہوں اور نقطے صحیح جگہ پر ہوں۔ ایسے حرف اچھّی خاصی تعداد میں ہیں جن کا تعیّن محض نقطوں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ ایسے حرف جب لفظ میں مختلف شوشوں کی صورت میں آتے ہیں، اُس وقت نقطوں کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ نقطوں کے بے جگہ آنے سے، لفظ کی صورت ہی بدل سکتی ہے۔ پرانی تحریروں کے پڑھنے میں بہت سی مشکلیں محض نقطوں کی وجہ سے پیش آیا کرتی ہیں۔ "نبی" کا "بنی" بن جانا تو مشہور بات ہے۔ "رجحان" کو "رجحان" اور "متنبّی" کو "متبنّی" پڑھنا بھی نقطوں کی کرشمہ کاری ہے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح، شوشوں میں بھی جوڑ پیوند کے صحیح طریقوں کو ملحوظ نہ رکھنے سے،

صحتِ املا پر حرف آسکتا ہے۔ اُردو رسمِ خط کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اکثر حرف، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی صورت میں ترتیب پاکر، لفظ کی صورت گری کرتے ہیں۔ جو حرف اپنے ماقبل و مابعد حروف کے ساتھ ملاکر لکھے جاسکتے ہیں، یہ صورت اُن میں زیادہ پیش آیا کرتی ہے۔ چوں کہ ایسے حرف دونوں طرف سے جوڑ کو قبول کیا کرتے ہیں، اس وجہ سے یہ ہونا ہی تھا کہ اِن حرفوں کی شکلوں میں کئی طرح کی تبدیلیاں ہوں۔ لکھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حرفوں کے جوڑ پیوند کے صحیح اور مسلّمہ طریقوں کی پابندی کرے، یعنی خطِّ نستعلیق کے اصولوں کے تحت حرفوں کے جوڑ پیوند اور شوشوں کی نمود کے متعلق جو قاعدے بنائے گئے ہیں، اُن کو ملحوظ رکھا جائے۔ یہاں پر نستعلیق کی قید اِس لیے لگائی گئی ہے کہ اُردو میں عام طور پر تحریر میں اِسی خط کو استعمال کیا جاتا ہے اور خیال یہ ہے کہ آیندہ بھی اِس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

اِس سلسلے میں ایک غلط فہمی پائی جاتی ہے: ایمان دارانہ معصومیت کے ساتھ یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ املا میں بہت سی خرابیاں، خطّاطی کی پھیلائی ہوئی ہیں اور خاص طور پر مراد یہ ہوتی ہے کہ خطِّ نستعلیق میں حرفوں کے جوڑ پیوند اور شوشوں کے تعیّن میں، صحتِ املا کے تقاضوں کو پوری طرح ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اِس بات میں دل سوزی تو ہے مگر حقیقت نہیں۔ اِس مبحث کی اہمیّت کے پیشِ نظر، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض امور کی وضاحت کی جائے اور خطِّ نسخ و خطِّ نستعلیق کی بعض خصوصیات کو بیان کیا جائے اور اِن دونوں خطوں میں روِش کا جو فرق ہے اور جس کے تحت حرفوں کے جوڑ اور شوشے، مختلف انداز سے رونما ہوتے ہیں؛ اُس پر گفتگو کی جائے۔

جس خط میں اُردو کو عام طور پر لکھا جاتا ہے، اُس کو نستعلیق کہتے ہیں، جو خطِ نسخ اور خطِ تعلیق کے امتزاج سے وجود میں آیا ہے۔ نسخ کے دائروں میں چپٹھا پن نمایاں ہوتا ہے اور ہر جوڑ واضح ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں حرفوں کے شوشے صاف صاف اور الگ الگ نظر آتے ہیں۔ مجموعی طور پر سادگی، یک سانیت اور صلابت، اِس خط کی نمایاں صفات معلوم ہوتی ہیں۔ خطِ تعلیق اصل میں دفتری کام کے لیے موزوں تھا۔ اِس کی کششوں میں کسی قدر ترچھا پن اور دائروں میں گراو نمایاں ہوتا ہے اور حرفوں کے سرے دوسرے لفظوں کے حرفوں سے مل سکتے ہیں یعنی کئی لفظ ایک دوسرے سے پیوستہ لکھے جا سکتے ہیں اور اِن وجوہ سے یہ زود نویسی کے کام آسکتا ہے؛ اِسی صفت کی وجہ سے یہ ایرانی دفتروں میں مقبول ہوا، خاص طور پر فرامین کے لیے۔ اِس خط کو ایران کی دفتری ضرورت کی پیداوار بھی کہا جاسکتا ہے۔
نسخ کے مقابلے میں تعلیق میں سادگی کم تھی۔ گویا عرب کی سادگی اور یک سانیت کے مقابلے میں، اِس میں عجم کے حُسنِ طبیعت اور تنوع پسندی کی نمود تھی، مگر صناعی کی اعلا سطح سے یہ پھر بھی نیچے تھا۔ دفتری ضرورتیں، مطلق صناعی کی متحمل ہو بھی نہیں سکتیں۔ یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایرانی مزاج کی نفاست پسندی، اِس خط پر اکتفا نہیں کر سکتی تھی۔ صناعی کے تقاضوں نے خطِ نستعلیق کی تشکیل کا شرف حاصل کیا، جس میں فن کارانہ صناعی نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ اِس کی کششوں میں نفاست کی تراش اور دامن اور دائروں میں گولائی اور بیضوی پن کا امتزاج عجیب انداز سے رونما ہوتا ہے۔ اِس کے لکھنے میں قلم بار بار بدلتا ہے، کہیں پورا قلم لگایا جاتا ہے، کہیں نصف اور کہیں اِس سے کم، تاکہ گردن، دامن، دور، پیالے،

اور دائرے؛ نقاشی کے اُتار چڑھاو کے حریف بن سکیں۔ اِسی لیے اِس خط کو "عروس الخطوط" بھی کہا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خط کی تکمیل اور حُسن کاری کا درجۂ آخر اِس ایجاد کو حاصل تھا اور کئی سو سال کی طویل مدّت گزر جانے کے باوجود، اِس پر نہ کوئی اضافہ کیا جا سکا اور نہ کسی نئی روش کو نکالا جا سکا، جب کہ اِس مدّت میں نہ معلوم کتنے اعلا درجے کے خطّاط اور باکمال استاد، کمال کی مسند پر بیٹھ چکے ہیں۔

یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ نسخ میں قلم اِس طرح بدلتا نہیں ہے، شروع سے آخر تک ایک ہی قلم سے کام لیا جاتا ہے، اِسی لیے اِس خط میں یک سانیت ہوتی ہے؛ جب کہ نستعلیق میں شروعِ حرف، درمیانِ حرف، آخرِ حرف اور اِسی طرح مختلف حرفوں کے جوڑ میں قلم کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ بؔ، سؔ، جؔ، یؔ وغیرہ کو غور سے دیکھا جائے تو نستعلیق میں قلم کے مختلف پیمانوں کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دونوں خطوں میں یہ بہت بڑا فرق ہے۔ نستعلیق کے اِس انداز کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہونا چاہیے تھا کہ حرفوں کے جوڑ میں، مختلف مقامات پر، مختلف انداز بہ روے کار آئیں، کیوں کہ اِس اہتمام کے بغیر، تناسب کا وہ حُسن نمایاں نہیں ہو سکتا تھا جو اِس خط کا نمایاں تر انداز مانا جاتا ہے اور لفظوں کی کرسی ٹھیک نہیں ہو سکتی تھی جس کی بڑی اہمیت ہے۔ نستعلیق میں حرفوں کی گردن، دامن اور دائروں وغیرہ کے تنوع کی وجہ سے کرسی کا خاص طور پر خیال رکھنا پڑتا ہے اور اِس کی وجہ سے، بہت سے جوڑ خاص طرح لگائے جاتے ہیں کہ لفظ اُترنے نہ پائے، جب کہ نسخ میں یہ مسئلہ اِس طرح سامنے نہیں آتا، کیوں کہ دائروں کا چپٹا پن، یک سانیت کو برقرار رکھتا ہے۔

خطِّ نسخ میں لکھی ہوئی عبارت کو سامنے رکھ کر، نستعلیق کے جوڑوں کو دیکھیں تو پہلی نظر میں کچھ ایسا محسوس ہوگا کہ نسخ کے جوڑ بالکل صحیح ہیں اور نستعلیق کے جوڑ کچھ ٹھیک نہیں؛ کیوں کہ بعض حرفوں کے شوشے، واضح صورت میں نمایاں ہونے کے بجاے، اِس طرح معرضِ اظہار میں آئے ہیں کہ یا تو جوڑ کی نوک اُبھر نہیں پائی ہے، یا شوشے کا اندرونی فاصلہ سکڑ گیا ہے۔
میں ایک مثال سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا: م سے پہلے جب ن (یا اِس گروپ کے کسی اور حرف) کا جوڑ آئے گا تو اُس کی صورت یہ ہوگی: "نم"۔ اگر اِس ٹکڑے سے پہلے کسی اور حرف، مثلاً کاف کا اضافہ کیا جائے تو "کنم" لکھا جائے گا۔ اب بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکتی ہے کہ نون کا جوڑ یا اُس کا سِرا تو اُبھرا ہی نہیں۔ یہ سوچتے وقت اُن کی نظر میں ٹائپ کے جوڑ ہوتے ہیں۔ حالاں کہ جب بھی "نم" پر "ک" کا اضافہ کیا جائے گا تو نستعلیق کے اصول کے مطابق اِسی طرح لکھا جائے گا؛ بات اِتنی سی ہے کہ اِس صورت میں ن کا سر، اُبھرنے کے بجاے، ذرا سا دب جاتا ہے؛ محض اِس لیے کہ نستعلیق کی روش کے مطابق، حُسنِ تناسب، کا یہاں پر یہی تقاضا ہے۔ حرف تینوں برقرار ہیں، اُن کے جوڑ بھی محفوظ ہیں؛ بس قلم کے ذرا سے دباو سے، نون کے شوشے کی نوک، اُبھرنے کے بجاے، ذرا سا نیچے میں ڈھل گئی ہے۔
ج یا چ سے پہلے جب ب، ت، ن، ی جیسے حرفوں کا جوڑ آئے گا تو اُس کی صورت "ر" ہوگی۔ مثلاً "بچنا" سے "بچ" لکھا جائے گا۔ اِس میں ایک ٹکڑا (ب) ہے اور چ آخر میں ہے اِس لیے پوری لکھی گئی ہے۔ اب اگر اِس "بچ" میں ایک اور حرف کا جوڑ لگانا ہو، مثلاً

(ب ی چ) لکھنا ہو، تو "بیچ" کا پہلا جُز "بیٖ" بن جائے گا (اِس لیے کہ جوڑ کے لحاظ سے "ب" اور "یٖ" ایک ہی گروپ کے حرف ہیں) اور "ب" کا شوشہ (بہ) کی شکل میں اِس میں شامل ہوجائے گا۔ اب اِن جوڑوں کی ترتیب اِس طرح ہوئی : بہ یہ چ - یہ ترتیب "بیچ" کی صورت اختیار کرے گی۔ اب اگر کسی کو خیال ہو کہ "یٖ" کا شوشہ تو آیا ہی نہیں، تو ظاہر ہے کہ یہ احساس اِس غلط فہمی پر مبنی ہوگا کہ نسخ و نستعلیق کے جوڑ ایک جیسے ہوتے ہیں۔

یہ سمجھنا بہت بڑی غلط فہمی ہوگی کہ نستعلیق میں بعض حرف غائب ہوجاتے ہیں۔ اگر دونوں خطوں کی روِش کا فرق پیشِ نظر ہو تو یہ غلط فہمی کبھی نہیں ہوسکتی۔ نستعلیق میں تو ہر حرف کے جوڑ کی باقاعدہ مشق کرائی جاتی ہے۔ سرِ مشقوں کو دیکھ کر اِس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اِس خط میں حرف ہی غائب ہوجائے۔ بات بس اِتنی ہے کہ نسخ میں وضاحت ہوتی ہے اور نستعلیق میں، اِس کے مقابلے میں بعض جوڑوں میں کم وضاحت ہوتی ہے یعنی فاصلہ ذرا سا سمٹ جاتا ہے اور بس۔ اور یہ دُو روِشوں کا فرق ہے۔ ایک دو مثالوں سے اِس کی وضاحت بہ خوبی ہوسکے گی :

حرفِ "ق"، نسخ اور نستعلیق دونوں خطوں میں جب درمیانِ لفظ میں آتا ہے تو جوڑ کے لیے اپنے ماقبل کسی شوشے کو نہیں چاہتا۔ جب "ق" سے پہلے "ن" کے گروپ کے دُو حرف آئیں گے تو نسخ و نستعلیق میں اُن کے جوڑ مختلف انداز سے لگیں گے۔ مثلاً "رتنقید" (ر ت ن ق ی د) لکھنا ہو تو نسخ میں دو شوشے واضح طور پر نمایاں ہوں گے اور نستعلیق میں دوسرا شوشہ اُبھرنے کے بجائے ڈھلا ہوا نظر آئے گا۔ یہ دونوں خطوں کی روِش کا فرق ہے کہ نسخ

میں تت میں ن کا اِس طرح پیوند لگے گا کہ دونوں حرف الگ الگ دکھائی دیں گے ، اِس طرح : "تنقید"۔ اور اِسی کو جب نستعلیق میں لکھا جائے گا تو نسخ کی طرح شروع کے دونوں حرف بالکل الگ الگ نظر نہیں آئیں گے ، اِس طرح : "تنقید"۔ حرف سب موجود ہیں ، شوشے بھی برابر ہیں ؛ البتہ روش کے اختلاف سے ، جوڑ مختلف انداز سے لگے ہیں ۔ اب اِس کو یہ سمجھنا کہ "تنقید" میں نون کا شوشہ تو آیا ہی نہیں ، اِس کو "تننقید" لکھنا چاہیے تھا ؛ اِس کو غلط فہمی کے سرا اور کیا کہا جا سکتا ہے ۔

یہی صورت و کے ساتھ حرفوں کے جوڑ میں پیش آیا کرتی ہے ۔ مثلاً "بیونت" کہ اِس میں بھی واو سے پہلے کوئی زائد شوشہ نہیں آئے گا ؛ اِس کو "بییونت" لکھنا غلط ہوگا کہ دو کے بجائے تین شوشے بن گئے ہیں ۔ یا جیسے (ب ، ن ، ت ، ی) کے مجموعے کو نسخ میں اِس طرح لکھا جائے گا : "بنتی" ، جب کہ نستعلیق میں اِس کی صورت "بنتی" ہوگی ۔ حرف اور شوشے دونوں صورتوں میں برابر ہیں ، مگر روش کے فرق نے ایک صورت کو ذرا سانچے میں ڈھال دیا ہے ۔ ی میں جب کبھی ایسے حرفوں کے جوڑ لگیں گے تو یہی صورت نمایاں ہوگی ۔ اِس لفظ کے ٹکڑے اِس طرح ہوں گے : بہ نہ تہ ی ۔ یعنی ایسے مقامات پر ی کا سرا ایک حرف میں تبدیل ہو جائے گا (ی) ۔

نسخ میں ر سے پہلے ی وغیرہ کا جوڑ بہت واضح ہوتا ہے ، جیسے : نظیر ۔ اِس کی دوسری صورت "نظیر" ہوگی ۔ دونوں صورتیں نسخ سے متعلق ہیں ۔ مگر نستعلیق میں یہ جوڑ بالکل مختلف انداز سے لگتا ہے ؛ اِس میں ی کے لیے پورا قلم لگایا جاتا ہے ، اور جس طرح "بنتا" میں ت کا پیالہ بنتا ہے ،

اُسی طرح "نظیر" میں "یؔ" کے لیے ایک اُبھار سا آتا ہے۔

مقصودِ گفتگو یہ ہے کہ نسخ اور نستعلیق دونوں میں ہر لفظ میں حرف اور شوشے بالکل برابر رہتے ہیں، بس بات یہ ہے کہ دونوں خطوں کی روش مختلف ہے، دونوں میں جوڑوں کے طریقے بھی مختلف ہیں؛ اِس لیے صورت نگاری کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ اِس کو یہ سمجھنا کہ نستعلیق میں حرفوں کے شوشے غائب ہوجایا کرتے ہیں، یا یہ فرض کرلینا کہ نسخ میں تو سب جوڑ پیوند بالکل صحیح ہوتے ہیں اور نستعلیق میں بعض جوڑ صحیح نہیں ہوتے؛ یہ خیالات کُلیّتاً غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ یہ چاہنا کہ نستعلیق میں بھی جوڑ اُسی طرح آنا چاہیے جس طرح وہ نسخ میں آتے ہیں؛ یہ مطالبہ محض کم نظری پر مبنی ہے۔ یہ دراصل دونوں خطوں کے مزاج اور اصولوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ دونوں خطوں کی اپنی اپنی خصوصیات اور اصول ہیں، اِن کو گڈمڈ کرنے سے، دونوں خطوں کی خصوصیات تباہ ہوجائیں گی۔

خطِ نستعلیق پر ایک یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ اِس خط میں صحتِ املا کے بعض التزامات کو ثانوی چیز سمجھا گیا۔ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ نقطہ کہاں پر رکھا جائے اور دو لفظوں کو کہاں پر مِلا کر لکھا جائے اور کہاں الگ الگ لکھا جائے، اور کہاں پر زوائد سے کام لیا جائے؛ اِن سب کا انحصار اِس پر تھا کہ لفظوں کی نشست اور حُسنِ تناسب کا تقاضا کیا ہے۔ کہیں پر دو لفظوں کو ملا کر لکھنے سے اگر بات بنتی ہے اور حُسن نمایاں ہوتا ہے تو وہاں پر یہی املا ٹھیک ہے اور جہاں پر الگ الگ لکھنے سے خطّاطی کے آداب کی تکمیل ہوتی ہے تو وہاں پر وہی درست ہے۔ جگہ کو بھرنے کے

لیے نقطوں کو اِدھر اُدھر کیا جا سکتا ہے ۔ اِسی طرح بعض حرفوں میں کشش کو اِس طرح آمیز کیا جا سکتا ہے کہ تناسب کی ضرورت کو پورا کیا جا سکے ، خواہ اُس سے کسی طرح کا التباس کیوں نہ پیدا ہو جائے ، جیسے " مثنوی " کو " مثنوی " لکھنا۔ ہائے مخلوط اور ہائے ملفوظ میں امتیاز نہ کرنا ۔ یائے معروف و مجہول میں امتیاز نہ کرنا۔ الف کی جگہ ہائے مختفی لکھنا ، یا اُس کے برعکس ۔ اِسی طرح کی اور بھی کئی باتیں گنائی جاتی ہیں ۔۔۔ گویا آج لفظوں کو ملا کر لکھنے کا جو مسئلہ ہے ، یہ اِسی خط کا پیدا کیا ہوا ہے اور نقطے بے جگہ رکھنے اور یائے معروف و مجہول وغیرہ کی بے امتیازیاں ، یہ سب کچھ خطّاطی کا عطیّہ ہے ۔ مگر یہ محض الزام تراشی ہے ۔

پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خطّاطی کا موضوع کیا ہے ۔ اور یہ بھی کہ املا کی صحت کے قاعدے بنانا کس کی ذمّے داری ہے ، خطّاط کی یا قواعد نویس کی ؟ اور لفظ میں حرفوں کا تعیّن کس کا کام ہے ، لُغت نگار کا یا خوش نویس کا ؟

خوش خطی کے دورِ آخر کے ایک معروف و ممتاز اُستاد منشی شمس الدّین اعجاز رقم نے اپنی کتاب اعجاز رقم میں لکھا ہے :

" اور اصطلاحِ خوش نویسی میں خط اس کو کہتے ہیں جو صورتِ حرفی بلا لحاظ نقطوں کے ، بہ قیدِ حدودِ دوری و مقادیرِ سطحی ، قلم سے لکھی جائے ۔
غرض و غایت : بدخطی کے عیوب سے دست و قلم کو بچا کے ، خوب صورت حرف لکھنا ہے "۔ (اعجاز رقم ، طبعِ چہارم ، ص ۵)

لفظ میں حرفوں کا ٹھیک تعیّن لُغت نگار کی ذمّے داری ہے ، خطّاط کی نہیں ۔ اِسی طرح صحتِ املا کے ضابطے مرتّب کرنا بھی خطّاط کے فرائض میں شامل نہیں ؛ یہ قواعد نویس کا کام ہے ۔ خطّاطی کا موضوع ، ایک

روشِ خاص کا تعیّن ہے، جس کی غرض و غایت، خوش نویسی یا سادہ لفظوں میں "خوب صورت حرف لکھنا" ہے۔ یہ دو مختلف ذمّے داریاں ہیں۔ خطّاطی میں روشِ خط کا جب تعیّن کیا گیا تھا، اُس وقت تک قواعد نویسوں نے صحتِ املا کے وہ مفصّل ضابطے نہیں بنائے تھے جن کی تلاش ہم آج کرتے ہیں۔ نستعلیق کی روش جب نکالی گئی ہوگی تو اُس وقت ساری توجہ حرفوں کی صورت تراشی، جوڑ پیوند، حروف کے نئے پیمانوں کے تعیّن اور تناسب کے لحاظ سے نشست کے تعیّن پر مبذول رہی ہوگی؛ اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ خطّاطی کا موضوع ہی یہ ہے۔

املا کے مسائل پر ہمارے قواعد نویسوں نے اِس طرح غور نہیں کیا تھا کہ اِس کے سارے التزامات کا قطعی طور پر تعیّن ہو جائے اور اِس عدمِ تعیّن نے ساری خرابیوں کو پھیلایا؛ مگر یہاں پر یہ بات ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ جن باتوں کو آج ہم خرابیوں سے تعبیر کرتے ہیں، اُس زمانے میں اُن کو اِس نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ مثلاً آج "گھر" کو "گہر" لکھنا ہم غلط سمجھتے ہیں، یا "زندگی" کو "زندگے" لکھنا پسند نہیں کرتے؛ لیکن یہ آج کی بات ہے؛ کل اِن باتوں کو مطلق اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ عام تحریروں میں اِس طرح کے امتیازات کا بالکل گزر نہیں تھا اور خواص بھی اِن امتیازات کو، کوئی قابلِ لحاظ بات نہیں سمجھتے تھے۔ اِس طرح کے قاعدے قانون تھے ہی نہیں، پھر خطّاط کیا کرتے؟ اُس زمانے میں ایک طرف تو تعلیم کا دائرہ محدود تھا، دوسری طرف طبیعتیں مشکل پسندی کی خوگر تھیں اور یہاں تک کہ آسان پسندی کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔

لسانیات ، صوتیات ، تدوین کے مسائل وغیرہ مستقل موضوعات کی صورت میں اِس طرح سامنے نہیں آئے تھے ؛ اِن وجوہ سے املا بھی سیّال حالت میں رہا ۔ اگر قواعد نویسوں نے صحتِ املا کے مفصّل ضابطے نہیں بنائے تو اِس میں خطّاطوں کا کیا قصور ! عبارت نویسی کا جو انداز رائج تھا ، وہی خطّاطی کے حصّے میں آیا ۔ اور جیسا کہ کہا جا چکا ہے ، خطّاطی کا موضوع یہ تھا کہ خوش نویسی کی کسی روشِ خاص کے تحت ، حروف نویسی کے ضابطوں کا تعیّن کیا جائے اور حروف و الفاظ کے اجزا کی صورت نگاری کی تفصیلات مرتّب کی جائیں ؛ خطّاطی کا فریضہ یہ نہیں تھا کہ املا کے ضابطے مرتّب کیے جائیں ۔

اِس کو یوں دیکھیے کہ اب اِس بیسویں صدی میں یاے معروف و مجہول اور ہاے مخلوط و ملفوظ کی کتابت میں لازماً فرق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ، نونِ غنّہ پر نقطہ نہیں لگایا جاتا ، غیر ضروری کششوں سے لفظوں کو محفوظ رکھا جاتا ہے ، کوشش کی جاتی ہے کہ نقطے صحیح جگہ پر لگائے جائیں ، جگہ کو بھرنے کے لیے امکان بھر زوائد کو شامل نہیں کیا جاتا ، اعراب و علامات سے بھی کام لیا جاتا ہے ؛ اور کتابت میں بھی اِن سب باتوں کی پابندی کی جاتی ہے ۔ اب ہر خوش نویس اِن قاعدوں کو ملحوظ رکھتا ہے اور اِن باتوں کو ملحوظ رکھنے کی وجہ سے نستعلیق کی روش میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں کرنا پڑی ہے ، کوئی دقّت محسوس نہیں ہوتی ، اصل روش میں ذرا سی بھی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ یعنی جب املا کے بعض قاعدے نافذ ہو گئے تو خوش نویسی نے بھی اُن کو قبول کر لیا اور اِس سے خوش نویسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ۔ یہ قاعدے پہلے بن جاتے اور برتے جاتے تو اب سے

پہلے ہی شاملِ کتابت ہو جاتے۔ املا میں عام سطح پر جو عدمِ تعیّن تھا، وہی خوش نویسی کے حصّے میں آیا؛ اِس میں نسخ یا نستعلیق کا کیا قصور ہے اور خطّاطی کی کیا ذمّے داری ہے؟

نقطوں اور شوشوں کی حد تک، عام تحریروں میں جو غلط نویسی یا بدنظمی دیکھنے میں آتی ہے؛ اُس میں خطِّ شکست کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ نسخ ہو یا نستعلیق، اِن دونوں خطوں کو دفتروں کی زود نویسی سے کچھ زیادہ علاقہ نہیں ہوسکتا تھا؛ اِس لیے ہندستان میں دفتری ضرورتوں نے خطِّ شکستہ کو پیدا کیا، جسے خطِّ دیوانی بھی کہتے ہیں۔ دنوں تک اِس خط کو فروغ رہا۔ اِس خط میں لمبی لمبی ترچھی اور آڑی کششیں اصل چیز تھیں اور جو حرف منفصل رہتے ہیں، اُن کو بھی ملا کر لکھا جا سکتا تھا، کیوں کہ زود نویسی کے تقاضے اِن کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ جب قلم اِس طرح چلے گا تو ظاہر ہے کہ یہ اہتمام ہو ہی نہیں سکتا کہ ہر حرف کا شوشہ ٹھیک ٹھیک بنے اور نمایاں ہو اور یہ کہ نقطے بھی ٹھیک جگہ پر آئیں۔ اِس خط کی روش نے شوشوں کی کم نمائی اور نقطوں کے انتشار کو عام تحریر میں اور زیادہ پھیلایا۔ خطِّ شکستہ کی کچھ کششیں، خطِّ نستعلیق کی عام لکھاوٹ میں بھی شامل ہوگئیں، یعنی عام لوگوں کی تحریروں میں۔ تعلیم کی ابتدائی منزل میں نستعلیق کی روش سکھائی جاتی ہے؛ مگر تعلیم ختم ہونے کے بعد، روزمرّہ کی ضرورتوں کے تحت جب کچھ لکھا جاتا ہے تو اُس میں نستعلیقیت کی تہ میں شکستہ پن کے کچھ اثرات بھی شامل ہو جاتے ہیں اور اِس طرح شوشوں میں کم نمائی اور نقطوں میں کم احتیاطی شاملِ تحریر ہو جاتی ہے،

مگر اِس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ خطِ شکستہ اب رواج کی دنیا سے بے دخل ہو چکا ہے، وہ دفتر ہی نہیں رہے؛ لیکن جہاں تہاں پولیس کی رپٹوں میں اور پٹواریوں کے پُرانے کاغذوں میں اِس کی کچھ کرشمہ کاریاں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں اور عام تحریر میں بھی اِس کی کئی کششوں اور کئی آسان پسندیوں کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

ٹائپ میں خطِ نسخ کی حکومت ہے۔ اِس خط کو عرب کی پرانی سادگی اور کھُردرے پن کا نمونہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ چپٹے چپٹے سے دائرے، اور حرفوں کے جوڑ ایسے جن پر نفاست سے زیادہ وضاحت کا عکس پڑتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ خط مجموعی طور پر طاقت اور صلابت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ نستعلیق اصل میں ایرانی صنّاعی، جمالیاتی ذوق، تراش خراش اور ظاہر آرائی کا آئینہ خانہ ہے۔ اِس خط میں اگر صورت پر سارا زور مرکوز ہو کر رہ گیا ہے اور نوک پلک اور نزاکت مآبی نے اِس صورت آرائی کی تشکیل کی ہے تو جائے تعجب نہیں؛ یہ تو اُس تہذیب کا تقاضا تھا۔ نستعلیق کے دائروں اور کششوں میں ایسی نزاکت ہوتی ہے کہ قلم ذرا سا اُچٹا اور دائرہ بگڑا۔ کرسی ذرا سی بدلی اور حُسنِ تناسب غارت ہوا ـــــ اِن صفات کی بنا پر، لوہے کی مشین کے ناز اُٹھانا، نستعلیق کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُس کی نفاست اور تراش خراش، اِس فولاد روشی کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اِس بارِ امانت کو خطِ نسخ ہی اُٹھا سکتا تھا۔ اور باتوں کے علاوہ (جس میں شروع سے آخر تک قلم کی یک سانی کی بہت اہمیت ہے) اِس میں دونوں خطوں کے جوڑ پیوند کے طریقوں کو بہت کچھ دخل ہے۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، نستعلیق

میں اکثر جوڑ، اپنی نمود کے لیے، نسخ کی طرح دو ٹوک پن کو گوارا نہیں کرتے۔
اِس میں قلم کی جنبشوں سے کچھ ایسا انداز پیدا کیا جاتا ہے کہ حرف
کی نمود تو ہوتی ہے، مگر جوڑ نمایاں نہیں ہوتا؛ اور یہ مبہم صنعت گری،
مشین کے بس کی بات نہیں تھی۔ نستعلیق میں پورے لفظ کے اجزا
اِس انداز سے باہم پیوست ہوتے ہیں کہ اُن کو ٹکڑوں میں تقسیم
کرکے، دوبارہ اُس طرح وصل دینا مشکل ہے۔ ٹائپ میں سارا کاروبار
مختلف ٹکڑوں کو مقررہ انداز سے جوڑنے پر مشتمل ہے اور اِس میں وہ
چسپیدگی، وصل اور نوک پلک کی آب داری نہیں آپاتی جو قلم کی جنبشوں
سے وجود میں آتی ہے۔ ہاں پورے پورے لفظ ڈھال لیے جائیں تو اور بات
ہے، اور یہ ہونے سے رہا۔ آسمان کے تاروں کو کس نے گنا ہے!
ایک زمانے میں کوشش کی گئی تھی کہ نستعلیق ٹائپ تیار کیا جائے۔ تیار
تو ہوگیا، مگر جلد ہی مرحوم ہوگیا۔ بات وہی تھی۔ نستعلیقیت کی نفاست
و نزاکت اور ٹائپ کی فولادیت میں صنعتِ تضاد کی نسبت ہے۔ نستعلیق
ٹائپ میں چھپی ہوئی اُس زمانے کی کتابیں موجود ہیں؛ اُن کو دیکھ کر ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ نستعلیق پر ٹائپ کی پھبتی کسی گئی ہے۔ بے نور دائرے،
حُسن سے عاری جوڑ، جن میں سے اکثر کے مُنہ کھلے رہ گئے ہیں، لطافت
سے معرّا پیچ و خم؛ جیسے نستعلیق پر بھی اِس زمانے کی شاعری کی
جدیدیت کا سایہ پڑ گیا ہو۔ نسخ اور نستعلیق دونوں کا حُسن تباہ ہوگیا۔
نسخ اور نستعلیق دونوں خط اپنی اپنی امتیازی صفات سے آراستہ ہیں
اور دونوں کی اہمیت اور ضرورت ہے، مگر جب یہ کوشش کی
جائے گی کہ اِن دونوں کو آمیز کیا جائے تو دونوں کی خوبیاں تباہ

ہو جائیں گی۔

اب صورت یہ ہے کہ اردو میں نسخ و نستعلیق دونوں خط مستعمل ہیں۔ ہاتھ کی لکھائی میں صرف نستعلیق کام آتا ہے اور چھپائی میں دونوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اِس سلسلے میں دو باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اِن دونوں خطوں میں مزاج کا بھی فرق ہے اور صورت کا بھی، یہ دو مختلف خط ہیں، جن کی روشیں مختلف ہیں؛ اِس لیے یہ چاہنا کہ نسخ، نستعلیق بن جائے یا نستعلیق بعض اعتبارات سے نسخ سے قریب آ جائے؛ فضول بات ہے۔ اگر کوئی شخص اِس طرح سوچتا ہے تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اِن دونوں خطوں کے مزاج سے واقف نہیں ـــــــ دونوں خطوں میں حرفوں کی کشش اور جوڑ پیوند کا انداز الگ ہے، اِس لیے یہ توقع کرنا کہ نستعلیق کی تحریر میں حرفوں کے جوڑ عین مین اُسی طرح صاف صاف، الگ الگ اور نمایاں ہوں جس طرح نسخ میں نظر آتے ہیں اور جس کے نمونے ٹائپ کی چھپائی میں سامنے آتے رہتے ہیں؛ نادانی کی بات ہے۔ ایسا نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دونوں خط اُردو والوں کے کام آتے رہیں گے۔ بچّہ سب سے پہلے نستعلیق کی لکھاوٹ سیکھے گا اور پھر عُمر بھر اُسی کو اپنے قلم سے لکھتا رہے گا۔ اِس لیے یہ ضروری ہوگا کہ سب سے پہلے نستعلیق کی روش سے اُسے آشنا کیا جائے۔ بڑا ہو کر، وہ ٹائپ کی کتابیں بھی پڑھے گا۔ اِس وقت تک اُس کا شعور اور اُس کی نگاہ اِس قابل ہو چکی ہوگی کہ وہ

اِس خط کو بہ آسانی پڑھ لے ۔ ہوتا بھی یہی ہے۔خطِ نسخ اور اُس کے واحد مظہر ٹائپ کی چھپائی کو ہم ہرگز نہیں چھوڑیں گے، کیوں کہ طباعت کے مستقبل میں اِس سے بہت مدد ملے گی، اِس کی ضرورت بھی ہوگی اور نستعلیق کی روش کو بھی ترک نہیں کریں گے، کیوں کہ یہ سیکڑوں سال سے رائج اور مقبولِ عام خط اپنا الگ حُسن رکھتا ہے۔اِس کی حیثیت تہذیبی دولت کی سی ہے۔ یہ برابر استعمال میں آتا رہا ہے، آتا رہتا ہے اور آتا رہے گا۔ دفتری کارروائی بھی اِسی میں ہوگی، دوستوں اور بزرگوں کو خط بھی اِسی میں لکھے جائیں گے، چھپنے کے لیے مسوّدوں کو بھی اِسی خط میں لکھا جائے گا (خواہ وہ مسوّدہ چھپے ٹائپ میں)، گھر کا حساب کتاب بھی اِسی میں لکھا جائے گا، بچّہ سب سے پہلے اِسی کو سیکھے گا۔مختصر لفظوں میں یہ کہیے کہ ہاتھ سے ساری تحریریں اِسی خط میں لکھی جائیں گی، جس طرح کہ اب تک لکھی جاتی رہی ہیں ۔اور چھپائی کے لیے، حسبِ ضرورت، نسخ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

ممکن ہے کسی زمانے میں طباعت میں نسخ کی اجارہ داری ہو جائے، مگر ہاتھ کی تحریریں نستعلیق ہی میں لکھی جاتی رہیں گی۔ انگریزی والوں سے اگر یہ کہا جائے کہ جس طرح کتابیں چھپتی ہیں، ہاتھ سے بھی اُسی طرح لکھا جائے، یعنی تحریر و طباعت میں ایک ہی سے حروف استعمال کیے جائیں، تو کیا خیال ہے، کوئی مانے گا اِس بات کو ؟ ہاتھ سے اِسی طرح لکھا جاتا رہے گا۔خیال یہ ہے کہ مستقبلِ قریب میں بھی اُردو میں طباعت کے لیے کم تر نسخ کو، اور بیش تر نستعلیق کو استعمال کیا جاتا رہے گا اور ہاتھ کی لکھائی میں صرف نستعلیق ساتھ دے گا۔

خطِ نستعلیق کے سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اِس خط کی ایجاد دفتری ضرورتوں کے تحت نہیں ہوئی تھی اور چھپائی کا تو وجود ہی اُس زمانے میں نہیں تھا ؛ یہ خط دراصل کمالِ خطّاطی کے مظاہرے کے کام آتا تھا، اِس لیے فنّی نزاکتوں کو اِس پر سایہ کیے ہوئے رہنا ہی تھا۔ اِس خط کے آغاز و ارتقا میں یہی محرّکات شامل رہے ، مگر اِس خط میں اِس قدر خوب صورتی رچی بسی ہوئی تھی کہ بے انتہا فنّی ریاضت کے مطالبے کے باوجود، اِس کو قبولِ عام کا شرف حاصل ہوا اور رہا اور کمال کی بات یہ ہے کہ عام تحریر کے لیے اِسی کو اختیار کیا گیا اور ساری فنّی نزاکتوں کے ساتھ ۔ اِس نے عام تحریر کا بھی اُسی طرح ساتھ دیا جس طرح وصلیاں لکھنے میں یہ کام آیا کرتا تھا ۔ اِس سے اُس لچک کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے جو اِس خط کی روش میں تہ نشیں ہے ۔ عام تحریر میں خواہ اساتذہ کے قلم کی آب داری نہ آئی ہو ، (اور کیسے آ سکتی تھی) مگر اصل روش پوری طرح محفوظ رہی ۔

جب پریس کا رواج ہوا تو پتھر کی چھپائی کے لیے کاپی نویسی نے رواج پایا۔ ظاہر ہے کہ اِس کام میں تجارت کا جُز غالب تھا ، پریس اور تجارت لازم و ملزوم ہیں ۔ کاپی نویسی میں بہ ظاہر فنّی آداب کو اُس انداز سے برقرار نہیں رہنا چاہیے تھا ، جس طرح وصلیاں لکھنے میں وہ نمایاں رہتے تھے ؛ مگر فنّی آداب برقرار رہے ۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ کتابت کرنے والے لوگ شاگرد تو اُنھی اساتذہ کے ہوتے تھے ۔ اِن خوش نویسوں کی تربیت اُنھی آداب کے ساتھ کی گئی تھی ۔ اِن شاگردوں نے ، کاپی نویسی کے عجلت طلب اور آہستگی دشمن تقاضوں کے باوجود ، اُس فنّی میراث کی پوری طرح حفاظت کی ۔ کاپی نویسی میں وہ بہت سی آزادیاں باقی نہیں رہ سکتی تھیں جن سے اساتذہ فائدہ

اٹھایا کرتے تھے کہ لفظ کو جس طرح چاہا، اُس طرح لکھا اور زوائد کا حسبِ ضرورت استعمال کر لیا۔ کاپی نویسی میں اِس کی گنجایش نہیں تھی۔ اِس کے باوجود، نستعلیق کی روش مکمّل طور پر محفوظ رہی اور کتابت میں کسی طرح کی دقّت کا احساس کسی سطح پر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ کاپی نویسی میں کمالِ فن کا وہ پرتو نہیں جھلک سکا، جو وصلیوں کی خصوصیت ہے، مگر یہ ثانوی بات ہے؛ اصل بات یہ ہے کہ روشِ خط بہ دستور رہی۔ حرفوں کے دَور، دامن، دائرے، کشش، جوڑ پیوند، غرض ہر چیز مقرّرہ اصولوں کے مطابق ہی رہی۔

پریس کے لیے کاپی نویسی آج بھی ہوتی ہے۔ حالات بدل چکے ہیں، معاش کے مسائل نے ریاضت کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے، مگر نستعلیق کی اصل روش آج بھی محفوظ ہے۔ آج کل اچھّے خوش نویس کم ہیں، اور خطّاط اگر ہوں گے بھی تو دو چار سے زیادہ نہیں ہوں گے، معمولی اور کم درجہ کاتب بہت ہیں؛ مگر یہ بات اہم نہیں، اہم ہے یہ بات کہ اِس خط کا فنّی کردار اور اِس کی اصل روش آج بھی بہ دستور محفوظ ہے۔ کاتب کا خط کیسا ہی ہو، مگر حرفوں کی صورت نویسی اور حرفوں کو پرکھنے ناپنے کے پیمانے، سب پُرانے ہیں۔ زمانے کا بہاو، حالات کے تقاضے، معاش کے مسائل، پریس کی عجلت پسندی اور بے رحمی، صنعتی زندگی کی آشوب آفرینیاں، زبان کے مسائل؛ اِن میں سے کوئی چیز اِس خط کے فنّی کردار کو ذرا سا بھی نہیں بدل پائی ہے۔ یہ بات ٹھنڈے دل سے سوچنے کی ہے کہ اِس سے کیا ظاہر ہوتا ہے! اگر اِس خط میں اُتنی مشکلیں واقعتاً ہوتیں جن کا رونا رویا جاتا ہے اور ناواقفیت کی زبان جن کو دُہراتے نہیں تھکتی ہے؛ تو

کیا اِس قدر طویل عرصے میں، اِس قدر ناموافق حالات میں اور پریس کے بے امان و بے کراں تقاضوں کے دباو میں، یہ خط پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ رہ سکتا تھا! انسانی مزاج، جمالیات سے بے تعلّقی کا اعلان کرنے کے قابل اگر کبھی ہو سکا، تو شاید اُس وقت اِس خط کے فنّی کردار پر حرف آ سکے۔

عام لوگوں کی تربیت، خوش نویسوں کے مقابلے میں مختلف طور پر ہوا کرتی ہے؛ اِس لیے یہ قدرتی بات ہے کہ بعض لفظوں کے لکھنے میں اختلاف رونما ہو۔ فنّی اصولوں کے تحت جس کی تربیت ہوگی تو ظاہر ہے کہ اُس شخص کا قلم، مسلّمہ طرزِ نگارش کے خلاف کوئی نقش نہیں بنائے گا، جب کہ ایک عام آدمی کے یہاں، دونوں باتیں پائی جا سکتی ہیں، وہ بعض لفظوں کو کچھ مختلف طور سے بھی لکھ سکتا ہے۔ یہ صورت بعض حرفوں کے جوڑوں میں پیش آیا کرتی ہے، خاص طور سے اُن جوڑوں میں جہاں جوڑ کے لیے شوشے کی نوک کو ابھارا نہیں جاتا، جیسے: نظیر۔ کہ عام قلم اِس کو "نطیر" لکھ سکتا ہے۔ روزمرّہ کی لکھاوٹ میں ایسے بعض اور اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ اِس سلسلے میں دو باتوں کو خوب ذہن میں بٹھا لینا چاہیے: ایک تو یہ کہ اِس قسم کے اختلاف، فروعی حیثیت رکھتے ہیں، اور اِس طرح کے اختلافات عام تحریر میں ہمیشہ رہیں گے، مگر اِن کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اصولی سطح پر اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ روزمرّہ کی تحریر میں لوگ جس طرح بھی لکھیں، جب کتابت کی منزل آئے گی تو خوش خطی کے مسلّمہ طریقوں کو مدِّ نظر رکھا جائے گا۔ اِس میں کسی طرح کا ایسا تضاد

یا اختلاف نہیں سمجھنا چاہیے جس کی وجہ سے کسی اکھیڑ پچھاڑ یا معترضانہ فریاد و فغاں کو ضروری سمجھا جائے۔ ہر شخص کا قلم الگ انداز سے چلتا ہے، اِس لیے ہر شخص کے یہاں سے سند نہیں لی جا سکتی، سند کے لیے صرف مستندین کی طرف دیکھنا ہوگا۔

علم و فن کے ضابطے، آیت و حدیث نہیں ہوتے کہ اُن میں تبدیلی کی ہی نہیں جا سکتی، خطّاطی کے ضابطے بھی اِس سے مستثنا نہیں ہو سکتے؛ مگر اِس کے ساتھ ہی اِس بات کو بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ بے اصولی کو اصول نہیں مانا جا سکتا اور نہ ہر شخص کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ بہ طورِ خود جو چاہے، وہ کرتا رہے۔ اِس سے چیزیں بکھرتی ہیں اور صرف انتشار کا بھلا ہوتا ہے۔ ہر شخص ہر کام کا اہل نہیں ہوتا۔ ترقیِ اردو بورڈ اور انجمن ترقیِ اردو؛ یہ دو ادارے مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ادارے اِس قابل ہیں کہ اربابِ نظر کو جمع کر سکیں اور علمی و فنی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ، دورِ حاضر کی ضرورتوں کو بھی ملحوظ رکھ کر، بعض مسائل کا فیصلہ کر سکیں۔ یہ ادارے ایسے فیصلوں کو نافذ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کام اِن اداروں کا ہے کہ خطّاطی اور طباعت کے ماہرین کو جمع کرکے، اِس پر غور کریں کہ کیا کچھ تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ اور ساری تفصیلات کو سامنے رکھ کر، باضابطہ فیصلے کیے جائیں۔ اِن اداروں کے وسائل کی مدد سے، ایسے فیصلوں کو ابتداءً ایک دائرے کے اندر فوری طور پر نافذ کیا جا سکتا ہے، اِس کے بعد یہ باتیں خود بہ خود اپنی جگہ بنا لیں گی ــــــ جب تک ایسا نہ ہو، اُس وقت تک قطعی طور پر

مسلّمہ اندازِ نگارش کی مکمّل پابندی کی جائے گی اور اِس سلسلے میں انفرادی جدّت پسندیوں کو، ضرورت کے نام پر مداخلت نہیں ہونے دیا جائے گا۔ شاعری کی طرح خطّاطی کو نہ تو بازیچۂ اطفال بنایا جاسکتا ہے اور نہ جدّت پسند طبیعتوں کے حوالے کیا جاسکتا ہے۔ علمی مسائل اور فنّی ضوابط، علمی وفنّی سطح پر ہی طے کیے جاسکتے ہیں۔

پہلی نظر میں بعض تبدیلیوں کی ضرورت محسوس ضرور ہوتی ہے۔ خطّاطی کے ضابطے جب مرتّب کیے گئے تھے، تب پریس کا وجود نہیں تھا۔ اب خطّاطی کا وہ تصوّر دھندلا چکا ہے اور پریس کی ضرورتوں نے اہمیت اختیار کرلی ہے۔ یہ بات واضح کردی جائے کہ اِس سلسلے میں کسی بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہرگز نہیں، صرف فروعی تغیّرات کی ضرورت ہے اور یہ فروعی ضرورتیں، عام تحریر کے بجاے، طباعت کا تقاضا ہوسکتی ہیں۔ مثلاً مٓ جب شروعِ لفظ میں آتا ہے تو اِس کی دو شکلیں تو واضح ہوتی ہیں: جب یہ الفؔ کے ساتھ آتا ہے تو اِس کا سر بے طرح دب جاتا ہے اور کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ بؔ یا نؔ وغیرہ کا ٹکڑا ہے، نقطہ چھوٹ گیا ہے۔ جب یہ بعض دوسرے حرفوں کے ساتھ آتا ہے تو اِس کا وجود واضح ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دو لفظ، خطّاطی کے اصول کے مطابق، اِس طرح لکھے جائیں گے: (۱) "ماں"۔ (۲) "ممنون"۔ اگر "ماں" کے مٓ کو بھی "ممنون" کے مٓ کی طرح لکھا جائے تو اِس سے کسی طرح کا تغیّر رونما نہیں ہوگا اور تشابہ کی وہ صورت ختم ہوجائے گی۔

اِسی طرح ہاے ملفوظ جب بعض الفاظ کے شروع میں آتی ہے تو پیالے کی صورت میں ڈھل کر آتی ہے اور خطّاطی کے اصولوں کے تحت، یہ ڈیڑھ

شوشے کے برابر لکھی جاتی ہے۔ مثلاً (ہ ن و ز) کو خطّاطی کے مطابق اِس طرح لکھا جائے گا: "ہنوز"۔ جب کہ "ہیں" میں یہی ہائے ہوّز، صرف ایک شوشے کی صورت میں نمایاں ہوگی۔ اِس دو رنگی کو بھی ختم ہونا چاہیے۔ یہ بھی معمولی مگر کارآمد تبدیلی ہوگی۔

تناسب کے حُسن کو برقرار رکھنے کے لیے، اور کبھی کُرسی کو صحیح رکھنے کی خاطر، بعض حرفوں میں کشش کو آمیز کر دیا جاتا ہے اور بعض جگہ اِس سے التباس کی گنجایش نکل آتی ہے۔ جیسے ایک لفظ ہے: قطعہ، اِس کو "قطعـہ" بھی لکھ دیا جاتا ہے، جب کہ ع کے بعد سؔ کے جوڑ کے لیے شوشے کی ضرورت نہیں ہوتی اور اِس طرح اِس احتمال کی گنجایش پیدا ہو جاتی ہے کہ شاید یہاں ع کے بعد سؔ بھی ہو۔ اِسی طرح "مثـنوی"، "منافع" "مقطـع"، "خـط" جیسے لفظوں میں اِس زائد کشش کا داخلہ ممنوع ہونا چاہیے۔ یہ بھی فروعی تبدیلی ہوگی۔

ممکن ہے کہ طباعت کے لیے بعض اور ترمیموں کی ضرورت بھی محسوس کی جائے۔ دن ہوئے کہ حیات اللہ انصاری صاحب نے اِس سلسلے میں ایک چھوٹا سا مگر مفید مضمون لکھا تھا، جس میں طباعت کے نقطۂ نظر سے ایسی بعض تبدیلیوں کی ضرورت کا اظہار کیا گیا تھا (مشمولہ ہماری زبان، ۲۲ جون ۱۹۶۳ء)۔ اِن مسائل پر اجتماعی طور پر ضرور غور کیا جانا چاہیے۔ اِس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ جب کچھ ترمیموں کا تعیّن کیا جائے گا تو اِس کی بھی ضرورت ہوگی کہ ترقیِ اُردو بورڈ نئے کاتب صاحبان کی تربیت کا انتظام بھی کرے، جن کو شروع ہی سے تربیت دی جائے۔ اِس انتظام کے بغیر، ساری بحث اور ساری عرق ریزی

بے کار ثابت ہو گی۔ پُرانے کاتب صاحبان، اپنے انداز میں مشکل ہی سے کسی تبدیلی کو قبول کر سکتے ہیں۔ قبول کر بھی لیں گے، تب بھی قلم وہی پُرانے نقش بنائے گا۔ رہی عام تحریر کی بات، تو اُس میں خود بہ خود ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں اور ہر شخص کا قلم، ایک الگ انداز سے حروف نویسی کرتا ہے، اِس لیے عام تحریر کے لیے کسی پریشانی کی ضرورت نہیں، اِس کے لیے کوئی منشور نہیں بنایا جا سکتا۔ اصل مسئلہ طباعت کا ہے، جس کا تعلق کتابت سے ہے۔

(۲)

ترکیب یعنی ایک حرف کے دوسرے حرف سے ملنے کی تین صورتیں ہیں:
(۱) ترکیبِ* سابق (۲) ترکیبِ لاحق (۳) ترکیبِ طرفین۔
ترکیبِ سابق کا مطلب ہے: حرف کا اپنے سے پہلے حرف سے ملنا، جیسے: "با" میں الف کا ب سے ملنا۔ ترکیبِ لاحق کا مفہوم ہے: حرف کا بعد والے حرف سے ملنا، جیسے "رنج" میں ن کا ج سے ملنا۔ ترکیبِ طرفین سے مراد ہے: حرف کا دونوں طرف سے، یعنی اپنے پہلے والے اور بعد والے حرف سے ملنا، جیسے "عجیب" میں ج کا ع اور ب سے ملنا۔
نو حرف ایسے ہیں جو کسی اگلے حرف سے ملا کر نہیں لکھے جا سکتے۔ گویا یہ حرف

---

* یہ اصطلاحیں، مولوی نذیر احمد صاحب کے رسالے رسم الخط سے ماخوذ ہیں۔ اِس بیان کا بڑا حصّہ، اِسی رسالے پر مبنی ہے۔ واوین میں جو عبارتیں آئیں گی، وہ اِسی رسالے سے ماخوذ ہوں گی۔ اِس کی اشاعتِ پنجم پیشِ نظر ہے، "مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج"، سالِ طبع ۱۹۱۹ء۔

ترکیبِ لاحق سے محروم رہتے ہیں اور اِس طرح ترکیبِ طرفین سے خود بہ خود محروم رہیں گے۔ یہ حرف ہیں: ا، د، ڈ، ذ، ر، ز، ڑ، ژ، و۔ جب بھی یہ حرف کسی کلمے میں واقع ہوتے ہیں تو وہاں پر اُس لفظ کی ترکیب ٹوٹ جاتی ہے اور وہ کلمہ ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جیسے: دیدار، دال، ڈوریا، وقت، دولت، بولنا۔

ب، پ، ت، ٹ، ث، ن، ي؛ یہ سات حرف، ترکیب کی صورت میں ٹوٹ کر، تین شکلیں اختیار کرتے ہیں:

(۱) جب یہ س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، و، ي؛ اِن بارہ حرفوں کے ساتھ ترکیبِ لاحق کے ساتھ آئیں گے تو اِن کی مختصر صورت یہ ہوگی: ﺑ۔ نقطوں کی مدد سے مختلف حروف کی تعیین کی جائے گی، جیسے: بس، نص، یش، تو، بط، بع، بق، پف، بی، بے، نے، ٹوپ۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ یؔ اور ےؔ کے ساتھ یہ صورت اُسی وقت ہوگی جب یؔ یا ےؔ آخری حرف کے طور پر آئیں، جیسے: نی، نے، پے، ٹے۔ اگر یؔ درمیانی حرف ہوگا تو یہ صورت نہیں آئے گی، اُس وقت اِن حرفوں کو شوشے کی صورت میں لکھا جائے گا۔ جیسے: نیم، بیمار، تیمّم۔ یہ تخصیص کی صورت ہے۔

(۲) مذکورہ سات حرف (ب، ت، .....) جب ج، چ، ح، خ، م؛ اِن پانچ حرفوں کے ساتھ ترکیبِ لاحق کے ساتھ آئیں گے تو اِن کی مختصر شکل یہ ہوگی: ﺑ۔ جیسے: بچ، رنج، بم، نم، یم، تج۔

ہؔ جب درمیان میں آتی ہے تو گھنڈی دار لکھی جاتی ہے، جیسے: کہنا۔

کبھی دارہ کے ساتھ بھی اِن مذکورہ سات حرفوں کو اِسی طرح ترکیبِ لاحق دی جائے گی، جیسے: بہت، نہانا، ٹہلنا۔ ہائے مخلوط کے ساتھ بھی یہی صورت رہے گی، جیسے: ٹھگ، بھٹ۔

(۳) باقی حروف کے ساتھ ترکیبِ لاحق کی صورت میں اِن کو شوشے کی صورت میں لکھا جائے گا، جیسے: بدن، بن، تک، بل، نگ۔ ترکیبِ طرفین کی صورت میں بھی یہ شوشے دار لکھے جاتے ہیں، جیسے: بننا، کٹنا، جینا۔

ج، چ، ح، خ: ترکیبِ لاحق کی صورت میں اِن کا ابتدائی حصّہ باقی رہتا ہے، جیسے: جمنا، چلو۔ ترکیبِ طرفین کی صورت میں بھی اِن کو اِسی طرح لکھا جائے گا، جیسے: عجب، رنجیدہ، پیچیدہ۔ ترکیبِ سابق کی صورت میں یہ پورے لکھے جائیں گے، جیسے: رنج، پیچ۔

د، ڈ، ذ: یہ حرف صرف ترکیبِ سابق کو قبول کرتے ہیں، اور اِس صورت میں ذرا سی تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ اِن کا مُڑا ہوا سر، سیدھا ہو جاتا ہے۔ جیسے: بد، نذر، ضد۔

ر، ڑ، ژ، ز: یہ حرف بھی ترکیبِ سابق ہی کو قبول کرتے ہیں اور اِس صورت میں، اِن میں ایک کشش کا اضافہ ہو جایا کرتا ہے، جس سے اُتار پیدا ہو جاتا ہے، جیسے: نظر، کمر، تر، بڑ، پژمردہ۔

دال اور رے کے جوڑ میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ ر کے سر میں دوسرے حرف کا جوڑ لگایا جاتا ہے، جیسے: تر۔ اور د کے بیچ میں جوڑ لگتا ہے، جیسے: بد۔

س، ش، ص، ض: ترکیبِ لاحق کی صورت میں اِن حروف کا

جُزوِ اوّل باقی رہتا ہے، جیسے: سل، شام، صاف، ضعف۔ یہ خیال رہے کہ ص اور ض میں شوشہ، جزوِ حرف ہے، یہ ہمیشہ نمایاں رہے گا، جیسے: صبا، کہ اِس کو "صبا" نہیں لکھا جا سکتا۔ ترکیبِ طرفین کی صورت میں بھی یہ اِسی طرح لکھے جائیں گے، جیسے: نصف، کشف، نسیم۔ اور ترکیبِ سابق کی صورت میں یہ باقی حروف کی طرح پورے ہی لکھے جائیں گے، جیسے: نص، بس۔

ط، ظ: یہ دونوں حرف ہر صورت میں اِسی طرح رہتے ہیں، جیسے: طرح، بط، نظر۔

"ع اور غ کا یہ حال ہے کہ مفرد ہوں یا ترکیبِ لاحق ہو؛ دونوں صورتوں میں اِن کا سر کشادہ رہتا ہے، لیکن ترکیبِ سابق میں بند کر دیا جاتا ہے، جیسے: موقع"۔

ترکیبِ طرفین میں بھی اِن کا سر بند رہتا ہے، جیسے: تعجب، مغلوب۔

"ف کا سر پوری صورت میں بند ہے، مگر ترکیبِ سابق میں کھل جاتا ہے، جیسے: تعف وغیرہ"۔ ترکیبِ لاحق میں اِس کا سر بند رہتا ہے، جیسے: فرقت۔ ترکیبِ طرفین میں سر کھُل جائے گا، جیسے: نفس۔

ق: ترکیبِ لاحق میں ف کی طرح ق کا سر بھی بند رہتا ہے، جیسے: قالب۔ ترکیبِ سابق میں، ف کے برخلاف، ق کا سر بند رہتا ہے، جیسے: شق۔ ترکیبِ طرفین میں ف اور ق دونوں کا سر کھُل جائے گا، جیسے: نفس، نقش، نفع، شفقت۔

ک، گ: اِن دونوں حرفوں کو الف اور لام کے ساتھ جب ترکیبِ لاحق دی جائے گی تو اِن کی صورت گول ہو جائے گی، جیسے: کا، کل، گا، گل۔

الف اور لام کے سوا دوسرے حرفوں کے ساتھ ترکیب کی صورت میں اِن کا ابتدائی حصہ (ک یا گ) آئے گا، جیسے: بکنا، لگنا، کب، گپ، کر۔

ل: ترکیب کی صورت میں اِس کا ابتدائی حصہ (ل) باقی رہے گا، جیسے: تلنا، چلنا، لکڑی، لایا، لگانا۔

م: ترکیبِ لاحق اور ترکیبِ طرفین کی صورت میں اِس کا پہلا حصہ (م) باقی رہ جاتا ہے، جیسے: چمکنا، مٹنا، مانا۔ آخر میں اور حروف کی طرح یہ بھی پورا لکھا جائے گا، جیسے: ہم، تیمم۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ترکیبِ طرفین میں اِس کا سر نیچے کی طرف جھکا رہے گا، جب کہ ترکیبِ لاحق میں اِس کا سر اوپر کو اُٹھا رہے گا۔ آخر میں اِس کا سر اندر کی طرف جھکا رہے گا، جیسے: چمکنا، ہم اور منہ، ماں۔

ہ: ترکیبِ لاحق کی صورت میں یہ ب وغیرہ کے شوشے کی طرح آئے گی، جیسے: ہوا، ہم، ہمت۔ شوشے کے نیچے ایک اور شوشہ بنایا جائے گا، جسے لٹکن بھی کہتے ہیں (ا ہ)۔

ترکیبِ طرفین میں اِس کی صورت بدل جاتی ہے اور اِس صورت کو "کُہنی دار ہ" کہا جاتا ہے، جیسے: بہت، کہنا، ترکیبِ سابق میں اِس کی صورت ایک شوشے سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔ اگر ہ ملفوظ ہے تو اُس کے نیچے شوشہ آئے گا، جیسے: جگہ، یہ، تہ، کہ۔ اگر مختفی ہے تو نیچے کا شوشہ نہیں آئے گا، جیسے: سرمہ، کعبہ۔

ہائے مخلوط کو دو چشمی کی صورت میں لکھا جائے گا، جیسے: گھر، بھر۔

اِس سلسلے میں اِس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ ترکیبِ سابق کی صورت میں ہ کے ساتھ اور سب حرفوں کے جوڑ کے لیے، اُس حرف اور

ہ کے درمیان (ہ ملفوظ ہو یا مختفی) کوئی شوشہ نہیں آئے گا، یعنی جوڑ نمایاں نہیں ہوگا، جیسے: مہ، بہ، تہ، نہ، یہ۔ مگر حرفِ اوّل اگر ہ ہے، تب جوڑ کا شوشہ ضرور نمایاں ہوگا، جیسے: امروہہ، دو ماہہ۔ جس طرح "یہہ" یا "یہہ" لکھنا غلط ہے، اُسی طرح "امروہہ" لکھنا بھی غلط ہوگا۔

کُل حرفوں کے واسطے یہ قاعدہ ہے کہ جب آخر میں واقع ہوں گے تو اپنی اصلی صورت پر لکھے جائیں گے، لیکن اِس سے د، ڈ، ذ، ر، ڑ، ز، ژ، ع، غ، ف، ہ مستثنا ہیں۔ د، ڈ، ذ میں ابتدائی حصّے کی ٹیڑھ کی صورت ذرا سی بدل جاتی ہے، جیسے: بد۔ اور ر، ڑ، ز، ژ میں کشش میں ذرا سا اضافہ ہو جاتا ہے، جیسے: تر، کر۔ ع اور غ کی یہ صورت ہے کہ اُن کا سر بند ہو جاتا ہے، جیسے: شمع، مغ۔ ف کا سر بند ہے، مگر ترکیبِ سابق میں کُھل جاتا ہے، جیسے: تلف، کف۔ ہ کا مفصّل بیان ابھی ہو چکا ہے۔
ذیل کے نقشے میں مجموعی طور پر حرفوں کی مختلف مختصر ترکیبی صورتوں کو دیکھا جا سکتا ہے:

ا : اب، بادہ

ب، پ، ت، ٹ، ث، (ن، ی) : ٮ ر ل۔ بد، بس، تیج، تجّا تی، نے، بب، تپ، پت۔

ج، چ، ح، خ : ﺣ نج، جج، عجب۔

د، ڈ، ذ : ﮈ بد، کھڈ، نذر، مدد، ابدال۔

ر، ڑ، ز، ژ : ﺮ تر، نر، برڑ، تراب۔

س، ش : ﺳ، ﺷ سگ، مسکنا، مشک، شخص۔

		بس ،کش ۔
ص ،ض	: صـ	صاف ، مصفا ، مضاف ۔نص ،بعض ۔
ط ،ظ	: ط	طا ، بط ، بطخ ۔
ع ،غ	: ء ع	عقب ، غصہ ، شمع ، جمع ۔
ف	: فـ ، فـ	فوراً ، تفریح ،کف ۔
ق	: قـ ، قـ	قاف ، وقت ،تقدیر ۔شق ،عشق ۔
ک ،گ	: کـ ،گـ ، کا	کا ، کل ، گا ، گل ۔کب ،گیت ، ہلکنا ، ٹھگنا ۔
ل	: لـ	لام ، بلا ، الگ ،کلب ، لب ۔ بل ، چل ،گل ، کل ۔
م	: مـ	مان ، ممتا ، جماو ۔
ن	: نـ ، ـنـ ، نـ	نقد ، ناپ ، نچانا ، نبھانا۔
و	: و	وقت ، ہوا ، بونا ۔
ہ	: ہـ ، ـہـ ، ـہ ، ـہ ، ھ	ہوا ، ہمت ، بہت ، کہنا ۔ ماشہ ، نہ ۔ جگہ ، یہ ۔ گھر ، بھر ۔ تہ ، مہ ۔
ی	: یـ ، ـیـ ، یـ	یاد ، یخ ، یم ، لیس ، بیپار ، بیان ، یوسف ، یعقوب ۔

حرفوں کے جوڑوں میں اِس کا خیال رکھنا چاہیے کہ شوشے نہ کم ہوں نہ زیادہ۔ میں دو تین مثالوں سے اِس بات کو واضح کرنا چاہوں گا :

ب، پ، ت، ٹ، ث، ن اور ی؛ یہ سات حرف جب ج، چ، ح، خ اور م کے ساتھ ملتے ہیں تو اُن کی صورت یہ ہو جاتی ہے: ـ۔
جیسے: بچ ۔ اب اگر اِس سے پہلے ایک اور حرف کا اضافہ مقصود ہو تو صرف اُسی حرف کے شوشے کا (یا اُس کے ابتدائی حصّے کا) اضافہ ہو جائے گا، جیسے: بچ سے بیچ (ب، ی، چ) یا جیسے: یم سے نیم ۔ اِن کو "بییچ" یا "نییم" لکھنا صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ ایک شوشہ فالتو ہے۔
یا جیسے ف اور ق اپنے سے پہلے آنے والے حرف کے لیے شوشے کا مطالبہ نہیں کرتے، جیسے: تنقید ۔ اِس کو "تنںقید" لکھنا بھی صحیح نہیں ہوگا۔
یا جیسے: ہائے مختفی ہو یا ملفوظ، دونوں صورتوں میں، ترکیبِ سابق میں اُس سے پہلے جوڑ کے اظہار کے لیے کوئی شوشہ نہیں آئے گا، جیسے: یہ، تہ، نہ، بہ ۔ اِن کو "ییہ" یا "تیہ" لکھنا غلط ہوگا، مگر جب حرفِ اوّل خود ہ ہو، تب جوڑ کے لیے شوشہ ضرور آئے گا، جیسے: درماہہ ۔
کھنی دار ہ کی صورت ترکیبِ طرفین میں آتی ہے، جیسے: کہنا، بہنا، قہقہہ، شبہہ ۔ اِس لیے "کہنا" مصدر کے امر کو "کہہ" لکھنا غلط ہوگا، اِسی طرح "یہہ" لکھنا بھی غلط ہوگا ۔ اِن کو "کہ" اور "یہ" لکھا جائے گا۔

ذیل میں مختلف حرفوں کی تختیاں لکھی جاتی ہیں، اِن سے نستعلیق کے جوڑوں کا صحیح صحیح علم ہوگا ۔ کچھ تین حرفی اور اِس سے زیادہ حرفوں سے مرکب لفظوں کو نسخ و نستعلیق دونوں میں لکھا گیا ہے؛ مقصد یہ ہے کہ اِن مثالیہ کلمات کے واسطے سے دونوں خطوں میں مختلف حرفوں کے جوڑوں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ ذہن نشین کیا جا سکے ۔

یہ بات ذہن میں رہے، اور اسی لیے اِس کی تکرار کی جاتی ہے کہ خوش خطی ایک فن ہے ۔ خوش نویس کے قلم سے دائروں میں جو تراش اور نزاکت پیدا ہوگی اور جوڑوں میں جو نفاست ہوگی اور حرفوں کی کرسی میں جو درستی ہوگی، وہ عام قلم سے اُس طرح نہیں نمایاں ہوسکتی ۔ مقصد بھی یہ نہیں ہوتا۔ مقصد ہوتا ہے بنیادی طور پر حرفوں کے جوڑوں کو سمجھنا اور روش کو سیکھنا۔ خطّاط کا قلم ، فن کاری کے پورے آداب کے ساتھ نقش بناتا ہے اور بنائے گا اور عام آدمی کا قلم سادگی اور سہولت کے ساتھ اُس روش میں حرفوں اور لفظوں کو لکھے گا ۔ میں ایک دو مثالوں سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا :

اصولِ خوش نویسی کی رو سے ، دو شوشے ایک ساتھ نہیں آتے ـــ ایک پیالہ ہوتا ہے ، ایک شوشہ ۔ جیسے : بنتا ، اِس لفظ میں پہلا جوڑ پیالے کا ہے ، دوسرا شوشہ ہے ۔ پیالے اور شوشے میں قلم کا فرق ہوتا ہے یہ مقصد ہے خوش نمائی اور توازن ، جس کی خطّاطی میں اصل حیثیت ہے ۔ظاہر ہے کہ عام لکھاوٹ میں یہ صورت باقی نہیں رہے گی ، اِس میں سیدھے سادے شوشے بنیں گے ۔ کتابت میں ہمیشہ اور لازمی طور پر مسلمہ آداب کو ملحوظ رکھا جائے گا اور عام تحریر میں سادگی رہے گی اور اِس میں کسی طرح کا تضاد نہیں ہے ۔

ایک لفظ ہے " پیچ "۔ اِس کے ٹکڑے ہیں : پ ، ی ، چ ۔ پ اور ی کا جوڑ اِس طرح لگے گا کہ جوڑ کی نوک اوپر کو نمایاں نہیں ہوگی ، مگر عام آدمی اِس التزام کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یا جیسے " نظر " میں ظ ر کا جوڑ ذرا اُترا ہوا لگے گا اور " نظیر " میں ی کا شوشہ اُبھرا ہوا نہیں ہوگا ،

بل کہ پیالے کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ یہاں ہر جوڑ کے لیے پورا قلم لگایا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ عام تحریر میں یہ رکھ رکھاؤ بالکل اِسی طرح برقرار نہیں رہ سکتا۔

ٹائپ کی بنیاد نسخ پر ہے، مگر ٹائپ میں مختلف انداز ملتے ہیں۔ الگ الگ اداروں کے ڈھالے ہوئے حرف، نمایاں طور پر معلوم ہوتے ہیں، یہ ہوسکتا ہے (اور ہوتا ہے) کہ کسی ٹائپ میں جوڑوں کا اور کششوں کا وہ مکمل انداز محفوظ نہ ہو جو خوش نویس کے قلم سے نمایاں ہوتا ہے، مگر یہاں بھی نستعلیق کی طرح، اصل مقصد بنیادی روش کو محفوظ کرنا ہے، ایسی معمولی تبدیلیوں سے، بنیادی تبدیلی نہیں پیدا ہوتی، اِس لیے اِن کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں۔

با بب بج بد بر بس بش بص بط بع بف بق بک بل بم
بن بو بہ بھ بی بے

جا جب جج جد جر جس جش جص جط جع جف جق جک جل جم
جن جو جہ جھ جی جے

سا سب سج سد سر سس سش سص سط سع سف سق سک سل
سم سن سو سہ سھ سی سے

صا صب صج صد صر صس صش صص صط صع صف صق صک
صل صم صن صو صہ صی صے

عا عب عج عد عر عس عش عص عط عع عف عق عک عل عم
عن عو عہ عی عے

طا طب طج طد طر طس طش طص طط طع طف طق طک طل
طم طن طو طہ طی طے

فا فب فج فد فر فس فش فص فط فع فف فق فک فل فم
فن فو فہ فی فے

کا کب کج کد کر کس کش کص کط کع کف کق کک کل کم
کن کو کہ کھ کی کے

لا لب لج لد لر لس لش لص لط لع لف لق لک لل لم
لن لو لہ لھ لی لے

ما مب مج مد مر مس مش مص مط مع مف مق مک مل
مم من مو مہ مھ می مے

ہا ہب ہج ہد ہر ہس ہش ہص ہط ہع ہف ہق ہک ہل
ہم ہن ہو ہہ ہھ ہی ہے

بنتا	بنتی	تنقید	تمنّا	تنہا
بنتا	بنتی	تنقید	تمنّا	تنہا
کمی	زلف	جائزہ	نظر	نظیر
کمی	زلف	جائزہ	نظر	نظیر
منظر	ممتاز	کیفیت	بیان	صانع
منظر	ممتاز	کیفیت	بیان	صانع
تعیین	گفتگو	آئینہ	صنم	پختہ
تعیین	گفتگو	آئینہ	صنم	پختہ
صنعت	عقدہ	جسم	مجمع	شبنم
صنعت	عقدہ	جسم	مجمع	شبنم

اعراب ۔ علامتیں ۔ رموزِ اوقاف

اعراب :

اعراب سے مراد ہیں : زبر ، زیر ، پیش اور جزم ۔ یہ عربی کا لفظ ہے اور وہاں یہ اصطلاح ، خاص لفظ کے طور پر استعمال ہوتی ہے ، مگر اُردو میں اِس کو عام معانی میں استعمال کیا جاتا ہے اور اُردو کے لحاظ سے یہ ٹھیک ہے ۔ اُردو میں اعراب کے لیے " حرکات و سکنات " کی ترکیب بھی مستعمل ہے ، مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے قواعدِ اردو میں " اعراب " کے ساتھ قوسین میں اِس کو بھی لکھا ہے ؛ مگر اِس ترکیب کے مقابلے میں مفرد لفظ " اعراب " بہتر ہے ۔ جہاں صرف زبر ، زیر ، پیش سے مراد ہو ، وہاں " حرکات " کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ جس حرف پر اِن میں سے کوئی حرکت ہوگی ، اُسے " متحرک " کہا جائے گا ۔ جس حرف پر جزم ہوگا ، اُسے " ساکن " کہا جائے گا : جیسے : " دِل " میں دال ، متحرک ہے اور لام ، ساکن ہے اور اِن دونوں (زبر اور جزم) کے مجموعے کا نام " اعراب " ہے ۔

معروف و مجہول آوازوں کے لیے جو نشانیاں استعمال کی جاتی ہیں (جیسے :

مپست ، دوُر) یا بعض اور علامتیں ؛ اُن کو رواجِ عام کے مطابق " علامات " کے نام سے موسوم کیا گیا ہے ۔ صوتیات میں حرکات و علامات (مصوّتوں) کی تقسیم اِس طرح نہیں کی جاتی ؛ مگر یہاں متعارف طریقے ہی کو اختیار کیا گیا ہے ۔ صوتیات کی بحث کا یہ محل بھی نہیں ہے ۔

اُردو میں ہر لفظ پر زبر زیر لگانے کا رواج نہ تھا اور نہ ہے ، اور اِس کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں ۔ ہاں ، اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ کچھ لفظوں کے بعض ٹکڑوں پر زبر ، زیر ، پیش ، جزم ، یا کسی اور علامت کی ضرورت ہوسکتی ہے ، اور ہوتی ہے ۔ اردو میں حرکات ، حرفوں کا جز ہیں ، اِس طرح کہ جب کوئی لفظ لکھا جاتا ہے تو حرکات ، حروف کے باطن میں شامل ہوتی ہیں ۔ جو لفظ آسان ہیں ، یا تحریر و تقریر میں آتے رہتے ہیں ؛ اُن کے تلفظ سے ذہن اُسی طرح واقف ہوتا ہے ، جس طرح آنکھیں اُن کی صورت سے آشنا ہوتی ہیں ؛ اِس لیے نگاہ و زبان دونوں بہ یک وقت اُن کی تکرار کرتے ہیں ۔ مشکل ہوتی ہے اُن لفظوں میں جو استعمالِ عام سے ذرا دور رہتے ہیں ، یا جن میں کسی طرح کا اختلاف ہوتا ہے ، یا کسی نوع کا التباس ہوسکتا ہے ؛ ایسے لفظوں میں حرکات کا تعیّن بھی درکار ہوتا ہے ؛ واو اور یے کے سلسلے میں یہ بات بھی وضاحت کی طلب گار ہوتی ہے کہ معروف و مجہول آوازوں کے اعتبار سے کیا کیفیت پائی جاتی ہے (وغیرہ)، اور اِس کے بغیر ، غلط خوانی اور بعض جگہ غلط فہمی کے امکانات پیدا ہوسکتے ہیں ۔

یہاں پر یہ بات صاف ہوجانا چاہیے کہ اعراب (زیر ، زبر ، پیش ، جزم) نفسِ املا میں شامل نہیں ۔ حرکات کے بغیر بھی لفظ کو لکھا جاسکتا ہے اور لکھا ہی جاتا ہے ۔ ایک حرف جب دوسرے حرف کے ساتھ لکھا جائے گا تو

حرکات اُس ترکیب کے ساتھ ہی معرضِ وجود اور معرضِ اظہار میں آجائیں گی۔ مفرد حرف، حرکت سے محروم بل کہ یوں کہیے کہ بے نیاز ہوتا ہے، اِس صورت میں وہ محض ایک شکل کی حیثیت رکھتا ہے، غیر متحرک شکل۔ دوسرے حرف سے مل کر، اُس میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور یہ حرکت اُس کا باطنی جز بن جاتی ہے۔ اعراب یا علامات کی مدد سے، حسبِ ضرورت، ضروری تعیّنات کو خارجی سطح پر نمایاں کرنے کا فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔

ایک بات اور: بہت سے لفظوں کے تلفظ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی، مگر اکثر لفظوں کی صورت نویسی اِس طرح کی تبدیلیوں سے عموماً متاثر نہیں ہوتی؛ اور جن لفظوں میں اِس طرح کی تبدیلی ہوتی ہے، اُن کی تعداد محدود ہوتی ہے۔ مثلاً "مسرّت اور محبّت" اِن دو لفظوں کو لغت کے مطابق بہ فتحِ اوّل بھی بولا جاتا ہے، اور استعمالِ عام کے مطابق بہ ضمِ اوّل بھی استعمال کیا جاتا ہے، یا جیسے "افق" کو دراصل کے مطابق، "اُفُق" بھی بولتے ہیں اور عام لوگ "اُفق" بھی کہتے ہیں، اِس طرح کی سیکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں؛ تو یہ سب تلفظ کے مسائل ہیں، اور مسائلِ تلفظ بجائے خود ایک مستقل موضوع کا حکم رکھتے ہیں، اِن مسائل کو املا میں آمیز نہیں کرنا چاہیے۔ املا لفظوں کی صورت نویسی کا نام ہے، حرکات کا تعیّن اُس میں شامل نہیں؛ یہ دوسرا موضوع ہے، جس کا تعلق لُغت سے ہے۔

روزمرّہ کی تحریروں میں لفظوں پر اعراب لگانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، مگر بعض اہم مضامین میں اِس کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ ضبطِ حرکات

کی اصل ضرورت تدوین میں پیش آیا کرتی ہے ، جہاں یہ ضروری ہوتا ہے کہ بہت سے لفظوں میں اعراب و علامات کی مدد سے ، وضاحت کی آسانی فراہم کی جائے ۔ عہد بہ عہد کی تبدیلیوں نے ، اور زبان کی معلومات کے گرتے ہوئے معیار نے اب یہ لازم کردیا ہے کہ نثر و نظم دونوں میں ، ضروری لفظوں کے مختلف ٹکڑوں کو اعراب یا علامات سے مزیّن کیا جائے ۔ نظم میں اِس کی ضرورت نسبتاً زیادہ محسوس کی جائے گی ۔ بہت سے متروک اور کچھ قلیلُ الاستعمال لفظوں میں تو اعراب نگاری کو لازم قرار دیا جائے گا ۔

اِس کے علاوہ ، بعض مقامات اور ہیں جہاں (عام تحریروں میں بھی) ضبطِ حرکات کو ضروری سمجھا جائے گا ۔ اِن میں سے اہم ترین "اضافت کا زیر" ہے ۔ اضافت کے زیر کو ہر جگہ لازماً لگانا چاہیے ۔ عام تحریروں میں بھی اِس کی پابندی کرنا چاہیے اور تدوین میں تو اِس کو جزوِ لازم سمجھنا چاہیے اور اِس کے بغیر، تدوین کو ناقص قرار دیا جانا چاہیے ۔ یہ بات واضح ہو جانا چاہیے کہ اضافت کا زیر، متعیّن علامت ہے ، اِس کی حیثیت لفظوں کے مختلف فیہ تلفّظ کو ظاہر کرنے والے اعراب کی سی نہیں ہے ۔ یہ ایک اضافی علامت ہے جو دراصل (ي) کی قائم مقام ہے ، اِس لیے اِس کو لکھنا ضروری ہے ۔ بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں جہاں اضافت کے عدمِ تعیّن سے اچھا خاصا آدمی غلط خوانی کے پھیر میں آ سکتا ہے ۔

اُس ، اِس ، اُن ، اِن ، اُدھر ، اِدھر : اِن کلمات میں الف پر زیر یا پیش لازماً لگانا چاہیے ۔ ایک زمانے میں پیش کے اظہار کے لیے اِن لفظوں کو مع واو لکھا جاتا تھا اور واو کے نہ ہونے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ الف پر زیر ہے ۔ وہ واو تو "اعراب بالحروف" کے پھیر میں آکر نکل گیا ،

اُس کی جگہ قاعدے کے مطابق پیش نے لے لی ہے!اب اِس پیش کو، اور اِس کے ساتھ "اِس ، اِن ، اِدھر" میں زیر کو پابندی کے ساتھ لکھنا چاہیے۔

مشکل یا کم متعارف لفظوں پر اعراب لگانا مناسب بات ہے ، مگر اِس سلسلے میں کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا ، یعنی لفظوں کا تعیّن نہیں کیا جاسکتا۔ یہ لکھنے والے کی صواب دید پر منحصر ہے۔ عبارت کی نوعیت ، عہد کے تعینات ، غرض مختلف اُمور پر اِس کا انحصار ہوگا۔ بہ ہر صورت، مناسب یہ ہوگا کہ ایسے لفظوں کے ضروری اجزا پر اعراب ضرور لگائے جائیں، جن کے پڑھنے میں اوسط درجے کی استعداد رکھنے والے کو مشکل پیش آسکتی ہے۔ اِسی طرح اُن لفظوں پر بھی اعراب لگا دینا چاہیے جن میں التباس کا احتمال ہوسکتا ہے ، جیسے : پُرکار ، نفی ، لُغت وغیرہ۔

ابتدائی درسی کتابوں میں اعراب نگاری کا ضرور لحاظ رکھنا چاہیے۔ عربی ، فارسی ، ہندی وغیرہ کے ایسے الفاظ جن کے تلفّظ میں غلطی کا احتمال ہوسکتا ہو، اُن کے بعض اجزا کو حرکت و سکون کے تعیّن کے ساتھ پیش کرنا چاہیے۔ اِس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ طالب علم شروع ہی سے تلفّظ کی اہمیت سے باخبر رہے گا ؛ اِس وقت بھی پڑھنے میں آسانی ہوگی اور آیندہ بھی وہ لفظ اُس کی زبان سے اُسی طرح ادا ہوں گے۔ آج کل کے حالات کو دیکھتے ہوئے اِس کی ضرورت بہت زیادہ ہے۔ اِس ضرورت میں اضافہ یوں اور ہوگیا ہے کہ بہت سے اساتذہ بھی اب تلفّظ کی طرف سے بے نیاز ہوچکے ہیں۔

اِس بحث کے آخر میں ، اِس بات کی تکرار کی جاتی ہے کہ اعراب نگاری

ضروری چیز ہے، مگر وہ املا کا جز نہیں، یعنی اصل املا میں شامل نہیں۔ یہ اضافی صفت ہے، جس کی مدد سے عبارت کو صحیح پڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ اِس کے التزام سے لکھنے والے کی ذمّے داری بڑھ جاتی ہے، اُس کی مشکلوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، بل کہ صحیح معنی میں اُس کی صلاحیت اور معلومات کا امتحان ہوتا ہے۔ وہ سرخ رو بھی ہو سکتا ہے اور رسوا بھی۔ اچھے لکھنے والے کو اِس امتحان کے لیے تیار رہنا چاہیے، اور تدوین کا کام انجام دینے والوں کو، اور ابتدائی درسی کتابیں مرتّب کرنے والوں کو تو لازماً اِس کے لیے آمادہ و مستعد رہنا چاہیے۔ اِس کے مقابلے میں، پڑھنے والے کو اعراب و علامات کی مدد سے عبارت کے صحیح پڑھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ آسانی و مشکل کا یہ اجتماع بہت دل چسپ چیز ہے۔

علامات:

علامتیں تین طرح کی ہوتی ہیں: ایک تو وہ جو کسی حرف کی نمایندگی کرتی ہیں، جیسے تشدید، کہ یہ ایک حرف کی نمایندگی کرتی ہے، جیسے لفظ "مدّت" میں دال پر تشدید کا مطلب یہ ہے کہ یہاں اصلاً یہ حرف مکرّر تھا (مددت)۔ دوسری قسم کی علامتیں وہ ہیں جن کو اعراب کی ایک قسم کہا جا سکتا ہے، جیسے واوِ معروف پر اُلٹا پیش۔ اور تیسری قسم میں وہ علامتیں آتی ہیں، جن کی مدد سے بعض لفظوں کے خاص مفہوم کے تعیّن میں مدد ملتی ہے، یا وہ ایسے مخفّفات ہوتے ہیں جو کسی خاص مفہوم کی طرف ذہن کو منتقل کرتے ہیں۔

الف :

پہلی قسم کی علامتیں ، حروف کا درجہ رکھتی ہیں ؛ اِس لیے یہ شاملِ املا ہیں اِس فہرست میں (۱) مد (۲) تشدید اور (۳) تنوین کے اعرابؑ آتے ہیں۔ مد ، الف کی قائم مقامی کرتا ہے ، جیسے لفظ " آب " میں الف پر مد کی علامت کا مطلب یہ ہے کہ یہاں دراصل دو الف ہیں (اا ب) ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے " الفِ ممدودہ " کا بیان ۔ تشدید ، اُسی حرف کی تکرار کو ظاہر کرتی ہے (مددت) ، اور تنوین کے اعراب ، نون کی قائم مقامی کرتے ہیں (نظم میں " فوراً " کے قافیے میں " گلشن " آسکتا ہے اور اِس کی وجہ یہی ہے ۔ اِس کی بحث " تنوین " کے ذیل میں آچکی ہے) اصولاً یہ تینوں علامتیں جزوِ املا ہیں ، اِس لیے اِن کو لکھنا ضروری ہے ۔

مد کی طرح تشدید بھی ایک حرف کی نمایندگی کرتی ہے اور اِس لحاظ سے اصلاً وہ بھی لازماً جزوِ املا کی حیثیت رکھتی ہے ، مگر شروع سے کچھ ایسی صورت رہی ہے کہ ایسے اکثر لفظ ، جن میں حرفِ مشدّد موجود ہوں ، تشدید کے بغیر ہی لکھے جاتے رہے ہیں ، یوں اِس کا التزام برقرار نہیں رہا ، جب کہ مد اور تنوین کے اعراب کو برابر استعمال کیا جاتا رہا ہے ۔ اب صورت یہ ہے کہ اصولاً تو تشدید شاملِ املا ہے ، مگر عملاً وہ شاملِ کتابت کم ہوتی ہے ۔ غالباً وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ مد ، اور تنوین کے اعراب نہ لکھنے سے ، لفظوں کو صحیح صحیح پڑھنا مشکل ہوگا ، " آب " کو اگر مد کے بغیر لکھا جائے تو اُس

لہ عربی کے لحاظ سے تنوین کی حرکات بھی شاملِ اعراب ہیں ، مگر اردو کے لحاظ سے ، اِن کو مد کی طرح ، علامات کے ذیل میں رکھا گیا ہے ۔

کو "آب" پڑھا جائے گا، اور "عمداً" کو دو زبر کے بغیر "عمدا" بروزن فردا پڑھا جائے گا، مگر "مدت" کو "مدّت" ہی پڑھا جائے گا اور "متعلق" کو "متعلّق" ہی بولا جائے گا، یعنی تشدید کے بغیر بھی لفظوں کو صحیح طور پر پڑھا جا سکتا ہے۔ ایسے لفظ نگاہوں میں بس چکے ہیں، نظر اُن کی صحیح صورت آسانی سے دریافت کر لیتی ہے اور زبان اُس کی تکرار کرتی ہے۔ مگر یہ اکثریّہ ہے، کُلّیہ نہیں۔ بہت سے مقامات پر تشدید کے بغیر اُلجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ میں ایک مثال سے اِس بات کو واضح کرنا چاہوں گا، عرؔفی کا شعر ہے:

امید ہست کہ بیگانگیِ عرؔفی را بدوستیِ سخنہای آشنا بخشند

"بیگانگی" اور "دوستی" کی یے مشدد ہیں، اگر یہاں تشدید نہ لکھی جائے تو غلط خوانی کے ساتھ غلط نویسی اِس طرح پیدا ہوگی کہ اِن کو "بیگانگیٔ" اور "دوستیٔ" لکھا جائے گا، جس طرح کہ بہت سے لوگ لکھ دیتے ہیں، اور "بیگانگیِ ء" اور "دوستیِ ء" پڑھا جائے گا۔ املا بھی غلط ہوا اور تلفّظ بھی چوپٹ ہوا۔ "ردی" اور "ردّی" دو لفظ ہیں، تشدید کے بغیر (نثر میں) اِن دونوں میں امتیاز کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہی صورت "ندی" اور "ندّی" کی ہے۔ اِس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

بہ ہر طور، اب جہاں تک ممکن ہو، تشدید کا التزام کرنا چاہیے۔ نصابی کتابوں میں تو لازماً اِس کو لکھا جانا چاہیے۔ حرف کے قائم مقام ہونے کی وجہ سے، تنوین کے اعراب اور مد کی طرح، اِس کا وجود بھی ضروری ہے۔

ب:

اب رہیں دوسری قسم کی علامتیں، تو جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، یہ نفسِ املا

میں شامل نہیں، مگر اِن کو صحتِ کلام کے اہم اسباب و وسائل میں شمار کرنا چاہیے، اور اِسی لحاظ سے حسبِ ضرورت اِن کو استعمال بھی کرنا چاہیے۔
شروع میں جس طرح اعراب کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا تھا، اُسی طرح اِس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی کہ یاے معروف و مجہول یا واوِ معروف و مجہول کے لیے علامتوں کا تعیّن کیا جائے۔ قواعدِ صرف و نحو کی طرح اِس کی ضرورت بھی سب سے زیادہ غیر ملکیوں نے محسوس کی، اور یہ قدرتی بات تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں اِس کا اہتمام کیا گیا کہ کچھ علامتوں کو استعمال کیا جائے۔ کالج کی کتابوں میں سے میرے سامنے اِس وقت میر حسن کی مثنوی سحر البیان کا مطبوعہ نسخہ ہے، اور میر امّن کی کتاب گنجِ خوبی کے اُس خطّی نسخے کا عکس ہے، جس کے متعلق آخرِ کتاب میں یہ صراحت ملتی ہے کہ یہ نسخہ خود میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے (مخطوطہ مخزونہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن)؛ اِن دونوں میں واوِ معروف اور یاے معروف کے لیے کوئی علامت استعمال نہیں کی گئی ہے، البتّہ واوِ مجہول اور یاے مجہول دونوں کے لیے ایک ہی علامت "ہ" استعمال کی گئی۔ ، جیسے:
لیوے، ایک، روز، کوئی، نوک، توتا۔
یاے ماقبل مفتوح اور واوِ ماقبل مفتوح کے لیے بھی ایک ہی علامت "^" استعمال کی گئی ہے، جیسے: میذ، ایسا، ہیں، دھول، بیٹھ، نورتن جوشن، اور، جیسے۔
نونِ غنّہ جب درمیانِ لفظ میں آیا ہے، تو اُس پر نقطہ نہیں رکھا گیا ہے بل کہ اُس پر چھوٹا سا گول دائرہ بنا دیا گیا ہے، جیسے: ہنسا، ہنس، ہنسوڑ، منہ۔

گویا کُل تین علامتیں استعمال کی گئی ہیں ۔ اِس سلسلے میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں: ایک تو یہ کہ ےؔ اور وؔ دونوں کے لیے ایک ہی علامت کا انتخاب کیا گیا، اور دوسرے یہ کہ علامتوں کی تعداد کم سے کم ہے ۔ یہ دونوں باتیں بہت اہمیت رکھتی ہیں ۔ یہ نہایت صحیح طریقۂ کار تھا کہ علامتوں کی کثرت سے عبارت کو بوجھل نہ بنایا جائے ۔

اِن علامتوں میں مختلف اوقات اور مقامات پر کئی طرح کی تبدیلیاں ہوتی رہیں ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اپنی کتاب قواعدِ اردو میں حسبِ ذیل علامتوں کا تعیّن کیا تھا :

" واؤ معروف پر اُلٹا پیش لکھتے ہیں ، اور واؤ مجہول خالی رہتی ہے "۔ واؤ معدولہ : " اِس قسم کی واؤ کے نیچے ایک چھوٹا سا خط کھینچ دیا جاتا ہے ، تاکہ امتیاز ہو سکے "۔ نونِ غنہ جب آخر میں آتا ہے تو اُس میں نقطہ نہیں دیتے ، لیکن جب بیچ میں آتا ہے تو اُس پر اُلٹا جزم (۷) لگانا چاہیے "۔

" بعض الفاظ میں یؔ بھی اپنے پہلے کے ساتھ اِس طرح مل کر پڑھی جاتی ہے کہ وہ دونوں ایک آواز معلوم ہوتے ہیں ، جیسے : کیا ، کیاری ، پیارا ، دھیان ، چیونٹی ، گیارہ ۔ اِس کا نام ہم نے " یائے معدولہ " رکھا ہے ۔ امتیاز کے لیے ایسی یؔ کے اوپر یہ (۷) نشان لگا دیتے ہیں "۔

(قواعدِ اردو ، طبعِ چہارم ، ص ۱۴)

۱۔ محکمۂ تعلیماتِ پنجاب کی کچھ کتابوں میں یہ علامت ملتی ہے ۔ قواعدِ اردو کی ایک کتاب افضل القواعد میں بھی اِس علامت کو لکھا گیا ہے ۔

مولوی صاحب مرحوم نے بھی اختصار کو ملحوظ رکھا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب بھی کسی زبان کو پڑھا جائے گا تو اُس کی مختلف آوازوں کو سمجھنا ہی ہوگا۔ یہ بہت مشکل ہے کہ محض علامتوں کی مدد سے کسی زبان کے ہجے کے اُتار چڑھاو کو سمجھ لیا جائے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے لکھا تھا:

"لوگ اکثر املا کو بھی زبان سمجھ بیٹھتے ہیں، حالاں کہ املا تو لفظوں کی تصویر کھینچنے کی ایک کوشش ہے، جو ہمیشہ کام یاب نہیں رہتی۔ املا کے قاعدے کیسے ہی ہمہ گیر اور مکمل بنائے جائیں، زبان کی پوری اور سچی ترجمانی اُن سے مشکل ہی سے ہو سکتی ہے۔ ایک "کوئی" کا لفظ ہم کئی طرح پر ادا کرتے ہیں"۔ (مقدمۂ کلیاتِ ولی)

معروف ایرانی مصنف ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری نے لکھا ہے:

"ہیچ خطی نیست کہ درست از چگونگی تلفظ زبانی حکایت کند، و ہر گو چنین خطی در نوشتن مطالب عادی معمول نخواہد شد..... در ہر زبانی لہجہ ہا و تلفظہای مختلف وجود دارد، علامتہای خط تنہا برای تلفظ عادی یا متوسط بکار میرود و ہرگز نمی توان برای ہر گونہ تفاوت لہجہ علامت خاصی قرار داد"۔

(زبان و خط، مجلۂ سخن، دورۂ نہم، شمارۂ ۱۲، ۱۳۰)

اِس طرف دس پندرہ سال کے عرصے میں مختلف لوگوں نے بہت سی علامتوں کی تشکیل کی ہے؛ اگر اُن سب کو استعمال کیا جائے تو اُردو کی عبارت سے زیادہ اُلجھن میں ڈالنے والی چیز دوسری نہیں ملے گی۔ ذہن اُلجھے گا، نگاہ گھبرائے گی اور زبان دھوکے کھائے گی اور پڑھنے والے کو پرچۂ ترکیبِ استعمال ساتھ لے کر بیٹھنا پڑے گا۔ انگریزی کچھ ایسی آسان زبان نہیں، اور اُس

کی عبارتوں میں شاید سب سے کم علامتوں کا استعمال ہوتا ہے۔

بہ ہر حال، اُردو میں جس طرح اعراب کا استعمال محدود پیمانے پر ہوتا ہے، اُسی طرح علامات کو بھی محدود پیمانے پر استعمال کیا جانا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ علامات تعداد میں کم سے کم ہوں اور اُن کو ضرورت کے بغیر، محض حُسنِ عبارت کی خاطر ہرگز نہ استعمال کیا جائے۔ عام لفظوں سے نگاہ بھی آشنا ہوتی ہے اور ذہن بھی واقف ہوتا ہے، اُن کی صورت سے بھی اور اُن کے تلفّظ سے بھی؛ بہت سے مقامات پر جملے میں الفاظ کی ترتیب صاف صاف دلالت کرتی ہے مختلف لفظوں کی تفصیلات پر؛ ایسے مقامات پر علامات کو استعمال کرنا قطعاً نامناسب ہے۔ بہت سے زیور لا دینا، گنوارپن کی پہچان بھی بن جاتی ہے۔ جن لفظوں میں کسی طرح کا اشتباہ رونما ہو سکتا ہو، اُن میں ضرور علامات کی مدد سے وضاحت اور صراحت کو نمایاں کیا جائے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، علامتیں مختلف مرحلوں سے گزری ہیں، مگر بعض علامتیں ایسی بھی ہیں جن کو اکثر لوگوں نے مانا ہے اور اُن کو استعمال بھی کیا گیا ہے، اِس طرح اِن علامتوں کی حیثیت متعارف نقوش کی سی ہو چکی ہے؛ اِسی کے پیشِ نظر، ذیل میں علامات کا تعین کیا جاتا ہے، اور اب اِنھی علامات کو اردو کی عبارتوں میں (ضرورت کے مطابق) استعمال کرنا چاہیے:

(۱) یائے معروف لفظ کے آخر میں پوری لکھی جاتی ہے اور یہی ٹھیک ہے، جیسے: زندگی، خوشی۔ جب یہ درمیانِ لفظ میں آئے گی، اور کسی طرح کے اشتباہ کا احتمال ہوگا، تو اُس کے نیچے "کھڑا زیر" (ا) لگایا جائے گا،

جیسے : مِیت ، پِیت ، شِپر ، پِیر ۔ یہ علامت پہلے سے مستعمل ہے ، اور اِس کو متعارف علامت کہا جا سکتا ہے۔

یائے مجہول آخر میں پوری لکھی جاتی ہے ۔ اِس صورت میں : یے ۔ جب یہ درمیانِ لفظ میں آئے اور ملا کر لکھی جائے تو اگر ضرورت سمجھی جائے تو اِس سے پہلے والے حرف پر زیر لگا دیا جائے ، جیسے : دِیر ، بِیر ، تِیر ، مِیل۔ یائے مجہول پر کوئی علامت نہیں لگائی جائے گی ، اور یائے معروف سے پہلے والے حرف پر زیر نہیں لگایا جائے گا ۔

(۲) واوِ معروف پر اُلٹا پیش بنایا جائے گا ، جیسے : چُور ، دُور ، نُور ، طُور۔ یہ بھی مستعمل اور متعارف علامت ہے ۔ واوِ مجہول پر کوئی علامت نہیں آئے گی ، ضرورت پڑنے پر ، اُس سے پہلے حرف پر پیش لگا دیا جائے گا ، جیسے : مُور ، گُور ، مُجوڑ ۔ جس طرح یائے معروف کے حرفِ ماقبل پر زیر نہیں لگایا جائے گا ، اُسی طرح واوِ معروف کے حرفِ ماقبل پر پیش نہیں لکھا جائے گا ۔ دونوں حرفوں کی مجہول آوازوں کے لیے ، دونوں کے حروفِ ماقبل پر زیر اور پیش لگائے جاسکتے ہیں ۔ (اگر ضرورت ہو)۔

(۳) واوِ ماقبل مفتوح اور یَ ماقبل مفتوح کے لیے ، اِن کے حروفِ ماقبل پر زبر لکھا جائے گا ، جیسے : پَیر ، دَیر ، سَیر ، غَیبت ۔ اور دَور ، جَور ، دَوڑ ، خَوض ، دَھونسا ، پَیسا ۔

کچھ الفاظ بہ طورِ مثال :

غِیبت ، غَیبت ، پِیر ، پَیر ۔ شِپر ، شِیر ۔ دِیر ، دَیر ۔ دُور ، دَور۔
ہُوش ، ہوش ۔ چَین ، چِیں ، چِین ۔ چُوکنا ، چوُکنا ، چَونکنا۔
بوُٹ ، بُوٹ ۔ طوُر ، طَور ۔ بُور ، بوُر ، بَور ۔ سِیر ، سِیر ، سَیر۔

بِہر، بِیر، بَیر۔ تِپر، رِتیر، تَیر۔

(۴) واوِ معدولہ کے لیے بہ ظاہر کسی علامت کی ضرورت نہیں۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ایسے لفظ جن میں واوِ معدولہ آتا ہو، کچھ زیادہ نہیں، دوسرے یہ کہ یہ لفظ متعارف ہیں۔ "خود" اور "خوش" وغیرہ سے سبھی لوگ واقف ہیں۔ پھر بھی، اگر کہیں اور کبھی ضرورت محسوس کی جائے (خاص طور پر لُغت میں یا غیر ملکی طلبہ کے لیے ابتدائی کتابوں میں) تو اُس صورت میں، مولوی عبدالحق صاحب مرحوم کی منتخب کی ہوئی یہ علامت کہ اُس واو کے نیچے ایک لکیر بنا دی جائے؛ استعمال کی جائے گی، جیسے: خوِیشگی، خوِیشاوند۔

الف کے ساتھ جو واوِ معدولہ آتا ہے، اُس کے نیچے یہ علامت نہیں آئے گی اِس کے بجائے، حسبِ ضرورت اِس واو پر یہ نشان ۷ بنایا جائے گا (ابتدائی درسی کتابوں میں)، اِس لیے کہ یہ واو ایک خاص طرح تلفّظ میں آتا ہے، جیسے: خوٛاب، خوٛاہش، خوٛار۔ یہی صورت انگریزی کے بعض الفاظ کی ہے، جیسے: بوٛاے، جوٛائس، پوٛائنٹ وغیرہ۔

(۵) آخرالذکر واوِ معدولہ کی طرح، تین حرف اور ہیں، جو نصف سے کچھ کم تلفّظ میں آتے ہیں، بل کہ صحیح معنی میں اُن کی آواز، حرفِ ماقبل کی آواز میں مخلوط ہو جاتی ہے۔ یہ حرف ہیں: ہ، ء، ی۔ جیسے: پیار، پہیا، مکئی۔ عروض میں "پیار" کو تین حرفی لفظ مانا جائے گا، بروزنِ "پار"؛ اِس سے آواز کے مخلوط ہونے کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے اِس ی کو "یاے معدولہ" لکھا ہے اور یہ مناسب نام ہے۔ اِسی قیاس پر "ہمزۂ معدولہ" اور

"ہائے معدولہ" کہا جائے گا۔ اِس طرح "حروفِ معدولہ" چار ہوئے:
و ، ہ ، ۶ ، ی ۔

مولوی صاحب مرحوم نے یائے معدولہ کے لیے علامت (۷) تجویز کی تھی ، اور اِس کو تسلیم کرنے میں بہ ظاہر کوئی قباحت نہیں ۔ مگر یہاں پر یہ بات خاص طور پر سمجھ لینے کی ہے کہ اِس علامت کے استعمال کی ضرورت کم سے کم آئے گی ۔ عام الفاظ (پیار ، گیارہ وغیرہ) علامت کے بغیر ہی لکھے جائیں گے ، یہ ممکن ہے کہ بعض خاص لفظوں میں کہیں اور کبھی اِس کی ضرورت محسوس کی جائے ، اُس وقت اِس کو استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ اب واوِ معدولہ کی ایک الگ علامت ہوئی ، واو کے نیچے لکیر (و) اور باقی تین حروف کے لیے اور واوِ معدولہ ماقبلِ الف کے لیے ایک الگ علامت ہوئی ۔ یہ تفریق اِس لیے ضروری ہے کہ "خود" اور "خوش" جیسے لفظوں میں واوِ معدولہ تلفظ میں نہیں آتا ، جب کہ "بوائے" ، "پیار" ، "پہیا" ، "مکئی" میں یہ حرف تلفظ میں جھلکتے ہیں ۔

ہاں اِس ی اور ہمزہ کو "یائے مخلوط" اور "ہمزۂ مخلوط" بھی کہا جا سکتا تھا ، مگر اُن کے ساتھ کے ایک اور حرف ہ کو "ہائے مخلوط" نہیں کہا جا سکتا ، کیوں کہ "ہائے مخلوط" کی اصطلاح اب تک دو چشمی ھ (ھ) کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے ، اِس لیے اِن سب حرفوں کو "معدولہ" کہا گیا ہے ۔ مزید وضاحت کے لیے ذیل میں اِن کی تکرار کی جاتی ہے :

واوِ معدولہ : خود ، خویش ، خوراک ، خوردن ـــــ خواب ، خواہش ، خواستگار ، خوار ـــــ بوائے ، جوائنٹ ، کوالی فائڈ ۔

ہائے معدولہ : پہیّا ، کہیّو ، رہیّو ، چُھہیّا ۔
ہمزۂ معدولہ : چمپئی ، گُجئی ، ارئی ، تُرئی ۔
یائے معدولہ : پیّا سا ، کیّا ، کیّاری ، ریّولا ، تیّورانا ، کیّوڑا ، جیّوڑا ۔
(۶) نونِ غنّہ جب آخرِ لفظ میں آئے گا تو اُس کو نقطے کے بغیر لکھا جائے گا۔
یہ مستعمل انداز اور مروّج طریقہ ہے ، جیسے : ماں ، کہاں ۔ جب درمیانِ لفظ میں آئے گا اور متّصل لکھا جائے گا تو اُس پر اُلٹے قوس کی علامت بنائی جائے گی ، جیسے : بانس ، کانسا ۔ اِس علامت کو اکثر لوگوں نے مانا ہے اور اِس کو استعمال بھی کیا گیا ہے ، اور اِس طرح یہ بھی متعارف علامت ہے ۔
نونِ ساکن کی حیثیت ، دوسرے ساکن حروف کی سی ہے ، جس طرح ضرورت پڑنے پر ، اُن حروف پر جزم بنا دیا جاتا ہے (جیسے : نفْی) اُسی طرح خاص خاص صورتوں میں اِس نونِ ساکن پر بھی جزم آئے گا ، جیسے : بنْدر ، سنْگ ، کنْدھا ، پھنْدر ۔ یہ واضح رہے کہ ایسے بہت کم لفظ ملیں گے جن میں نونِ ساکن پر جزم لکھنے کی ضرورت ہو ۔
نونِ غنّہ کی ایک صورت وہ ہے جس میں غنّہ آواز ، کاف یا گاف میں آمیز ہوکر نکلتی ہے ، مگر اِن لفظوں پر کسی خاص علامت کی ضرورت نہیں ، دراصل یہاں بھی نونِ ساکن ہی ہے ۔
اب نون کی علامتیں اِس طرح ہوئیں :
۱ : نونِ ساکن : بنْدر ، انْداز
۲ : نونِ غنّہ آخرِ لفظ میں : ماں ، کہاں (نقطے کے بغیر) ۔
۳ : نونِ غنّہ درمیان میں : مانٛد ، چانٛد ، کُنٛور ، بھنٛور ۔

ہندی کی ایک خاص آواز " ण " اُردو میں موجود نہیں ، اردو میں ایسے لفظ سادہ نون کے ساتھ بولے جاتے ہیں ، اور سادہ نون کے ساتھ لکھے جاتے ہیں، اور یہ اِسی طرح لکھے[1] جائیں گے ۔ جیسے : کرشن اور برہمن ۔ یہ دو زبانوں کا فرق ہے ، جو بہ ہر طور باقی رہے گا ۔ یہ کہا گیا ہے کہ اِس آواز کے لیے نون کے اوپر ط لکھنا چاہیے ، یعنی : کرشݨ ۔ مگر جب یہ آواز اُردو میں موجود ہی نہیں ، تو علامت کی کیا ضرورت ؟ ایک زبان کے لفظ دوسری زبان میں جاکر ، اُسی زبان کے سانچوں میں ڈھلتے ہیں ۔ یہ سوچنا کہ ایک زبان کی خاص آوازیں ، دوسری زبان میں بھی منتقل ہو جائیں گی اور اُس خاص آواز والے لفظوں کو اصل کے مطابق بولا جائے گا ؛ ناقابِلِ عمل بھی ہے اور ناقابِلِ قبول بھی ۔ ایسا نہ ہوتا ہے اور نہ ہوگا ۔

---

[1] " ण (ݨ) کی آواز اردو نے اپنے ارتقا کے کسی دور میں نہیں اپنائی ۔ ہندی بولیوں میں بھی یہ عام طور پر ن میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ جدید ہندی میں بہت سے سنسکرت الفاظ کے CLUSTERS کی طرح اِس کا بھی تعلیم کے ذریعے احیا ہو رہا ہے۔"

(ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۔ اردو صوتیات کا خاکا ، اردوے معلّیٰ ، لسانیات نمبر ، ص ۱۱۹)

ڈاکٹر گیان چند جین نے لکھا ہے :

" اردو نے ہندی کے چند مصمتے قبول نہیں کیے ، اُن میں سب سے پہلے ण (ݨ) ذہن میں آتا ہے ۔ اردو میں اِس کے لیے کسی نے موزوں ترین علامت (ݨ) تجویز کی تھی ۔ اِس کے لیے ڈاکٹر دھریندر ورما اور ڈاکٹر اودے نراین تواری تسلیم کرتے ہیں کہ تت سم الفاظ کے سوا ، ہندی میں اِس کا تلفظ ن ہی کی طرح ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ کھڑی بولی کے علاقے میں ، بول چال میں (بقیہ حاشیہ ۵۳۱ صفحہ پر)

اِس بات کی تکرار کی جاتی ہے کہ اِن سب علامتوں کو ضرورت کے مطابق ہی استعمال کرنا چاہیئے ۔ یعنی جب یہ محسوس ہو کہ کسی خاص لفظ کو اگر علامت کے بغیر لکھا گیا تو اُس کو پڑھنے میں دقت ہو سکتی ہے ، یا کسی طرح کا اشتباہ ہو سکتا ہے ، صرف اُس صورت میں علامت کو لفظ کا جُز بنا یا جائے ۔ علامتوں کے زیادہ استعمال سے یا زیادہ علامتوں کے استعمال سے عبارت بوجھل ہو جائے گی اور نظر آسانی کے بجاے اُلجھن سے دوچار ہوگی ۔ منتخب الفاظ کے ساتھ حسبِ ضرورت اِن کو استعمال کیا جائے گا تو پڑھنے میں واقعتاً آسانی ہوگی اور نگاہ بھی سکون محسوس کرے گی ۔

یہ بات بھی سمجھ لینا چاہیے کہ آواز کے اُتار چڑھاو اور لہجے کی ساری کیفیات کو صرف علامتوں کے ذریعے سے دوسرے تک نہیں پہنچایا جا سکتا ، اِس کے لیے زبان کو باقاعدہ سیکھنا پڑے گا ، اور اِس میں کسی زبان کی تخصیص نہیں ۔

اب بیانِ علامات کا خلاصہ یہ ہوا :

(۱) واوِ معروف کے لیے : ٗ ، جیسے : چوٗر

(۲) واوِ مجہول کے لیے : حرفِ ماقبل پر پیش جیسے : چُور

اِس آواز کا کوئی چلن نہیں، بانگرو (ہریانی) اور پنجابی میں اِس کی فراوانی ہے ۔ بانگرو سے سہارن پور اور میرٹھ کے علاقے میں کہیں نؔ کے بجاے ण بولنے کا رجحان ملتا ہے ۔ آج کل ہندی کے حامی تت سم انداز سے ण بولنے پر اصرار کرتے ہیں ، لیکن اردو میں اِس متروک آواز کو اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں ۔"

(اردوے معلّیٰ ، لسانیات نمبر، ص ۱۵۲)

(۳) یاے معروف کے لیے : ا جیسے : تیر

(۴) یاے مجہول کے لیے ؛ حرفِ ماقبل پر زیر جیسے : تیر

(۵) واوِ معدولہ کے لیے : جیسے : خوِش

(۶) واوِ معدولہ مع الف : ٧ جیسے : خواب

(۷) یاے معدولہ کے لیے : ٧ جیسے : نیولا

(۸) ہاے معدولہ کے لیے : ٧ جیسے : پہیا

(۹) ہمزۂ معدولہ کے لیے : ٧ جیسے : مکئی

(۱۰) واوِ ماقبل مفتوح کے لیے : حرفِ ماقبل پر زبر جیسے : دَور

(۱۱) یاے ماقبل مفتوح کے لیے : " " " جیسے : پَیر

(۱۲) نونِ غنّہ آخرِ لفظ میں : نقطے کے بغیر جیسے : ماں

(۱۳) نونِ غنّہ درمیانِ لفظ میں : ٧ جیسے : چانٓد

(۱۴) نونِ ساکن کے لیے : جزم جیسے : بنْدر

اِس سلسلے میں ایک یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہر زبان میں کچھ ایسی مخصوص آوازیں اور لہجے کے ایسے انداز ہوتے ہیں ، جو عین مین اُسی طرح دوسری زبان میں منتقل نہیں ہو پاتے ، اِس لیے یہ چاہنا کہ علامتوں کی مدد سے اُن کی باز آفرینی کی جائے[1] ، زائد بات ہے ، ایسا نہیں ہوا کرتا۔ مثلاً انگریزی کا لفظ BOY اردو میں " بواے " لکھا جائے گا اور لکھا ہی جاتا ہے ، تلفظ میں واو اُسی طرح مخلوط ہے جس طرح مثلاً " خواب " اور " خواہش " میں ہے ۔ اِس کے برخلاف ، لارڈ جیسے[2] الفاظ کو الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے ،

---

[1] " ہندی میں انگریزی الفاظ مثلاً " لارڈ " ، " کانفرنس " وغیرہ کے لیے ایک مخصوص مصوتہ (بقیہ حاشیہ ص ۵۳۳ پر)

اور بولا بھی اِسی طرح جاتا ہے ۔ یا جیسے SCHOOL اور STATION کو اُردو میں " اسکول " اور " اسٹیشن " لکھا اور بولا جاتا ہے ، اور یہ اُردو کے انداز اور لہجے کے عین مطابق ہے ؛ اب یہ فرمایش کہ اِن کو اصل کے مطابق " سکول " اور " سٹیشن " لکھا جائے اور بولا بھی اِسی طرح جائے، اور اس کے لیے ایک خاص علامت وضع کرنا ، محض بے ضرورت بات ہے ۔ بے ضرورت ہی نہیں، غلط بھی ۔ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں پہنچ کر، اُس زبان کے جنتر پر کھنچ جاتے ہیں اور اُسی کے سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں ۔ اور اِس کے خلاف مطالبہ کرنا ؛ علمِ زبان

؎ وضع کیا گیا ہے ۔ ابھی اِسے عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ۔ ہندوستانی بول چال میں انگریزی خواں حضرات بھی اسے " آ " کی طرح بولتے ہیں، اِس لیے اردو میں فی الحال اِس کے لیے کسی نئی علامت کی ضرورت نہیں "۔
(ڈاکٹر گیان چند جین ۔ اردوے معلّٰی ، لسانیات نمبر، ص ۱۵۴)

لہ " اردو کئی لحاظ سے آمیختہ زبان ہے ، لیکن اِس کی صوتیات کے چوکھٹے میں مستعار الفاظ کی ہڈیاں پسلیاں توڑ مروڑ کر درست کردی جاتی ہیں ۔ یہ عمل سب سے زیادہ CLUSTERS میں نظر آتا ہے ۔ اردو صوتیات کا عام رجحان CLUSTERS کے خلاف ہے ۔ اتّفاق سے عربی ، فارسی اور سنسکرت اور انگریزی؛ جن زبانوں سے اُس نے اپنے لغت کا خزانہ بھرا ہے ، CLUSTERS سے بھری پڑی ہیں ۔ یہ CLUSTERS عام طور پر الفاظ کے شروع میں آتے ہیں اور کبھی کبھی خاتمے پر بھی ۔ جب کہ خاتمے کے خوشے کا اردو احترام کرتی ہے ، لفظ کی ابتدا کے خوشے اِس کے لیے (بقیہ حاشیہ ص ۵۳۴ پر)

کے مسلّمات کو جُھٹلانا ہے ۔ اور دوسری طرف ، اِس خیال سے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کو ، اُنھی زبانوں کے معیارِ صحت پر رکھّا جائے ؛ نئی نئی علامتیں وضع کرنے کا کاروبار شروع کیا جائے ۔ یہ تضاد ہے اور اِس سے اتّفاق نہیں کیا جاسکتا اور علامتوں کی کثرت سے ، عبارت کو بنیے کی دُکان نہیں بنایا جاسکتا ۔ مثلاً اُردو میں "کرشن" اور "برہمن" ہی لکھے جائیں گے اور ان کو بولا بھی اِسی طرح جائے گا ، اورؔ "اسکول" اور "اسٹیشن" اور "لارڈ" کو بھی اِسی طرح استعمال کیا جائے گا ۔ "برہمنڑ" ، "کرشنڑ" ، "سکول" "سٹیشن" نہ لکھا جاسکتا ہے ، نہ بولا جاسکتا ہے ، اور نہ اِس کی فرمایش کی جاسکتی ہے ۔

"احمد" اور "محل" جیسے لفظوں میں حرفِ ثانی کا زبر ایک خاص "اور یہی انداز" سے ادا ہوتا ہے ، جب کہ "ازل" اور "محِل" میں وہ سیدھی طرح ادا ہوتا ہے ۔ صوتیات میں اِس قسم کے سب آہنگوں کا تعیّن کیا جائے گا ، اُن کی تفصیلات مرتّب کی جائیں گی ، اور یہ بے حد ضروری اور مفید کام ہوگا ؛ مگر یہ نہیں ہوگا کہ "محل" کے لیے ایک الگ علامت کا بھی عبارت میں اضافہ کیا جائے ۔ اِس فرق کو ملحوظ رکھّا جائے گا[۱] ۔

ناقابلِ برداشت ہیں ۔ مثلاً : ..... انگریزی ، اسپرٹ ۔ سپرٹ SPIRIT

اسٹیشن ۔ سٹیشن STATION اسکول ۔ سکول SCHOOL

(ڈاکٹر مسعود حسین خاں ۔ اردوے معلّٰی ، لسانیات نمبر ، ص ۱۲۲)

[۱] یہاں پر پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ایک عبارت پیش کرنا بے محل نہیں ہوگا :

"صوتی رسمِ خط کو جتنا مکمّل کرنے کی کوشش کی جائے گی ، اُتنی ہی حرفوں اور علامتوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۳۵ پر)

(ج) :

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، تیسری قسم کی علامتیں وہ ہیں جن کی مدد سے لفظوں کے ایک خاص مفہوم کے تعیّن میں مدد ملتی ہے، جیسے یہ مصرع : عمر ساری تو کٹی عشقِ بُتاں میں مومنؔ ۔ اِس مصرعے میں "مومن" بہ طورِ تخلّص آیا ہے، اور اِس پر جو نشان (ؔ) ہے، وہ اِس کی علامت ہے کہ یہ لفظ یہاں اصلاً تخلّص کے طور پر آیا ہے (خواہ ضمناً اِس کا کچھ اور مفہوم بھی ہو)۔ گویا اِس نشان سے اِس تعیّن میں مدد ملتی ہے۔ بہت سے مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں شاعر کا تخلّص اِس طرح آتا ہے کہ اگر بتایا نہ جائے تو یہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ یہ لفظ بہ طورِ تخلّص آیا ہے۔

کی تعداد بڑھتی جائے گی، اور اُتنا ہی اُن کا یاد رکھنا مشکل ہوتا جائے گا۔ اِنھی دقّتوں سے بچنے کے لیے، ہر زبان کی تحریر میں عملی آسانی کو، صوتیاتی صحّت پر مقدّم رکھنا پڑتا ہے۔ لفظ حقیقت میں ایسی نازک چیز ہے کہ لکھا ہوا لفظ، زیادہ سے زیادہ اُس کے قریب پہنچ سکتا ہے، اُس کو پورے طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ حرفوں کی آوازوں اور اُن کی حرکتوں میں ایسے ایسے باریک فرق ہوتے ہیں کہ اُن کو علامتوں کے ذریعے سے بالکل ٹھیک ٹھیک طور پر ظاہر نہیں کر سکتے؛ اِس لیے صوتیات کے ماہروں کی بھی یہی راے ہے کہ ہر لفظ کی معیاری مکتوبی صورت صرف ایک ہونا چاہیے۔ یعنی لفظ کی تحریری صورت کو، اُس لفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں، بل کہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہیے، جو تلفّظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہ نمائی کرتی ہے۔ اُردو کے رسمِ خط کو بھی اِسی عملی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے "۔

(اُردو میں لسانیاتی تحقیق، ص ۳۹۶)

اِس فہرست میں درجِ ذیل علامتیں آتی ہیں :

(۱) ــ : یہ نشان ، تخلّص کی علامت ہے ، جیسے : اسدؔ ، ذوقؔ۔ تخلّص کو اِس نشان کے بغیر کبھی نہیں لکھا جائے گا ۔

(۲) ــــــ : خاص ناموں کے اوپر ایک چھوٹی سی لکیر اِس لیے بنا دی جاتی ہے کہ عبارت میں وہ لفظ ممتاز رہیں ۔ افراد کے نام ، مقامات کے نام ، کتابوں کے نام ، حروف کے نام ، اور اِسی قبیل کے دوسرے نام ، اِس ضمن میں آتے ہیں ۔ اِس نشان کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ عبارت میں (جو بہت سے لفظوں کا مجموعہ ہوتی ہے) ایک خاص لفظ یا بعض خاص الفاظ کو ، کسی نہ کسی وجہ سے ، اِس طرح امتیاز بخشا جائے کہ نظر فوراً اُس امتیاز کو دریافت کرلے ؛ ایسا نہ ہو کہ اُن الفاظ کو بھی دوسرے الفاظ کی طرح جزوِ عبادت سمجھا جائے ۔

کبھی پورے جملے یا کئی جملوں کے مجموعے کو خط کشیدہ قرار دیا جاتا ہے ، اور اُس کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ لکھنے والا ، کسی خاص وجہ سے ، عبارت کے اُس ٹکڑے کو ممتاز قرار دینا چاہتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ پڑھنے والا بہ یک نظر اِس مقصد سے واقف ہو جائے ۔ اِس سلسلے میں خیال رکھنے کی بات یہ ہے کہ مفرد الفاظ کے سلسلے میں ، خاص ناموں کے علاوہ ، عام الفاظ پر خط نہ کھینچا جائے ۔ عام الفاظ کے لیے اگر ضرورت محسوس کی جائے تو کاما اور واوین کو استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ بعض مثالیں :

مولانا جامیؔ نے بہارستان میں لکھا ہے ۔ شیراز میں ایک مقام سعدیہ ہے ، جہاں شیخ سعدیؔ کا مزار ہے ۔

حافظ محمود خاں شیرانی کو اُردو میں تحقیق کا معلّمِ اوّل کہنا چاہیے ۔

یَی کا شمار بھی حروفِ علّت میں ہے۔

یہ علامت کبھی اعداد کے درمیان لائی جاتی ہے اور مراد یہ ہوتی ہے کہ اِس ہندسے سے لے کر اُس ہندسے تک یہ بیان یا یہ باب (وغیرہ) پھیلا ہوا ہے۔ جیسے: "حروفِ علّت کا بیان: ۲ــــ ۱۸ "یہ مطلب یہ کہ حروفِ علّت کا بیان، ص ۲ سے ص ۱۸ تک کیا گیا ہے ــــ یہ استعمال فہرستِ مضامین میں زیادہ دیکھنے میں آتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص بات لکھنا ہے، اور پیراگراف بدلنا مقصود نہیں، یا اُس کا محل نہیں؛ ایسے مواقع پر، جملۂ ماقبل کے خاتمے پر "فُل اسٹاپ" یعنی ختمہ کے بجائے، یہ خط استعمال کرتے ہیں، جیسے: یہ بیان مکمّل ہوگیا ــــــ ارے ہاں! ایک بات یہ رہ گئی تھی کہ ..... "۔

(۳) ... : نقطے علامت کے طور پر تین صورتوں میں استعمال کیے جاتے ہیں:

(۱) کسی عبارت یا شعر کے شروع کے چند لفظ لکھ کر، چند نقطے لگا دیے جاتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس شعر یا عبارت کے ابتدائی لفظ لکھے گئے ہیں، وہ شعر یا عبارت مکمّل طور پر مراد ہے۔ کبھی اختصار کی غرض سے اور کبھی تکرار سے بچنے کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ کبھی عبارت کے شروع اور آخر کے چند لفظ لکھ کر، بیچ میں نقطے رکھ دیے جاتے ہیں، مطلب اِس کا بھی وہی ہوتا ہے۔ یہ عبارت یا شعر یا تو پہلے آچکے ہوتے ہیں، یا اِس قدر معروف ہوتے ہیں کہ ذہن اُن کی طرف فوراً منتقل ہو جاتا ہے، یا اُن کا مفصّل حوالہ

آچکا ہوتا ہے۔

(۲) کسی عبارت کو مکمل طور پر نقل کرنا مقصود نہیں، صرف ضروری اجزا کو نقل کرنا مطلوب ہے؛ ایسی صورت میں یہ اہتمام کیا جائے گا کہ جہاں جہاں پر سے عبارت کو ترک کیا جائے، وہاں وہاں پر نقطے لگائے جائیں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کہاں کہاں پر سے عبارت کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ جب بھی کسی عبارت کے بعض اجزا کو چھوڑ دیا جائے گا، تو یہ لازم ہوگا کہ اُن مقامات پر نقطے لگائے جائیں۔

(۳) کسی مخطوطے (یا مطبوعہ اوراق) میں کرم خوردگی یا کسی اور وجہ سے عبارت کا کوئی حصّہ ضائع ہوگیا ہے؛ اُس صورت میں جب اُس کی نقل تیار کی جائے گی تو اُن مقامات پر نقطے لگائے جائیں گے۔ تدوین میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ اِس کی صراحت کردی جائے۔

(۴) ع : یہ مصرعے کی علامت ہے۔ عبارت کے درمیان میں اگر مصرع آئے تو اِس کو ضرور لکھنا چاہیے۔ اِس نشان کی وجہ سے وہ مصرع، نثری عبارت میں آمیز نہیں ہوگا اور نظر کو بھی آسانی رہے گی، جیسے: "اِس مشاعرے میں آرزو لکھنوی نے بھی غزل پڑھی تھی، ایک مصرع واقعی بے مثال تھا ع: نشیمن کی بنا رکھوں، قفس تیّار ہو جائے"۔

(۵) سه : اب سے کچھ پہلے تک اِس نشان کو شعر سے پہلے لکھا جاتا تھا۔ یہ لفظِ "بیت" کی مخفّف صورت ہے، جس نے علامت کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، مرتبۂ عرشی صاحب، اشاعتِ ششم، ص ۴۴) اب اِس کا رواج اُٹھ سا گیا ہے، مگر اب بھی حسبِ ضرورت

اِس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اِس علامت کو ہندسوں کے ساتھ اب بھی استعمال کیا جاتا ہے، خاص طور پر حواشی کے لیے۔ یعنی عبارت میں متعلق جگہ پر "سہ" لکھ کر، اِس پر ہندسہ لکھا جاتا ہے، مثلاً کسی صفحے پر پہلے حاشیے کے لیے، عبارت میں متعلق لفظ کے اوپر، یا جملے کے آخری لفظ کے اوپر (جیسا محل ہو) "سلہ" لکھا جائے گا اور پھر حاشیے میں اِس کی تکرار کی جائے گی اور اِس کے آگے حاشیے کی عبارت لکھی جائے گی۔ اِس موقعے پر اِس شکل کے ساتھ ساتھ، ایک اور شکل (ے) کو بھی استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: "ے۱"۔

(۶) ص: صفحے کے لیے، جیسے: ص ۱۲۲، مطلب ہے صفحہ ۱۲۲۔ اِس کی ایک صورت "صـ" بھی ہے، جیسے: "دیکھیے مکاتیبِ غالب صـ۳۱"۔ مگر استعمالاً اِن دونوں میں ذرا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ جب جلد کے لیے "ج" لکھا جاتا ہے تو اُس کے صفحے کے لیے "ص" لکھتے ہیں، جیسے: "سبک شناسی، ج ۲، ص ۱۴۱"۔ اور یہ محض مناسبت کی رعایت سے ہوتا ہے، اور دوسری صورتوں میں، دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے، البتہ "صـ" میں ہندسے کو اِس علامت کے اوپر لکھا جاتا ہے، جیسے: صـ۳۱، اور "ص" کے بعد لکھا جاتا ہے، جیسے: ص ۳۱۔

(۷) ج: جلد کے لیے، جیسے: سبک شناسی، ج ۱، ص ۲۱۰۔ یعنی پہلی جلد کا صفحہ ۲۱۰۔ اِن دونوں علامتوں کو ضرور استعمال کرنا چاہیے۔ ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ "جلد" اور "صفحہ" کے لفظ استعمال نہیں کیے جا سکتے۔ کوئی شخص لکھنا چاہے تو ضرور لکھے، مگر جب کتابوں کے حوالے بار بار آئیں گے تو مناسب یہی ہوگا کہ مخففات کو استعمال کیا جائے۔

(۸) = : اِس علامت کو دو طرح استعمال کیا جاتا ہے: کسی کتاب

وغیرہ کے مخفّف نام کو ظاہر کرنے کے لیے ، جیسے : " قاطعِ برہان ورسائلِ متعلّقہ = قاطع "۔ مراد یہ ہے کہ عبارت میں جہاں بھی " قاطع " استعمال کیا گیا ہے، وہاں قاطعِ برہان و رسائلِ متعلّقہ مراد ہے ۔ اِس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ قاطعِ برہان و رسائلِ متعلّقہ کے لیے مختصر نام " قاطع " متعیّن کیا گیا ہے اور آیندہ عبارت میں اِسی کو استعمال کیا جائے گا ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فرہنگ میں برابر یا موافق جیسے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے ، مثلاً کلّیاتِ ولی کی فرہنگ میں مخفّفات کی نشان دہی کے سلسلے میں لکھا گیا ہے :

"= اِس علامت سے مطلب ہے کہ قوسین کے باہر اور اندر کے لفظ میں صرف تلفّظ کا فرق ہے "۔ مثالاً اِس فرہنگ سے ایک اندراج پیش کیا جاتا ہے، جس سے استعمال کا بہ خوبی اندازہ ہو جائے گا : " اُپر " (= اوُپر) " ۔ مطلب یہ ہے کہ " اُپر " اصلاً وہی لفظ ہے جسے " اوُپر " لکھتے اور بولتے ہیں ۔ یا یوں کہیے کہ " اُپر " ، " اوپر " ہی کی ذرا سی بدلی ہوئی صورت ہے ، لفظ ایک ہے ۔

بہ ہر حال ، دونوں صورتوں میں مفہوم ایک ہی ہے ، یعنی " یہ لفظ ، برابر ہے اُس لفظ کے "۔ یہ علامت ریاضی سے آئی ہے اور وہاں بھی اِس کا مفہوم یہی ہے ۔

(۹) رک : یہ " رجوع کنید " کا مخفّف ہے ۔ جیسے : رک ص ۲۱۰ ۔ مطلب یہ ہے کہ اِس سلسلے میں صفحہ ۲۱۰ کو دیکھا جائے ۔

(۱۰) ؑ : برائے علیہ السّلام ، جیسے : عیسیٰؑ ، آدمؑ ۔ یعنی عیسا علیہ السّلام اور آدم علیہ السّلام ۔

(۱۱) رح : برائے رحمت اللہ علیہ، جیسے : خواجہ معین الدین چشتی رح ۔یعنی خواجہ معین الدین چشتی رحمت اللہ علیہ ۔(یا رحمۃ اللہ علیہ)۔
یہ علامت نام کے اوپر لکھی جاتی ہے، نام کے آخری سرے پر۔ اگر نام کے ساتھ کچھ تعظیمی یا نسبتی الفاظ بھی ہوں، تو لفظِ آخر پر لکھی جائے گی۔
اچھا یہ ہوگا کہ عبارت میں اِن مخفّفات ہی کو استعمال کیا جائے۔

(۱۲) صلعم : یہ "صَلّی اللہ عَلَیہ وَ سلّم" کی مخفّف صورت ہے ـ یہ عبارت رسول اللہ کے لیے آتی ہے۔ مناسب یہ ہوگا کہ " رح " اور "ع" کی طرح " صلعم " ہی کو استعمال کیا جائے۔

(۱۳) ﷺ : یہ بھی " صَلّی اللہ عَلَیہ وَ سلّم " کی مخفّف صورت ہے، بل کہ اِس کو " صلعم " کی تخفیف کہنا چاہیے ۔ رسول اللہ کے نام کے اوپر عموماً اِس کو لکھا جاتا ہے، جیسے : محمدؐ ، احمدؐ ۔ یہ مختصر ترین علامت ہے اور اِس لحاظ سے استعمال میں اِسے ترجیح حاصل رہنا چاہیے۔

اِس کے علاوہ، یہ علامت اور کئی مواقع پر استعمال میں آتی ہے :

(۱) دعوت کی فہرست میں اپنے نام پر ﷺ بنا دیا جاتا ہے۔ (یہ پُرانا طریقہ ہے اور بہت سے شہروں اور مضافات میں اب بھی رائج ہے) مطلب یہ ہوتا ہے کہ دعوت کی اطلاع مل گئی۔

(۲) پسندیدہ شعر پر ﷺ بنا دیا جاتا ہے۔ کبھی زیادہ پسندیدگی کے اظہار کے لیے دو ﷺ بھی بنا دیے جاتے ہیں۔ یہ عموماً ابتدائے شعر میں، شعر کے محاذی، یا اُس کے ابتدائی حصّے کے اوپر بنائے جاتے ہیں۔ کبھی منتخب اشعار پر بھی ﷺ بنائے جاتے ہیں۔ دونوں مصرعوں کے درمیان جو فصل ہوتا ہے، کبھی وہاں بھی ﷺ بنا دیا جاتا ہے۔ اساتذہ اپنی پسندیدگی

کا اظہار عموماً اسی طرح کیا کرتے تھے۔

(۱۳) جس شعر، جملے یا لفظ کو غلط یا زائد سمجھ کر پہلے قلم زد کر دیا ہو، اُس پر بھی ء بنا دیتے ہیں، تاکہ اُس کو غلط یا زائد نہ سمجھا جائے۔ مختصر یہ کہ ص پسندیدگی اور قبولیت کی علامت کے طور پر استعمال میں آتا ہے۔

(۱۴) " : یہ "ایضاً" کی علامت ہے۔ تنوین کے دو زبر لفظ کی قائم مقامی کر رہے ہیں۔ اِس کا مطلب ہوتا ہے: اوپر والے اندراج یا اندراجات کے مطابق۔

(۱۵) ع : اِس علامت کو عموماً نمبر شمار کے ساتھ لکھا جاتا تھا، اِس طرح: ۱۲، ۳، ۲۰۔ اب بھی اِس کا رواج کچھ نہ کچھ ہے۔

(۱۶) ر : پہلے یہ عام انداز تھا کہ رقم، تاریخ اور وزن کے آگے ایک محرّف سی لکیر (ر) بنا دیا کرتے تھے۔ اِس کے بغیر، اُن اعداد کو مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا، جیسے: ۳ر (تین آنے)، صہ ر (پانچ روپے)، ۳ر مارچ (مارچ کی تیسری تاریخ)، مار (ایک سیر)۔ اب آنے ہی نہیں رہے، لکھے کون، اور کچھ یہ رواج ہو گیا ہے کہ اگر ان کو لکھا بھی جائے تو لفظوں میں لکھا جائے، یعنی: تین آنے، یہی صورت سیر اور چھٹانک کی ہے، کہ اب یہ اوزان بھی متروک ہیں، اور روپیوں کے لکھنے کا پُرانا انداز بھی اُٹھ گیا؛ اِس لیے یہ علامت بھی اِن تینوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔ البتّہ تاریخ کو اب تک اِسی طرح لکھا جاتا ہے، جیسے: "مورخہ ۱۰ر مارچ ۱۹۳۷ء" اور اِس لیے یہ علامت اب صرف تاریخ کے ساتھ منسلک ہو کر رہ گئی ہے۔ جب تک تاریخ اور مہینے کو اِس طرح لکھا جاتا رہے، اُس وقت تک تاریخ کے ہندسے کے بعد اِس علامت کو ضرور لکھنا چاہیے۔

(۱۷) کذا : جب کسی اور کی عبارت میں دخل دہی منظور نہ ہو اور وہ لکھنے والے کی نظر میں صحیح نہ ہو، یا یہ احتمال ہو کہ ممکن ہے صحیح ہو، یا اِسی طرح کے اور مواقع پر، متعلق لفظ یا عبارت یا مصرعے یا شعر کے آگے قوسین میں "کذا" لکھ دیا جاتا ہے، اِس طرح : (کذا)۔ اِس کا تعلق دراصل تدوین سے ہے۔

کچھ مخففات ہر شخص اپنے طور پر متعیّن کرسکتا ہے، خاص طور پر کتابوں کے ناموں کے لیے، جیسے : نکات الشعرا کے لیے "نکات" یا کوئی اور لفظ، یا کوئی عدد۔ یا جیسے عربی کے لیے : ع۔ فارسی کے لیے : ف۔ وغیرہ۔ یا جیسے مذکر کے لیے : مذ۔ اور اِسی طرح کی بہت سی صورتیں۔ اِن کی حیثیت انفرادی مختارات کی ہوگی، اور لکھنے والے کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ شروعِ کلام میں اِن کی صراحت کرے۔

بہت سی علامتیں اب متروکات کی فہرست میں اپنی جگہ محفوظ کرا چکی ہیں، البتہ پرانی تحریروں میں اُن سے آنکھیں چار ہو جاتی ہیں۔ ایسی بعض اہم متروک علامتیں یہ ہیں :

عبارت کے خاتمے پر پہلے ۱۲ [له] کا ہندسہ لکھ دیا کرتے تھے، یہ لفظِ "حد" کے اعداد کا مجموعہ ہے۔ جس طرح "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی جگہ ۷۸۶ کے اعداد

له غالب نے اِس ہندسے کے بارے میں لطیفے کے طور پر مہر کو لکھا ہے :

"صاحب بندہ اثنا عشری ہوں، جو ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں"۔ (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۲۲۳)

بھی لکھے جاتے تھے (اور اِس کا اب بھی رواج ہے) ، یہی صورت اِس ۱۲ کے عدد کی ہے ۔ اِس کا چلن اُٹھ گیا ہے ۔ چوں کہ یہ علامت رواج سے بے دخل ہوچکی ہے ، اِس لیے اب اِس کو استعمال نہیں کرنا چاہیے ۔

۱۲ کے ہندسے کی جگہ ایک اور علامت " ؏ " بھی استعمال کی جاتی تھی ، جو عرشی صاحب کے الفاظ میں لفظِ "فقط" کی طغرائی شکل ہے (مکاتیبِ غالب ص ۲۲۳) ۔ غالب کے خطوں میں اکثر اِس کا استعمال ملتا ہے ۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے یہ کئی طرح سے لکھی جانے لگی تھی ، یہاں تک کہ کہیں کہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ " ۵ " کے ہندسے پر " ط " بنا دی گئی ہے ، مگر اصلاً اِس کی صورت کچھ اِس طرح کی ہوگی : ؏ ، مختلف قلموں کی کششیں آمیز ہوتی گئیں اور شکل میں خفیف خفیف تبدیلی راہ پاتی گئی ۔

ایسی ہی ایک متروک علامت ہے : ـــ ۔ عرشی صاحب نے مکاتیبِ غالب کے مقدمے میں ، " املاے غالب " کے ذیل میں لکھا ہے : کبھی نئے جملے کے پہلے لفظ کے اوپر یہ شکل (ـــ) بناتے ہیں ، جو عربی کے لفظ " بت " بہ معنیِ قطع کی شکل ہے ۔ کچھ خطوں میں نئے پیراگراف کے آغاز میں بھی یہ علامت بنائی ہے " (ص ۲۲۳) ۔

یہ علامت کثرتِ استعمال یا کسی اور وجہ سے ، ایک سادے خط (ـــ) کی صورت میں بھی بعض قدیم تحریروں میں ملتی ہے ۔ بہ ہر صورت جملے یا پیراگراف کے شروع میں اب ایسے کسی اہتمام کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا ، اور اب یہی ٹھیک ہے ۔ سادہ خط (ـــــ) کی علامت اب اسماے خاص کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے ، اور اِس کا بیان آچکا ہے ۔

الخ : کبھی کسی عبارت یا شعر کو مکمل طور پر نقل کرنے کے بجاے ، اُن

کے ابتدائی الفاظ لکھ کر " الخ " لکھ دیا کرتے تھے۔ یہ مخفف ہے " الی آخرہٖ " کا۔ اِس کا مطلب ہوتا تھا کہ پورا شعر یا مکمل عبارت مراد ہے۔ ایسا عموماً تکرارِ عبارت کی صورت میں ہوتا تھا، یا پھر مشہور اشعار یا مذکور عبارتوں سے مراد ہوتی تھی۔ اب ایسے مواقع پر، شروع کے چند الفاظ لکھ کر، چند نقطے لگا دیتے ہیں۔

لہٗ : " عربی کا یہ فقرہ عموماً مجموعہ ہائے اشعار میں استعمال ہوتا ہے۔ چوں کہ اِس کے معنی ہیں: " اُس کا "، اِس لیے کسی ایک شاعر کے متفرق شعر لکھتے وقت، ہر نئے شعر سے پہلے " لہٗ " لکھ دیتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ یہ شعر بھی اُسی شاعر کا ہے، جس کا شعر ابھی گزر چکا ہے۔ مرزا صاحب (غالبؔ) نے اِسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے " (مکاتیبِ غالب، ص ۲۳۴)۔

" لہٗ " کی جگہ " ولہٗ " بھی لکھا جاتا تھا۔ یہ لفظ دراصل نظم سے مخصوص تھے، نثر میں اِن کا استعمال بہ طورِ شاذ ہے۔ مفرد اشعار کی طرح، غزلوں وغیرہ کے لیے بھی اِن علامتوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔

رموزِ اوقاف :

اِن ضروری اور مفید علامتوں کو بہت سے لوگ ضرورت کے مطابق استعمال نہیں کرتے، حالاں کہ کلام کی وضاحت، معنویت اور صحیح خواندگی کے لیے اِن کا استعمال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح اضافت کا زیر لگانا ازبس ضروری ہے، اُسی طرح اِن علامات میں سے " کاما " کو استعمال کرنا نہایت ضروری، بل کہ لازم ہے۔ بہت سے جملے، شعر اور

عبارتیں ایسی ہیں کہ اُن میں اگر کاما اور اضافت کے زیر صحیح لگائے جائیں تو اُن کی پیچیدگی، صراحت سے قریب ہو سکتی ہے۔ عرشی صاحب نے دیوانِ غالب کے مقدّمے میں لکھا ہے:

"یوں تو اِس نسخے میں وقف کی کئی علامتیں استعمال کی ہیں، مگر ان میں سے کامے کو حدِ افراط تک برتا گیا ہے۔ چوں کہ غالب جیسے تعقید پسند اُستاد کے کلام کا مطلب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا، اِس لیے امید ہے کہ دیدہ ور نقاد اِس سے درگذر فرمائیں گے" (ص ۱۱۹)۔

اِس میں غالب کی تخصیص نہیں، اکثر قدما کے یہاں یہ صورت پائی جاتی ہے اور اِس میں نثر اور نظم دونوں برابر ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کی نثر ہو، یا غالب کی نظم؛ اِن سب کا حال ایک جیسا ہے۔ اور قدیم وجدید کی تفریق بھی اِس سلسلے میں غیر ضروری ہے، عام تحریر میں (مضامین، مقالے، کتابیں) اِن کی پابندی ضروری ہے۔ اِس پابندی سے، پڑھنے والے کو صحیح طور پر پڑھنے میں بیش قیمت مدد ملتی ہے، اور دوسری طرف لکھنے والے کو ذرا سوچ سمجھ کے قلم چلانا پڑتا ہے۔ اور تدوین میں تو اِس کو لازم قرار دیا جانا چاہیے۔ لوگ عام طور پر (تدوین میں) اضافت کے زیر اور کاما سے اِس لیے بھی گھبراتے ہیں کہ اِن کے التزام سے ایک تو کام جلدی نہیں ہو سکتا، بہت سارا وقت تو سوچنے سمجھنے ہی میں نکل جائے گا اور دوسرے یہ ڈر بھی ہوتا ہے کہ بے محل استعمال سے کہیں بات رسوائی تک نہ پہنچے، حالاں کہ اچھے کام کرنے والے کو اِس طرح کی سبھی آزمایشوں کے لیے تیار رہنا چاہیے، اور اگر اِس کی تاب نہ ہو تو پھر تدوین جیسے صبر آزما امتحان کے پھیر میں پڑنا ہی

نہیں چاہیے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب مرحوم نے، قواعدِ اردو میں گیارہ علاماتِ وقف کو لکھا ہے۔ اِن میں سے دو علامتیں ایسی ہیں جو عام استعمال میں نہیں آ سکیں اور بہ ظاہر زائد بھی معلوم ہوتی ہیں۔ اِن میں سے ایک علامت کا نام "خط" ہے (DASH)، اِس کے لیے مولوی صاحب مرحوم نے لکھا ہے کہ "یہ علامت، جملۂ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہے"، اور مثالاً یہ جملہ لکھا ہے "میری رائے ــــ اگرچہ میں کیا اور میری رائے کیا ــــ تو یہ ہے کہ آپ اِس سے دست بردار ہو جائیں"۔ مگر یہ علامت رواجِ عام میں جگہ نہیں پا سکی؛ اور یہ کام بھی "کاما" سے لیا جانے لگا۔

دوسری علامت کا نام "تفصیلیہ" (COLONAND DASH) ہے۔ یہ علامت بھی استعمالِ عام میں جگہ نہیں پا سکی۔ مولوی صاحب مرحوم نے مثالاً ایک یہ جملہ بھی لکھا ہے: "ہندوستان کے بڑے شہر یہ ہیں:- (۱) بمبئی (۲) کلکتہ (۳) حیدرآباد (۴) مدراس ....."۔ مگر یہ فائدہ اب "رابطے" (COLON) ہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ استعمالاً اِن دونوں علامتوں میں معمولی سا فرق ہے، اور اِس فرق کو بہ آسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے، اور کیا کیا جا سکتا ہے، کیا جا چکا ہے؛ اِسی بنا پر، دونوں علامتوں کو اِس مقالے میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

ایک اور علامت ہے "زنجیرہ" (HAYPHEN) مولوی صاحب مرحوم نے اس کے متعلق لکھا ہے:

> "یہ علامت اُن مرکب اجزا کے درمیان لگائی جاتی ہے جن کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ بغیر اِس علامت کے، وہ علاحدہ علاحدہ لفظ سمجھے جائیں گے۔

خاص طور پر علوم کی مرکّب اصطلاحوں میں اِس کا لگانا ضروری ہے "۔

یہ اصطلاح جیسا کہ مولوی صاحب نے خود بھی لکھا ہے (" زنجیرے کا استعمال اب تک نہیں کیا گیا") اب تک استعمال میں نہیں آپائی ہے ۔ مولوی صاحب نے یہ دو مثالیں بھی لکھی ہیں : روسی ـ جاپانی صلح نامہ (جو روس اور جاپان کے مابین ہوا ہے)"۔ " کل ـ ہندی" (ALL - INDIA) مگر لکھاوٹ میں " روسی جاپانی صلح نامہ " اور " کل ہندی " لکھے جاتے ہیں ۔ یہ ممکن ہے کہ سائنس وغیرہ کی اصطلاحوں میں اِس کی ضرورت پیش آئے، وہاں اِس کو شاید استعمال کیا جائے ، مگر عام کتابوں میں نہ اِس کا گزر ہوا ہے اور نہ اِس کا وجود ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ اِس علامت کو بھی اِس مقالے میں شامل نہیں کیا گیا ہے ۔ باقی آٹھ علامتیں مروّج ہیں ، اور اِن علامتوں کو پابندی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے ، خاص طور پر نصابی کتابوں میں اِن کو لازماً استعمال کیا جانا چاہیے، اور تدوین میں بھی ان کے استعمال کو لازم قرار دینا چاہیے ۔

علاماتِ اوقاف کے بیان کو مولوی صاحب مرحوم نے نہایت خوبی اور مناسب تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ، اور ہر علامت کے ذیل میں مثالیں بھی لکھی ہیں۔ میں اُن مثالوں کو مختصر کرکے ، اُس بیان کو وہیں سے نقل کرتا ہوں ، کیوں کہ اُس سے زیادہ اختصار اور خوبی کے ساتھ اور کیا لکھا جائے گا۔ کم سے کم میں نہیں لکھ سکتا ۔ جیسا کہ ابھی لکھ چکا ہوں ، زنجیرے (ـــ) ، تفصیلیے :ـــ اور خط ـــــ کو شامل نہیں کیا گیا ہے ، اور صرف وقفہ (:) کے بیان میں بعض اجزا کو شامل نہیں کیا گیا ہے ۔ اگر کسی جگہ کچھ اضافے کی ضرورت محسوس کی جائے گی ، تو امتیاز کے لیے ، اُس عبارت کو

قوسین میں لکھا جائے گا ۔ مزید امتیاز کے لیے یہ قوسین اِس شکل کے ہوں گے:
[ ] اگر اصل عبارت کا کوئی جُز قوسین میں ہوگا تو اُس کو اِن قوسین
( ) میں لکھا جائے گا —— اب یہاں سے مولوی صاحب کی عبارت
شروع ہوتی ہے :

" اوقاف یا وقفے ، اُن علامتوں کو کہتے ہیں جو ایک جملے کو دوسرے جملے سے ، یا کسی جملے کے ایک حصّے کو دوسرے حصّوں سے علاحدہ کریں۔اِن اوقاف کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اوّل تو اِن کی وجہ سے نظر کو سکون ملتا ہے ، اور وہ تھکنے نہیں پاتی ؛ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ ذہن ، ہر جملے یا جزوِ جملہ کی اصلی اہمیت کو جان لیتا ہے ، اور مطلب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے ۔

جو علامتیں ، وقفوں کے اظہار کے لیے استعمال کی جاتی ہیں ،اُن کے نام اور شکلیں حسبِ ذیل ہیں :

	انگریزی نام	اردو نام	علامت
چھوٹا ٹھہراو ،	COMMA	سکتہ	،
ٹھہراو ،	SEMICOLON	وقفہ	؛
ملاؤ، یعنی مجمل سے مفصّل کوملانے والا ،	COLON	رابطہ	:
	FULL STOP	ختمہ	ـــ
	NOTE OF INTERROGATION	سوالیہ	؟
	NOTE OF EXCLAMATION	فجائیہ ، ندائیہ	!
	BRACKETS	قوسین	( ) یا [ ]
	INVERTED COMMAS	واوین	" "

"علامتوں کا محلِ استعمال :

(۱) سکتہ ، یہ سب سے چھوٹا وقفہ ہوتا ہے - یہ حسبِ ذیل موقعوں پر استعمال ہوتا ہے :

۱- ایسے اسما یا ضمائر کے بیچ میں جو ایک دوسرے کے بدل کا کام دیتے ہوں، جیسے : جہاں گیر، ابنِ اکبر، شہنشاہِ ہندوستان نے جب .....

۲- ایک ہی قسم کے کلمے کے اُن تین ، یا تین سے زیادہ لفظوں کے بیچ میں جو ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہوں (اُس حالت میں جب کہ یا تو صرف آخری دو لفظوں کے درمیان حرفِ عطف یعنی و ، یا اور ، یا حرفِ تردید یعنی یا، آئے ــــــ (۱) حیدرآباد ، میسور اورٹراونکور جنوبی ہند کی ریاستیں ہیں - (۲) چوری کرنا مذہباً ، اخلاقاً اور رسماً بُرا سمجھا جاتا ہے-اُس کا طرزِ عمل عامیانہ ، جاہلانہ اور سوقیانہ ہے - اکبر بہت عقل مند ، وسیع النظر، ہم درد اور مدبّر بادشاہ تھا -

۳- ندائیہ لفظوں کے بعد ، جیسے : جنابِ صدر ، خواتین وحضرات -

۴- جب ایک ہی درجے یا رتبے کے لفظ جوڑوں میں استعمال ہوں،تو ایک جوڑے اور دوسرے جوڑے کے درمیان سکتہ دیتے ہیں : دن ہو کہ رات ، سفر ہو کہ حضر ، خلوت ہو کہ جلوت ، انسان کو چاہیے کہ خدا کو نہ بھولے -

۵ -ایسے اجزاے جملہ کے درمیان جو تشریحی ہوں ، سکتہ آتا ہے : یہ چبوترا ۳۰ فٹ لمبا ، ۲۰ فٹ چوڑا ، ۵ فٹ اونچا ہے -

۶ - دو یا زیادہ ایک ہی درجے کے ایسے چھوٹے جملوں کے بیچ میں جو ایک بڑے جملے کے جُز ہوں : میں گھر سے بازار گیا ، بازار سے مدرسے آیا ، اب مدرسے سے گھر واپس جاتا ہوں ـــ کھیلنے کے وقت کھیلو ، پڑھنے کے وقت پڑھو ـــ

نہ نو من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی۔ ؏. زباں بگڑی تو بگڑی تھی، خبر لیجے دہن بگڑا۔

۷۔ شرط اور جزا یا صلے اور موصول کو بیان کرنے والے سادہ جملوں کے بیچ میں:
اُس کے منہ جو کوئی لگا، ذلیل ہی ہوا۔ جب مطلع صاف ہوگیا اور سورج نکل آیا، تو میں اپنے گھر سے نکلا۔ جس شخص نے مجھ سے، آپ سے کل باتیں کیں، وہ زید تھا۔

۸۔ ایسے سادہ جملوں کے بیچ میں جو مستثنا اور مستثنا منہ کا بیان کریں:
وہ شخص ایمان دار ہے، لیکن سست۔ سارا زمانہ آیا، پر زید نہ آیا۔

۹۔ جب ایک سادہ جملہ دوسرے کی توجیہ کرے، تو دونوں کے بیچ میں سکتہ آتا ہے: میں نہیں گیا، اِس لیے کہ وہ خود ہی میرے ہاں آ پہنچا۔ اُسے گھر بیٹھے نوکری مل گئی، پھر باہر کیوں جاتا؟

۱۰۔ جب کسی فعل کے بعد "کر" یا "کے" مقدّر ہو، تو سکتہ لانا ضروری ہے:
وہ چھڑی ہاتھ میں لے، نکل کھڑا ہوا۔ وہ یہ جا، وہ جا، چمپت ہوگئی۔

۱۱۔ جب مبتدا اور خبر کے بیچ میں کوئی حجاب نہ ہو، تو سکتہ ضرور ڈال دیتے ہیں: یہی مجموعہ یا انتخابِ مضامینِ مطبوعہ، رسالے کا نہایت عمدہ اشتہار بھی بن گیا۔ حالیؔ، مسدّسِ حالی کے مصنّف ہیں۔ مسدّس، حالیؔ کی سب سے ممتاز تصنیف ہے۔ نذیر احمد کی سب سے عام پسند کتاب، مرآۃ العروس ہے۔

۱۲۔ عبارت اور خصوصاً شعر کی تعقید کو دور کرنے کے لیے بھی سکتہ لگاتے ہیں:
(۱) اِس زمانے میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں، کتنے، پہلوں کی رسموں کو پکڑتے ہیں، کتنے، قصّے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کتنے، مولویوں کی باتوں کو جو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں، سند

پکڑتے ہیں اور کتنے ، اپنی عقل کو دخل دیتے ہیں ۔ (ب) سب، رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے ۔ (ج) کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی ، عرض ، کیا قدرت ؟ ۔ (د) دیوار ، بارِ منّتِ مزدور سے ، ہے خم ۔ (ہ) ورنہ مشکل ہے ، حکمت ، دل میں سوزِ غم چھپانے کی ۔ (و) نہیں بہار کو فرصت ؛ نہ ہو ، بہار تو ہے ۔

۱۳۔ اور ، یا وغیرہ سے پہلے جب ہی سکتہ لگاتے ہیں کہ لفظوں پر خاص طور پر زور دینا منظور ہو۔

(۲) وقفہ ؛

جب سکتے سے زیادہ ٹھہراو کی ضرورت پڑے ، تو وقفہ استعمال کرتے ہیں ۔ اِس کا استعمال حسبِ ذیل موقعوں پر ہوتا ہے :

۱۔ جملوں کے لمبے لمبے اجزا کو ایک دوسرے سے علاحدہ کرنے کے لیے ۔ (یہاں سکتوں کے علاوہ وقفوں کا استعمال اِس وجہ سے ضروری ہے کہ خلطِ مبحث نہ ہو جائے) جیسے :

"حق یہ ہے کہ اِس زمانے میں ، جب کہ قومی تپش نما کا پارا ہر گھڑی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے ؛ جب کہ باوجود تعلیمی کاموں کی کثرت کے ، قومی تعلیم کا کوئی صحیح خاکا ہمارے سامنے نہیں ہے ؛ جب کہ سیاسی تار و پود سارے ملک میں پھیلا ہوا ہے ، مگر کوئی طریقہ قومی فلاح کا ایسا نہیں ہے ، جس پر تمام جماعتیں متفق ہو سکیں ؛ جب کہ مصلحت اور اصول ، جہل اور صداقت ، تلوّن اور استقامت میں اکثر مغالطہ ہو جاتا ہے ؛ جب کہ باوجود سادگی کے اِدّعا کے ، عیش پرستی کے بہت سے چور دروازے کھلے ہوئے ہیں....."

۲۔ جہاں جملوں کے مختلف اجزا پر زیادہ تاکید دینا مدِّ نظر ہوتا ہے ، وہاں

بھی وقفے استعمال ہوتے ہیں۔

(الف) جو کرے گا، سو پائے گا؛ جو بوئے گا، سو کاٹے گا۔

(ب) آنا، تو خفا آنا؛ جانا، تو رُلا جانا۔

۳۔ جن جملوں کے بڑے بڑے اجزا کے درمیان ورنہ، اِس لیے، لہٰذا، اگرچہ، چہ جایے کہ، درآں حالے کہ، لیکن اور اِسی قسم کے ربط دینے والے الفاظ آئیں؛ وہاں ذہن کو سمجھنے کا موقع دینے کے لیے، اِن لفظوں سے پہلے وقفے کی علامت لگاتے ہیں۔ واضح رہے کہ جب مذکورۂ بالا الفاظ، چھوٹے چھوٹے جملوں کو ملاتے ہوں تو یہ علامت نہ لگائی جائے گی، بلکہ سکتہ ہی کافی ہوگا۔

(الف) اگرچہ آج کل نقادانِ فن اِس بات کو مذموم سمجھتے ہیں کہ کسی خاص غرض کو پیشِ نظر رکھ کر، یا کسی خیال یا رائے کی اشاعت کے لیے کوئی ڈراما لکھا جائے؛ لیکن ہندستان جیسے ملک میں، جہاں زندگی کا ہر پہلو قابلِ اصلاح ہے، اور معاشرت کے ہر پہلو میں تذبذب اور انتشار بپا ہے، فن کی بعض نازک اور خیالی خوبیوں کو قربان کرسکتے ہیں؛ بہ شرطے کہ وہ سلیقے سے لکھا جائے۔

(ب) چوں کہ نکاح سے قبل ہی نسبت توڑ دی گئی اور لڑکی چچا سے علاحدہ کرلی گئی؛ اِس لیے ایسی شادی سے جو مذموم اور درد ناک نتائج پیدا ہوتے ہیں، اُن کا موقع ہی نہیں آیا۔

۴۔ جن صورتوں میں سکتہ لاتے ہیں، اُن میں وقفہ صرف ایسی حالت میں لائیں گے جب جملے کے بعض ایسے حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا پڑے جن میں اندرونی طور پر سکتہ موجود ہے:

(ا) حیدر آباد، میسور اور ٹراونکور، جنوبی ہند کی؛ بھوپال، گوالیار اور اندور، وسطِ ہند کی ریاستیں ہیں۔

(ب) حالیؔ کی مسدّس، یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید؛ نذیر احمد کی مرآۃ العروس، توبۃ النصوح، محصنات، ایامیٰ؛ شبلیؔ کی الفاروق، موازنہ، سیرۃ النبیؐ؛ پڑھنے اور بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔

(۳) رابطہ :

اِس کا ٹھہراو، وقفے کے ٹھہراو سے زیادہ ہوتا ہے۔

۱۔ عام طور پر اِس کا استعمال وہاں کیا جاتا ہے، جب جملے کے کسی سابقہ خیال یا بات کی تشریح یا تصدیق کی جاتی ہے:

"انسان کو بعضے کاموں کی قدرت ہے، بعضوں کی نہیں: وہ چل سکتا ہے؛ دوڑ سکتا ہے؛ مگر اُڑ نہیں سکتا"۔

۲۔ جب کسی مختصر مقولے یا کہاوت وغیرہ کو بیان کرنا ہو، تو تمہیدی جملے اور اُس جملے کے بیچ میں رابطہ لاتے ہیں:

(ا) کسی حکیم کا قول ہے: آپ کاج، مہا کاج۔

(ب) بہ قولِ شاعر: عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے۔

(ج) سچ ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

[استعمالاً اب یہ صورت ہے کہ نقلِ قول، نقلِ اقتباس (نثر یا نظم) تشریح و تفسیر، بیانِ تفصیلات اور مثالوں سے پہلے، اِسی علامت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے (ا) ہندستان کے مشہور شاعر یہ ہیں: میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ، اقبالؔ وغیرہ۔ (ب) مومنؔ کا یہ شعر: تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ÷ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا؛ بہت مشہور ہے۔ (ج) غالبؔ نے ایک

خط میں لکھا ہے: مغل کے لہجے کی نقل نہ کرو؛ کیوں کہ لہجے کی نقل، بھانڈوں کا کام ہے۔ (د) خدا نے فرمایا ہے: تم کسی کے معبودوں کو بُرا مت کہو؛ ورنہ وہ تمھارے معبودوں کو بُرا کہیں گے ۔]

(۴) ختمہ[1] ـــ

۱۔ یہ علامت مکمل جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہے جہاں ٹھہراو بھرپور ہوتا ہے: دُنیا دارالعمل ہے۔ جب طبیعت خراب ہو تو کوئی کام نہیں ہوسکتا۔

۲۔ مخفّفات کے بعد بھی یہ علامت لگا دیتے ہیں: کے۔ سی۔ آئی۔ ای، بی۔ اے۔

صرف انگریزی کے مخفّفات کے بعد۔ عربی کے مخفّفات کے بعد اکثر نہیں لگاتے: ص، صلعم، ؑ، رضؓ، یوں ہی لکھے جاتے ہیں۔ (جب ایک سے زیادہ مخفّفات ایک ہی سلسلے میں لکھے جائیں تو ہر مخفّف کے بعد، سکتے کی علامت دینی چاہیے): (ا) ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا۔

(ب) ہز اگزالٹڈ ہائی نس، میر عثمان علی خاں بہادر، جی۔ سی۔ ایس۔ آئی، جی۔ سی۔ بی۔ ای،

---

[1] "ایرانی تحریروں میں پورا وقفہ (FULL STOP) انگریزی کی طرح، نقطے سے ظاہر کرتے ہیں؛ لیکن جن زبانوں میں حروفِ منقوطہ کی کثرت ہو، وہاں یہ علامت التباس پیدا کرتی ہے۔ اِس کے لیے چھوٹا خط (ـ) اُردو میں بہت عرصے سے استعمال کیا جا رہا ہے ..."۔

(۵) واوین " "

جب کوئی اقتباس دیا جاتا ہے، یا کسی کا قول اُسی کے الفاظ میں نقل کیا جاتا ہے؛ تو اُس کے اوّل آخر یہ علامت لگائی جاتی ہے: اُس نے جواب دیا "میں کل دس بجے یہاں پہنچوں گا"۔

[اِس کا استعمال اِس طرح بھی ہوتا ہے کہ کسی مشہور شعر کا کوئی ٹکڑا، خاص طور پر کوئی خاص ترکیب، یا کسی نثری عبارت کا کوئی معروف جُز لکھنے والا اپنی عبارت میں اِس طرح استعمال کرے کہ وہ اُسی عبارت کا جُز معلوم ہوتا ہو؛ اِس صورت میں ایسے ٹکڑوں کو واوین میں محصور کر دیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی لفظ یا مجموعۂ الفاظ کو ایک خاص معنی میں، یا ایک خاص طرح استعمال کیا گیا، اور پڑھنے والوں کی توجّہ کو اُس خاص معنویّت یا خاص استعمال کی طرف مبذول کرانا مقصود ہے۔]

(۶) فجائیہ !

یہ اُن الفاظ یا جملوں کے بعد لگائی جاتی ہے، جن سے کوئی جذبہ ظاہر کرنا ہوتا ہے، جیسے: غصّہ، حقارت، استعجاب، خوف وغیرہ۔ جذبے کی شدّت کی مناسبت سے، ایک سے زیادہ علامتیں بھی لگا دیتے ہیں۔

(الف) اُفوہ! سخت تکلیف ہے۔ (ب) معاذاللہ!۔ (ج) بس صاحب! بس!!۔ (د) وہ اور رحم! اِس کی امیّد فضول ہے۔ (ہ) میں اور بزم مَے سے یوں تشنہ کام آؤں!۔

یہ علامت، منادا کے ساتھ بھی استعمال کی جاتی ہے، اور اِسی لیے اِس کو "ندائیہ" بھی کہتے ہیں۔ جیسے: مومن! یہ لافِ الفتِ تقوا ہے کیوں، مگر؟

دلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا ؟ ۔ صنم ! تری بھی ادا کا کوئی جواب نہیں۔

(۷) سوالیہ ؟

سوالیہ جملے کے آخر میں یہ علامت لگائی جاتی ہے : کیا ہے ؟ ۔ کس کی باری ہے ؟

اِس علامت کا ایک محلِ استعمال یہ بھی ہے کہ جب کسی لفظ یا جملے یا شعر کو بہ لحاظِ صحّت مشکوک سمجھا جاتا ہے ، تو اُس کے بعد قوسین میں اِس علامت کو لکھ دیتے ہیں ، تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ اِس مقام پر کوئی خرابی ہے ۔ تدوین میں اِس کا یہ استعمال عام ہے ۔ اِس کے بغیر یہ سمجھا جائے گا کہ مدوّن کو اس محلِ نظر مقام کی اطلاع نہیں تھی اور یہ بڑا الزام ہوتا ہے ۔ یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ ایسے مقامات پر اِس علامتِ استفہام کو لازماً قوسین کے اندر لکھا جائے گا ، یعنی (؟)۔ اگر قوسین کے بغیر لکھا جائے گا تو پھر وہ سادہ علامتِ استفہام ہوگی ، اور اُس سے یہ مقصود حاصل نہیں ہوگا ۔

(۸) قوسین ( )

یہ علامتیں ..... جملۂ معترضہ کے پہلے اور آخر میں لگائی جاتی ہیں : میرا گھر (یعنی مکان کا وہ حصہ جس میں سکونت ہے) بوسیدہ ہوگیا ہے ۔

ہدایات : قوسین کے استعمال کرنے میں اِس بات کا بہت خیال رکھنا چاہیے کہ اِن کے بے جا لانے سے ، عبارت بے ربط نہ ہوجائے ۔ بہت سے لکھنے والے اِس کی پروا نہیں کرتے ؛ اور آج کل ایسے اُکھڑے ہوئے جملے بہت دیکھنے میں آتے ہیں :

(ا) محمود علی صاحب (جن کے بڑے بھائی الٰہ آباد میں تحصیل دار ہیں) کو

میں نے کل موٹر پر جاتے دیکھا۔

(ب) حکیم احمد حسین خاں صاحب (جو اُردو محلّے میں رہتے ہیں اور بڑے حاذق طبیب ہیں) سے میں نے رجوع کیا۔

اِن جملوں میں قوسین کا استعمال اِس طرح ہونا چاہیے تھا:

(ا) محمود علی صاحب کو (جن کے ..... ہیں) میں نے .....

(ب) حکیم احمد حسین خاں صاحب سے (جو اردو محلّے ..... طبیب ہیں) میں نے رجوع کیا۔"

یہاں تک مولوی صاحب مرحوم کی عبارت تھی اور اِسی پر یہ بیان ختم ہوتا ہے۔

املاے فارسی

اُردو اور فارسی ، اِن دونوں زبانوں کا رسمِ خط ایک ہے ، البتہ املامیں کچھ اختلافات ہیں ۔ اِن اختلافات کا تعلق حرفوں کے جوڑ پیوند سے بالکل نہیں، نسخ و نستعلیق دونوں خطوں کی روشیں دونوں جگہ ایک ہی ہیں۔نستعلیق تو ایران ہی سے آیا ہے ۔ اِن اختلافات کا تعلق ہے لفظوں کے املا سے۔ دو مستقل زبانوں میں ایسے اختلافات کا وجود قدرتی بات ہے ۔ یہ بات ضروری ہے کہ " فارسی املا " سے متعلق ضروری تفصیلات معلوم ہوں۔ یہ اِس لیے ضروری ہے کہ اُردو عبارتوں میں کبھی کبھی فارسی کے مصرعے، شعر اور نثری اقتباسات بھی شامل ہوتے ہیں ؛ اُن کی صحیح لکھاوٹ کے لیے ، فارسی املا کے قاعدوں کا علم ضروری ہے ۔اِن کے علاوہ ،تذکرے، قواعد اور لُغت وغیرہ بہت سے اہم موضوعات پر بنیادی کتابیں فارسی ہی میں ہیں ، امیر خسرو سے لے کر بیدل اور پھر غالب اور اُس کے بعد اقبال تک فارسی شاعری کا نہایت درجہ وقیع سرمایہ، ہندستانی ادبیات کے گراں قدر ذخیرے کی حیثیت رکھتا ہے ؛

اِن کتابوں کو مرتب کرنے کا جب بھی مرحلہ آئے گا ، اُس وقت املا کے مسائل سامنے آئیں گے ۔ جب تک اُن مسائل سے صحیح طور سے واقفیت نہیں ہوگی ، اُس وقت تک تدوین کے فرائض سے صحیح طور پر عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا ۔

اِس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ایران کے لہجے کی تبدیلی نے ، املا میں بعض ایسی تبدیلیاں کی ہیں ، جن کو ہم بنیادی تبدیلیاں کہہ سکتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں ہندستان میں اِس لیے رونما نہیں ہوسکیں کہ یہاں لہجے میں وہ تبدیلی نہیں ہوئی ۔ یہاں جو لہجہ پہلے تھا ، وہی اب ہے ۔ مغلوں کے زمانے میں بھی یہاں زبان کی حد تک اہلِ زبان سے سند لی جاتی تھی ، لہجے کی تقلید نہیں کی جاتی تھی ، بل کہ لہجے کی تقلید کو بھانڈوں کا کام سمجھا جاتا تھا ۔ اِس کے سوا ، خود ایران میں لہجے کی یہ تبدیلی نو آمدہ ہے ، قدما کے یہاں یہ صورت اِس طرح نہیں تھی ، اور اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندستان میں کلاسکی فارسی کا لب و لہجہ اب بھی اپنے کو محفوظ رکھے ہوئے ہے ۔

" املاے فارسی " کے اِس باب کو دو فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے :

پہلی فصل میں املا کی اُن تبدیلیوں پر گفتگو کی گئی ہے جو ایران میں لہجے کی تبدیلی کی وجہ سے پیدا ہوئیں ۔ یہ تبدیلیاں خود ایران میں اِس سے پہلے اِس طرح نہیں پائی جاتی تھیں ، اور ہندستان میں نہ پہلے تھیں اور نہ اب ہیں ۔ دوسری فصل میں فارسی املا کے عام قاعدوں پر بحث کی گئی ہے ۔

پہلی فصل :

کہا جاتا ہے کہ اب (معیاری) ایرانی لہجے میں یائے مجہول اور واوِ مجہول کی آوازیں اپنے وجود کو کھو بیٹھی ہیں۔ اِسی طرح "گلستاں"، "ایں"، "چوں" جیسے لفظوں میں غنّہ آواز بھی ختم ہوچکی ہے۔ وہاں یؔ کو معروف بولا جاتا ہے اور جب آخرِ لفظ میں واقع ہوتی ہے تو اُس کی معروف صورت (ي) کتابت میں آتی ہے اور اِس میں کوئی استثنا نہیں۔ اسی طرح ہر نون پر نقطہ لگا دیا جاتا ہے اور اِس کو بولا بھی اعلان کے ساتھ جاتا ہے؛ مگر یہ صورت بہت پُرانی نہیں۔ اب سے سو سوا سو برس پہلے تک کی قواعد اور لغت کی اکثر کتابوں میں معروف و مجہول کی تفریق کا بیان ملتا ہے، اِس فہرست میں وہ کتابیں بھی ہیں جو ایرانی مصنّفین کی لکھی ہوئی ہیں اور اِس کا مطلب اِس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اُس وقت تک یہ آوازیں کُلّیتاً ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اور سو سوا سو برس کی کیا بات ہے، اب بھی بعض ایرانی مصنّف اِس امتیاز کا ذکر کرتے ہیں اور اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواہ عام سطح پر یہ تغیّر اپنی جگہ بنا چکا ہو، مگر پچھلی روش کے طاقت ور اثرات اب بھی اپنے آپ کو نمایاں کر لیا کرتے ہیں۔ یہ بھی علم ہوتا ہے کہ ایران کے بعض علاقوں میں مجہول آوازیں اب بھی موجود ہیں۔ لُغت نامۂ دہخدا، اِسی زمانے کی تالیف ہے، اِس کی چالیسویں جلد میں جلال الدین ہمائی کا ایک طویل مقالہ "دستورِ زبانِ فارسی" کے عنوان سے شامل ہے، اِس میں مقالہ نگار نے "آہنگہا و حروفِ گویای فارسی" کے عنوان کے تحت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ مجہول آوازیں، فارسی زبان کا جُز ہیں؛ جو ابھی بعض لہجوں، خاص طور پر کُردوں کے لہجے میں باقی ہیں۔

مقالہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ آوازیں "مختصاتِ زبانِ فارسی" میں شامل سمجھی جاتی ہیں اور سمجھی جانا چاہیے۔ عبارت یہ ہے:

"آہنگہای فارسی وحروف مصوّتہ بیش از سہ یا چہار تا است۔ درست است کہ واو یا یاء در کلماتِ فارسی گاہی برای بیانِ حرکت یعنی از حروفِ مصوّتہ است اما کیفیت آہنگ آن تفاوت دارد۔ مثلاً واو معروف در کلمات "نوروز، فروز، آموز" با واو مجہول در امثال "شور، کور، مور" وہمچنین یاء مجہول در کلمۂ "سیر" ضد گرسنگی و ہمچنین "شیر" درندہ با یاء معروف در "سیر" مرادف پیاز و "شیر" خوردنی در قدیم دو آہنگ داشتہ و ہم اکنون ہردو آہنگ در بعضی لہجہ ہای بومی از قبیل لہجۂ کردہا باقی ماندہ است۔ بنا برین واو معروف و واو مجہول و ہمچنین یاء معروف و یاء مجہول دو آہنگ ممتاز است کہ از مختصات زبان پارسی شمردہ میشود و باید در حروف مصوّتہ کاملاً شرح داد"۔

ہندستان اور ایران دونوں جگہ مجہول آوازیں شروع ہی سے شاملِ تلفظ رہی ہیں۔ لغات اور قواعد کی اہم کتابوں میں ہمیشہ اِن کا ذکر کیا گیا ہے۔ فارسی لغات میں جگہ جگہ اِس کی صراحت ملتی ہے کہ فلاں لفظ میں یاے مجہول ہے اور فلاں لفظ میں واوِ معروف ہے۔ مثلاً چراغِ ہدایت میں لفظ "تیشہ" کے تحت یہ صراحت کردی گئی ہے کہ یہ "بیاے مجہول" ہے۔ فرہنگِ جہانگیری کے مؤلف نے مقدمۂ فرہنگ میں معروف ومجہول کی اِس طرح صراحت کی ہے:

"و واوے کہ در حور و سور و سود، و یایے کہ در نیل و پیل و زنجبیل و امثالِ آں باشد، آں واو و یا را معروف نوشتم۔ و واوے کہ در

روز و سوز و بوز ، و یایے کہ در سیر و .... مانندِ آں بود ، آں واو و یارا مجہول مرقوم نمودم " (مطبوعۂ مطبعِ ثمر ہند۔ص ۱۸)

مثلاً لفظ "پیشہ" کے ذیل میں اِس طرح صراحت کی گئی ہے : "پیشہ ، با اوّل مکسور و یاے مجہول و شینِ منقوطۂ مفتوح ...."(ص ۲۸۹) ۔ اِس طرح کی صراحتیں فارسی کے اور لُغات میں بھی پائی جاتی ہیں ۔مثلاً صاحبِ برہانِ قاطع نے لکھا ہے :

" و دیگرے یای تعجب است کہ اگر مخاطب حاضر باشد، معروف خوانند و گویند: تو مردِ بدی ، دبسیار بدی ۔ و اگر غائب باشد، مجہول خوانند و گویند : فلانے مرد بدے بود ۔ و ایں یارا اضافت نمی باشد " (مقدّمۂ برہانِ قاطع)

غالبؔ کی ایران پرستی سے سب واقف ہیں ۔ وہ ہندستانی فارسی دانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے ، مگر با ایں ہمہ ، وہ قواعد اور لہجے میں فرق کرتے تھے اور مغل کے لہجے کی تقلید کو " بھانڈپن " سمجھتے تھے ۔ اُنھوں نے تفتہ کو ایک خط میں لکھا ہے :

" صاحبِ بندہ ! تحریر میں اساتذہ کا تتبّع کرو ، نہ مغل کے لہجے کا ۔ لہجے کا تتبع بھانڈوں کا کام ہے ، نہ دبیروں اور شاعروں کا ۔ ایسی تقلید کو میرا سلام "۔

(خطوطِ غالب ، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم، ص ۱۷۹)

یہی بات تیغِ تیز میں اِس طرح لکھی ہے ، یہاں نونِ غنّہ زیرِ بحث ہے:

" اسی ۱۸ اور ۱۹ صفحے میں جہاں کندیدن کو غلط بتاتے ہیں ، اور ماند و خواند کو بروزنِ چاند غلط بتاتے ہیں ، اور مند و خند کو بروزنِ تند و کند صحیح فرماتے ہیں ۔ ..ں سے لازم آتا ہے کہ ماندن و خواندن بھی

بے الف بروزنِ گُندن ہو ، جو ہندی میں اسم زرِ بے غش ہے ؛ لاحَولَ وَلا قُوَّۃَ اِلّا بِاللّٰہ ۔ خواندن مع الواوِ معدولہ و الف ، اور ماندن مع الالف ، اور خواند مع الواو اور الف ، اور ماند مع الالف ، مولوی جی کی مثال کے مطابق بروزنِ چاند صحیح ہے ، لیکن اہلِ ایران الف کو سُلا دیتے ہیں ، اور یہ لہجہ ہے ، نہ قاعدہ ؛ شاعر اور منشی کو تتبّع قواعد کا چاہیے ، لہجے کی تقلید ، بہروپیوں اور بھانڈوں کا کام ہے "۔
(قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ ، مرتبۂ قاضی عبدالودود صاحب ، ص ۲۷۰)

انشا نے بھی دریاے لطافت میں مغل کے لہجے کی نقل کا مذاق اُڑایا ہے اور اُسے " تمغّل " کہا ہے ۔ مرزا صدرالدین صفاہانی مرزا کاظم اصفہانی اور مولوی عبدالفرقان اور لالا مکتا پرشاد سریواستو کی گفتگو جہاں درج کی ہے ، وہاں مولوی صاحب اور لالا صاحب کے ایسے الفاظ درج کیے ہیں ، مثلاً : " شما کو " شمو " تمغّل کی وجہ سے کہا " ۔ " ایشور " ، بجاے " ایشاں " بمعنیِ شما ۔ " خوک پوک " یہ غلبۂ تمغّل نے " خاک پاک " کی مٹی عزیز کی ہے " ۔ " زبوں " ، زبان کی جگہ ، مُغلیت کے غلیان کی وجہ سے " ۔

چوں کہ خود ایران میں دورِ اساتذۂ متاخّرین تک یہ آوازیں موجود تھیں ، لغات و قواعد کی کتابوں میں بھی معروف و مجہول کی تفریق کا ذکر کیا جاتا تھا ، علمِ قافیہ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ، اُن میں بھی تقفیۂ معروف و مجہول کا خاص طور پر ذکر ملتا ہے ، اور ہندستان میں تو آج بھی یہ آوازیں موجود ہیں اور یہ یہاں کے لہجے کا غیر منفک جُز ہیں ؛ اِن وجوہ سے ، اصول یہ قرار پائے گا کہ قدیم ایرانی فارسی ادب ہو (عنصری ، فرخی ، فردوسی ، سعدی ، حافظ ، نظامی ، انوری ، جامی وغیرہ) یا ہندستانی فارسی ادب

ہو (بدر چاچ اور امیر خسرو سے لے کر غالب و اقبال تک ، بل کہ آج تک)
اِس سارے سرمایے کو ، اُس عہد کے مسلّمہ قواعد کے مطابق ، معرضِ تحریر و تقریر میں لایا جائے گا ۔ یعنی فرخی کے قصیدے ہوں اور سعدی کی غزلیں ہوں یا گلستاں بوستاں ، حافظ کا کلام ہو یا نظامی کی مثنویاں ، غالب کی نثر و نظم ہو یا اقبال کی منظومات ؛ اِن سب میں املا اور تلفظ دونوں میں معروف و مجہول اور غنّہ آوازوں کا امتیاز ملحوظ رکھا جائے گا ۔ اگر کوئی شخص فارسیِ جدید کی تقلید میں اِس کے خلاف کرے گا ، تو یہ طریقہ اصولِ تدوین کے قطعاً خلاف ہوگا ۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مصنف کی تحریر میں ، اور کسی عہد یا علاقے کے مسلّمہ قواعد میں تحریف کرے ، اور بنیاد اُس کی یہ ہو کہ اب ایسا نہیں ہوتا ۔ اگر کسی نے " ایک شخص " کے معنی میں " شخصے " لکھا ہے ، (جیسا کہ لکھا جاتا تھا) تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُس کو " شخصی " لکھے اور بولے ۔ یا " ہُوش " کو " ہوش " بر وزنِ " موش " پڑھے اور لکھے اور " پیشہ " کو " پیشہ " لکھے ۔

اگر کوئی صاحب غالب کے اِس شعر میں :

ہم وعدہ و ہم منع ز بخشش ، چہ حساب است
جاں نیست ، مکرر نتواں داد ، شراب است

" جاں " اور " نتواں " کو جدید فارسی لہجے کے مطابق پڑھیں اور بہ نونِ نقطہ دار لکھیں ، تو غالب کے منقولۂ بالا قول کی روشنی میں اِس طرزِ عمل کو کیا کہا جائے گا ؟ کیا یہ لہجے کی وہ تقلید نہیں ہوگی ، جس کو اُنھوں نے " بہروپیوں اور بھانڈوں " کا فن بتایا ہے ؟

لہ ذکرِ میر میں میر صاحب نے کچھ لطیفے بھی لکھے ہیں ۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب
(بقیہ ص ۵۶۶ پر)

غالب نے قاطعِ برہان میں لکھا ہے :

" مدہوش لغتِ عربی الاصل است ، مفعولِ دہشت ، و ہیچ صیغۂ مفعول درعربی بواوِ مجہول نیست ، پارسیاں تصرف کردہ بواوِ مجہول ، مرادفِ مست و بیخود میآرند "۔ (قاطعِ برہان و رسائلِ متعلقہ ، ص ۱۲۱)

اب اگر کوئی شخص اِس کو " مدہوش " پڑھے ، تو غالب کی روح کیا کہے گی؟ قاطعِ برہان ہی میں لفظ " شکوہ " کے متعلق اُنھوں نے لکھا ہے :

" شکوہ بضمِ شین زنہار نیست ، ہماں بکسرۂ شین و ضمۂ کاف و واوِ مجہول ، اسمِ جامد است ..... "

اِس کو " شکوہ " کے بجاے " شکوہ " کہنا کیسے جائز ہوگا ؟

نے اُن میں سے کچھ لطیفوں کے ترجمے ایک مضمون کی صورت میں پیش کیے ہیں ۔ یہ مضمون اُن کے مجموعۂ مضامین نگارشاتِ ادیب میں شامل ہے ۔ اُن میں سے ایک لطیفہ یہ ہے ، جس سے معلوم ہوگا کہ اِس قماش کے لہجے کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا :

" عراقیوں کے لہجے میں ہر الف کو ، جس کے بعد نون آتا ہے ، واو سے بدل دیتے ہیں ۔ صفدر محمد خاں عراقی ایک دن محمد شاہ کے مجرے کو گیا ۔ بادشاہ نے اِس خیال سے کہ اِس قسم کے بعض الفاظ عراقیوں کے لہجے میں قباحت پیدا کرتے ہیں ؛ اُس کو مخاطب کرکے ، شیخ سعدی کا یہ مصرع پڑھا : اے مرغِ سحر ، عشق ز پروانہ بیاموز ــــ خانِ مذکور فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا ، اور بولا : جی ہاں ، کوں سوختہ را جوں شدو آواز نیامد "۔ (نگارشاتِ ادیب ، ص ۱۴۱)

مخدومی مولانا امتیاز علی خاں عرشی (زاد مجدہ) نے اِس موضوع پر ایک گراں ارز مقالہ لکھا ہے، جس کا عنوان ہے: "فارسی کا ہندستانی لہجہ"، یہ مقالہ ارمغانِ مالک (جلدِ اوّل) میں شامل ہے۔ مولانائے محترم نے اِس مقالے میں نہایت تفصیل سے اِس موضوع پر بحث کی ہے اور مختلف ادوار میں لکھی گئی لغات اور قواعد کی کتابوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ایران میں اساتذۂ متاخرین تک یہ آوازیں مستقلاً موجود تھیں اور اُن کا پوری طرح لحاظ رکھا جاتا تھا۔ میری تو یہ بساط نہیں کہ اِس پر کچھ اضافہ کر سکوں، البتہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اِس مقالے سے کچھ ضروری حصّے یہاں نقل کیے جائیں، تاکہ وضاحت بل کہ قطعیّت کے ساتھ اِس مبحث سے متعلّق ضروری باتیں سامنے آجائیں، اور یہ معلوم ہو کہ جس انداز کو ہندستانی لہجے سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ بجائے خود معیاری چیز[1] ہے۔ مقالے میں بہت سے حوالے ہیں، ظاہر ہے کہ سب حوالوں کی نقل غیر ضروری بات ہوتی، اِس لیے انتخاب سے کام لیا گیا ہے۔ اِس مقالے میں ہاے مختفی کے حرفِ ماقبل کی حرکت (فتحہ یا کسرہ) اور "ندہ" پر ختم ہونے والے لفظوں میں "ندہ" کے حرفِ ماقبل کی حرکت پر بھی بحث کی گئی ہے، اِن دونوں بحثوں کا تعلق چوں کہ کُلّیتاً تلفّظ سے ہے، املا سے نہیں، اِس لیے

---

[1] اِس موضوع پر ڈاکٹر شوکت سبزواری (مرحوم) نے بھی ایک مختصر سا مقالہ لکھا ہے، عنوان ہے: "قدیم ہند ایرانی مصوّتے، واو اور یاے مجہول"۔ یہ مقالہ ارمغانِ مالک، جلدِ دوم میں شامل ہے۔ نیز دیکھیے ملک الشعرا بہار کی کتاب: سبک شناسی کی پہلی جلد۔

اِن سے قطعِ نظر کرنا مناسب سمجھا گیا :

" اِس وقت مجھے فارسی زبان کے کچھ ایسے تلفّظوں سے بحث کرنا ہے، جن میں ایرانیوں اور ہندیوں میں اختلاف ہے ، اور یہ طے کرنا ہے کہ اِن دونوں میں قدیم کون سا ہے - اور یہ کہ ہندستانی لہجہ اہلِ ہند کی اُپج ہے ، یا یہ کہ خود ایران کا کلاسیکی تلفّظ ہے - موضوعِ بحث ہیں (۱) واو اور یاے مجہول ..... اور (۲) نونِ غنّہ -

جیسا کہ اہلِ علم واقف ہیں ، آج کل ایرانی حضرات واو اور یاے مجہول کو بھلا چکے ہیں ..... فارسی کے جو لفظ ایسے نون پر ختم ہوتے ہیں جس سے پہلے ا ، و اور ي ہو ، تو ہم ہندستانی ایسے نون کو نونِ غنّہ قرار دیتے ہیں ، اور ہمارے برخلاف اہلِ ایران اِس کا تلفّظ بہ اعلانِ نون کرتے ہیں .... -

جیسا کہ آیندہ حوالوں سے ثابت ہوتا ہے ، اہلِ ہند کا لہجہ کلاسکی اور باقاعدہ ہے ، اور ایرانیوں کا تلفّظ نیا ، جو کسی خاص علاقے سے نکل کر ، سیاسی یا ادبی اثرات کے تحت ، عمومی حیثیت اختیار کر گیا ہے - اِس لیے اہلِ علم کے لیے ضروری ہے کہ کلاسکی شعراے فارسی کے کلام کو قدیم لہجے کی روشنی میں دیکھیں ، اور اُن کے قوافی وغیرہ کو جدید لہجے کے مطابق پڑھنے سے احتراز کریں -

واو و یاے معروف و مجہول :

(۱) اِس بحث میں قدیم ترین گواہ جو میری دسترس میں ہے، "المعجم فی معاییر اشعار العجم" ہے - یہ مولّف اوائلِ قرنِ ہفتم میں موجود ..... اور شیخ سعدؔی کا معاصر تھا - حروفِ قافیہ کی بحث میں ، حرفِ

ردف کے تحت لکھتا ہے :

«ضمۂ ماقبلِ واو در لغتِ فارسی دوگونہ بود : مُشْبَعَہ و مُلَیَّنہ۔
مشبعہ ، چناں کہ ضمۂ حور ، سور ، وملینہ چناں کہ ضمۂ روز ، یوز۔
وہمچنیں کسرۂ ماقبلِ یا ، دوگونہ باشد : مشبعہ وملینہ —
مشبعہ ، چناں کہ کسرۂ نیل و زنجبیل ، و ملینہ ، چناں کہ
کسرۂ دیر و پریر۔

و متقدمان شعراء متحرک بضمۂ مشبعہ را مرفوعِ معروف
خواندہ اند ، ومتحرک بضمۂ ملینہ را مرفوعِ مجہول۔ وہمچنیں
متحرک بکسرۂ مشبعہ رامکسورِ معروف و بکسرۂ ملینہ را
مکسورِ مجہول « .....۔

اِن اقتباسوں سے ثابت ہوتا ہے کہ چھٹی صدی کے آخر اور ساتویں صدی کے
شروع میں اہلِ ایران واؤ اور یؔ کو مجہول بھی بولتے تھے اور اِسے
اصطلاحاً « ملیّنہ » کہتے تھے۔

(۵) مولانا جامی کے شاگرد عطاء اللہ بن محمود الحسینی نے علمِ قافیہ پر
ایک رسالہ تالیف کر کے ، میر علی شیر نوائی (ف : ۹۰۶ ھ) کے نام
معنون کیا تھا۔ اِس میں بھی حروفِ ردف کے تحت لکھا ہے :

« بداں کہ ہریک از واو و یا ، ردفِ معروف ومجہول میباشد۔
معروف آنست کہ ضمۂ ماقبلِ واو وکسرۂ ماقبلِ یا را اشباع
کردہ باشند ، مانندِ دوؔد و دیؔد۔ ومجہول آنست کہ اشباع
نکردہ باشند ، مثلِ روؔد و بیدؔ »۔

اِس عبارت کی تفسیر و تشریح کی بھی ضرورت نہیں۔

(۷) لغتِ فارسی کی مشہور کتابوں میں "موید الفضلاء" بھی ہے یہ .....
۹۲۵ھ میں لکھی گئی ہے - اِس میں واو اور یاے مجہول کو "فارسی" اور معروف
کو "تازی" کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، چناں چہ بحثِ یآ میں لکھا ہے:

"ویای تازی برای خطاب آید، چنانچہ: کردی - و یای فارسی
برای تنکیر، چنانچہ: مردے"-

(۱۱) سراج الدین علی خاں آرزو اکبر آبادی (ف: ۱۱۶۹ھ) نے ایک لغت
سراج اللغۃ کے نام سے لکھا ہے ..... اِس کتاب میں بھی صدہا لفظوں
میں مجہول واو اور یآ کی نشان دہی کی گئی ہے ... -

(۱۲) ایران کا ایک بہت بڑا عالم اور مورّخ اور شاعر لسانُ الملک
مورّخ الدولہ میرزا محمد تقی خاں مستوفی کاشانی، متخلص بہ سپہر ہے؛ اس
نے ۱۲۶۸ھ میں "براہین العجم فی قوانین المنجم" نام سے ایک کتاب علم
قافیہ پر تصنیف کی، اُس کے مقدمے میں لکھتا ہے:

"باید دانست کہ در قوانینِ فارسیہ ..... ایں واو و یآ بر دو نمط بود:
یا معروف بود، یعنی باشباعِ تمام گفتہ شود، چوں واو و یای
پور و پیر- و یا ایں واو و یآ مجہول بود، چوں واو شور و یای
شیر درندہ"-

سپہر کا ایک معاصر... میرزا رضا قلی خاں متخلص بہ ہدایت ہے-اس نے
۱۲۸۶ھ میں اپنا مشہور لغت "فرہنگ انجمن آرای ناصری" لکھ کر....اس
کتاب کے دیباچے میں واو کے بارے میں لکھا ہے:

"باید دانست کہ حرف واو خواہ در آخر و خواہ در وسط بود، اگر
ما قبلش ضمۂ خالص باشد، واو معروف گویند، و اگر خالص

نباشد، مجہول خوانند "۔

حرفِ یاؔ کے متعلق بھی یہی راے ظاہر کی ہے ۔

آقاے سیّد محمد علی داعی الاسلام بھی ایک ایرانی فاضل تھے .... انھوں نے " فرہنگِ نظام " کے نام سے چار جلدوں میں ایک فارسی لُغت مرتّب کرکے شائع کیا تھا..... اِس لغت کی جلدِ اوّل کے مقدّمے میں مولّف نے لکھا ہے :

" شعرای زبانِ فارسی بعضے از واو ہا و یا ہا را معروف میدانند، و بعضے را مجہول ۔ مثلاً واوِ زوؔر را مجہول میدانند، و واوِ لفظ بوؔد را معروف ، وحال آنکہ ہر دو در تلفّظِ ایران مسا دیند ۔ وہ یای لفظ دیؔر را مجہول میدانند و یای لفظ پیؔر را معروف، وحال آنکہ ہر دو در تلفّظِ ایران مسا دیند ۔

شعرای فارسی لفظِ واوِ معروف دار را با کلمۂ واوِ مجہول دار قافیہ نمی بندند۔ مثلاً لفظ زوؔر را با دوؔر قافیہ نمی بندند۔ ہمچنین کلمۂ یای معروف دار را با یای مجہول دار مثل شیؔر با نخچیؔر قافیہ نمی بندند "۔

ایرانؔ ہی کے ایک اور فاضل میرزا عبدالعظیم خاں قریب العہد ہیں ۔ انُھوں نے " دستورِ زبانِ فارسی " کے نام سے ایک کتاب تالیف کی ہے ، جو ۱۳۲۵ھ میں تہرانؔ سے چھپ کر شائع ہوچکی ہے ۔ اِس میں وہ لکھتے ہیں :

" چون ضمۂ ماقبل واو و کسرۂ ماقبلِ یا را اشباع کنند، آنہارا معروف خوانند، وگرنہ مجہول ۔ واوِ معروف : فرِوز ، تموز، شوخ، کلوخ ، دور ، نور ۔

واوِ مجہول : گور، تنور ، شور ، کور ، زور ۔

یای معروف : بیخ ، جاوید ، تیر ، پیش ۔
یای مجہول : دلیر ، دیر ، کویر ، شمشیر ، زیر۔
ولے امروز اغلب واو و یای مجہول را مانندِ معروف تلفظ میکنند۔
امّا در ہندوستان و کردستان ہنوز این فرق باقی است "۔

اِن حوالوں میں سے صرف ، ہندی اور باقی ایرانی ہیں ۔ اور ان میں ساتویں صدی ہجری سے دورِ حاضر تک کے اربابِ علم نظر آتے ہیں۔ اِس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ واو اور یا کا دو قسموں ، معروف ومجہول میں منقسم ہونا ، مسلّماتِ قوم میں داخل ہے اور اِس لیے قاعدے کی بات یہی ہے کہ اِن کے تلفّظ میں فرق ملحوظ رکھا جائے ، جیسا کہ شعراے فارسی نے ہمیشہ سے ملحوظ رکھا ہے ۔

نونِ غنّہ :

آج کل اہلِ ایران نونِ غنّہ بھی استعمال نہیں کرتے ، لیکن ہندی لہجے میں یہ نون قدم قدم پر نظر آتا ہے ۔ کتبِ قواعد سے پتا چلتا ہے کہ نونِ غنّہ خود ایران میں بھی موجود ہے ۔

(۱) چنانچہ شمس قیس ، المعجم میں لکھتا ہے :

" و امّا نونِ غیر ملفوظ ، ہر نون کہ ماقبلِ آں ساکن باشد ، و در شعر بہ تحقیقِ آں احتیاج نبود و در تقطیع ساقط آید ، چنانکہ :

چوں نگاریں روی او در شہر نیست

کہ نونِ "چوں" و "نگاریں" از تقطیع ساقطند "۔

(۲) محقق طوسی لکھتے ہیں :

" و حرفہای دیگر باشد کہ ہم از ترکیبِ دو حرف حادث باشد ،

مثلاً چنانکہ از ترکیبِ یکے از حروفِ مدۃٔ غنۂ نون در لفظ دوٗن و داں و دیں باشد۔ و امثالِ ایں افتد کہ بر وزنِ دوٗ و دا و دی باشد"۔ (معیار الاشعار، ص ۷)

ملّا عبدالرشید نے تحریر کیا ہے :

"چوں در آخرِ کلمہ واقع شود، و ما قبلش یکے از حروفِ علّت باشد، بطریقِ غنّہ متلفظ شود، چوں زباں و دہاں۔ وگاہے در وسط نیز چوں نشاند و خواند و راند"۔ (فرہنگِ رشیدی)

رضا قلی ہدایت نے پہلے تو فرہنگِ رشیدی کا بیان من و عن دُہرایا ہے، پھر لکھا ہے :

"و نونے کہ بغنّہ ملفوظ گردد بہ نونِ غنّہ نامیدہ شود، چنانکہ بہ لفظِ زباں و زبوں و زمیں۔ و اعلانِ نونِ چنیں کلمات نزدِ فصحاے متاخرین بسیار قبیح است، مگر در صورتِ مضاف یا موصوف یا معطوف یا ملحق بہ ضمیر و لفظِ است شدنِ آنہا"

(فرہنگِ انجمن آرای ناصری، مقدمہ)

خلاصۂ کلام :

اِس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ ہند کا لہجۂ فارسی کلاسکی ہے، اور ایران، افغانستان، ماوراء النّہر، کُردستان اور ترکی، سب کا مسلّمہ ہے۔ نیز یہ ساتویں صدی سے آج تک فنّی حیثیت رکھتا ہے، اِس لیے قواعدِ فارسی کی ساری کتابوں میں خواہ ایران میں لکھی گئی ہوں یا کہیں اور، اسی لہجے کو معیاری قرار دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے تازہ موٗلّف... اِس کے خلاف لکھتے بھی ہیں تو یہ ضرور بتا دیتے ہیں کہ اب یوں بولتے ہیں،

یا فلاں جگہ کا یہ لہجہ ہے جو ہم لکھ رہے ہیں۔
ہندیوں نے اب تک اِس کے خلاف نہیں لکھا ہے ؛ لہٰذا امیر خسروؔ یا کسی
دوسرے ہندستانی شاعر کے یہاں ایرانی لہجے کی تلاش غلط ہے "۔

اب قاعدہ یہ ہوا کہ خواہ قدیم ایرانی مصنّفین کی تحریریں ہوں، یا وہ فارسی ادب ہو جو شروع سے اب تک ہندستان میں معرضِ وجود میں آیا ہے ؛ اِس سارے سرمایے میں معروف و مجہول آوازوں کا امتیاز اُسی طرح ملحوظ رکھّا جائے گا جس طرح ملحوظ رکھّا جاتا تھا اور جس کی ہندستان میں اب بھی مکمّل پابندی کی جاتی ہے۔ اِس کی چند صورتیں ہیں :

یاے وحدت و تنکیر : جیسے : شخصے، مردے، کسے، کتابے، شہرے، مسافرے، راہے۔

ع : دلے بفروختم، جانے خریدم

ع : ہر کمالے را زوالے، ہر زوالے را کمال

ع : ہر کسے مصلحتِ خویش نکو میداند

ع : مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

ع : آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

ع : میپرد رنگم، حبابے گر بدریا بشکند

اِسی طرح : زندگیے، آدمیے، موسیے، عیسیے، گفتگویے، جستجویے، آرزویے، جادویے، رعنایے، زیبایے۔

ع : آرزوے بدلم جلوہ گری کردہ بود

ع : موسیے با موسیے در جنگ بود

ع : ہر آدمیے دریں جہانِ فانی

سی طرح : کعبہ اے بنا کردم ، آستانہ اے یافتم ، جملہ اے نوشتم ،
جلوہ اے دیدم ، پردہ اے درمیاں آمد۔

ع : قطرہ اے تا مے تواند شد ، چرا گوہر شود۔

ع : افسانہ اے کہ لیلیِ محمل نشیں شنید۔

ع : پارہ اے از حالِ من بر جبہۂ من روشن است۔

تعظیم و تحقیر کے لیے ، جیسے ع : شاہبازے بشکارِ مگسے میآید ۔
زائد " است " کے ساتھ ، جیسے ع : ز شرمِ رنگِ رخسارش چو نیلوفر درآ بستے۔
قلت کے مفہوم کے لیے ، جیسے ع : سکندر را نمی بخشند آبے ۔
ماضی شرطی کے صیغوں میں : گفتے ، گفتندے ، کردے ، آمدے ۔
کلمۂ ندا : اے خدا ، اے فلک ، اے خضر۔

ع : اے کہ آگاہ نہ ای عالمِ درویشاں را۔

ماقبل مفتوح : مے ، نے ، پے ، کے ، وے ، طے ، رے ، دے ۔
اضافت کی صورت میں اِس " یے " کے نیچے زیر آجائے گا : مےِ تلخ ،
پےِ عذرِ نارسائی ، نےِ آذر فشاں ۔
کلمۂ " بے " لفظ کے ساتھ ملا کر لکھا جائے گا ، جیسے : بیدرد ، بیوفا ، بیدل ۔
مگر جن مواقع پر اِس کو علاحدہ لکھنا چاہیے ، وہاں اِس کی صورت " بے "
ہوگی۔ جیسے : بے پر و بال ، بے ننگ و نام ، بے سر و ساماں ، بے آزار ،
بے آب ، بے اماں وغیرہ ۔
کلمۂ نفی " نے " ، ہمیشہ الگ لکھا جاتا ہے ۔ جیسے ع : نے غم دزد و نے
غمِ کالا ۔
اگر ضرورت سمجھی جائے گی تو درمیانِ لفظ میں یائے معروف کے نیچے

(اردو کی طرح) کھڑی لکیر بنا دی جائے گی، جیسے: کیسہ وغیرہ۔ اور یاے مجہول کے لیے، حرفِ ماقبل پر زیر لگایا جائے گا، جیسے: پیشہ۔ ایرانیوں کو تو اِن علامات کی ضرورت نہیں، مگر ہندیوں کو اِس کی ضرورت پڑ سکتی ہے (کم سہی) اور ضرورت پڑنے پر اِن علامات کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اِسی طرح واوِ معروف پر (حسبِ ضرورت) اُلٹا پیش لگایا جا سکتا ہے، اور واوِ مجہول کے لیے، حرفِ ماقبل پر پیش لکھنا کافی ہے: جیسے: طُور، دُور، مُور، زُور۔

اِسی طرح اِس سرمایے میں نونِ غنّہ کی آواز برقرار رہے گی۔ لفظ کے آخر میں نونِ غنّہ جب آئے گا تو اُس پر نقطہ نہیں رکھا جائے گا، جیسے: گلستاں، بوستاں، اندیشۂ ایماں، غمِ دوراں وغیرہ۔

ع: تا درِ خانۂ جلّاد غزلخواں رفتم۔

جدید ایرانی ادبیات کے لیے، جدید روش کو اپنایا جائے گا۔ اِس میں ہر نون نقطہ دار ہوگا اور ہر یَ معروف۔ ہم پڑھیں کسی طرح (اور ظاہر ہے کہ ہندستانی تلفظ کے اثرات یہاں بھی کچھ نہ کچھ اپنے اثرات کو نمایاں کریں گے) مگر املا وہی ہوگا جو اب ایران میں رائج ہے اور مسلّم ہے۔ اردو والوں کو جن کتابوں سے سابقہ پڑتا ہے، قریب قریب وہ سب قدیم فارسی ادب سے متعلق ہیں یا ہندستان کے فارسی سرمایے سے تعلّق رکھتی ہیں، جدید فارسی ادب عموماً نصابی ضرورتوں کے کام آتا ہے؛ اِس لیے اِس سلسلے میں کچھ دقّت نہیں ہوگی

فارسی میں ہاے مخلوط کی آواز نہیں پائی جاتی ، اس لیے وہاں ہاے ملفوظ و ہاے مخلوط کی شکلوں میں وہ تفریق بھی نہیں ، جس کو اردو میں اب ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔ چونکہ ہندستان میں یہ آواز موجود ہے ، اور اردو میں اِس آواز کے لیے ایک خاص شکل (ھ) کو متعین کرلیا گیا ہے ؛ اِس لیے مناسب یہ ہوگا کہ اب یہاں فارسی عبارت میں ہاے ملفوظ کو ، دوچشمی صورت (ھ) میں بالکل نہ لکھا جائے ۔ یعنی ہمدرد ، ہست ، ہوا ، ہوس ، تہنیت ، سہل وغیرہ لکھا جائے ؛ " ھمدرد " ، " ھوس " ، " ھوا " ، " تھمورث " ، " تھران " وغیرہ نہ لکھا جائے ۔ فارسی کی اکثر کتابیں اب ٹائپ میں چھپتی ہیں ، اور ٹائپ میں اِس شکل (ھ) کو اکثر استعمال کیا جاتا ہے (یہ عربی کا اثر ہے) ، اِس لیے فارسی مطبوعات میں اِس شکل کا استعمال اکثر ہوتا ہے ۔ اِس سلسلے میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ جو کتابیں وہاں لیتھو میں چھپتی ہیں (اور ان کی تعداد بہت کم ہے) یعنی جن میں کمپوزنگ کے بجاے کتابت کا قدم درمیان ہوتا ہے ، اُن میں ہاے ملفوظ دوچشمی صورت میں کم ملتی ہے ۔

بہ ہرصورت ، ایران میں جو بھی صورت ہو ؛ ہندستان میں اب فارسی تحریروں میں ہ کی دوچشمی صورت (ھ) کو نہیں استعمال کرنا چاہیے ، اور اِس صورت کو اُردو سے مخصوص سمجھنا چاہیے ۔ عربی تحریریں یہاں بحث سے خارج ہیں ۔ اُردو اور فارسی میں جو نسبت ہے ، وہ اردو اور عربی میں نہیں پائی جاتی ، اِس لیے اِس بات کو بیچ میں نہیں لانا چاہیے کہ عربی میں بھی تو یہ صورت عام طور پر پائی جاتی ہے ۔

دوسری فصل :

اُردو کی طرح فارسی میں بھی املا سیّال حالت میں رہا ہے ۔ فارسی میں بھی عدمِ تعین نے اختلافِ نگارش کو رواج دیا ، جس کی مثالیں ہر کتاب اور ہر تحریر میں دیکھی جا سکتی ہیں ۔ گویا عدمِ تعین اور انتشار کے لحاظ سے اردو اور فارسی میں املا کے مصائب مشترک[۱] ہیں ۔ محض بہ طورِ مثال عرض کروں کہ ایسا لفظ جو ہاے بیانِ حرکت (ہاے مختفی) پر ختم ہوتا ہے ، اُس کے ساتھ یاے وحدت و تنکیر کا اضافہ کس طرح کیا جائے ، یہ بات اختلاف کا ہدف رہی ہے ۔ کچھ لوگ اُس پر ایک ہمزہ لکھ کر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وحدت یا تنکیر کا اضافہ حاصل ہو گیا ، جیسے : بندۂ (ایک بندہ) اور پروانۂ (ایک پروانہ) اور آستانۂ (کوئی آستانہ) ۔

---

[۱] احمد بہمنیار نے "املای فارسی" میں اِس سلسلے میں نہایت دل سوزی کے ساتھ اختلافاتِ املا کی پیدا کی ہوئی مشکلات کا ذکر کیا ہے ، اور مفصّل قواعد کی ضرورت پر زور دیا ہے ۔ اُن کی عبارت کا ضروری حصّہ یہ ہے :

"اختلاف حیرت آوری کہ در رسم الخط کتابہا و رسایل فارسی از قرن چہارم تا بدین عصر حتی در رسم الخط یک کتاب کہ در یک زمان و بقلم یک کاتب نوشتہ شدہ است مشاہدہ میکنیم نتیجۂ مضبوط و مدون نبودن قواعد املا و طرز کتابت است کہ نویسندگان خود را در تصرف در املا و رسم الخط آزاد دیدہ و ہر کدام بی آنکہ فکر اصلاحی داشتہ باشند شیوہ و رسمی اختیار کردہ و مقداری بر ہرج و مرج اشکال کتابت افزودہ اند"

"... امروز ببرکت عموم یافتن تعلیمات ... ہر نویسندہ ہر قدر کہ بی اطلاع

(بقیہ حاشیہ ص ۵۷۹ پر)

کچھ لوگ لفظ کے آگے " اے " (یا " ای ") کا اضافہ کرنا مناسب قرار دیتے ہیں، جیسے : پروانہ اے (یا پروانہ ای) اور جلوہ اے (یا جلوہ ای) ۔ اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ایسی صورت میں لفظ کے آگے " یی " کا اضافہ کرنا چاہیے، جیسے : خانہ یی ـــــ اِس طرح کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ ایسی صورت میں تعیّن اور ترجیح کی اشد ضرورت ہے ۔

اردو کی طرح فارسی میں بھی املا کے قاعدوں کو منضبط کرنے کی طرف باقاعدہ توجہ اِسی بیسویں صدی میں کی گئی ہے ۔ متعدد لوگوں نے اِس سلسلے میں متفرق کوششیں کی ہیں ۔ اِس سلسلے کی تحریروں میں ،

باشد مایل است کہ درست و بی غلط نویسد... و متأسفانہ چنین قواعدی در دست نیست و ہمہ منتظر اند کہ فرہنگستان کہ امروز یگانہ مرکز یا ہیئت صالح برای این امر و بصورت رسمی موظف برفع نقایص زبان فارسی است دراین زمینہ اقدامی کند "

" سبب وجہت دیگر کہ سرعت در اقدام بدین امر را ایجاب میکند اشکالاتی است کہ ہر سال در موقع امتحانات نہایی مدرسہ ہا در امتحان املای فارسی پیش می آید، وبطوری کہ مشاہدہ کردہ ایم از یک طرف امتحان دہندگان در نوشتن کلماتی کہ باشکال مختلف نوشتہ شدہ یا میشود مردود و متحیّر می مانند و از طرفی ہم امتحان کنندگان در رسیدگی باوراق املا در طرز نوشتن بعضی کلمات اختلاف نظر و عقیدہ پیدا می کنند و در مقایسۂ اوراق املا کہ در دو حوزۂ امتحانی تصحیح شدہ، می بینیم کہ ممتحن یک حوزہ غلط گرفتہ حوزۂ دیگر صحیح انگاشتہ و (بقیہ حاشیہ ص ۵۸۰ پر)

احمد بہمنیار کا مقالہ " املای فارسی " خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اِس کی اہمیت کا کچھ اندازہ اِس سے کیا جا سکتا ہے کہ لُغت نامۂ دہخدا کے چالیسویں حصّے میں، املا کے موضوع پر، اِس مقالے کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اِس موضوع پر یہ خاصی کارآمد اور مفصّل تحریر ہے۔ یہ مقالہ پیشِ نظر ہے۔ اِس فصل کے اکثر قاعدے اِسی مقالے سے ماخوذ ہیں۔

فارسی کے مقالہ نگار نے بار بار اِس کی صراحت کی ہے کہ اِس مقالے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اب تک جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ یک سر غلط ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ کئی طریقوں میں سے ایک مناسب، آسان اور زیادہ باقاعدہ طریقے کو مرجّح قرار دیا جائے اور اب کتابت میں اُس کی پیروی کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک ہی لفظ کو چار کتابوں میں چار طرح لکھا جائے اور اُستاد حیران پریشان اور مصیبت زدہ سا ہو کہ اپنے طالب علم کو کیا سکھائے اور اگر کوئی طالب علم اِس سلسلے میں سوال کر بیٹھے تو کیا جواب دے۔
یہی مسئلہ اُردو میں بھی توجہ طلب ہے۔ فارسی کے مقالہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے، اُردو والوں کو بھی اُس پر دھیان دینا چاہیے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ اب تک سب کچھ غلط ہوتا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ

ہر یک مطابق عقیدۂ خود بورقۂ امتحانی نمر داده است "۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، یہ فارسی ہی سے مخصوص نہیں، اردو میں بھی اِسی طرح کے پریشان کن مسائل ہم سب کی توجہ کے طلب گار ہیں۔

تعیّن کی بنا پر معیار بندی کی جائے، جس کی شدید ضرورت ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ فلاں طریقۂ کتابت غلط ہے، ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ کئی طریقوں میں سے یہ ایک طریقہ باقاعدہ ہے اور اسی لیے مرجح ہے، اور یہ اختلافِ نگارش جو نظر آتا ہے، یہ دراصل سیمیا کی سی نمود ہے، جس کی چمک دمک اِس لیے بڑھ گئی ہے کہ اِس موضوع کی طرف باضابطہ توجہ نہیں کی گئی تھی، عدمِ تعیّن کی وجہ سے، اور مفصّل جائزے کے نہ ہونے کے سبب سے، اور کچھ خطّاطی کی آرایش پسندی اور پھر کاتب صاحبان کی کم سوادی کی وجہ سے، اختلافات میں اضافے ہوتے رہے، یہاں تک کہ دفتر تیّار ہو گئے۔

فارسی املا کے عام قاعدوں کو لکھنے سے پہلے، ایک اور اہم بات کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عرب و ایران کی کشمکش کچھ نئی چیز نہیں۔ ہر سطح پر اِس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ زبان بھی اِس سے کس طرح محفوظ رہ سکتی تھی۔ تقریباً سو برس کے اِس عرصے میں متعدّد ایرانی اہلِ قلم نے پہلے سے زیادہ شدّت کے ساتھ یہ مہم شروع کی کہ عربی الاصل لفظوں کو فارسی سے بے دخل کیا جائے، مگر سنجیدہ اہلِ علم کا ایک بااثر طبقہ ایسا بھی تھا جس نے صفائی کی اِس مہم کو غلط سمجھا اور اِسے فارسی زبان کو تباہ کرنے کے مرادف قرار دیا۔ اِن لوگوں میں ایک نمایاں نام آقاے محمد بن عبدالوہاب قزوینی کا ہے۔ بیست مقالۂ قزوینی میں اِس سلسلے کی کئی تحریریں پڑھنے کے لائق ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِس تحریک کی بنیاد محض غلط عصبیّت پر تھی۔ قوم پرستی کے غلط جوش نے، علمِ زبان،

کے قوانین کو نظر انداز کرنا ضروری سمجھا تھا۔ یہ حددرجہ غیر حقیقت پسندانہ انداز نظر تھا۔ یہ تحریک جو کم نظری اور تنگ دلی کی پیدا کی ہوئی تھی، زبانوں کے ارتقا اور نشو و نما کے فطری قوانین کے بالکل خلاف تھی، اِس لیے اِس کا پوری طرح سرسبز ہونا تو محال تھا؛ مگر اُس کے بعض اثرات کا تہ نشیں ہو جانا بھی ناگزیر تھا۔ کوئی تحریک کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو؛ اگر اُس کو معاون محرّکات اور مناسب وقفہ مل جائے، تو اُس کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی رہ ہی جایا کرتے ہیں۔

اِس تحریک کے بعض اثرات املا کے سلسلے میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں، اور وہ اِس صورت میں کہ بعض قاعدوں کے سلسلے میں قدیم اندازِ نگارش کو از سرِ نو زندہ کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اِس میں سب سے زیادہ مرکزِ توجہ ہمزہ کا وجود ہے۔ فارسی والوں کا کہنا ہے کہ ہمزہ، فارسی کے حروفِ تہجّی میں شامل نہیں، اِس لیے جس لفظ میں ہمزہ جزوِ لفظ کی حیثیت سے آئے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ لفظ عربی کا ہے۔ فارسی لفظوں میں ہمزہ کو جگہ نہیں دی جائے گی۔ اِس میں یہاں تک غلو کیا گیا کہ بعض مقامات پر حد درجہ ناموس صورت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک مثال سے اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ طریقہ رہا ہے کہ لفظ کے آخر میں ہائے مختفی ہو (جس کو فارسی والے "ہای بیانِ حرکت" بھی کہتے ہیں) تو بہ صورتِ اضافت اُس ہ پر ہمزہ لکھ دیا جاتا ہے، جیسے: گفتۂ غالب، پردۂ مجاز۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ہمزہ، دراصل ي کی قائم مقام علامت ہے، پُرانے زمانے میں اِس جگہ ي کا ابتدائی حصّہ لفظ کے آگے لکھا جاتا تھا، رفتہ رفتہ وہ نصف ي،

عربی کے ہمزہ میں تبدیل ہوگئی اور ہائے مختفی کے اوپر اُس کو لکھا جانے لگا؛ اب بعض ایرانی اہلِ قلم کا کہنا ہے (اور احمد بہمنیار بھی اُن میں شامل ہیں) کہ اصل کی طرف بازگشت ہونا چاہیے، یعنی ایسے مواقع پر، لفظ کے آگے ی لکھنا چاہیے، جیسے: "گفتہ ی غالب" اور "پردہ ی مجاز"۔ احمد بہمنیار کے مذکورہ مقالے میں بھی بعض مقامات ایسے ہیں جہاں احیاپسندی کے اثرات شامل ہوگئے ہیں، جیسے یہی ہمزۂ اضافت کا مسئلہ۔ ظاہر ہے کہ ایسے مقامات پر صاحبِ مقالہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اِس سلسلے میں اطمینان کی بات یہ ہے کہ جس طرح عربی لفظوں کے اخراج کو، اہلِ نظر ایرانی فاضلوں نے اچھا نہیں سمجھا، اور قبول نہیں کیا؛ اُسی طرح ایسے قاعدوں کو بھی قبولِ عام نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ایرانی قواعد نگاروں نے مختلف مقامات پر اضافت وغیرہ کے قاعدوں کو، اور یائے وحدت وتنکیر کے اضافے کے قاعدوں کو لکھا ہے، اور اُن میں جدّت پسندی کے اِس جبر کو شامل نہیں کیا ہے ــــ جن مقامات پر "املای فارسی" کے مقالہ نگار سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا تھا، وہاں دوسرے ایرانی افاضل کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ بات صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اردو اور فارسی دو مستقل زبانیں ہیں، اِس لیے یہ ناگزیر ہے کہ بہت سی باتوں میں دونوں زبانوں میں اختلافات ہوں، املا کو بھی اِس سے مستثنا نہیں سمجھنا چاہیے، اور اِس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے کہ چوں کہ رسمِ خط ایک ہے، اِس لیے ہر جگہ املا میں بھی یکسانی ہوگی۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ فارسی تحریر میں فارسی

کے قواعدِ املا کی پابندی کی جائے گی اور اِس پابندی کو لازم سمجھا جائے گا۔ اِس تمہید کے بعد اب فارسی املا کے اُن عام قاعدوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن کا علم ازبس ضروری ہے۔

مرکّبات کو لکھنے کا قاعدہ:

اردو میں مرکّبات کو الگ الگ لکھنا ضروری ہے[1]، مگر فارسی میں یہ صورت نہیں۔ وہاں اِس کے برعکس، اکثر مرکّبات کو ملا کر لکھنا ضروری ہے۔ فارسی عبارت میں اِسی طریقے کی پابندی کی جائے گی۔ یہ پورا بیان "املای فارسی" سے ماخوذ ہے۔

(۱) مرکّباتِ امتزاجی، ایک کلمے کا حکم رکھتے ہیں؛ اِس لیے اِن کو ایک کلمے کی طرح (ملاکر) لکھا جائے گا۔ لحاظ خاص صورتوں کے علاوہ، جن کی تفصیل بیان کی جائے گی، ایسے مرکّبات کو ہمیشہ ملاکر لکھنا چاہیے۔ جیسے:

خاکسار، گلستاں، سنگلاخ، پیشگاہ، شاہترہ، سیماب، گلرخ، دلبر، غمگسار، دستکش، ہمنام، بیخرد، گوشوارہ، شاہوار، خوشرُوی، دستیار، بختیار، جاندار، بیطرح، بینام، بیکس، ہمدرد، ہمزباں، زباندان، زیانکار، نانفروش، بیزباں، دلدار، پاسبان، نگہبان، ہمچنیں، ہمچناں، دلکش، دلچسپ، دلنواز، غمگین وغیرہ۔

---

[1] اردو میں مرکّبات کو منفصل لکھنے کا جہاں ذکر کیا گیا ہے، وہاں ایسے مرکّبات کی بہت سی مثالیں لکھی گئی ہیں، اُن کو دیکھا جائے۔ فارسی میں یہ سب ملاکر لکھے جائیں گے۔

(۲) مرکّباتِ اضافی و توصیفی کو الگ الگ لکھا جاتا ہے ، جیسے: پایِ مور، غمِ جاں ، تیغِ تیز ۔ مگر ترکیبِ مقلوب کی صورت میں اُن کو ملا کر لکھنا چاہیے ۔ جیسے : کتابخانہ ، نیکمرد ، کتخدا ، شرابخانہ ، بتخانہ ، ہردلعزیز۔

(۳) لفظ " صاحب " بعض الفاظ کے شروع میں جب آتا ہے تو کسرۂ اضافت کے بغیر بولا جاتا ہے ؛ ایسے مرکّبات کو بھی متّصل لکھا جائے گا۔ جیسے : صاحبدل ، صاحبقران ، صاحبجاہ ۔

(۴) اگر مرکّبِ عطفی کا واو حذف ہو جائے تو دونوں ٹکڑوں کو ملا کر لکھا جائے گا ۔ جیسے : گفتگوی ، جستجوی ، رستخیز ۔

مندرجۂ ذیل صورتوں میں لفظوں کو ملا کر نہیں لکھنا چاہیے :

(۱) اُس صورت میں کہ کلمہ بہت لمبا ہو جائے ، جیسے : سلیمانشکوہ ، کہ اِس کو " سلیمان شکوہ " لکھا جائے گا ، وغیرہ ۔

(۲) یا دیکھنے میں بدنما معلوم ہو ، جیسے : ہمنخچیر کہ اِس کو " ہم نخچیر " لکھنا چاہیے ۔ وغیرہ ۔

(۳) یا پڑھنے میں کسی طرح کی دشواری پیدا ہو سکتی ہو ، جیسے : رستم صولت، کہ اِس کو " رستمصولت " نہیں لکھا جائے گا ۔

(۴) جب ملا کر لکھنے سے دو ہم جنس حرف ، ہم پہلو واقع ہوں ، جیسے : ہمسلک ، بییار ۔ کہ اِن کو " ہم مسلک " اور " بے یار " لکھنا چاہیے ۔ وغیرہ ۔

(۵) جب کسی مرکّب کلمے کے بعد عطف کا واو آئے ، جیسے : بے عار و ننگ، بے خورد و خواب ؛ ایسے مواقع پر جزوِ اوّل کو ہمیشہ منفصل لکھا

جائے گا۔ اگر اِن کو "بیعار و ننگ" اور "بیخورد و خواب" لکھا جائے گا تو ایسا معلوم ہوگا کہ کلمۂ نفی "بے" کا تعلق صرف پہلے جُز سے ہے، جزوِ ثانی سے اُس کو تعلق نہیں ہے۔ اِس قاعدے کو خاص طور پر ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

(۶) جب ملاکر لکھنے سے کسی اور لفظ سے التباس پیدا ہو۔ ایسا اکثر اُن کلمات میں ہوتا ہے جن میں پہلا جُز "بے" ہوتا ہے اور دوسرے جُز کے شروع میں الف ہوتا ہے، جیسے: بے آرام، کہ اِس کو "بیآرام" نہیں لکھنا چاہیے، کیوں کہ "آرامیدن" کے فعلِ امر سے التباس ہوسکتا ہے۔ اسی طرح "بے آب"، "بے آزار"، "بے اماں" وغیرہ کو منفصل ہی لکھنا چاہیے۔

(۷) جب کلمے کا دوسرا جُز ایسا لفظ ہو جو فعلِ امر کے معنی بھی دیتا ہے اور اسمِ فاعل کے معنوں میں بھی آتا ہے، اِس صورت میں یہ امتیاز ملحوظ رکھا جائے گا کہ جب اسمِ فاعل کے معنی میں آئے گا تو ملاکر لکھا جائے گا، جیسے: فرمانبر، نگہدار۔ مثلاً یہ جملہ: "فرمانبرِ خدا و نگہدارِ خلق باش"، اِس جملے میں "فرمانبر" اور "نگہدار" کو ملاکر لکھا جائے گا۔ مگر اِس جملے میں: "خدای را فرماں برو دل نگہ دار"، اِن کو منفصل لکھا جائے گا۔ اور اِس طرح کی مثالیں بہت ہیں۔ اِس قاعدے کی طرف بھی خاص طور سے توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔

(۸) جن مقامات پر دو کلمے کبھی وصفِ اسم (صفتِ مطلق) کے لیے، اور کبھی وصفِ فعل (قید) کے لیے استعمال ہوتے ہیں، تو پہلی صورت میں اُن کو متّصل اور دوسری صورت میں منفصل لکھیں گے۔

جیسے یہ دو کلمے : بیعلم اور بیزر ؛ کہ اِس جملے میں : مردِ بیعلم بیکارہ و شخصِ بیزر بیچارہ است " اِن دونوں کو متّصل لکھا جائے گا۔ اور مثلاً اِس جملے میں : " بے علم، کارے از پیش نرود و بے زر، مرادے میسّر نشود "، اِن کو منفصل لکھا جائے گا۔ اِس نکتۂ باریک کی رعایت بہت ضروری ہے۔ بہت سے لوگ اِس امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھتے ہیں، اور یہ بات ٹھیک نہیں۔

(۹) ایسے مرکّب کلمے جن میں جزوِ اوّل کا حرفِ آخر اور جزوِ آخر کا حرفِ اوّل ہم جنس یا قریبُ المخرج ہو، ایسے کلمات میں کبھی دو حرفوں کے بجائے ایک مشدّد یا مخفّف حرف لکھتے ہیں، جیسے : شبّو، شپّرہ، بتر، سپیدیو، نیمن ؛ کہ اِن کی اصل : شب بو، شب پرہ، بدتر، سپیددیو، نیم من ہے۔ اِن کلمات کو دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے، مگر جب اصل صورت کے مطابق لکھا جائے گا تب اُن کو منفصل لکھا جائے گا۔ جیسے : شب بو، شب پرہ، نیم من۔

(۱۰) کلمۂ "چہ" جب " قدر، کنم، گویم " وغیرہ الفاظ سے پہلے آتا ہے، تو پُرانے زمانے میں بہت سے لوگ "چہ" کی ہ کو ساقط کرکے اُس کو لفظِ مابعد سے ملاکر لکھ دیا کرتے تھے، جیسے : چقدر، چکنم، چگویم ؛ یہ طریقۂ کتابت درست نہیں، اِس لیے کہ بعض مقامات پر اِس سے اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے ـــــ کلمۂ "چہ" کو الگ لکھنا چاہیے۔ جیسے : چہ قدر، چہ طور، چہ کنم، چہ گویم وغیرہ۔

البتّہ دو کلمے اِس حکم سے مستثنا ہیں : "چساں" اور "چگونہ"؛ کیوں کہ کثرتِ استعمال سے یہ کلمے اب مفرد کلمات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

(۱۱) " کسے کہ "، " مردے کہ "، " شخصے کہ "، " وقتے کہ "، " صورتے کہ "؛ ایسے مقامات پر " کہ " کو لفظِ ماقبل سے ملا کر نہیں لکھنا چاہیے۔ یعنی "مردیکہ" اور "کسیکہ" اور " وقتیکہ" نہیں لکھا جائے گا۔ " مردے کہ"، "کسے کہ" اور" وقتے کہ" لکھا جائے گا۔

(۱۲) حرفِ ندا کو منادا سے ملا کر نہیں لکھنا چاہیے، جیسے: ایخدا، ایمرد وغیرہ۔ حرفِ ندا " اے " کو الگ لکھنا چاہیے، یعنی: اے خدا، اے مرد، اے فلک، اے دوست، اے چرخ وغیرہ۔ اِسی طرح "اے کہ"۔ جیسے: اے کہ آگاہ نہ ای عالمِ درویشاں را۔

(۱۳) اسمِ اشارہ کو مشارٌ الیہ سے ملا کر لکھنا، اور اِسی طرح اسمِ عدد کو معدود سے ملا کر لکھنا، کتابت کی غلطیوں میں سے ہے۔ البتہ ایسے مقامات جہاں یہ کلمے مل کر مرکبِ مزجی کی حیثیت اختیار کر چکے ہوں، اِس حکم سے مستثنا ہیں۔ جیسے: امشب، امسال، امروز، آنچناں، اینچنیں، آنکہ، آنچہ؛ اور جیسے: ششصد، ہفتصد، ہیجدہ، ہفدہ، نہصد وغیرہ۔ کہ یہ سب کلماتِ مفرد کا حکم رکھتے ہیں، اور اِس لیے متصل لکھے جائیں گے۔ مگر باقی سارے مقامات پر اسمِ اشارہ اور اسمِ عدد کو علاحدہ لکھا جائے گا، جیسے: ایں مرد، آں روز، پنج روز، شش ماہ، چہل سال، آں ساعت، ایں کار، آں وقت، ایں طفل، آں زن، آں گدا، نُہ فلک، ہفت چرخ، شش در، نُہ طاق وغیرہ۔

لہ، بائے موحدہ جو زینت یا تاکید کے لیے فعل کے ساتھ آتی ہے، اُس

کو فعل سے ملا کر لکھنا چاہیے ۔ جیسے : بگوید ، برفت ۔ اِس بائے موحدہ کو الگ لکھنا (جیسے : بہ گفت) جائز نہیں ۔

(۲) اِسی طرح وہ بائے موحدہ جو افادۂ معنیِ ظرفیت ، قسم وغیرہ کے لیے، اسم (یا ضمیر) کے ساتھ آتی ہے ، اُس کو بھی اسم سے ملا کر لکھنا چاہیے۔ جیسے : بدریا ، بخدا ، بخود ، بقیمت ، بکمال ، بسوی ، بروی ، بربِ کعبہ ، بکعبہ ، بمن ، بتو ، بشما ، باو ، بخیر ، بعافیت ۔

البتّہ ایسے مقامات کو اِس حکم سے مستثنا سمجھا جائے گا جہاں ملا کر لکھنے سے کلمہ بدنما معلوم ہو ، یا کسی طرح کا اشتباہ پیدا ہو سکتا ہو ، جیسے : " فلاں موسوم بکیخسرو یا بداو و داست " ، کہ یہاں " بہ کیخسرو " اور " بہ داوود " لکھنا چاہیے ۔

(۳) نونِ نفی جو افعال کے شروع میں آتا ہے ، اُس کو ملا کر لکھنا چاہیے ۔ جیسے : نگفت ، نیامد ، نخورد ، نبرد ۔ البتّہ جہاں نفی کا تعلّق فعل کے بجائے ، جملے سے ہو ، وہاں اُس کو الگ لکھا جائے گا ۔ جیسے : نہ گفت و نہ شنید ۔ نہ میآید و نہ میرود ۔ یہ وہی صورت ہے جو اسموں کے ساتھ پیش آیا کرتی ہے ، جیسے اِس مصرعے میں : رمزِ ایں نکتۂ پنہاں نہ تو دانی و نہ من ۔

(۴) می اور ہمی کو ملا کر بھی لکھا جا سکتا ہے اور علاحدہ بھی ۔ اِس میں کلمے کی بدنمائی یا اشتباہ کا لحاظ رکھا جائے گا ۔ مناسب یہ ہوگا کہ می کو ملا کر لکھا جائے اور ہمی کو علاحدہ ۔ جیسے : میکرد ، میگفت ، میکند ، میرزد ۔ اور ہمی گفت ، ہمی کرد ، ہمی آمد ، ہمی خورد ۔

(۵) " بل " بہ معنی " بہت " کو ، لفظ سے ملا کر لکھنا چاہیے ، جیسے : بلہوس ،

بلعجب ، بلفضول ، بلغاک ، بلغندہ ، بلکامہ ۔ " بلہوس " وغیرہ میں " بُل " فارسی کلمہ ہے ؛ اِس کو عربی فرض کرکے " بوالہوس " ، " بوالعجب " لکھنا درست نہیں ۔

(۱) " را " علامتِ مفعول کو ملاکر بھی لکھا جا سکتا ہے اور علاحدہ بھی ، اِس میں خوش نمائی اور عدمِ التباس کا لحاظ رکھا جائے گا ـــــ اَلبتّہ مرا ، ترا ، چرا ، کرا ؛ یہ کلمات مستثنا ہیں ، اِن کو اِسی طرح لکھا جائے گا ۔

(۲) " ہا " علامتِ جمع کو مفرد لفظ سے ملاکر لکھنا چاہیے ، جیسے : آنہا ، زنہا ، پیرہنہا ، جامہا ، نامہا وغیرہ ۔ مگر جب مفرد لفظ ہاے مختفی پر ختم ہو ، اُس صورت میں " ہا " کو علاحدہ لکھنا چاہیے ، جیسے : لالہ ہا ، پروانہ ہا ، سایہ ہا ، جامہ ہا ، نامہ ہا وغیرہ ۔ جامہ اور نامہ کی جمع اگر " جامہا " اور " نامہا " لکھی جائے گی تو اِس سے بہت اشتباہ پیدا ہوگا ، کیوں کہ بہ ظاہر یہ " نام " اور " جام " کی جمع ہوگی ۔ " جام " کی جمع " جامہا " لکھی جائے گی اور " جامہ " کی جمع " جامہ ہا " بنے گی ۔

ہمزہ ، الف ، یے :

فارسی والوں کو اب اِس پر اصرار ہے کہ فارسی لفظوں میں ہمزہ (ء) نہیں لکھنا چاہیے ۔ یہ واقعہ ہے کہ اردو کی طرح ، فارسی میں بھی ہمزہ کے سلسلے میں بے جا نویسی ، بل کہ غلط نویسی عام رہی ہے ، اور بعض مقامات تو ایسے ہیں کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ یہاں ہمزہ کیسے آسکتا ہے ، جیسے : " کردہ ای " کی جگہ " کردۂ " لکھنا ۔ ہمزہ کا یہ استعمال شاید سب

سے زیادہ ستم ظریفی کا مظہر ہے۔

جلال الدین ہمایی نے "دستورِ زبانِ فارسی" میں لکھا ہے:

"ضمناً این نکته را یاد آور میشوم که همزه در کلماتِ فارسی جز دراولِ کلمه وجود ندارد و امثال کلمات "آیین، آیینه، پایین" که تصور میکنند همزه در وسط کلمه واقع شده، اشتباه است و صحیح این کلمات یا است نه همزه ..... و این که در رسم الخط های قدیم گاهی دیده میشود که روی یا علامت همزه بشکل "ء" گذارده اند، در اصل یاءِ کوچک ابتری است که بشکل همزه نوشته میشده و این علامت برای تعیین آهنگ حرف بوده و تدریجاً اشتباه شده و کم کم به آهنگ همزهٔ عربی تلفظ کرده اند"۔

(لغت نامۂ دہخدا جلد چہلم)

اور بھی کئی لوگوں نے اِسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ مگر اِس سلسلے میں اصل بحث سے پہلے، ایک اور بات کا ذکر ضروری ہے۔

عربی میں "الف" اگر متحرک ہو تو وہ "ہمزہ" ہے۔ اب فارسی والے اِسی عربی انداز کے قائل نظر آتے ہیں۔ جلال الدین ہمایی کی منقولۂ بالا عبارت میں جو یہ جملہ ہے: "همزه در کلماتِ فارسی جز دراولِ کلمه وجود ندارد"، اِس کا یہی مطلب ہے۔ مگر فارسی کے قدیم لغت نگاروں نے متحرک الف کو الف ہی لکھا ہے اور ہمزہ اُس خاص صورت کا نام ہے جو عربی سے آئی ہے (ء)۔ ہندستان میں آج تک ہمزہ صرف اِس صورت (ء) کا نام ہے، متحرک الف کو "ہمزہ" نہیں کہا جاتا، وہ ہر صورت میں الف ہے؛ اِس لیے یہاں فارسی کی اِس نئی اصطلاح کو قبول نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں الف کو ہمیشہ الف کہا جائے گا، وہ

متحرک ہو یا نہ ہو ، اور ہمزہ صرف اِس صورت (ء) کا نام ہوگا ۔

یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ ساری جدّت پسندی اور تلفظ و املا میں یک سانیت کے دعوے کے باوجود ، فارسی عبارتوں میں " مأنوس "، " متأثر "، " منشأ "، " توأم "، " متأسف "، " متألم " جیسے بیسیوں لفظوں سے آنکھیں دو چار ہوں گی ، جو عربی کا اندازِ کتابت ہے ۔ ایک طرف تو مثلاً " استخر " میں حرفِ اوّل ہمزہ ہے ، کیوں کہ وہ متحرک ہے ، اور دوسری طرف " متأثر " میں جب تک الف کی شکل پر ایک ہمزہ نہ لکھا جائے ، اِس کو متحرک ماننے کے لیے تیار نہیں ۔ یہ دل چسپ تضاد ہے ۔

اِس معاملے کا ایک اور دل چسپ پہلو بھی دیکھیے : چوں کہ الفِ متحرک اُن کے نزدیک ہمزہ ہے ، اِس لیے " کردہ ای " اور " افسانہ ای " کی جگہ " کردہ یی " اور " افسانہ یی " لکھنے کو مرجّح بتایا جا رہا ہے (احمد بہمنیار ، املای فارسی) یہ کہہ کر کہ بھلا " کردہ ای " میں " ہمزہ " کیسے آسکتا ہے یا کیوں آسکتا ہے ؟ یہ سب تضاد محض انتہا پسندانہ اندازِ نظر کے پیدا کیے ہوئے ہیں ـــــــ بہ ہر صورت فارسی الفاظ میں جزوِ لفظ کی حیثیت میں عموماً ہمزہ نہیں آئے گا ، جیسے " پایین " کو " پائین " نہیں لکھا جائے گا ۔ عربی الفاظ میں وہ ضرور آئے گا ، جیسے : سائل ، مسائل ، مرئی ، جزئیات وغیرہ ۔ اِس سلسلے کے ضروری قاعدے ذیل میں لکھے جاتے ہیں ۔

(۱) فارسی افعال میں (مضارع ، حال ، امر) جہاں جہاں ی کا محل ہے ،

وہاں ہمزہ کبھی نہیں آئے گا۔ دوسرے لفظوں میں اِس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فارسی افعال کے مختلف صیغوں میں، صیغوں کی علامت کے طور پر، یَ آئے گی، ہمزہ نہیں آئے گا۔ جیسے:

گوید، گویند، گویی، گویید، گویم، گوییم۔

می آید، می آیند، می آیی، می آیید، می آیم، می آییم۔

اِس کو یوں بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے صیغوں میں پہلی یَ تو اصل لفظ کا جُزو ہوتی ہے، جیسے "گوید" میں یَ جزوِ لفظ ہے، دوسرے صیغوں کے لیے، اِس یَ کے آگے علامتوں (ند، ی، ید، م، یم) کا اضافہ کیا جائے گا۔ جیسے: پیماید، پیمایند، اِسی طرح پیمایی اور پیمایید، اِسی طرح پیمایم اور پیماییم۔ ہمزہ کا یہاں دور دور پتا نشان نہیں۔

(۲) اسمائے مشتق (اسمِ فاعل، اسمِ مفعول) میں بھی، یَ کی جگہ ہمزہ نہیں آسکتا، جیسے:

آیندہ، آیندگان — پایندہ، پایندگان — نمایندہ، نمایندگان۔

آرایندہ، آرایندگان — جویندہ، جویندگان۔ شایستہ، شایستگان۔

(۳) یہی صورت حاصل مصدروں کی ہوگی، وہ حاصل مصدر جن میں امر کے آگے "ش" کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے آراستن کے امر "آرای" سے "آرایش" اور نمودن کے امر "نمای" سے "نمایش"۔

آرایش، آسایش، بخشایش، پیمایش، نمایش، گشایش

ستایش، آزمایش، فرمایش (وغیرہ)

(۴) مضارع کے (صیغۂ واحد غائب میں) جن افعال میں آخری حرف دال سے پہلے یَ ہوتی ہے، جیسے: آید، گوید، جوید، نماید وغیرہ، اُن کے

امر کے صیغے میں بھی وہ یَی برقرار رہتی ہے ۔ مثلاً : آی ، گوی ، جوی ، نمای وغیرہ ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے فعل مع یَی اور بغیرِ یَی دونوں طرح استعمال میں آتے ہیں ، یعنی : "سخن گو " اور "سخن گوی " ، "نمای " اور "نما" (خود نمای ، خود نما) وغیرہ ؛ اِس یَی پر ہمزہ کا کچھ کام نہیں ۔

امر کے اوّل اسم کا اضافہ کرکے ، اسمِ فاعل (سماعی) بنا لیا جاتا ہے ، جیسے : عالم آرای (یا عالم آرا) سخن گوی ، (یا سخن گو) ۔ اِن مرکبات کے آگے ایک یَی کا اضافہ کرکے اسمِ مصدر بنا لیے جاتے ہیں ، جیسے : عالم آرایی ۔ اِس طرح ایسے کلمات میں دو یَی یک جا ہوں گی : ایک فعل کے اصل جُز کی حیثیت سے اور دوسری علامت کی حیثیت سے ۔ " عالم آرای " اصل کلمہ ہے ، ایک یَی کا اضافہ ہوگا تو " عالم آرایی " بنے گا ۔ بعض مثالیں :

دل رُبایی ، مشکل کُشایی ، عالم آرایی ، خود نمایی ، چمن پیرایی ، دیرپایی ، کم نمایی ، خودستایی ، زور آزمایی ، بادیہ پیمایی ، دل جویی ، کرم فرمایی وغیرہ ۔

ایک بار پھر اِس کو سمجھ لیا جائے : جیسے اوپر کی مثالوں میں پہلا کلمہ ہے " دل ربایی " اِس میں مصدر ہے " ربودن " اُس کا مضارع ہوا " ربایَد " ، اِس سے امر بنا " ربای " ، اِس سے اسمِ فاعل بنا " دل ربای " اور اِس سے " دل ربایی " بنا (دل ربای + ی = دل ربایی) ۔ ظاہر ہے کہ ہمزہ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ۔

نام اسموں سے بھی " اسمِ مصدر " بنتے ہیں ، جیسے : رعنایی ، زیبایی ، بے پروایی ، کج ادایی وغیرہ ۔ ایسے کلمات کو دو طرح لکھا جاتا رہا ہے ، یعنی " رعنائی " اور " رعنایی " ، " زیبائی " اور " زیبایی " ۔ اب فارسی کے اہلِ قلم کا خیال ہے کہ اِس قسم کے کسی بھی لفظ میں ہمزہ کو نہیں لکھنا

چاہیے ، اِن میں بھی اصلاً دو یٔ ہیں ۔ اِس سے کوئی شخص انکار نہیں کرتا (اور کر بھی نہیں سکتا) کہ اب تک ایسے لفظوں میں ہمزہ بھی لکھا جاتا رہا ہے اور اب بھی بہت سے لوگ لکھتے ہیں ، مگر میری رائے میں ایک تو اِس وجہ سے کہ اب بہت سے لوگ ہمزہ لکھنے کے حق میں نہیں ہیں، اور دوسرے اِس وجہ سے کہ ایسے سب کلموں میں یک سانیت پیدا کرنا ایک مناسب بات ہوگی ؛ ایسے کسی کلمے میں اب ہمزہ کو داخل نہیں کرنا چاہیے ، دو یٔ لکھنا چاہیے ۔ قدیم زمانے میں اِن کو اِسی طرح لکھا جاتا تھا ۔" مشکل کشایی" اور "کج ادایی" ایک جیسے کلمے معلوم ہوتے ہیں ، یہ کچھ مناسب بات نہیں کہ ایک کو تو ہمزہ کے بغیر "مشکل کشایی" لکھا جائے اور دوسرے کو "کج ادائی" لکھا جائے ۔

اِس اندازِ کتابت (دو یٔ کے ساتھ) کو دو وجہوں کے ساتھ ترجیح حاصل ہے:

(۱) بہت سے اسموں کو فارسی میں ، اضافت کے بغیر بھی ، بہ اضافۂ یٔ استعمال کیا جاتا ہے ، جیسے : جای ، پای وغیرہ ۔ جیسے ع : جای تنگ است و مرد ماں بسیار ۔ یا جیسے ع : پای در زنجیرِ پیشِ دوستاں ۔ یہ طریقہ فارسی میں عام ہے ۔ اِس طرح بہت سے اسموں کے آخر میں ایک یٔ ہوتی ہے اور علامتِ مصدری کے طور پر تو یٔ ہی کا اضافہ کیا جائے گا۔ اِس طرح ایسے لفظوں میں دو یٔ خود بہ خود جمع ہو جائیں گی ، جیسے : "برہنہ پای" سے برہنہ پایی (پای + ی = پایی) بنے گا ۔ ایسے اسما میں تو دو یٔ آنا ہی چاہیے ۔

(۲) جن اسموں میں آخری ٹکڑا "یی" ہے ، جیسے : رامی ، ہای وغیرہ ؛ ایسے اسما کے آخر میں تو دو یٔ لازماً رہیں گی ، جیسے "خود رایی" سے "خود رایی" ۔

اِس کو "خودرائی" تو نہیں لکھا جا سکتا۔

اِس طرح تین قسم کے ایسے کلمات کی بہت بڑی تعداد سامنے آتی ہے جن میں دو یؔ لازماً آنا چاہیے؛ اِس بنا پر یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اکثر کلمات کو تو ایک طرح لکھا جائے اور اُسی قبیل کے دوسرے اسموں کو دوسری طرح لکھا جائے، اِس سے بہت دشواری پیدا ہوگی۔ اور پھر یہ تفریق کی ہی کیوں جائے؟ فارسی میں ایسا کوئی قاعدہ نہیں کہ ایسی صورت میں ہمزہ ضرور آئے گا۔ اِس کے برعکس یہ مسلّمات میں سے ہے کہ ایسے اکثر کلمات میں دو یؔ آنا چاہیے۔

تو قاعدہ یہ ہوگا کہ ایسے سب کلمات میں اب دو یؔ لکھی جائیں گی، جیسے: رعنایی، زیبایی، کج ادایی، خوش نوایی، دیرپایی، مشکل کشایی، عالم آرایی، دلربایی، زور آزمایی، خودستایی، دل جویی، خوش خویی، ترش رویی، عیب جویی، بے پروایی، کہربایی، آشنایی، شناسایی، تمنّایی، تماشایی، چمن پیرایی، دیرآسایی، تنہایی، ہوایی، تلخ نوایی، خوشبویی، یکسویی، جادویی، عیسایی، موسایی، تبرّایی، تولّایی، کربلایی، بے وفایی وغیرہ۔

اضافت کی صورت میں آخری یؔ مکسور ہو جائے گی: تماشاییِ عمرِ رفتہ، تلخ نواییِ عاشق، کج اداییِ دوست، آشناییِ دیرینہ، شناساییِ دیریں، دیرپاییِ حُسن، دلرباییِ دنیا، خودستاییِ احمق۔

(۵) عام فارسی لفظوں میں بھی، درمیانِ لفظ میں ہمزہ نہیں لکھنا چاہیے: آیین، آیینہ، آیینہ، پایین، پاییز، سایبان، پایگاہ، بایست، جایگاہ، ہمسایگی، بے مایگی وغیرہ۔

(۶) جن لفظوں کا اختتام ہائے بیانِ حرکت پر ہوتا ہے ، اضافت کی صورت میں یہ قاعدہ[1] رہا ہے کہ اُس ہ پر ہمزہ لکھ دیا جاتا ہے ۔ جیسے : جلوۂ دوست اور کعبۂ مقصود ۔ یہ ہمزہ ، علامتِ اضافت کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ مروّج اور متعارف طریقہ ہے ، مگر اب بعض حضرات کا خیال ہے کہ اِس ہمزہ کو بھی دیس نکالا دیا جائے اور اِس کی جگہ ، لفظ کے آگے " ی " لکھی جائے ، یعنی : جلوہ ی دوست اور " کعبہ ی مقصود " لکھا جائے ۔ " املای فارسی " کے مقالہ نگار کا بھی یہی خیال ہے ۔ اِس پر دلیل یہ لائی گئی ہے کہ زمانۂ قدیم میں ایسے الفاظ میں ، لفظ کے آگے " ی " کی مختصر صورت لکھی جاتی تھی ، جو رفتہ رفتہ " کاتبانِ بے اطلاع " اور " ناسخانِ کم سواد " کے ہاتھوں " ہمزۂ عربی " میں تبدیل ہوگئی اور اُس کی جگہ ، ہائے مختفی کے اوپر قرار پائی ۔ یہ وہی عصبیت اور انتہا پسندی ہے جس کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے ۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ اکثر سنجیدہ لوگ اِس انتہا پسندی کے

---

[1] صاحبِ فرہنگِ جہانگیری نے لکھا ہے :

" چہارم ، ہای بیانِ فتحہ بود ، وآں ہایی است کہ جز دلالت بر فتحۂ ماقبل ، در معنیِ کلمہ ہیچ دخل ندارد ، مثلِ جامہ ..... و در اضافت بہمزۂ ملیّنہ تبدیل یابد ، مانندِ خامۂ من و خامۂ تو " (مقدّمۂ فرہنگِ جہانگیری)

مولّفِ برہانِ قاطع نے لکھا ہے :

" چہارم ، ہای بیانِ فتحہ است ..... و در اضافت بہمزۂ ملیّنہ تبدیل می یابد ، ہمچو خانۂ من و جامۂ من و بندۂ خدا " ۔

(مقدّمۂ برہانِ قاطع ، مرتّبۂ ڈاکٹر محمد معین)

حق میں نہیں۔ مجلّۂ سخن کے دورۂ نہم، شمارۂ ۱۲، ۱۳ میں، ایران کے ایک معروف و ممتاز اہلِ قلم پرویز ناتل خانلری نے ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا بہ عنوانِ "زبان وخط" اُس مضمون میں اِس "ی" کے متعلق لکھا ہے:

"این کہ بعضی بخیال خود اصلاحاتی درخط معمول میکنند، و مثلاً کلمۂ "خویش" را بصورت "خیلش" می نویسند، وعلامت اضافہ را آنجا کہ بعد از ہا بیان حرکت می آید، بصورت "ی" ثبت میکنند؛ نتیجہ وحاصلی جز آن ندارد کہ بر مشکلات رسم خط فارسی افزودہ شود"۔

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ بہ ہر طور، قاعدہ یہ ہوگا کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی آتی ہے؛ اضافت کی صورت میں، اُس ہ پر ہمزہ لکھا جائے گا۔ جیسے: کعبۂ مقصد، پردۂ مجاز، صلۂ خویش، کردۂ خویش، گفتۂ غالب۔

(ز) جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی ہو، تو وحدت اور تنکیر کے لیے، کبھی تو اُس لفظ کے آگے "ای" (یا اے) کا اضافہ کیا جاتا تھا، جیسے: خانہ اے۔ اور کبھی اُس ہ پر ایک ہمزہ لکھ کر، یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وحدت و تنکیر کا فائدہ حاصل ہوگیا، جیسے: بندۂ خریدم (میں نے ایک غلام خریدا) اور، جلوۂ ندیدم (میں نے کوئی جلوہ نہیں دیکھا)۔ یہ وہی صورت تھی کہ جیسے: "گفتہ ای" کی جگہ "گفتۂ" لکھا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ ہائے مختفی پر ہمزہ لکھنے کا یہ طریقہ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اِس زمانے میں اِس دورنگی کی طرف بھی توجہ کی گئی اور یہ طے کیا گیا کہ ایسے مواقع پر "ای" (یا اے) کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔ علامۂ قزوینی مرحوم کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ روزنامۂ کاوہ نے ایک اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ

آیندہ سے "یاءاتِ تنکیر" کو "ای" کی صورت میں لکھا جایا کرے گا، جیسے: بندہ ای اور خانہ ای ۔ یہ نہیں ہوگا کہ ہ پر ہمزہ لکھ دیا جائے ۔ قزوینی مرحوم نے اِس پر مدیر کاوہ کو ایک خط میں لکھا تھا کہ یہ نہایت مناسب تجویز ہے اور اِس اقدام پر مبارک باد دی تھی ۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ "یاءاتِ تنکیر" کی تخصیص کیوں کی جائے، یاے خطاب و نسبت کو بھی اِسی طرح لکھنا چاہیے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر قزوینی مرحوم کی تحریر کے ضروری اجزا کو نقل کر دیا جائے ۔ اِس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اضافت و توصیف کے لیے (مروّج طریقے کے مطابق) ایسے الفاظ میں وہ ہ پر ہمزہ لکھنا ہی صحیح سمجھتے تھے، یعنی "خانۂ من" اور "جلوۂ تو" اور "پردۂ مجاز" ۔ اِسی طرح وہ "گفتۂ" کی جگہ "گفتہ ای" اور "تشنۂ" کی جگہ "تشنہ ای" لکھنا مرجح سمجھتے تھے ۔ قزوینی کی متعلقہ عبارت یہ ہے:

"در شمارۂ اخیر کاوہ ... اخطاری راجع برسم الخط ملاحظہ شد کہ حاصلش این بود کہ جریدۂ کاوہ مصمّم شدہ است بعد ازین یاءات تنکیر را درکلمات مختومہ بہاءِ مخفیہ درمثل "بندۂ از بندگان شما ہستم" و "خانۂ بزرگ و باغی وسیع خریدم" و "ہفتۂ مانند سالی گذرا ندیم" ہمانطور درکتابت ہم برسم نسخ قدیمہ بصورت یاء بنویسد یعنی "بندہ ای" و "خانہ ای" و "ہفتہ ای" ۔

اوّلاً ازاین قدم اوّل کہ جریدۂ کاوہ در راہ اصلاح خطّ فارسی برداشتہ، بغایت خرسند شدہ ..... ثانیاً عرض میکنم ..... علّت منطقی نوشتن یاءِ تنکیر بصورتِ یاء این است کہ این یاء یاءِ صریحۂ مشبعہ است، نہ مثل یاءِ اضافت و توصیف مثل خانۂ من و خانۂ تاریک، کہ یاءِ

نہ مشبعہ است و نہ صریحہ ، بل مانند ہمزۂ ملیّنہ تلفظ میشود و برای عدم التباس یاءِ صریحۂ مشبعہ بیاءِ غیر مشبعہ البتّہ باید فرقی مابین این دو نوع درکتابت گزارد ، چنانکہ در تمام نسخ قدیمہ این تفاوت منظور بودہ است ، دراین صورت تخصیص یاءِ تنکیر فقط بکتابت بصورت یاء و اخراج یاءِ خطاب از این قلمرو منطقی نیست و ہیچ وجہی ندارد۔ بعبارۃ اخری ہر کسی کہ برعہدۂ خود بگیرد یاءِ تنکیر را بصورت یاء بنویسد ، البتہ چارہ ای ندارد کہ یاءِ خطاب و یاءِ نسبت را نیز بصورت یاء بنویسد۔یعنی مثلاً کسی کہ برعہدۂ خود گیرد کہ " بندۂ از بندگان شمایم " را " بندہ ای " بنویسد، البتّہ باید " تو در خانۂ " و " تو آمدۂ " و " ملّا حسین بشرویۂ " و " میرزا محمد رضا قمشۂ " و " فلان کرۂ " و " بہمان آبادۂ " را نیز قطعاً بصورت یاء بنویسد ..... بنا براین مستدعی است ..... کہ درشمارۂ آتیۂ کاوہ اخطاری باین مضمون بفرمایید کہ " بعد ازین جریدۂ کاوہ تمام یاءات تنکیر و یاءات خطاب و یاءات نسبت را در آخر کلمات مختومہ بہاء مخفیہ بصورت یاء (ای) خواہد نوشت ، و یاء اضافت و یاء توصیف را بہمان طریقۂ سابق بگزاردن ہمزہ ای در بالای یاء (خانۂ من ، ہفتۂ گذشتہ) مرقوم خواہد داشت "۔ در ہر صورت این اقدام شجاعانۂ جریدۂ کاوہ شایستۂ تحسین و تہنیت است " ۔

(بیست مقالۂ قزوینی ، جزو اول ، ص ۲۵ ، ۲۶)

احمد بہمنیار نے " املای فارسی " میں لکھا ہے کہ جو لفظ ہاے بیانِ حرکت پر ختم ہوتے ہیں ، تنکیر و خطاب کے لیے اُن کے آگے " ای " کی جگہ " ي " لکھنا چاہیے ۔یعنی اُن کی راے میں " تو در خانہ ي ، خانہ ي خریدم ، جلوہ ي

دیدم " وغیرہ لکھنا چاہیے ۔ مگر یہ قول بھی ، اُن کے پچھلے قول کی طرح ناقابل قبول ہے ۔ یہاں بھی وہی انتہا پسندی کارفرما ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جاچکا ہے ۔

ڈاکٹر محمد معین ، ایران کے معروف مصنّف اور برہانِ قاطع کے ایرانی اڈیشن کے مرتّب ہیں ، اُنھوں نے اپنے معروف لُغت فرہنگِ فارسی میں اِس قاعدے کی وضاحت بھی کی ہے :

" درکلمات مختوم بہ ہ غیر ملفوظ بھنگام الحاق بہ " ی " وحدت و نکرہ ، نشانۂ اخیر بصورت " ای " نوشتہ شدہ : آشیانہ ای ، خانہ ای ، لانہ ای "۔

(مقدمۂ فرہنگِ فارسی ، جلدِ اوّل ، ص ۵۰)

اب اختصار کے ساتھ اِس قاعدے کی تکرار کردی جائے کہ :

(۱) ہاے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ میں ، اضافت و توصیف کے لیے ہ پر ہمزہ لکھا جائے گا ۔ جیسے : خانۂ من ، بندۂ خوب ، پردۂ مجاز ۔

(۲) ایسے لفظوں میں وحدت ، تنکیر ، خطاب اور نسبت کے لیے " اے " اور " ای " کا اضافہ کیا جائے گا ۔ جیسے : خانہ اے خریدم ، جلوہ اے دیدم ، تو تشنہ ای ، تو درخانہ ای ، کعبہ اے بنا کردم ، تو گفتہ ای ، تو آمدہ ای ، تو رفتہ ای ۔

(۷)

است ، اند ، ای ، اید ، ام ، ایم : یہ دراصل " افعالِ رابطہ " ہیں ۔ " است " کا بیان بعد میں آئے گا ، باقی پانچ کلمات کی صورت یہ ہے کہ جب لفظ حروفِ پیوند پذیر (ملاکر لکھے جانے والے حروف) پر ختم ہوتا ہے ، اُس صورت میں

الف کی حرکت، حرفِ ماقبل کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور اِن کلمات کا الف، تلفظ اور کتابت دونوں میں ساقط ہو جاتا ہے، اور "رابطے" کو کلمے سے ملا کر لکھا جاتا ہے۔ جیسے: مارا ہمدمند، تو شادمانی، شما حق را طالبید، من اورا ہمبازم، مادوستِ ویم ـــ اِسی طرح: نیستند، کیستند، چیستند، نیستی، کیستی، چیستی۔ نیستید، چیستید، کیستید۔ نیستم، کیستم، چیستم۔ نیستیم، کیستیم، چیستیم۔

اگر کلمے کا اختتام ہائے بیانِ حرکت پر ہو گا تو "روابط" کو مکمل صورت میں لکھا جائے گا۔ جیسے: فرزانہ اند، دیوانہ ای، افتادہ ای، تشنہ ای، رفتہ اید، گفتہ ام، تشنہ ایم، شما درخانہ اید۔

اگر کلمہ حرفِ پیوند ناپذیر (منفصل لکھے جانے والے حرف) پر ختم ہو گا، اور وہ حرف اگر د، ذ، ر، ز، ژ اور واوِ ماقبل مفتوح ہو گا تو "روابط" کا الف حذف ہو جائے گا۔ جیسے: ایشاں آزادند، تو گرفتاری، شما گرفتارید، من گرفتارم۔ مارا برادرید، بدانش سرفرازم، رہروند، رہرویم، خسروید۔

اگر حرفِ آخر الف ہو گا تو اُس صورت میں "روابط" کا الف تلفّظ و تحریر دونوں میں یِ سے بدل جائے گا۔ جیسے: دانایند، توانایی، زیبایید، زیبایم، زیبایم، شکیبایم، بندۂ خدایند، بندۂ خدایی، بندۂ خدایم۔ ہمزہ یہاں کہیں نہیں آئے گا۔

اگر حرفِ آخرِ کلمہ "واوِ ممدود" ہو گا، تب بھی الف، یِ سے بدل جائے گا۔ جیسے: شما خوشخویید، من باآبرویم، ما باآبرویم، مادر گفتگویم، درجستجویند، تو درجستجویی۔

اگر آخری حرفِ کلمہ "واوِ بیانِ ضمہ" ہو گا، اِس صورت میں اُس کا حکم

ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کا سا ہوگا ۔ جیسے : طرفدارِ شما دو اند ، ارادتمندِ توام ، دوستِ من توای ، یارِ من شما دواید ، ما یارِ ہر دو ایم ۔

۱

است ، جب ایسے کلمے کے ساتھ آتا ہے جو حرفِ پیوند پذیر پر ختم ہوتا ہے ، تو کبھی تو " است " کو مکمل طور پر (یعنی مع الف) لکھا جاتا ہے ، اور کبھی اُس کا الف نہیں لکھتے ۔ جیسے : شب است اور شبست ، خوش است اور خوشست ، اندک است اور اندکست ، بازی است اور بازیست ۔

یہ دونوں طریقے رائج ہیں ۔ " است " کو بہ حذفِ الف لکھنے میں یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اِس سے کسی طرح کا التباس نہ پیدا ہو ۔ مگر اچھا یہ ہوگا کہ ایسی صورت میں (یعنی جب لفظ حرفِ پیوند پذیر پر ختم ہو) " است " کو منفصل لکھا جائے ، اِس سے کسی طرح کا التباس پیدا نہیں ہوسکے گا ۔ جیسے : خوش است ، پنج است ، اندک است ، بازی است ، قاضی است ، راضی است ، حال است ، احمق است ۔

اگر کلمۂ ماقبلِ " است " ، منفصل لکھے جانے والے حرف پر ختم ہو (الف ، واوِ ممدود اور واوِ بیانِ ضمہ کے علاوہ) اُس صورت میں " است " کا الف ضرور لکھنا چاہیے ، جیسے : بد است ، کاغذ است ، برادر است ، سبز است ، خسرو است ، بیزار است ، تیز رو است ، درتگ ودو است ، اسپ است ، خر است ۔

اگر کلمہ ہائے مختفی پر ختم ہو ، تب بھی الف لکھا جائے گا ، جیسے : خانہ است ، گرفتہ است ، کردہ است ، بندہ است ، کعبہ است ، غنچہ است ، شگفتہ است ۔

ہاے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کے ساتھ "است" کو اِس طرح بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے کہ آخرِ لفظ کی ہاے مختفی کو اور "است" کے الف کو ساقط کر دیا جاتا ہے، جیسے: آمدست، کردست، گفتست، پروردست؛ یہ انداز نظم میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ جہاں یہ صورت ہوگی، وہاں اِسی طرح لکھا جائے گا۔

کہ، چہ، نہ؛ یہ کلمے جب "است" کے ساتھ آتے ہیں تو "ہاے مختفی" یؔ سے بدل جاتی ہے اور "است" کا الف حذف ہو جاتا ہے، جیسے: کیست، چیست، نیست۔

اگر کلمہ یاے ماقبل مفتوح پر یا واوِ بیانِ ضمّہ پر ختم ہو، ("تو" کے علاوہ) تو "است" کا الف لازماً برقرار رہے گا، جیسے: مے است، نے است، درپے است، دو است۔

"تو" کے ساتھ "است" کو دو طرح لکھا جاتا ہے: "تُست" اور "تو است"۔ یہاں تلفّظ کے مطابق املا اختیار کیا جائے گا، یعنی تلفظ میں "تُست" آتا ہے تو یوں ہی لکھا جائے گا اور اگر "تو است" آتا ہے تو اِس طرح، اور اِس آخری صورت میں "است" کا الف باقی رہے گا۔

اگر کلمہ ماقبل الف یا واوِ ممدود پر ختم ہو، اِس صورت میں "است" کے الف کا لکھنا اور نہ لکھنا دونوں جائز ہیں، جیسے: خداست اور خدا است۔ نیکوست، نیکو است۔ مگر اچّھا یہ ہوگا کہ ایسی صورتوں میں "است" کا الف نہ لکھا جائے، یعنی ایسے لفظوں کو اِس طرح لکھا جائے: نیکوست، بازوست، خداست، دنیاست، خوشخوست۔ ع: سالے کہ نکوست، از بہارش پیداست۔

یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ اکثر صورتوں میں " است" کا الف تلفظ میں نہیں آتا۔ خواہ لکھا جائے، خواہ نہ لکھا جائے۔ اور اِس صورت میں اِس الف کا زبر، کلمۂ ماقبل کے حرفِ آخر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جیسے: خوش است، تلفظ: خوش سُت۔ ہاں جب کلمۂ اوّل کا حرفِ آخر الف ہوتا ہے، تب بھی الف تو تلفظ میں ساقط ہو جاتا ہے، مگر اُس کی حرکت، حرفِ ماقبل کی طرف منتقل نہیں ہوتی۔ یہی صورت پیش آتی ہے اُس وقت جب حرفِ آخر واوِ ممدود یا یائے ممدود ہو، جیسے: نیکو است، اور قاضی است، تلفظ: نیکو سُت اور قاضی سُت۔ (ضرورتِ شعری سے یہاں بحث نہیں)۔

ہائے مختفی پر ختم ہونے والے لفظوں میں بھی یہ صورت پیش آتی ہے کہ کبھی تو الف تلفظ میں باقی رہتا ہے، جیسے: کردہ است۔ اور کبھی " کردُست" بولتے ہیں۔ اِس آخری صورت میں " است" کے کلمۂ ماقبل کی ہ اور " است" کا الف، دونوں ساقط ہو جاتے ہیں۔

(۸)

استند، استی، استید، استم، استیم؛ یہ فعلِ رابط جب کسی کلمے کے ساتھ آتے ہیں، تو الف کی حرکت، کلمۂ ماقبل کے حرفِ آخر کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور تلفظ و تحریر دونوں میں الف ساقط ہو جاتا ہے، جیسے: اہلِ دلستند، تو باہنرستی، خسروستید، دوستِ ویستم، مردِ رہستیم۔

کلمے کا حرفِ آخر الف ہو تو " است" کا الف اِس صورت میں بھی ساقط ہو جائے گا، مگر اُس کی حرکت، حرفِ ماقبل کی طرف منتقل نہیں ہوگی، جیسے:

داناستند، توانا ستی، شکیباستید، بے پرواستم، بے پرواستیم۔

(۹)

ضمیر ہائے متصل: جب کوئی کلمہ حروفِ پیوند پذیر پر ختم ہوگا، اُس صورت میں، ضمیر ہائے متّصل: ش، ت، تاں، م، شاں کو اُس لفظ سے ملا کر لکھا جائے گا، جیسے: قلمش، کلکت، اسپتاں، گفتتاں، نگاہم، جانم۔

جب کلمہ ہائے مختفی پر ختم ہوگا تو کلمے اور ضمیر ہائے واحد کے درمیان الف آئے گا، جیسے: خانہ اش، جلوہ ات، بندہ ات، نامہ ام، جامہ ام۔ اور ضمیر ہائے جمع کے درمیان الف نہیں آئے گا، جیسے: بندہ تاں، خانہ شاں۔

"کہ" کے ساتھ جب "ش" اور "ت" کو لایا جائے گا تو ہائے مختفی ساقط ہوجائے گی، جیسے: کش، کت۔

جب کلمہ، منفصل لکھے جانے والے حروف میں سے د، ذ، ر، ز، ژ، اور واوِ ماقبل مفتوح پر ختم ہوگا تو ضمیریں منفصل ہی لکھی جائیں گی، جیسے: دیدش، برادرت وغیرہ۔

اگر کلمے کا آخری حرف الف یا واوِ ممدود ہو، اِس صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ ضمیروں کو منفصل لکھا جائے، جیسے: خدااش، فرداات۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ ضمیر سے پہلے یِ کو داخل کیا جائے، جیسے: خدایش، فردایت، آبرویتاں، پایم، وضویش، وفایت، پایش۔

یہ دوسری صورت (مع اضافہ "یِ") زیادہ بہتر ہے، خصوصاً نثر میں۔

اگر کلمے کا آخری حرف واوِ بیانِ ضمّہ ہو، تو تین مفرد ضمیروں سے پہلے الف آئے گا، جیسے: بدستِ تو اش سپردم، ہر دو ات گفتند، بدستِ تو ام دادہ ام،

اور باقی تین ضمیروں میں یہ الف نہیں آئے گا، جیسے : ہر دو شاں آمدند، ہر دو تاں صاد قید، ہر دو ماں آمدہ بودیم ۔

(۱۰)

جس فعل کا حرفِ اوّل الف ہو، جب اُس سے پہلے بائے زینت یا بائے تاکید یا میم و نونِ نہی یا نفی آتا ہے، تو اگر وہ الف مضموم یا مفتوح ہے، اِس صورت میں وہ یؔ سے بدل جاتا ہے، جیسے : بیفتد، میندیش، نیند اخت، نیازارد، بیاموز، بیاراید ـــ ایسے مواقع پر یؔ اور الف دونوں کا لکھنا جائز نہیں، یعنی "بیافتد" یا "میاندیش" یا "نیانداخت" نہیں لکھا جائے گا۔

اگر وہ الف مکسور ہوگا تو اُس کو اُسی طرح برقرار رکھا جائے گا، جیسے : بایست، نایستاد ۔

(۱۱)

"کہ" جب شعر میں ایسے لفظ سے پہلے واقع ہوتا ہے جس کا پہلا جز الف ہو، اُس صورت میں "کہ" کی ہائے مختفی کو حذف کر کے، "ک" کو اُس کلمے سے ملا کر لکھتے ہیں، جیسے : کانبیا (کہ انبیا)، جیسے یہ مصرع : آں سبب‌ها کانبیارا رہبر است ۔ ایسے مواقع پر الف اگرچہ تلفظ میں نہیں آتا، مگر اُس کو لکھا ضرور جائے گا۔ بعض مثالیں :

ع : بہ بوئی نافہ اے کاخر صبا زاں طرہ بگشاید (حافظ)

ع : کایہ بجلوہ سروِ صنوبر خرامِ ما (")

ع : کاینجا ہمیشہ باد بدست است دام را (")

ع : کاغوشِ کہ شد منزل و ماوا گہِ خوابت (")

ع : کاتش زعکسِ عارضِ ساقی درآں گرفت (حافظ)

(۱۲)

"کہ ایں" اور "کہ آں" کو مخفّف صورت میں "کایں" اور "کاں" لکھا جائے گا، جیسے ع : کایں ہمان است کہ پیوستہ در ابروی تو بود۔ ع : کاں راکہ خبر شد، خبرشش باز نیامد۔ ع : کانکس کہ پختہ شد، مے چوں ارغواں گرفت (حافظ)

اِسی طرح "کہ اے" کے مخفّف کو "کاے" لکھا جائے گا، جیسے ع : کاے خداوندِ آسماں رفعت۔ ع : گفت کاے عاشقِ دیرینۂ من، خوابت ہست (حافظ)

اِن تینوں صورتوں میں بھی الف کو لازماً لکھا جائے گا۔

(۱۳)

"کہ از"، "نہ از"، "و از"، "و اگر" کی مخفّف صورتیں : کز، نز، وز، ور، آتی ہیں۔ یہ بھی نظم سے تعلّق رکھتی ہیں۔ اِن کو الف کے بغیر لکھا جائے گا، جیسے، ع : ور نہ ستانی، بہ ستم میبرد۔ ع : وز خدا میطلبم عقلِ بصیرت افروز۔ ع : کزیں بحر کشتی نیامد پدید۔

(۱۴)

"ازایں" کے مخفّف کو، الف کے بغیر، "ازیں" لکھا جائے گا، جیسے ع : ازیں پردہ بیروں نہ بینی تو ہیچ۔ اِس کی ایک صورت "زیں" بھی ہے، جیسے ع : زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت۔

لہ اردو میں بھی، فارسی کے اثر سے، اِس قسم کی مثالیں ملتی ہیں، جیسے مثنوی سحرالبیان کا یہ شعر:

وزیروں نے کی عرض کاے آفتاب نہ ہو تجھ کو ذرّہ کبھی اضطراب

(۱۵)

او ، ایشاں ، ایں ، ایناں ؛ اِن سے پہلے جب در ، بر ، از ، اندر ، آتے ہیں تو عام طور پر اِن کو الف کے بغیر لکھا جاتا ہے ، یعنی : برو ، بریشاں ، بریں ، ازو ، ازیں ، ازیناں ۔ اندرو ، اندریں ، اندراں ۔ درو ، دریں ، دراں ، دریشاں ۔ یہ اِن کی مروّج صورت ہے ، مگر " املای فارسی " میں کہا گیا ہے کہ اِن سب کلمات میں الف بھی لکھنا چاہیے (یعنی : درایں ، ازایشاں وغیرہ) لیکن ایسے کلمات کو الف کے بغیر ہی لکھا گیا ہے اور یہی اِن کی متعارف صورت ہے ، اِس لیے اِس کو بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

(۱۶)

عربی کے بابِ تفعیل سے کچھ ایسے مصدر بھی آتے ہیں ، جن میں دو یَ اک جا ہیں ، اِن میں دونوں یَ لکھی جائیں گی ، ہمزہ کہیں پر نہیں آئے گا : تخییل ، تغییر ، تمییز ، تبیین ، تعیین (وغیرہ) ۔ یہی صورت ہوگی بعض دوسرے الفاظ کی ، جیسے : معاییر (فارسی کی مشہور کتاب کا نام ہے : المعجم فی معاییرِ اشعار العجم) ۔ قاعدہ یہ ہوگا کہ عربی کے جن لفظوں میں دو یَ اک جا ہیں ، اُن کو اُسی طرح لکھا جائے گا ۔ دو یَ کا اجتماع ، فارسی لہجے کے عین مطابق ہے ، اور خود فارسی الفاظ میں یہ صورت بہت پائی جاتی ہے ۔

(۱۷)

عربی کے جن مصدروں اور جمعوں کے آخر میں ہمزہ ہوتا ہے ، جیسے : ابتداء ، انتہاء ، املاء ، انشاء ، شعراء ، حکماء ، اُمراء (وغیرہ) ؛ اُن سب کو ہمزہ کے بغیر ہی لکھنا چاہیے ، کیوں کہ یہ ہمزہ ، تلفّظ میں ساتھ نہیں دیتا ۔ اب تک ایسے لفظوں کو دونوں طرح لکھا جاتا رہا ہے ، اب ایک ہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے ۔ اضافت

کی صورت میں ، ایسے اور الفاظ کی طرح ، اِن لفظوں کے آگے بھی " ي "، کا اضافہ کیا جائے گا ، جیسے : انبیای بنی اسرائیل ، شعرای نامدار ، ابتدای کار، انتہای شوق ، املای فارسی ، انشای طاہر وحید ، ..." املای فارسی" میں بھی یہی کہا گیا ہے اور اب اکثر لوگوں کا عمل بھی اِسی پر ہے ۔
ضمیرِ متصل کے اضافے کی صورت میں بھی ، عام الفاظ کی طرح ، اِن الفاظ کو بھی استعمال کیا جائے گا ، جیسے : اطبّایش جواب دادند ، انبیایش دعوت کردند ۔

(۱۸)

عربی کے لحاظ سے کچھ حروفِ تہجی ہمزہ پر ختم ہوتے ہیں ، با ، تا ، ثا ، حا، خا، را، زا ، طا ، ظا ، فا ، ہا ، یا ۔ کچھ ایرانی مصنّفین کا کہنا یہ ہے کہ اِن حرفوں میں ہمزہ کو باقی رکھا جائے ۔ صاحبِ " املای فارسی " کا بھی یہی خیال ہے ، مگر یہ محض زائد بات ہے ۔ فارسی قواعد و لُغت کی متعدّد کتابوں میں اِن حرفوں کو " دو حرفی " بتایا گیا ہے ، یعنی دو ٹکڑوں پر مشتمل ۔ عام طریقہ یہ رہا ہے کہ اضافت کی صورت میں ، الف پر ختم ہونے والے عام لفظوں کی طرح ، اِن کے آگے بھی " ي " کا اضافہ کیا جاتا ہے ، جیسے : بای موحّدہ ، تای فوقانی ، یای تحتانی ، ثای مثلّثہ ۔ یہ رسمِ کتابت لُغات میں عام ہے ۔ یہی مروّج اور متعارف طریقہ ہے ، اور اِسے بدلنے کی کچھ ضرورت نہیں ۔

ؔ مثلاً برہانِ قاطع میں لکھا ہے : " بباید دانست کہ بنای کلامِ عرب بربیست وہشت حروف است، وآنرا بر سہ قسم ساختہ اند، قسمِ اوّل را مسرمدی گویند، وآں دو حرفی بود و دوازدہ حرف است : با و تا و ثا و حا و خا ....." (مقدمۂ برہانِ قاطع)

اِس کے علاوہ ، جس طرح " علماء " اور " ابتداء " میں ہمزہ ، تلفظ کا جُز نہیں ، اُسی طرح اِن حرفوں میں ہمزہ ، تلفّظ سے بے تعلق رہتا ہے ، اِس لیے دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

(۱۹)

عربی کے جن الفاظ میں الف یا واو پر ہمزہ لکھا جاتا ہے ، جیسے : تأمل، مؤلف وغیرہ ؛ فارسی مطبوعات میں ایسے لفظ دونوں طرح دیکھنے میں آتے ہیں، یعنی مع ہمزہ اور بغیرِ ہمزہ ۔ بل کہ آج کل یہ رجحان کچھ بڑھ گیا ہے کہ ایسے عربی الفاظ پر ہمزہ ضرور لکھا جائے۔"املای فارسی" میں اِسی پر زور دیا گیا ہے ۔ یہ بھی تضاد کی دل چسپ صورت ہے ۔ علاوہ اور باتوں کے ، یہ خیال نہیں کرتے کہ ایک آواز کے لیے دو حرف یا "علامتیں" کیسے آئیں گی ۔ فارسی میں تو ایسا کوئی قاعدہ ہے نہیں ۔ بہ ہر صورت ، ایسے سب لفظوں کو ہمزہ کے بغیر ہی لکھنا چاہیے ۔ جیسے : تامّل ، تاثّر ، مودّب ، مولّف ، مونث ، مانوس ، منشا وغیرہ ۔

(۲۰)

عربی کے بہت سے اسماے جمع اور اسم فاعل ایسے ہیں ، جن میں فا کلمے یا عین کلمے کے بعد ایک الف ، اور اُس کے بعد ہمزۂ مکسور آتا ہے ، جیسے : سائل ، مسائل ، وظائف ، وقائع ، صنائع ، فوائد ، زوائد ، عمائد ، قائل ، مائل ، شمائل ، خصائل وغیرہ ۔ فارسی میں ایسے بہت سے لفظوں میں کبھی ہمزہ دیکھنے میں آتا ہے اور کبھی ی ۔ (سائل ، سایل)۔" املای فارسی" کے مصنّف کی رائے ہے کہ :

" ہمزۂ این کلمات را اگر اصلی باشد ، از قبیل " سائل و مسائل " .....

بصورت ہمزہ نویسند و بین بین تلفّظ کنند، و کلمات عبری جبرائیل و میکائیل راہم بہمین قیاس نویسند، و در غیر این مورد، یعنی در موردی کہ ہمزہ بدل از واو یا یاء یا بدل از مدحرف زاید باشد، بصورت یاء نویسند و بیاء تلفظ کنند، مانند مایل، شمایل، قایل، عوایِد، زوایِد، مرایی، دلایل، رسایل وغیرہ"۔

مگر اِس تقسیم کو قبول کرنا بہت دِقّت طلب ہے۔ ہر عربی لفظ کی اصل کون معلوم کرتا پھرے گا، اور کس سے معلوم کرے گا۔ یہ تکلّفِ محض اور لزومِ مالایلزم ہے۔ اِس سلسلے میں، اردو کی طرح، ایک طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے کہ عربی کے ایسے سب لفظوں کو مع ہمزہ لکھا جائے۔

(۱)

کاووس، سیاووش، داوود، پیشاوور؛ اور اِس طرح کے دوسرے الفاظ کے لکھنے میں تلفّظ کی رعایت ملحوظ رکھی جائے گی، یعنی جہاں واو کھینچ کر پڑھنے میں آتا ہے، وہاں دو واو لکھے جائیں گے، جیسے: نبشتند نامہ بکاووس شاہ۔ یا ؏: سیاووش را گفت با او برو۔ اور جہاں تلفّظ میں صرف ایک واو آئے گا، وہاں ایک واو لکھا جائے گا، جیسے: ؏: سیاوش چو او را پیادہ بدید۔

(۲)

عربی میں بہت سے لفظوں کو اِس طرح لکھا جاتا ہے کہ آخرِ لفظ میں لکھی تو یؔ جاتی ہے مگر پڑھنے میں الف آتا ہے، جیسے: عیسیٰ، مرتضیٰ، مولیٰ، مصفّیٰ، اعلیٰ، ادنیٰ وغیرہ۔ ایسے سب لفظوں کو الف سے لکھنا چاہیے۔

جیسے : فتوا ، مولا ، مصطفا ، اعلا ، ادنا وغیرہ ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خاص ناموں (عیسی، موسی ، یحیی) کو عربی کے مطابق بھی لکھا جائے ، مگر اچھا یہی ہوگا کہ اِس قاعدے کو بہ طورِ کلّیہ نافذ کیا جائے (املای فارسی) ۔

فارسی میں ایسے کچھ لفظوں کو اب تک دونوں طرح لکھا جاتا رہا ہے اور بعض لفظوں کو صرف مع الف لکھا جاتا ہے ۔ اب ایک ہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے ۔ یہ قاعدہ اردو اور فارسی میں مشترک ہے ، اِس سلسلے میں اردو کے حصّے کو بھی دیکھا جائے ، وہاں تفصیلات بھی ملیں گی ۔

اِن الفاظ کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنا چاہیے کہ (نظم میں) اِن کو بہ یاے معروف بھی استعمال کیا جاتا ہے ، یعنی : لیلی اور عیسی ۔۔۔ قاعدہ یہ ہے کہ اِن کی کتابت ، تلفظ کے مطابق ہوگی ؛ جب یہ الف کے ساتھ استعمال میں آئیں گے تو اِن کو الف سے لکھا جائے گا ، جب یاے معروف کے ساتھ استعمال کیے جائیں گے تو یاے معروف کے ساتھ لکھا جائے گا ۔

اضافت کی صورت میں یاے معروف ، مکسور ہو جائے گی ، جیسے :
ع : عیسیِ مریم چہ کند چارہ اش ۔ جب یہ الف کے ساتھ لکھے جائیں گے تو یِ کا اضافہ کیا جائے گا ، جیسے ع : علیِ مرتضا مولای ماہست ۔

یاے وحدت و تنکیر کا اضافہ اِسی طرح ہوگا ، جیسے : موسیے اور مولایے ۔
ع : موسیے با موسیے در جنگ بود ۔

(۳)

گذاشتن ، گذشتن اور پذیرفتن کے مشتقات کو مع ذال لکھا جائے گا ، جیسے : گذشتہ ، گذرگاہ ، سرگذشت ، پوزش پذیر ۔ اور گزاردن جب ادا

کرنے ، پیش کرنے اور شرح و تفسیر کے معنی میں آئے گا تو اُس کو زے سے لکھا جائے گا ، جیسے : خدمت گزار ، گزارش ، عبادت گزار ، خراج گزار۔ اِس سلسلے میں بھی تفصیلات کے لیے اُردو کے حصّے کو دیکھا جائے۔

(۴)

تپیدن ، تپش ، تپانچہ ، غلتیدن ، تشت ، تہماسب ، تہمورث ، تہران کو ت سے لکھنا چاہیے ۔ مگر صد ، صندلی ، طوس ، شصت ، شطرنج ، بسطام جیسے لفظوں میں تبدیلی کی ضرورت نہیں ۔ یہ اِسی طرح متعارف ہیں ۔ بعض اور حضرات کی طرح صاحبِ " املای فارسی " کا بھی یہی خیال ہے کہ اوّل الذّکر الفاظ کی طرح ، اِن لفظوں کو بھی فارسیا لینا چاہیے ؛ مگر یہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا ۔ صحت پسندی اور اصلاح کو ایک حد کے اندر رہنا چاہیے ۔

(۵)

صلوٰۃ ، زکوٰۃ ، مشکوٰۃ ، جیسے لفظوں کو فارسی میں ، تلفّظ کے مطابق ، الف اور تاے کشیدہ (ت) کے ساتھ لکھنا چاہیے ۔ یعنی : صلات ، زکات ، مشکات ، حیات وغیرہ ۔ اِن لفظوں کو واو سے لکھنا ، قرآنِ پاک کا خاص املا ہے (املای فارسی) ۔

(۶)

جن لفظوں میں ، عربی میں تاے مدوّر (ۃ) لکھی جاتی ہے ، تنوین (دو زبر) کی صورت میں ایسے لفظوں کے آگے الف کا اضافہ نہیں کیا جاتا ، بل کہ اُسی " ۃ " پر دو زبر لگائے جاتے ہیں ، جیسے : دفعتہً ، نسبتہً ۔ باقی الفاظ میں الف کا اضافہ کیا جاتا ہے ، جیسے : اتفاقاً ، انتظاماً ۔ جن لفظوں کے

آخر میں تاے دراز ہوتی ہے، اُن میں بھی الف کا اضافہ کیا جاتا ہے، جیسے: وقتاً۔

اِس امتیاز کی فارسی میں مطلق ضرورت نہیں۔ لفظ کے آخر میں ہر صورت میں الف کا اضافہ کیا جائے گا، جیسے: عمداً، نسبتاً، ابداً، قطعاً، دفعتاً، غفلتاً، اثباتاً، نفیاً، حقیقتاً، عادتاً (املای فارسی)۔

یہ نہایت مناسب اصلاح ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ کون سی ت اصلی ہے اور کون سی زائد، اور اِس کی کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں۔ تاے مدوّر (ۃ) عربی کی چیز ہے اور اُسے عربی زبان ہی سے مخصوص سمجھنا چاہیے، فارسی اور اردو دونوں میں صرف ایک ت ماننا[1] چاہیے۔ البتہ عربی کے جملوں اور عبارتوں میں تاے مدوّر ضرور آئے گی۔ کتابوں (وغیرہ) کے خاص نام اِس سے مستثنا ہیں، جیسے: تذکرۃ الاولیا۔

(۷)

اسماعیل، رحمان، اسحاق، لقمان (وغیرہ) کو کبھی عربی رسمِ خط کے مطابق الف کے بغیر بھی لکھا جاتا ہے، یعنی: رحمٰن، اسحٰق، اسمٰعیل۔ ایسے سب لفظوں کو تلفّظ کے مطابق الف کے ساتھ ہی لکھنا چاہیے۔ صرف لفظ "اللہ" اور

---

[1] صاحبِ فرہنگِ جہانگیری نے لکھا ہے:

"ہرگاہ لغتِ عربی کہ در آخرِ آں تاے فوقانی باشد و آنرا در املای عربی بصورتِ ہا نویسند مثلِ ظہیر الدولۃ والسعادۃ و الرفعۃ والشوکۃ؛ چوں در پارسی نویسند، آں تاءات را دراز باید نوشت، مانندِ ظہیر دولت و سعادت و رفعت و شوکت۔ وایں تا بارا در عبارتِ فارسی گرد نوشتن بے املاست"۔ (مقدمۂ فرہنگِ جہانگیری)

" ابہ " مستثنا رہیں گے۔

(۸)
عربی کے مکمل جملوں کو، عربی رسم خط کے مطابق ہی لکھا جائے گا، جیسے:
خلد اللہ ملکہ، العاقل تکفیہ الاشارۃ، دام بقاؤہ، رحمۃ اللہ علیہ، زیدۃ شوکتہ، غفر اللہ لہ وغیرہ۔

(۹)
واوِ معدولہ فارسی کی خاص چیز ہے، اور اِسے ضرور لکھا جائے گا، جیسے:
خود، خویش، خواب۔

(۱۰)
پہلی فصل میں " یاے مجہول " کی بحث آچکی ہے۔ یہ لکھا جاچکا ہے کہ وحدت وتنکیر کے لیے اور ماضی تمنائی کے صیغوں میں اور ے، نے جیسے لفظوں میں، جن میں حرفِ ماقبل مفتوح ہوتا ہے، اور " اے " کلمۂ ندا میں یاے مجہول (ے) لکھی جائے گی اور اِس کا تعلق ہندستانی فارسی اور کلاسکی فارسی سے ہوگا۔ فارسیِ جدید میں ہر ی کی معروف صورت (ي) لکھی جائے گی، جیسے: شخصی، مردی، ای، کردمی۔
لفظ کے آخر میں (فعل ہو یا اسم) جو ی آتی ہے، جیسے: آرای، فرمای، ہای، رای، وای وغیرہ؛ اور اضافت و توصیف کی صورت میں جب ی کا اضافہ علامتِ اضافت کی حیثیت سے کیا جاتا ہے، جیسے: بازوی قاتل، گیسوی شب تاب؛ تو اِن سب صورتوں میں معروف و مجہول آوازوں کا کچھ جھگڑا نہیں ہوتا۔ ایسے مقامات پر وہ حرف کے بجاے، علامت کی حیثیت رکھتی ہے؛ اِس لیے یہ مناسب بات ہوگی کہ ایسی سب صورتوں میں، ی

کو صرف اِسی صورت میں لکھا جائے۔ اِس طرح بڑی حد تک موجودہ طرزِ نگارش سے یک سانیت کا فائدہ بھی حاصل رہے گا۔

اِس طرح، قاعدہ یہ ہوا کہ اوپر جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے، جہاں کہ یاے مجہول آئے گی؛ اُن کے علاوہ، آخرِ لفظ میں جزوِ لفظ کی حیثیت سے آنے والی، اور علامتِ اضافت کی حیثیت سے اضافہ کی جانے والی یِ کی معروف صورت (يِ) کو لکھا جائے گا، جیسے:

پاي، جاي، راي، ہاي، واي، روي، خوي، بوي، آراي، کشاي۔

پاي چوبیں، راي عالی، روي خوب، خوي بد، بوي دہن، عالم آراي، مشکل کشاي۔

(۱۱)

جو لفظ الف یا واو پر ختم ہوں گے؛ اضافت کے لیے، اُن کے آگے يِ کا اضافہ کیا جائے گا، جیسے: ابتداي عشق، روي زیبا، موي میاں، سوي خدا، یکتاي زماں، بلاي فراق۔

جو لفظ یاے معروف، یا واوِ ماقبل مفتوح پر ختم ہوتے ہیں؛ اُن میں واو کے نیچے اضافت کا زیر آئے گا، جیسے: پیروِ فکرِ اسد، خسروِ والاتبار، کج خرامِ عارو، بے نیازيِ خدا، کج اداِيِ محبوب، زیبائيِ رخسار، رعنائيِ گل، پرتوِ خورشید۔

کچھ متفرق باتیں:

فارسی کی مطبوعہ کتابوں میں، عام طور پر، حرکات و سکنات کا استعمال

نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ خاص طور پر اضافت کا زیر تو گویا ہوتا ہی نہیں۔ اِسی طرح ایک ضروری علامت "کاما" کا استعمال بھی بہت کم ہوتا ہے۔ آج کل ایران کی چھپی ہوئی جو کتابیں دیکھنے میں آتی ہیں، اُن سب میں یہ بات مشترک ہوتی ہے۔ ایران والوں کا جو بھی طرزِ عمل ہو، یہاں اضافت کا زیر لازماً لگایا جائے گا، اور ضروری مقامات پر اعراب نگاری کا التزام بھی کیا جائے گا۔ یہی صورت مختلف علامات کے استعمال کی ہوگی۔ یہاں کی ضرورتیں اِسی کی متقاضی ہیں، اور یہاں رواج بھی یہی ہے۔

فارسی میں ہائے مختفی کو عموماً "ہای بیانِ حرکت" لکھتے ہیں اور اِس کو من جملۂ حروفِ علّت مانا جاتا ہے۔ یہ نہایت مناسب بات ہے اور اُردو میں بھی اِس کی تقلید کی جانا چاہیے، کیوں کہ یہ ہ، "بیانِ حرکت" ہی کے کام آتی ہے، جو حروفِ علّت کا خاص کام ہے۔ الف، واو، ي؛ یہ تین حروفِ علّت ہیں، چوتھا حرف یہ ہوا۔ فرق بس یہ ہے کہ الف، واو، ي؛ یہ تینوں حرف کبھی حرفِ صحیح بھی ہوتے ہیں، مگر ہائے بیانِ حرکت (یا ہائے مختفی) میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی۔

اِس سلسلے میں ایک یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اب فارسی والے متحرک الف کو، ہمزہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ عربی کی تقلید ہے اور اِس کو ماننے کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ پُرانے فارسی لُغات میں متحرک الف کو الف ہی لکھا گیا ہے۔ الفِ مقصورہ اور الفِ ممدودہ کے ابواب میں اِس کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بہ ہر صورت، یہاں الف کو الف ہی کہا جائے گا، وہ متحرک ہو یا نہ ہو۔ اور ہمزہ اُس خاص صورت کا

نام ہوگا جو عین کے سرے سے مشابہ ہوتی ہے (۶) اور جس کو اُردو و فارسی دونوں میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ یعنی "ادب" اور "افروز" میں حرفِ اوّل الف ہے ، اور "پردۂ" اور "رئیس" میں ہمزہ ہے ۔

"املای فارسی" میں احمد بہمنیار نے "وضعِ قواعدِ املا" کے ذیل میں آٹھ بنیادی اصولوں کا ذکر کیا ہے ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس عبارت کو بہ لفظہٖ نقل کردیا جائے ، کیوں کہ یہ اصول اُردو والوں کے بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے ۔ اُردو اور فارسی میں املا کے انتشار اور عدمِ تعیّن کے لحاظ سے بہت سے مصائب مشترک ہیں اور وضعِ قواعد و معیار بندی کے بہت مسائل بھی قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں :

"در وضعِ قواعد برای املای فارسی چندین اصول بطریق الأہم فالأہم باید رعایت شود (اوّل) تطابق مکتوب و ملفوظ کہ آنچہ بتلفظ صحیح می آید ، ہمان ہم نوشتہ شود ، آنچہ در لفظ الف است در خط ہم الف باشد ، و آن مقدار از حروف کہ متصل بہم و بصورت یک کلمہ تلفظ میشود ، در نوشتن ہم متصل بہم باشد و ھکذا ۔ (دوم) احتراز از اشتباہ کہ حروف یا کلمات مشتبہ بیک دیگر نشود ، مثلاً کتابت "جامہ ہا" و "جامہا" بیک صورت نباشد ۔ (سوم) اطراد قاعدہ کہ قواعدی کہ برای نوشتن کلمات وضع میشود ، تا ممکن است استثنا نداشتہ باشد ۔ (چہارم) رعایت اصل کہ از دو رسم الخط صحیح آنرا کہ اصل کلمہ را نشان میدہد اختیار کنند ، مثلاً "شب پرہ" را "شپرہ" ہم میتوان نوشت و ہر دو صحیح است لیکن اگر "شب پرہ" نوشتہ شود اصل کلمہ را ہم نشان میدہد کہ مرکب از دو لفظ

ضب و پره است ۔ (پنجم) اختیار اشهر که از دو رسم الخط صحیح آنرا که بیشتر معمول است اختیار کنند ۔ (ششم) حفظ استقلال خط که لغاتی که از زبانهای دیگر داخل فارسی شده است ، مطابق قواعد املای فارسی نوشته شود ۔ (هفتم) ملاحظۂ زیبائی که در وضع املا و رسم الخط زیبائی کلمه و لا اقل زشت و ناهنجار ننمودن آنرا بقدر امکان در نظر بگیرند ۔ (هشتم) ترجیح اسهل که از دو رسم الخط مختلف و صحیح آنرا که نوشتنش آسانتر و حرکت دست و جنبش قلم در کتابتش روانتر و سریعتر است اختیار کنند " ۔

(املای فارسی ، لغت نامۂ دهخدا ، جلد چہلم ، ص ۱۵۵)

تدوین اور املا

تدوین میں املا کے مسائل کی خاص حیثیت ہے۔ غور کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ متن میں انتخابِ الفاظ اور حواشی میں اختلافِ نسخ کا بہت کچھ تعلّق املا سے ہوتا ہے۔ تدوین میں املا کی اہمیّت کو صحیح طور پر نہ سمجھنے سے، اور املا کے مسائل سے کم واقفیت کی بنا پر متن اور حواشی دونوں جگہ انتخابِ الفاظ میں غلطیوں کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے متنوں میں غلطیوں کا جو ذخیرہ ہے؛ اُس میں خاصا حصّہ املا سے تعلّق رکھتا ہے۔

متن میں املا سے متعلّق غلطیوں کی کئی صورتیں ہوتی ہیں: کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ جن الفاظ کو متن میں جگہ ملنا چاہیے، وہ غیر صحیح یا غیر مرجّح الفاظ کے ذیل میں آکر، حاشیے کے حوالے ہوجاتے ہیں اور اس طرح متن میں اُن صورتوں کو جگہ ملتی ہے جن کو یا تو حواشی میں آنا چاہیے؛ یا وہ سرے سے قابلِ ذکر ہی نہیں ہوتیں۔ کبھی اُن شکلوں

کو مصنّف سے منسوب کیا جاتا ہے جن سے اُس کے قلم کو واقعتاً تعلّق نہیں ہوتا، بل کہ بعض صورتوں میں تو اُس مصنّف کے عہد کو بھی اُن سے نسبت نہیں ہوتی؛ اور پھر اِس غلط سنجی کی بنیاد پر، لسانی جائزے کی بحثوں کی ٹیڑھی عمارت تعمیر کی جاتی ہے۔ کبھی خلطِ مبحث کی صورت اِس طرح پیدا ہوتی ہے کہ مدوّن کو یہ علم نہیں ہوتا کہ کن لفظوں میں کون سے املائی تغیّرات، ارتقاے زبان کا نتیجہ ہیں، کون سی صورتیں انفرادی پسندیدگی یا علاقائی اثرات کی زائیدہ ہیں، کون سی شکلیں محض ناقلوں کی کم سوادی کی آئینہ دار ہیں، لغزشِ قلم کی نیرنگیاں کہاں ہیں، اور عدمِ تعیّن کی وجہ سے اور قواعدِ املا کے منضبط نہ ہونے کے سبب سے، املا میں جو حقیقی و غیر حقیقی اختلافات نظر آتے ہیں، اُن کی نوعیت کیا ہے؛ لیکن اِن سب کے مقابلے میں بدترین صورت یہ ہوتی ہے کہ مدوّن کو واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جن کے پُرانے املا کو بدلا جاسکتا ہے۔ بل کہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جن کے قدیم املا کو بدل دینا ضروری ہے۔ جب تک اِس طرح کے اہم مسائلِ املا کا علم نہیں ہوگا؛ اُس وقت تک صحّتِ متن کی ذمّے داری سے عہدہ برآ نہیں ہوا جا سکتا۔ میں دو چار مثالوں کی مدد سے وضاحت کرنا چاہوں گا:

مصدر "پھنسنا" اور اِس کے مشتقّات کو عام طور پر مع نونِ غنّہ لکھا جاتا ہے، مگر داغ نے ایک خط میں اِس کو نونِ غنّہ کے بغیر صحیح بتایا ہے:

"لفظ "پھسنا"، بغیر نون کے صحیح ہے، چنانچہ میں نے بھی یہی کہا ہے۔ رند[1] کے شعر سند میں لکھتا ہوں ..." (زبانِ داغ، ص ۱۰۵)

اِس قول کی بنیاد پر، داغ کے کلام میں لازمی طور پر اِس مصدر اور اِس کے مشتقّات کے اِسی املا کو اختیار کیا جائے گا۔ یہ تو ہوئی اصولِ تدوین کی بات؛ مگر اِس سلسلے میں یہی علم کافی نہیں کہ اِس لفظ کے متعلّق داغ کی رائے کیا تھی؛ یہ بھی اُسی قدر ضروری ہے کہ اِس مصدر کے متعلّق دوسرے اقوال کا بھی علم ہو۔ یہ بھی معلوم ہو کہ قواعدِ قافیہ کی رو سے ایسے تقفیے کا کیا حکم ہے اور اِس روشنی میں داغ کا یہ قول صحیح ہے یا غلط، کیوں کہ قواعدِ قافیہ کے ضابطے کے تحت ہی یہ فیصلہ کیا جا سکے گا کہ داغ نے جو اور شعرا کے اشعار پیش کیے ہیں اپنے قول کی سند کے طور پر، اُن کی کیا نوعیت ہے۔ اِس طرح کی معلومات کے بغیر، یعنی اِس مصدر (اور اِس کے مشتقّات) کی املائی صورتوں کے علم کے بغیر، اور قواعدِ قافیہ کی ضروری معلومات کے بغیر، ذہن کو وضاحت کی وہ روشنی نہیں

---

[1] داغ نے رند، ذوق اور میر کے اشعار سنداً لکھے ہیں۔ ذوق کے شعر یہ ہیں:

ہوں یہ لاغر، جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے جوں کمادہ لچکے ہے، پائے مگس کے بوجھ سے
نکلے دنیا سے کہاں احمق، اُٹھا کر بارِ حرص رہ گیا یہ تو گدھا دل دل میں پھس کے بوجھ سے"

[2] خورشید لکھنوی نے رسالۂ افادات میں اِس لفظ کو مع نونِ غنہ مانا ہے اور قواعدِ قافیہ کی رو سے، اِس کا تقفیہ اُن الفاظ کے ساتھ (باقی ص ۶۲۴ پر)

مل سکتی جس کی مدد سے صحیح فیصلے کرنے کا شعور اپنا کام کرتا ہے۔
غالب کے متعلق یہ معلوم ہے کہ وہ فارسی میں وجودِ ذال کے قائل نہیں تھے، یعنی وہ "گذشتن" اور "پذیرفتن" جیسے فارسی مصادر اور اِن کے مشتقّات کو زٓ سے لکھنا صحیح سمجھتے تھے۔ وغیرہ۔ غالب کے کلام کو اگر کوئی شخص مرتّب کرنا چاہے، تو اور باتوں کے علاوہ، اُس کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اِس سلسلے میں غالب کی رائے کیا تھی، یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے اور کتنے لفظ ہیں جن میں زٓ اور ذال کا یہ جھگڑا سامنے آ سکتا ہے، دوسروں کی رائے کیا ہے، اربابِ لُغت نے کیا کہا ہے، اور اب لوگ کیا کہتے ہیں۔ اِن تفصیلات، یعنی ایسے الفاظ کے متعلقاتِ املا کے علم کے بغیر، نہ غالب کے کلام کا متن صحیح طور پر مرتّب ہو پائے گا

جائز قرار دیا ہے جن میں حرفِ روی سے پہلے نونِ غنّہ ہو۔ مثلاً "پھنس" کا قافیہ "دس" ہو سکتا ہے۔ (افادات ص ۹۸)۔ (یہی بات صحیح ہے۔ داغ سے یہاں غلطی ہوئی ہے۔) اِس قول کی روشنی میں داغ کی پیش کی ہوئی مثالیں غیر متعلّق ہو جاتی ہیں۔ داغ کے کلام کے علاوہ دوسرے شعرا کے کلام میں (خاص طور پر وہ شعرا جن کے شعر داغ نے سنداً لکھے ہیں) "پھنس" ہی لکھا جائے گا۔
ضمنی طور پر یہ بھی کہہ دوں کہ دیوان ذوق مرتّبۂ آزاد میں، ذوق کے اُس شعر میں (جس کو داغ نے "پھس" کی سند میں پیش کیا ہے) "پھنس" (مع نونِ غنّہ) ہی چھپا ہوا ہے۔

اور نہ دوسروں کے کلام کے ساتھ انصاف کیا جا سکے گا۔
جلالؔ نے اپنے لُغت گلشنِ فیض میں (جو فارسی زبان میں ہے) لفظ "سنہ" کے معنی میں بھی "سَن" لکھا تھا۔ گویا اُس وقت تک وہ اس معنی میں بھی اِس لفظ کے اِسی املا کو صحیح سمجھتے تھے۔ اُن کے معاصرین میں سے بعض نے اِس سے اختلاف کیا تھا۔ بعد کو جب اُنھوں نے سرمایۂ زبانِ اُردو کے نام سے اِس لُغت کو اُردو زبان میں شائع کیا تو لفظ "سن" کے زیرِ بحث معنی اُس میں شامل نہیں کیے۔ اِس کا صاف طور پر مطلب یہ ہوا کہ اُنھوں نے پچھلے قول سے رجوع کرلیا۔ اب اگر کسی کے سامنے صرف گلشنِ فیض ہی کا اندراج ہو اور وہ اُس کی بنا پر کلامِ جلالؔ میں یا دوسروں کے کلام میں "سنہ" کو "سن" لکھے تو ظاہر ہے کہ یہ عمل صحیح نہیں ہوگا۔ یہ ضروری ہے کہ مرتّب کو اِس لفظ کے اِن سب متعلّقات کا عِلم ہو۔
بحرؔ لکھنوی نے اپنے رسالے بحرالبیان[2] میں "سونگھنا" کو مع نونِ غنّہ

---

[1] دیکھیے مکتوبِ امیرؔ مینائی بہ نامِ نعیم الحق آزادؔ (مکاتیب امیرؔ، مرتّبۂ احسن اللّٰہ خاں ثاقبؔ)۔ نیز شوقؔ نیموی کا رسالہ ازاحۃ الاغلاط، بحثِ لفظ "سن"۔

[2] اِس کا واحد مخطوطہ رضا لائبریری رام پور میں محفوظ ہے اور رسالۂ اُردو ادب (علی گڑھ) کے شمارہ ۱ ۱۹۶۳ء میں اِس کا مکمّل متن شائع ہو چکا ہے

لکھا ہے؛ اب اِس مصدر اور اِس کے مشتقّات کے اِس املا میں تبدیلی ہو چکی[1] ہے؛ مگر بحرؔ کے کلام میں اُن کی اختیار کردہ صورت ہی کو محفوظ رکھا جائے گا۔ بحرؔ کے دیوانِ مطبوعہ (ریاض البحر) میں بھی اگر اِس کے خلاف ملتا ہے تو اُس کو غیر متعلق چیز سمجھا جائے گا۔ غالبؔ کی تحریروں میں بھی اِس لفظ کا املا مع نونِ غنّہ (سونگھنا) ملتا[2] ہے، اور یہاں بھی اِسی اصول سے کام لیا جائے گا۔

جیسا کہ اِس سے پہلے ابواب میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے؛ اُردو میں طویل مدّت تک املا سیّال حالت میں رہا ہے۔ املا کے قاعدوں کی طرف بہت دیر میں توجّہ کی گئی اور اِس عرصے میں بہت سے لفظوں کی غیر صحیح شکلوں نے بھی نمود حاصل کرلی۔ آسان پسندی نے، صحّتِ املا کی مشکل پسندی سے آنکھیں چُرانا ہی مناسب سمجھا اور معلومات کی کمی، عام طور پر اِس

---

[1] شوقؔ نیموی نے رسالۂ اصلاح میں لکھا ہے:

"سونگھ کو متقدّمین نون سے لکھا کرتے تھے، ایک آدھ جگہ "چونچ" کے قافیے میں بھی نظر سے گزرا ہے، مگر فی زماننا اکثر "سوچ" بغیرِ نون لکھتے ہیں۔"

[2] ملاحظہ ہو مرقّعِ غالب (مرتّبہ پرتھوی چند) میں نوّاب کلبِ علی خاں کے نام غالبؔ کا پہلا خط مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۶۵ء،

طرزِ بے پروا خرامی کو بڑھاوا دیتی رہی۔ آج تدوین کا کام کرنے والے کو اِس سرگذشت کا علم ہونا چاہیے۔ اُس کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہونا چاہیے کہ عام طور پر مستعمل الفاظ کی اب صحیح یا مرجّح صورت کیا ہے، اور پچھلے ڈھائی تین سو برسوں میں ان پر کیا گزری ہے۔ اِس کے بغیر معمولی معمولی الفاظ میں غلط نویسی کا رنگ شامل ہوتا رہے گا۔ کیے، لیے، دیے اور آزمایش، فرمایش اور منہدی، منہگی اور ابتداے عشق، زندگیِ فانی جیسے بیسیوں مفرد و مرکّب لفظ ہیں؛ یہ معلوم ہونا چاہیے کہ "لیے" کو کیسے لکھا جائے گا (لیے، لیئے، لئے) "منہدی" میں نونِ غنّہ کہاں پر آئے گا (منہدی، مہندی)، "ابتداے عشق" میں یے پر ہمزہ لکھا جائے گا یا نہیں (ابتداے عشق، ابتدائے عشق)، "جامہ" کی جمع "جامہ ہا" لکھی جائے گی یا "جامہا"، "بننا" درست ہے یا "بنّا"۔ وغیرہ۔ اِس قبیل کے بہت لفظ ہیں جن سے بار بار سابقہ پڑتا ہے۔ اگر ان سب لفظوں کے متعلّقاتِ املا کا علم نہیں تو ظاہر ہے کہ متن میں انتخابِ الفاظ خواہ ٹھیک ہو، مگر الفاظ کی صورت نادرست ہو سکتی ہے۔ میں بعض مثالوں سے اِس کی مزید وضاحت کرنا چاہوں گا:

میرؔ کا ایک شعر یوں بھی دیکھا گیا ہے:

"سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے"

کلّیاتِ میر مرتبہ آسی میں اِس کی یہ صورت ہے:

"سرھانے میرؔ کے کوئی نہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے"

اِس شعر میں "آہستہ بولو" اور "کوئی نہ بولو" تو اختلافِ متن کے ذیل میں آتے ہیں، مگر مصرعِ اوّل کا پہلا ٹکڑا "سرھانے" ہے یا "سرہانے"؛ اِس کا تعلّق خالصتًا املا سے ہے۔ اگر اِس کو "سرہانے لکھا جائے (سرہانے میرؔ کے......) تو اِس کا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا، املا تو غلط ہوا ہی۔

لفظ "گھائل" کو سائل، مائل وغیرہ کا ہم قافیہ کہا گیا ہے، اور پھل، آنچل وغیرہ کے ساتھ بھی باندھا گیا ہے۔ ایسے الفاظ کے املا کے متعلق ایک اصول یہ ہے کہ آخری حرف سے پہلے والا حرف اگر مفتوح ہے تو وہ یَی ہے، جیسے: گھایل، پایل، نراین وغیرہ، اور مکسور ہونے کی صورت میں اُس کو ہمزہ مانا جائے گا، جیسے: گھائِل، پائِل وغیرہ۔ اب اِن شعروں کو دیکھیے:

یہ دی ہے بے کلی تو نے، کہ دل میں ہے یہی کل سے
کہ دھو کر زندگی سے ہاتھ پونچھوں تیرے آنچل سے
ستم کیا کیا نہ ہوگا اُس قمر طلعت کے کُشتے پر
کرے گی چاندنی بھی نازِ معشوقانہ گھایل سے (بحرؔ لکھنوی)

نہ احباب کی تیغِ احساں سے گھائل نہ بیٹے سے طالب، نہ بھائی سے سائل (حالیؔ)

اِن اشعار میں اِس ایک لفظ کے دو مقامات پر دو املا ہیں اور اپنے اپنے مقام پر دونوں صحیح ہیں، لیکن پہلی مثال میں اگر "گھائل" یا دوسری مثال [illegible] "گھایل" لکھا جائے تو [illegible] جگہ املا غلط ہو جائے گا، اور

اِس کے نتیجے میں قافیہ بھی غلط ہو جائے گا۔ مدوّن کو اِس لفظ سے متعلّق اختلافِ املا کا بھی علم ہونا چاہیے، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اب مرجّح صورت کیا ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ ایسے الفاظ میں زبر اور زیر کے لحاظ سے ہمزہ اور یٔ کے تعیّن کا کیا قاعدہ ہے، اور کس مقام پر کون سی صورت کو اختیار کیا جائے گا۔

"کیونکے" اور "کیونکہ" دو مختلف لفظ ہیں۔ غالب کے اِس شعر میں :

نہ جانوں، کیونکے مٹے داغِ طعنِ بدعہدی تجھے کہ آینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

"کیونکے" کی جگہ اگر "کیونکہ" لکھ دیا جائے تو املا کی اِس غلطی سے مفہوم پر بھی اثر پڑے گا۔ اِن دونوں لفظوں کے املا میں عام طور پر کم لوگ احتیاط کو ملحوظ رکھ پاتے ہیں۔

آخرِ لفظ میں یٔ مشدّد ہو تو تشدید لکھنا ضروری ہے اور ایسا عموماً عطف و اضافت کی صورت میں ہوتا ہے۔ بہ صورتِ اضافت یہ یاے مشدّد، مکسور ہو جاتی ہے، جیسے ذوق کا یہ مصرع : سرویّ حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک۔ اب بہت سے لوگ اِس یٔ پر تشدید لکھنے کے بجاے، ایک عدد ہمزہ جڑ دیا کرتے ہیں اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ صحّتِ املا اور اضافت دونوں کا حق ادا ہو گیا، یعنی اِس طرح :

سرخیٔ حنا .....

"سرخیِّ" کو "سرخیٔ" لکھنے کا مطلب قطعی طور پر یہ ہوا کہ اِس کو "سرخی ءِ" پڑھا جائے (ورنہ مصرع ساقط الوزن ہو جائے گا)، اور "سرخی ءِ"، کس قدر غلط اور بے معنی ہے، اِس کو بیان

کرنے کی ضرورت[۱] نہیں۔ غلط املا نے معنویت کو بھی مجروح کر دیا۔ ایسی بہت مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

"دوکان" اور "پہونچنا" (وغیرہ) اُس زمانے کی یادگار ہیں جب اعراب بالحروف کا رواج تھا۔ اب اِن لفظوں کی صحیح صورت "دکان" اور "پہنچنا" ہے، مگر یہ لفظ اور اِس قبیل کے بعض اور الفاظ مع واو لکھ دیے جاتے ہیں اور احساس بھی نہیں ہوتا کہ صحتِ املا پر کیا گزر گئی!

"خورد" اور "خُرد" دو مختلف لفظ ہیں، جیسے: خورد و نوش، اور خُرد و کلاں۔ "خُرد" کو "خورد" لکھنے سے (مثلاً خورد و کلاں)، املا ہی غلط نہیں ہوگا، مفہوم بھی تباہ ہو جائے گا ــــ لفظ کے آخر میں ہاے مختفی ہو تو محرّف ہونے کی صورت میں، ہاے مختفی کی جگہ یے آجائے گی، جیسے: کعبہ، اور کعبے میں۔ اِس کو "کعبہ میں" لکھنا، صحتِ املا پر ستم ڈھانا ہے ــــ کربل کتھا کا واحد خطّی نسخہ جو جرمنی کے ذخیرۂ اشپرنگر میں محفوظ ہے اور جس کا عکس پیشِ نظر ہے، اُس کے کاتب نے "اسّی" کو "اسّی" اور "سات" کو "ثات" لکھا ہے۔ اب ایک مجہول الاحوال کاتب کی غلط نویسی کی بنیاد پر، یہ فرض کر لینا کہ یہ مصنّف کا املا ہے، اِس لیے مطبوعہ نسخے میں بھی اِسے محفوظ رکھنا چاہیے؛ یا یہ فرض کرنا کہ "اسّی" کا ایک املا "اسّی" یا "سات" کا ایک املا "ثات" بھی ہے؛ یہ سب

---

[۱] غالب نے نوابینِ رام پور کو جو خط لکھے ہیں، اُن میں بالعموم "حضرت ولیِ نعمت، آیۂ رحمت" بہ طورِ القاب لکھا ہے اور اکثر خطوں میں "ولی" کی یِ پر تشدید لگائی ہے: "ولیّ نعمت"

ستم ظریفی کے سوا کچھ نہیں۔

غرض، مرتب کو الفاظ کے قدیم و جدید املا اور عہد بہ عہد کے اختلافاتِ املا کا علم ہونا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جس شخص کا کلام مرتّب کیا جا رہا ہے، اُس کا طرزِ عمل کیا تھا، یا یہ کہ اُس عہد میں بعض دوسرے لوگوں کے یہاں کیا صورت پائی جاتی ہے۔ حقیقی اور غیر حقیقی اختلافاتِ املا کی کیا نوعیت ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں قدیم املا کو بدلا جا سکتا ہے۔ اِس کے بغیر تدوین کا کام مکمّل نہیں ہو سکتا اور ایسے متن کو قابلِ اعتبار نہیں قرار دیا جا سکتا۔

املا کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایسے الفاظ کی بڑی تعداد ہے جو یا تو کسی مرحلے پر کسی تبدیلی سے دو چار ہوئے ہیں، یا پھر وہ کسی بحث کا موضوع بن چکے ہیں۔ انتخابِ الفاظ کے لحاظ سے بھی مختلف مصنّفین کے یہاں مختلف صورتیں پائی جاتی ہیں۔ اِس بنا پر یہ تو بہت مشکل ہے کہ تدوین کے سلسلے میں املا کے سارے متعلّقات کو کسی ایک تحریر میں جمع کر دیا جائے؛ البتہ کچھ اصولوں اور قاعدوں کا تعیّن کیا جا سکتا ہے اور یہ اچھّے مدوّن پر ہوگا کہ وہ صحیح قیاس کی مدد سے، مختلف مقامات پر فیصلے کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ تدوین بجائے خود سکھانے کی چیز کم ہے، وہ سمجھنے کی چیز ہے، اور یہ "سمجھنا" تجربے کی کارگاہ میں مکمّل ہوتا ہے۔ اِس سلسلے میں بنیادی اُمور کے علم کے بعد، تجربہ ہی سب سے بڑا معلّم ہوتا ہے۔ قاعدے قانون کا علم اِس لیے ضروری ہے کہ قیاس کو صحیح راستہ مل سکے اور

نظری طور پر ... نصیب ہو کر اِس سے زیادہ اُس کی

رسائی نہیں۔ تدوین کا کام، غالبؔ کے الفاظ میں "قانونِ باغبانیٔ صحرا" لکھنا ہے؛ اِس میں نہ آسانی کی توقّع کرنا چاہیے نہ جلدی کی، اِن دونوں کو تدوین کی سنجیدگی اور مشکل پسندی سے بَیر ہے۔ اِن میں باہم وہی نسبت ہے جو عشق و ہوس میں ہوتی ہے (یا ہونا چاہیے)۔

اِس بحث میں سب سے پہلے اِس کا تعیّن کیا جانا چاہیے کہ وہ کون سے مقامات ہیں جہاں املا کی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ ضروری کا مطلب یہ ہے کہ اُن تبدیلیوں کے بغیر کسی قدیم تحریر کو پیش نہیں کیا جائے گا۔ یہ ضروری تبدیلیاں ایسی ہوں گی جن سے لفظ کی صورت میں اِس طرح کی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی جس کو بنیادی تبدیلی کہا جا سکے اور جس کی وجہ سے وہ لفظ اپنے عہد سے دُور جا پڑے۔ مثلاً "ستی" "سیں" اور "سوں" کو اگر "سے" میں بدل دیا جائے تو ظاہر ہے کہ لفظ ہی بدل[1] جائے گا، اور

---

[1] اِس سلسلے میں مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کی ایک تحریر سے یہ اقتباس پیش کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا، قاضی صاحب نے لکھا ہے:

"تذکرۂ میر حسن طبعِ اول میں انساںؔ دہلوی معاصرِ محمد شاہ کا ایک شعر یوں ہے:

سودا خیالِ خام کا سرسوں گزر گیا — تل باندھتے تھے جس میں، وہ کملی نہیں رہی

انساںؔ کے عہد میں ایہام کا بہت رواج تھا، اور "سے" کی جگہ "سوں" بھی بہت استعمال ہوتا تھا، اس نے "تل" کی رعایت سے "سرسوں" ہی لکھا ہوگا۔ لیکن طبعِ دوم میں "سرسے" ہے، جو اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن اِس میں ایہام نہیں رہتا۔ کتاب میں غلط نامہ نہیں۔ طباعت کی غلطی ہے۔"

(رسالۂ تحریک (دہلی) ستمبر ۱۹۶۲ء)

اِس کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ ذیل میں جو قاعدے لکھے جا رہے ہیں، اُن سے بنیادی اور فروعی تبدیلیوں کے فرق کا اندازہ کیا جا سکے گا۔

(۱)

اعراب بِالحروف کے طور پر جو واو پہلے لکھا جاتا تھا اور جو صرف پیش کی نشان دہی کرتا تھا، اور مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ حرفِ ماقبل کو پیش ہی کے ساتھ پڑھا جائے؛ اُس واو کو اب حذف کر دیا جائے گا اور اُس کی جگہ، ضرورت کے مطابق پیش لگایا جائے گا۔ یہ واو، جس کو حذف کیا جائے گا، اصلاً لفظ کا جُز کبھی نہیں تھا۔ شروع میں محض بر بِنائے احتیاط اور بعد کو بر بِنائے روش، اِس کو لکھا جانے لگا۔ یہی مقصد اب پیش سے حاصل کیا جا سکتا ہے، جیسے: "دوکان"، "پہنچنا"، "اوس"، "اون"، "اودھر"، "مونہ" (وغیرہ) کہ اب اِن کو "دکان، اُس، اُن، پہنچنا، اُدھر، مُنہ لکھا جائے گا۔ "اُس"، "اُن"، "اُدھر" جیسے لفظوں میں متعلق حرف پر پابندی کے ساتھ پیش لگایا جائے گا اور "اِس"، "اِن"، "اِدھر" میں الف پر زیر لگایا جائے[1] گا۔

---

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (مرحوم) نے لکھا ہے:

"سیّد انشا نے "اوس" پر اعتراض کیا ہے..... لیکن اِس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ "اِس" اور "اُس" دو لفظ ایک دوسرے کے متقابل تھے، وہ دونوں گونگے ہو گئے۔ اکثر اوقات یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ کسی عبارت کو پڑھنے میں، جب تک اُس کا پہلے سے مطالعہ نہ کر لیا جائے، پڑھنے والا ٹھوکریں کھاتا ہے اور سُننے والے کو اُلجھن ہونے لگتی ہے۔

سب سے بڑا ... (باقی ص ۶۳۴ پر)

اگر کسی مقام پر یہ واو جزوِ تلفّظ ہو، یعنی لفظ کو اشباع کے ساتھ نظم کیا گیا ہو، جیسے یہ مصرع : اودھر ہی گیا خیالِ میرا، یا جیسے غالب کا یہ مصرع : رزم میں اوستادِ رستم و سام ؛ تو ایسے مقامات پر اِس واو کو لازماً لکھا جائے گا، کیوں کہ یہ جزوِ لفظ ہوگا۔

(۲) بعض ایسے لفظ جن میں اصلاً یؔ جزوِ کلمہ کی حیثیت رکھتی ہے، جب تخفیف کے ساتھ استعمال کیے جاتے تھے، تب بھی بہت سے لوگ اُس یؔ کو کتابت میں برقرار رکھّا کرتے تھے۔ یہ حرفِ زائد اصل میں اُس زائد واو کے قیاس پر، قلم سے نکل جایا کرتا تھا۔ ایسے لفظوں میں، "میرا، میرے، تیرا، تیرے، ایک اور آئینہ، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پُرانے مخطوطوں میں یہ صورت اکثر دیکھنے میں آتی ہے۔ جیسے یہ مصرعے :

"وصلِ زنگارِ رخِ آئینہ، حُسنِ یقیں"

"ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں میرے نزدیک"

اِن مصرعوں میں "آئنہ"، "مرے" اور "اک" کا محل ہے، کیوں کہ یہ لفظ مخفّف صورت میں نظم ہوئے ہیں۔ اب ایسے سب مقامات پر اِس زائد یؔ کو کتابت میں شامل نہیں کیا جائے گا اور اِس میں کسی طرح کا استثنا نہیں ہوگا، اور کسی بھی مصنّف کے طرزِ نگارش کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ اِس زائد

اور "اِس" کو ہمیشہ زیر کے ساتھ لکھیے۔ پُرانے زمانے میں جن لوگوں نے وؔ سے کام لیا، چنداں بے جا نہ تھا۔ اُنھوں نے "اوس" پورا لکھا اور کاتب کی محنت بچانے کو "اِس" کو بغیرِ اظہارِ حرکت لکھا۔

(اردوئے معلّٰی، پرمشتمل قیمیز حاشیہ ص ۶۹)

یؔ کو شامل کرنے سے ، غلطیِ املا کے علاوہ ، یہ قباحت بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر نظم ہے تو مصرعے بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اصل کی پابندی کے نام پر (اور خواہ وہ پابندی کاتب یا ناقل کے املا کی کیوں نہ ہو) ایسے مقامات پر "اوس" وغیرہ میں واو کو، اور "ایک" وغیرہ میں یؔ کو شاملِ کتابت رکھتے ہیں۔ یہ غلط طرزِ عمل ہے۔ اِس غلط نگاری سے املائی خرابی کے علاوہ، وزنِ شعر بھی مجروح ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ حواشی میں ہر جگہ اِس کی نشان دہی کی جائے ، مقدمے میں ایک جگہ اِس کی صراحت کافی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے ، دیوانِ غالب کے ایک حالیہ مطبوعہ نسخے سے بعض مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :

ع : "تھی وہ ایک شخص کے تصوّر سے"

ع : "طوطی کی طرح آیئنہ گفتار میں آوے"

ع : "آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے"

ع : "جو داغ نظر آیا ، ایک چشم نمائی ہے"

س : "ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
ایک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے"

ع : "مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے تیرا لمبر سہرا"

خط کشیدہ مقامات پر یؔ زائد اور مخلِّ صحّتِ متن ہے۔ موجودہ صورت میں اِن سب مصرعوں کو ساقط الوزن کہا جا سکتا ہے۔ اب سے بہت پہلے انشا ، دریاے لطافت میں لکھ چکے ہیں :

"ادھر کیدھر اودھر کتابت میں ضمّے کی رعایت سے واو

اور کسرے کی رعایت سے یؔ لکھ دیتے ہیں، اور بعض نہیں لکھتے۔ صحیح وہ ہیں جو نہیں لکھتے۔ کیوں کہ اگر ترکی کے قاعدے کے مطابق حرفِ مضموم کے بعد واوؔ، اور حرفِ مکسور کے بعد یؔ لکھنا ضروری ہے، تو حرفِ مفتوح کے بعد الفؔ بھی لکھنا چاہیے، اور ایسا نہیں ہوتا ..... اِس کے سوا، ہندی میں ترکی کی ٹانگ توڑنے کے کیا معنی؟ ..... اور یہ بھی ظاہر ہے کہ "اِس" میں یاؔ نہیں لکھتے، جب کہ "اُس" میں واوؔ لکھتے ہیں۔ "اِس" بے چارے نے کیا قصور کیا ہے کہ بغیر یاؔ کے لکھتے ہیں ..... اِس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ "اُس" اور ایسے تمام ہندی لفظوں میں، جن میں ضمہ بغیر واوؔ کے آواز دیتا ہے، واوؔ کا لکھنا صحیح نہیں۔ ایسا ہی حال یؔ کا ہے۔ جس حرف کے بعد تلفّظ میں اِس کا اظہار ہو، تو کتابت میں بھی درست ہے، ورنہ غلط"۔

(ترجمۂ دریائے لطافت ص ۲۲۷-۲۲۸ شائع کردۂ انجمن ترقّیِ اُردو ہند)

(۳) آخرِ لفظ میں آنے والی یائے معروف و مجہول کی کتابت میں پہلے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا تھا اور یہ روشِ عام تھی۔ خوش نویسی نے اِس کے فروغ میں اچھا خاصا حصّہ لیا ہے، کیوں کہ خطّاطی میں کششوں کے انتخاب میں مناسبتِ مقام کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُن لوگوں کو اُس زمانے میں اِس امتیاز کی کچھ ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ مشکل پسندی کو بھی اظہارِ کمال کا ایک وسیلہ سمجھا جاتا تھا اور اِس طرح کی آسان پسندیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کا دائرہ ہی محدود تھا۔ آج بہت سے مقامات پر اُسی عدمِ امتیاز کی وجہ سے اُلجھنوں سے دو چار

ہونا[1] پڑتا ہے۔ بہت سے مقامات پر تو تذکیر و تانیث کا مسئلہ اِس سے وابستہ ہوتا ہے۔

اب یہ لازم ہوگا کہ یاے معروف و مجہول کی کتابت میں امتیاز کو ملحوظ رکھا جائے۔ اِس تبدیلی سے بھی لفظوں کی ساخت پر کچھ اثر نہیں پڑے گا، البتّہ تعیّن کی مدد سے ایک طرف تو پڑھنے کی آسانی میسّر آئے گی اور دوسری طرف حالیہ روشِ نگارش کی پابندی کا فائدہ بھی حاصل ہوگا اور بہت سے مقامات پر تذکیر و تانیث کا فیصلہ بھی کیا جا سکے گا۔

اِس سلسلے میں اِس طرف توجّہ دلانا بے جا نہ ہوگا کہ پُرانی تحریروں میں آخرِ لفظ میں واقع ی یا ے کے تعیّن میں، بہت سے مقامات پر حد درجہ احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ یہ وہ مقامات ہوں گے جہاں اِس تعیّن کی وجہ سے کسی لفظ کی تذکیر یا تانیث کا فیصلہ ہوگا۔ تذکیر و تانیث بھی ہمارے یہاں ایک زمانے تک سیّال حالت میں رہی ہے اور بہت سے لفظوں میں اب بھی اِس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ دبستانی اختلافات اور انفرادی مختارات کا مسئلہ بھی اِس سے وابستہ ہوتا ہے۔ کچھ لفظوں

---

[1] محترمی مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے مقدّمۂ مکاتیبِ غالب میں غالب کے متعلّق لکھا ہے:

"وہ اپنے عہد کی طرزِ کتابت کے مطابق یاے معروف و مجہول کے لکھنے میں بول چال سے زیادہ خطّی خوش نمائی اور کاغذ پر باقی ماندہ جگہ کا لحاظ کرتے تھے۔ معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی جگہ معروف "ی" کا استعمال اُن کے یہاں اِتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں دقّت اور تذکیر و تانیث کے متعیّن کرنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے" (ص [illegible])

میں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ، تذکیر و تانیث کے لحاظ سے بھی تبدیلی ہوئی ہے کہ ایک لفظ کسی زمانے میں مذکّر تھا اور اب تانیث کی طرف رجحان ہے یا اِس کے برعکس۔ میں دو تین مثالوں کی مدد سے اِس کی وضاحت کرنا چاہوں گا:

دیوانِ قائمؔ چاندپوری کے ایک حالیہ مطبوعہ نسخے میں، پہلی غزل کے اِس شعر کو مرتّب نے اِس طرح لکھا ہے:

"ٹک فہم ارادت سے برہمن کی سمجھ شیخ کیا کم ہے خدا سے ترے ہنگامہ بتاں کا"

دیوانِ قائمؔ کے ایک دوسرے حالیہ مطبوعہ نسخے میں، دوسرے مرتّب نے اِس شعر کو اِس طرح لکھا ہے:

"ٹک فہم ارادت سے برہمن کے سمجھ شیخ کیا کم ہے ...."

یہاں "کے" اور "کی" سے لفظِ "فہم" کی تذکیر و تانیث وابستہ ہے۔ اِس سے اتفاق کیا جائے گا کہ اِن میں سے کسی ایک مصرعے کا متن لازماً غلط ہے اور یہ غلطی، اِسی "ی" اور "ے" کے غلط تعیّن کی پیدا کی ہوئی ہے۔

غالبؔ کے اِس معروف شعر کو، ایک مرتّبِ دیوان نے اپنے نسخے میں یوں لکھا ہے:

"جانا پڑا رقیب کے در پر، ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ تری رہگزر کو میں"

اِسی شعر کو ایک دوسرے مرتّبِ دیوان نے یوں صحیح سمجھا ہے:

"جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہگزر کو میں"

یہ دونوں اِسی زمانے کے مطبوعہ نسخے ہیں۔ "تری" اور "ترے" پر، لفظِ رہگزر کی تذکیر سے یہاں بھی کسی ایک مصرعے کا

متن لازماً غلط قرار پائے گا، اور یہ غلطی بھی یائے معروف و مجہول کے تعین میں بے احتیاطی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

غالبؔ کا یہ شعر، ایک نسخۂ دیوانِ غالب میں اِس طرح ملتا ہے:

"دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا"

ایک دوسرے نسخے میں اس کی یہ صورت ہے:

"دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا"

دیوانِ غالبؔ کے یہ دونوں نسخے وہی ہیں جن سے اوپر والی دو مثالیں لی گئی ہیں۔ یہاں بھی "کی" اور "کے" سے لفظِ "مانند" وابستہ ہے۔ جس مرتب نے "کے مانند" کو مرجّح قرار دیا ہے، اُس نے "ترے رہگزر" کی طرح، یہاں بھی صحیح فیصلہ کیا ہے اور اِس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے مرتب کے مقابلے میں وہ زیادہ باخبر اور محتاط ہے۔

(۴) مخطوطے میں جو بھی صورت ہو، گ پر لازماً دو مرکز لگائے جائیں گے، اِسی طرح ڈ، ٹ، ڑ کو بھی موجودہ صورت میں لکھا جائے گا۔

لہ غالبؔ کے اِس شعر سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ وہ اِس لفظ کو مذکّر مانتے تھے:

"زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی کیوں ترا راہ گزر یاد آیا"

(دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۵۲)

اور لفظِ "فہم" بھی عہدِ سوداؔ کے بعد تک عموماً مذکّر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ جب تک قائمؔ کے یہاں اِس کے خلاف مثال نہ ملے، اُس وقت تک قائمؔ کے یہاں (اور اُس عہد کے دوسرے شعرا کے کلام میں بھی) اِس لفظ کو مذکّر ہی مانا جائے گا۔

پُرانے مخطوطوں میں اِن کی مختلف صورتیں ملتی ہیں[1]۔ اب متن میں حالیہ طرز کی پیروی کی جائے گی اور مقدّمے میں تفصیل کے ساتھ اِس کا ذکر کیا جائے گا اور اُس مخطوطے میں جو صورت یا صورتیں پائی جاتی ہیں، اُن کی صراحت کی جائے گی۔

(۵) پہلے لفظوں کو ملا کر لکھنے یا علاحدہ لکھنے میں کوئی ایک انداز اختیار نہیں کیا جاتا تھا، ہاں اکثر لفظوں کو ملا کر لکھا جاتا تھا (اِس کے اثرات اب تک اپنا کام کر رہے ہیں)۔ اب ایسے لفظوں کو علاحدہ علاحدہ ہی لکھا جائے گا اِس کی تفصیل اِس سے پہلے آچکی ہے۔ پُرانی تحریروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی شخص کہیں دو لفظوں کو ملا کر لکھتا ہے اور کہیں الگ الگ۔ اب اِس مسلّمہ قاعدے کی پابندی کی جائے گی کہ مرکّبات کو الگ الگ لکھنا چاہیے۔

(۶) بہت سی پُرانی تحریروں میں (خطّی ہوں یا مطبوعہ) آخرِ لفظ میں آنے والے نونِ غنّہ پر بھی نقطہ لگا ہوا ملتا ہے۔ یہ روش بہت بعد کی تحریروں میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً امیر مینائی کے لُغت امیراللّغات میں ہر جگہ ایسے نون پر نقطہ ملتا ہے۔ (اِس لُغت کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اِس میں صحتِ املا کا بہت اہتمام کیا گیا ہے) غالب کی تحریروں میں بھی عام طور پر یہی

---

[1] اِس سلسلے میں تفصیل کے لیے دیکھیے شیرانی صاحب کی کتاب پنجاب میں اُردو کا مقدّمہ، نیز ڈاکٹر غلام مصطفا خاں کا مقالہ "اُردو املا کی تاریخ" جو اُن کے مجموعۂ مضامین علمی نقوش میں شامل ہے۔
(شائع کردہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی)

صورت پائی جاتی ہے ۔ اصل میں پہلے اِس طرح کی تفریق کی ہی نہیں جاتی تھی۔ اب اِس نون کو نقطے کے بغیر ہی لکھا جائے گا۔

(۷) ہائے مخلوط کو لازماً دو چشمی صورت میں لکھا جائے گا۔ پہلے اِس کی پابندی بھی نہیں کی جاتی تھی، بل کہ یوں کہیے کہ تفریق ہی نہیں کی جاتی تھی۔ امیر اللغات کا ابھی ذکر آچکا ہے۔ اُس میں بھی ہائے مخلوط و ملفوظ کی صورت نگاری میں امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اور پہلے کی بات کیا ہے، اب بھی اُس بے امتیازی کی مثالیں نظر آتی رہتی ہیں۔

(۸) آخرِ لفظ میں واقع ہائے ملفوظِ متّصل کے نیچے شوشہ لگانے کا رواج بھی گویا نہیں تھا، جب کہ ہائے مختفی و ملفوظ میں وجہِ امتیاز یہ شوشہ ہی ہوتا ہے۔ اب ایسی ہر ہ کے نیچے لازماً شوشہ لگایا جائے گا، جیسے: یہ، بہ، تہ، مہ، کہ وغیرہ۔

(۹) پہلے یہ ایک عام انداز تھا کہ آخرِ لفظ میں واقع ہائے ملفوظِ متّصل کے ساتھ ایک ہائے مختفی بھی شامل کر دی جاتی تھی، اور اِس طرح ہائے ملفوظ جو لفظ کا آخری جُز ہوتی تھی، درمیان میں آجاتی تھی۔ یہ مسلّماتِ کتابت میں سے ہے کہ درمیان میں آنے والی ہ کو، کھنی دار صورت میں لکھا جائے گا (جیسے: بہت، گُھر) اِس طرح ایسے لفظوں میں بھی یہ ہ، کھنی دار لکھی جانے لگی، جیسے: "یہہ، کہہ، مہہ، تہہ، بہہ"، کہ اِن کی اصلی اور صحیح صورت ہے: کہ، یہ، بہ، تہ، مہ۔ اب اِس فالتو ہائے مختفی کے اضافے کو روا نہیں رکھا جائے گا اور ایسی ہائے ملفوظ کے نیچے، قاعدے کے مطابق، شوشہ لگایا جائے گا، جیسے: کہنا سے "کہ"، بہنا سے "بہہ"،

اسی طرح یہ، تہ وغیرہ۔
ہاے مخلوط کے بعد بھی اِس فالتو ہاے مختفی کو شامل کر دیا جاتا تھا، جیسے: "آنکھہ، گانٹھہ" وغیرہ۔ ایسے لفظوں کو بھی، قاعدے کے مطابق، اِس فالتو ہاے مختفی کے بغیر لکھا جائے گا، یعنی: آنکھ، گانٹھ، لوتھ، کاٹھ وغیرہ۔
(۱۰) دو لفظ اِس طرح ساتھ ساتھ آئیں کہ پہلے لفظ کا آخری حرف اور دوسرے لفظ کا پہلا حرف، دونوں ہم جنس ہوں، تو بہت سے لکھنے والے ایک حرف کو حذف کرکے، دوسرے حرف کو مشدّد کر لیا کرتے تھے، جیسے: جسّے، اُسّے، اُنّے، کنّے، جنّے، بنّا، تنّا وغیرہ۔ اب متن میں ایسے سب لفظوں کو صحیح طور پر لکھا جائے گا، یعنی دونوں حرف لکھے جائیں گے: جس سے، اُس سے، اُن نے، کن نے، جن نے، بننا، تننا۔ مقدّمے میں اِس کی صراحت کی جائے گی۔
(۱۱) جن لفظوں کے آخر میں ہاے مختفی ہوتی ہے، جیسے: کعبہ، پردہ، خانہ (وغیرہ) تو محرّف ہونے کی صورت میں ہاے مختفی سے پہلے والا حرف، جو اصلاً مفتوح ہوتا ہے، مکسور ہو جایا کرتا ہے اور اِس لیے کتابت میں وہ ہاے مختفی، ہاے مجہول سے بدل جاتی ہے، جیسے: کعبے میں، پردے پر، مے خانے سے۔ ایسے الفاظ کو کبھی تو قاعدے کے مطابق بہ یاے مجہول لکھا جاتا تھا، اور اکثر محرّف صورت میں بھی قائم صورت کو برقرار رکھا جاتا تھا (جیسے: کعبہ میں)۔ اِس بے احتیاطی کی مثالیں اب بھی نظر آتی رہتی ہیں۔ پہلے اصل میں ایسے مسائلِ املا کی طرف توجہ ہی نہیں کی جاتی تھی اور "کعبہ سے" اور "کعبے سے" میں کوئی فرق نہیں سمجھا

جاتا تھا۔ اب ایسے سارے مقامات پر محرّف صورت میں، ہائے مختفی کی جگہ یائے مجہول لکھی جائے گی اور اِس کو لازم سمجھا جائے گا، اور اِس میں کسی طرح کے استثنا کو دخل نہیں دیا جائے گا۔

(۱۲) ہندی وغیرہ کے وہ لفظ جن کے آخر میں الف لکھنا چاہیے، اچھی خاصی بے امتیازی کا شکار رہے ہیں۔ کچھ لفظوں کو تو، عربی فارسی الفاظ کے قیاس پر، ہائے مختفی کے ساتھ لکھنے کا رواج سا ہو گیا تھا، اور کچھ لفظ کبھی الف کے ساتھ لکھے جاتے تھے اور کبھی ہ کے ساتھ۔ اب اصول یہ قرار پائے گا کہ ہندی وغیرہ کے ایسے سب لفظوں کے آخر میں لازماً الف لکھا جائے گا، جیسے: بھروسا، پتا، پٹّا، کتّا وغیرہ۔ اور اِس سلسلے میں ناقل، کاتب یا مصنّف، کسی کے اختلافِ نگارش کی پابندی نہیں کی جائے گی۔ مقدّمے میں اِس کا ذکر کیا جائے گا، اور ایسے بعض اہم الفاظ کی فہرست بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

غلط نگاری کا ایک دوسرا رُخ یہ بھی تھا کہ عربی فارسی کے کچھ لفظ، جن کے آخر میں اصلاً الف ہے، ہائے مختفی کے ساتھ بھی لکھ دیے جاتے تھے۔ جیسے: "سقّہ، معمّہ، تماشہ، تقاضہ، تمغہ، حلوہ، شوربہ" (وغیرہ) کہ اِن کی صحیح صورت ہے: معمّا، سقّا، تماشا، تقاضا، تمغا، حلوا، شوربا۔ اب متن میں ایسے سب لفظوں کو بھی لازمی طور پر صحّت کے ساتھ لکھا جائے گا اور اِس سلسلے میں ناقل یا مصنّف، کسی کے طرزِ نگارش کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

(۱۳) یہ اصول قرار دیا جائے گا کہ جن لفظوں کا املا صریحاً غلط ہو گا، تو اُس غلط املا کی پابندی کسی حال میں نہیں کی جائے گی۔ یہ غلط نگاری

خواہ ناقل کے قلم سے وجود میں آئی ہو یا مصنّف خود اُس کا ذمّے دار ہو، دونوں صورتوں میں ایک ہی حکم رہے گا۔ غلط املا سے مراد یہ ہے کہ وہ غلطی کم سوادی یا لغزشِ قلم کی زائیدہ ہو۔ جیسے کوئی شخص "ایذا" کو "ایزا" لکھے یا "پرستش" کو "پرشتش" یا "سمت" کو "صمت" یا "صبح" کو "سبح" لکھے۔ جن لوگوں کو پُرانی تحریریں پڑھنے کا اتّفاق ہوتا رہتا ہے، اُن کو خوب اندازہ ہوگا کہ کیسے کیسے کم سواد اور غلط نویس لوگوں نے نقلیں تیّار کی ہیں، اور اُن میں کیسی کیسی بوالعجبیاں پائی جاتی ہیں۔ ایسی سب نگارشات کا شمار، غلط نگاری کے ذیل میں کیا جائے گا۔ مثلاً کربل کتھا کے کاتب نے "سات" کا املا "ثات" لکھا ہے، یہ مسلّم ہے کہ اِس لفظ کا یہ املا کبھی نہیں رہا ہے، اِس لیے متن میں "سات" لکھا جائے گا اور مقدّمے میں اِس کی نشان دہی کی جائے گی۔ اِس "ثات" کی بِنا پر، نہ تو اِس لفظ میں اختلافِ املا مانا جائے گا اور نہ ایسا کوئی اور نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ کربل کتھا کے مخطوطے میں "اثّی" (اسّی)، "مثیں" (مسیں)، "ڈھارث" (ڈھارس)، "اسطلاحات" (اصطلاحات)، "فراط" (فرات)، "کتاب خانی" (کتاب خوانی) بھی ملتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کاتب کی کم سوادی پر دلالت کرتے ہیں۔ "ڈھارس" کو "ڈھارث" لکھنا، یا "اسّی" کو "اثّی" لکھنا، مطلقاً کم سوادیِ کاتب پر دلالت کرتا ہے۔ اب متن میں اِن الفاظ کو صحت کے ساتھ لکھا جائے گا۔ اور اُس غلط املا کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک زمانے میں اِن الفاظ کا یہ املا بھی رائج تھا، اور نہ اِس سے لسانی جائزے سے متعلق کوئی نتیجہ نکالا جائے گا۔ پُرانی تحریروں میں کتابت کے عجیب عجیب انداز دیکھنے میں آتے ہیں۔ اِن

سب کا تعلّق مصنّف سے یا اُس عہد کے املا سے نہیں ہوتا۔ اِن میں سے بہت سے مقامات محض ناقل کی نمایندگی کرتے ہیں اور بس۔ مثلاً بابائے اردو مولوی عبد الحق صاحب مرحوم نے قطب مشتری کے ایک خطّی نسخے کے متعلق لکھا ہے :

"ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہے کہ اُس کا رسمِ خط عجیب قسم کا ہے۔ خط نسخ ہے، لیکن الفاظ میں اکثر حروفِ علّت کا کام اعراب سے لیا ہے، خصوصاً اُن حروفِ علّت کے لیے جو لفظ کے آخر میں آتے ہیں۔ مثلاً اِس مصرعے کو : "جو بے ربط بولے تو بتیاں پچیس" یوں لکھا ہے : "جو بِ ربط بولِ توں بتیاں پچیس"۔

(مقدّمۂ قطب مشتری)

ظاہر ہے کہ "بے ربط" کو "بِ ربط" لکھنا یا "بولے" کو "بولِ" لکھنا ناقل کا عمل ہے، نہ اِس سے یہ مانا جائے گا کہ اُردو میں حروفِ علّت کے لیے اعراب کو استعمال کرنا جائز ہے اور نہ اِس کی پیروی کی جائے گی اور نہ یہ کہا جائے گا کہ اِس مثنوی کے مصنّف کا یہ طرزِ نگارش ہے۔

یہ تو ایک مخطوطے کا حال تھا، اب ایک مطبوعہ کتاب کو دیکھیے۔ ڈاکٹر عبد الستّار صدّیقی مرحوم نے عودِ ہندی کی پہلی اشاعت (مطبوعۂ مطبعِ مجتبائی میرٹھ) کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے :

"کاتب اِس نسخے کا غلط نویس اور بد املا ہی نہیں، رسمِ خط بھی نہیں جانتا۔ اور غلطیوں سے قطعِ نظر، لفظوں کو بُری طرح توڑتا ہے۔ "مانتے"، "جانتے"، "دینا" کو بے تکلّف "مان تے"، "جان تے"، "دے نا" لکھ دیتا ہے۔ اِسی طرح "تریسٹھ" کو "ترے سٹھ" اور

"پھانسی" کو "پھان سی"۔ ایک جگہ "پڑھوا دیجے گا" آیا، تو اُسے لکھتا ہے: "پڑھ وا دیجے گا"۔ بعض جگہ تو عبارت کا پڑھنا دشوار ہو گیا ہے"۔

(مقدمۂ خطوطِ غالب، ص ب)

صاف بات ہے کہ اِس طرزِ نگارش کو کاتب کی کم سوادی پر محمول کیا جائے گا، اور اِس کی پیروی نہیں کی جائے گی۔ ایسی مثالیں بہت ہیں۔ غرض یہ ہے کہ مخطوطے یا مطبوعہ نسخے کے املا کو مصنّف کا املا مان کر، اُس کی اندھی تقلید نہیں کی جا سکتی ــــ کربل کتھا کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اُس میں کاتب نے "کے" کی جگہ "کہ" بھی لکھا ہے، جیسے: "فاتحہ ہات اُٹھا کہ با اخلاص"ــ ڈاکٹر عبد السّتار صدّیقی مرحوم نے اِس کے حاشیے میں لکھا ہے: "یہ صورت کم سواد کاتبوں کی تحریر نے پیدا کی ہے"۔ (اُردوے معلّی، اُردوے قدیم نمبر، حاشیۂ ص ۸۵) نیز دیکھیے حاشیۂ ص ۶۶۔ ناقلوں اور کاتبوں کی کم سوادی کو نہ تو مصنّف کے دامن میں ڈالا جا سکتا ہے، نہ اُس کی تقلید کی جا سکتی ہے، نہ اُس کی بِنا پر الفاظ میں حقیقی اختلافِ املا مانا جا سکتا ہے اور نہ ایسی غلط نگاریوں کی بِنا پر، کسی کتاب کے لسانی جائزے میں اُن کو بہ طورِ شہادت پیش کیا جا سکتا ہے۔

مصنّفین سے اِس نوع کی غلطیاں کیسے ہوتی ہیں؛ اِس کی دلچسپ مثالیں مرزا غالبؔ کے یہاں سے پیش کرنا کافی ہوگا۔ محترمی مولانا امتیاز علی خاں عرشی (زاد مجدہ) نے مقدمۂ مکاتیبِ غالب میں لکھا ہے:

"میرزا صاحب سے بعض الفاظ کے املا میں بھول چوک بھی ہوئی ہے جو عربی، فارسی، اُردو اور انگریزی ہر زبان کے لفظوں میں پائی

جاتی ہے ....." پہنچنا" کے مشتق "پہنچا" کو ایک جگہ "پونچھا" لکھ گئے ہیں ۔ "گھٹائیں" اُن کے قلم سے "گھٹھائیں" بن گئی ہیں ..... اور "فرمائیے" کی جگہ "فرمائیّے" بہ تشدید ہے ۔ اِس عربی کے معرّف باللام اسموں سے پہلے حرفِ جر "ب" ہو، تو اُسے الف کے ساتھ ملا کر لکھتے ہیں ۔ میرزا صاحب نے بالکل ، بالفعل ، باللّٰہ کو، "باالکل، باالفعل اور باالله" تحریر کر دیا ہے ۔ (۳) فارسی کے جن لفظوں میں الف کے بعد ي آتی ہے ، جیسے گنجایش ، آیندہ وغیرہ ۔ اُن کا صحیح املا "ي" کے ساتھ ہے اور اِسی طرح میرزا صاحب نے لکھا ہے ، مگر پایندہ اور فزایندہ کو، "پائندہ" اور "فزائندہ" لکھ دیا ہے ۔ خرّم کو "خورّم" بہ واو لکھ دیا ہے ، حالانکہ اِسی کے مرکب "خرّمی" کو بغیر واو لکھا ہے ۔"

(مقدمۂ مکاتیبِ غالب ، ص ۲۳۲ ، طبعِ پنجم)

گنجِ خوبی کا مخطوطہ جو میر آمّن کا لکھا ہوا ہے ، اُس میں "ایذا" کا املا "ایزا" ملتا ہے اور "پرشمش" بھی موجود ہے ۔ ظاہر ہے کہ "باالکل ، "خورّم" ، "فرمائیّے" ، "ایزا" اور "پرشمش" غلط املا ہے ، متن میں لازمی طور پر اِن کو صحت کے ساتھ لکھا جائے گا اور مقدمے میں ایسے الفاظ کی فہرست ضرور پیش کی جائے گی ۔ وَعلیٰ ھٰذا القیاس ۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ بعض مصنف کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں ۔ یا وہ زبان و بیان کے معاملات سے اُس قدر آشنا نہیں ہوتے جس قدر کہ کسی دوسرے موضوع سے واقف ہوتے ہیں ۔ یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ ایک شخص ریاضی یا نفسیات یا کیمسٹری کا عالم ہو، یا مثلاً وہ

پولیس یا فوج کے مسائل سے خوب واقف ہو، مگر وہ اُردو یا فارسی سے معمولی واقفیت رکھتا ہو۔ ایسی صورتوں میں، یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ مصنّف صحتِ املا کا بھی حق اُسی طرح ادا کر سکے گا جس طرح وہ اُس خاص موضوع کا حق ادا کرسکتا ہے۔ اور ایسی صورتوں میں ایسے مصنّفین کے املا میں جو غلطیاں ہوں گی، اُن کی پابندی کسی حال میں نہیں کی جائے گی، بل کہ مسلّمہ طرزِ نگارش کو اختیار کیا جائے گا۔

جو لوگ لکھنے پڑھنے کا کام کرتے رہتے ہیں، اُن کو اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اچھا خاصا لکھنے والا بعض دفعہ کسی لفظ کے املا کے متعلق غلط فہمی کا شکار بھی ہو جایا کرتا ہے اور کبھی بے خیالی میں قلم سے کچھ کا کچھ نکل جاتا ہے اور ایسی بھول ہوتی ہے کہ بعد کو تعجب ہوتا ہے۔ لغزشِ قلم سے تو بہت کم لوگ محفوظ رہ پاتے ہیں۔ یہ صورتیں نادانستگی کے عالم میں رونما ہوا کرتی ہیں، اِس لیے ایسی مثالیں، تقلید یا سند کے کام نہیں آسکتیں۔ مطبوعہ کتابوں میں بھی لفظوں کی بہت سی صورتوں کو اِسی ذیل میں شامل سمجھنا چاہیے۔ ایسی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں کہ کاتب نے ایک لفظ کا وہ املا لکھا جس سے مصنّف کا قلم آشنا نہیں۔ پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اکثر صورتوں میں کاپی نویس کوئی ہوتا ہے اور مصحّح کوئی اور ہوتا ہے اور مصنّف بہت دور بیٹھا ہوتا ہے۔ اِسی طرح غلطی ہائے کتابت کو بھی نظر میں رکھنا چاہیے اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اِس سے اُردو کی شاید ہی کوئی کتاب محفوظ رہی ہو۔ اِن سب کا شمار غلطیوں میں کیا جائے گا اور اِن میں سے کسی صورت کو سند کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ متن میں لازماً صحیح صورتوں کو

جگہ دی جائے گی۔
کچھ مخطوطوں میں بعض صورتوں میں طرزِ نگارش کا کوئی خاص انداز پایا جاتا ہے۔ وہ انداز ایسا ہوتا ہے جس کو ہم مسلّمہ اندازِ تحریر کے خلاف پاتے ہیں، مگر اُس کو مذکورہ بالا مثالوں کی طرح قطعاً غلط کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ جیسے ایک مخطوطے میں "حروفِ مشدّد کو دو بار لکھا ہے"[1] یا جیسے مثنوی پھول بن کے ایک مخطوطے میں "الف پر اگر مد کی ضرورت ہے تو اکثر مقامات پر دو الف لکھے گئے ہیں"[2]۔ ایسی اور صورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ اِن صورتوں میں بھی ایسی مثالوں کی تقلید نہیں کی جائے گی اور مسلّمہ طرزِ تحریر کو اختیار کیا جائے گا۔ البتّہ خصوصیاتِ املا کے تحت، مقدّمے میں صراحت کر دی جائے گی۔ اِسی طرح ایک دو مثالوں کی بنا پر قطعیت کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ فلاں عہد کا املا ہے۔ کوئی خاص کاتب بھی اُس کا ذمّے دار ہو سکتا ہے اور اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔
مزید وضاحت کی خاطر میں اِس بات کو دُہرانا چاہتا ہوں کہ املا کے سلسلے میں غلطی دو طرح کی ہوتی ہے: ایک تو وہ جو اختلافِ راے پر مبنی ہو (خواہ وہ راے بجاے خود غلط ہی کیوں نہ ہو) جیسے غالب کی راے فارسی میں وجودِ ذال کے بارے میں۔ دوسری وہ جو ناواقفیت، بے احتیاطی، کم سوادی یا لغزشِ قلم کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی ہو، جیسے: اژدہام، پرشمش، ایزا، بالکل، ثات وغیرہ۔ پہلی صورت خاص ہے اور اِس سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ اُس خاص شخص (یا اُس کے متبعین) کے

---

[1] علمی نقوش، ص ۱۰۶۔ [2] ایضاً، ص ۱۱۳۔

کلام میں اُسی کے نقطۂ نظر کی پابندی کی جائے گی، مگر دوسروں کے کلام میں مسلّمہ انداز کو اختیار کیا جائے گا۔ غالب کے یہاں مثلاً "رہ گزر" لکھا جائے گا، مگر دوسروں کے یہاں "رہ گذر" لکھا جائے گا۔ دوسری صورت میں ایسے اغلاط کی پابندی ہرگز نہیں کی جائے گی اور الفاظ کو صحت کے ساتھ لکھا جائے گا۔

(۱۴) جیسا کہ اِس سے پہلے ابواب میں تفصیل کے ساتھ لکھا جا چکا ہے، اُردو میں ایک زمانے تک املا سیّال حالت میں رہا ہے، املا کے قاعدے بھی منضبط نہیں ہو پائے تھے؛ اِس وجہ سے بہت سے لفظوں میں اختلافِ نگارش نے راہ پائی، جیسے: پانو، پانوں، پاؤں؛ ایک لفظ کے یہ تینوں املا مل جائیں گے اور کہیں "پانؤں" بھی ملے گا۔ یا جیسے: لیے، لئے، لیئے؛ ایک لفظ کی یہ تین صورتیں نظر آئیں گی۔ یا جیسے: دھواں اور دُھنّواں اور کُواں، کوآں، کنّواں اور سایل، سائِل، سائل اور تپش، طپش وغیرہ۔ جن مصنّفوں کی خود نوشت تحریریں موجود ہیں، اُن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک ہی مصنّف ایک ہی لفظ کو کہیں ایک طرح لکھتا ہے، کہیں دوسری طرح، اور یہ مختلف نگاری بہت سے لفظوں میں پائی جائے گی۔ مثلاً غالب کی تحریروں میں، ہاے مختفی پر ختم ہونے والے لفظ، محرّف صورت میں کہیں یے کے ساتھ ملیں گے (جیسے: نشّے میں) اور کہیں عام روش کے مطابق نظر آئیں گے (جیسے: کعبہ میں)۔ اِسی طرح کہیں "میں نے" ملے گا اور کہیں "مینے"۔ "ایک مکتوب میں اُنھوں نے "مولانا" لکھا ہے، مگر اُس کے سولہ دن بعد "مولنا" اور "اولنا" لکھا ہے" (مقدمۂ مکاتیبِ غالب، ص ۲۳۲)۔ "اردو کے جن الفاظ میں الف یا

واوِ مدّہ کے بعد "ی" واقع ہوتی ہے، جیسے: جاے، یا ہوے؛ میرزا صاحب کی تحریروں میں اُن کی کتابت بھی یکساں نہیں ہے، وہ کبھی اُنھیں بے ہمزہ کے اور کبھی ہمزہ کے ساتھ "جائے، ہوئے" لکھ دیتے ہیں۔ اِسی طرح یای مدّہ کے بعد "ی" ہو، جیسے: لیے، کیے، تو یای اوّل کو کبھی بہ صورتِ ہمزہ، کبھی بہ صورتِ یا اور کبھی "ی" اور ہمزہ دونوں کے ساتھ لکھا ہے" (ایضاً ص ۲۲۸)۔ یا مثلاً غالبؔ کی تحریروں میں عموماً "مجکو" اور "تجکو" باے مختفی کے بغیر ملتے ہیں، مگر "مجہ"، "مجہے"، "مجہسے"، "تجہہ"، "تجہسے" مع ہاے مخلوط ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مرقّعِ غالب، مرتبۂ پرتھوی چندر میں خطوطِ غالبؔ کے عکس۔ اِسی طرح "قایل" اور "مایل" (مرقّع، خط ۱۴)۔ "قائل" اور "مائل" (مرقّع، ص ۱۸)، "چاہیئے" اور "چاہئے"، "میں نے" اور "مینے"، "مانگئے" اور "سینئے"، اور "فرمائیے"، "آیندہ" اور "آئندہ" "بڑھاپے" (مرقّع خط ۱۵) بوڑھے رنجور آدمیکو (ایضاً خط ۲۵) "ہات" (مرقّع خط ۵) اور "ہاتہہ" (ایضاً خط ۳۴) "گئے" اور "کر دیئے" اور "کردئے" (ایضاً خط ۶۹) "روانہ" (ایضاً خط ۱۹) اور "روانا" (ایضاً خط ۱۰)۔ (مرقّعِ غالب حصّۂ دوم میں جن خطوط کے عکس چھاپے گئے ہیں، اُن پر نمبر شمار موجود نہیں، خطوں کی ترتیب کے لحاظ سے نمبر شمار کا اضافہ میں نے کیا ہے)۔

اِس میں غالبؔ کی تخصیص نہیں، یہ عام صورت ہے۔ اِس سلسلے میں اصول یہ قرار دیا جائے گا کہ متن میں ایسے عام الفاظ کا صرف ایک املا اختیار کیا جائے گا اور اُس ایک صورت کے اختیار میں ترجیح کا فیصلہ اِس بنیاد پر کیا جائے گا کہ اصولِ املا کے لحاظ سے صحیح یا مرجّح صورت کون سی ہے۔

مقدمے میں تفصیل کے ساتھ ایسے الفاظ کا ذکر کیا جائے گا۔ صحیح اور مرجّح صورتوں کی بحث اِس سے پہلے ابواب میں آچکی ہے، اِس سلسلے میں اُس بحث کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

میں ایک مثال سے مزید وضاحت کرنا چاہوں گا: دیوانِ غالب کے ایک حالیہ مطبوعہ نسخے سے کچھ مصرعے نقل کیے جاتے ہیں:

"تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن، اسدؔ!"

"دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا، غالبؔ!"

"اِس تکلّف سے کہ گویا بُت کدہ کا، در کُھلا"

"ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب"

"سینہ کا داغ ہے، وہ نالہ کہ، لب تک نہ گیا"

"کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا"

"تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا"

خط کشیدہ حصّوں سے معلوم ہوگا کہ مرتّب نے ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ کے سلسلے میں کوئی ایک طریقہ اختیار نہیں کیا ہے۔ غالب کی تحریروں میں، جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، کسی ایک روش کی پابندی نہیں پائی جاتی؛ اِس لیے صحیح طریقہ یہ تھا کہ دو مختلف صورتوں میں سے ایک صورت کو منتخب کیا جاتا۔ چوں کہ ایسے الفاظ کو محرّف صورت میں یے سے لکھنا صحیح ہے؛ اِس لیے اِسی صورت کو اختیار کیا جانا چاہیے تھا اور مقدمے میں اِس کی صراحت کی جانا چاہیے تھی۔ یہ پہلو مرتّبین کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

مرتّب کو ایسی املائی تبدیلیوں کا حق حاصل نہیں جن کی وجہ سے لفظوں کی مستقل صورتوں پر حرف آجائے یا کسی مصنّف کے پسندیدہ انداز میں تبدیلی ہو جائے ۔ (یہ پسندیدہ انداز، عام غلط نگاری سے مختلف چیز ہے) یا علاقائی امتیازات ختم ہو جائیں ۔ اِس سلسلے میں انفرادی مختارات، عہد بہ عہد کی تبدیلیاں اور علاقائی خصوصیات؛ اِن کو خاص طور سے نظر میں رکھنا ہوگا ۔ "کوں" کی جگہ "کو" لکھنا، یا "سیں" "کو" سے "میں بدل دینا یا "تڑپھنا" کو "تڑپنا" بنا دینا یا دکنی کے "رکھیا" کو "رکھا"، لکھنا (اور اِسی طرح کی دوسری مثالیں)؛ یہ تبدیلیاں ناقابلِ قبول ہوں گی ۔ ایسی تبدیلیوں کا حق مرتّب کو نہیں پہنچتا ۔

اگر یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو کہ فلاں مصنّف کسی خاص لفظ یا کسی خاص قاعدے کے متعلق ایک خاص رائے رکھتا تھا، اِس صورت میں اُس مصنّف کے متن میں لازمی طور پر اُس کے پسندیدہ املا کی پابندی کی جائے گی، اور اُس میں کسی طرح کی تصحیح کو دخل نہیں دیا جائے گا ۔ مقدّمے میں اُس کی وضاحت کی جائے گی اور ضروری تفصیلات کو بھی درج کیا جائے گا ۔ غالبؔ اگر "پزیرفتن" کو صحیح سمجھتے تھے، تو مرتّب کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ غالبؔ کی تحریر میں "پذیرفتن" کو جگہ دے، محض اِس بنا پر کہ غالبؔ کی رائے صحیح نہیں تھی ۔ داغؔ اگر "پھنسنا"، نونِ غنّہ کے بغیر صحیح سمجھتے تھے؛ تو اُن کے کلام میں اِس مصدر اور اِس کے مشتقات کا یہی املا رکھا جائے گا ۔ داغؔ کا خیال صحیح تھا یا غلط، اِس پر بحث کی جائے گی مقدّمے میں ۔ جلالؔ نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ صحیح لفظ "گھانس" (مع نونِ غنّہ) ہے ۔ یہ قول صحیح ہے یا غلط، یہ الگ بات

(حاشیہ ص ۶۵۴ پر)

ہے ؛ جلالؔ کے کلام میں "گھانس" ہی لکھا جائے گا۔ ہاں مقدمۂ کتاب میں اِس پر بحث کی جائے گی، اور یہ بھی لازم ہوگا۔ مولوی نذیر احمد[1] مرحوم اور مولانا احسنؔ مارہروی[2] مرحوم نے لکھا ہے کہ بہ صورتِ تنوین، تاے موقوفہ کے ساتھ الف شامل نہیں کیا جائے گا؛ تو اب اُن کے کلام میں "نسبتاً" یا "مروّتاً"، (وغیرہ) لکھنا یک سر غلط ہوگا۔ ڈاکٹر عبدالستّار صدّیقی مرحوم کی راے میں صحیح لفظ "زرا" ہے، تو اُن کی تحریروں میں "ذرا" کو دخل نہیں دیا جائے گا۔ وغیرہ۔ غالبؔ کی تحریروں میں "اَودھ" کا املا "اود" ملتا ہے، (جیسے: "اود اخبار"، "شاہِ اود" تو غالبؔ کے کلام میں اِس املا کی پابندی کی جائے گی۔

اِس سلسلے میں مختصراً بعض قاعدوں کو لکھا جاتا ہے، اور جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، قیاسِ صحیح کی مدد سے، ایسے دوسرے مقامات پر، فیصلے کیے جا سکتے ہیں:

(۱) اگر کسی مصنّف کے متعلّق قطعیّت کے ساتھ یہ معلوم ہو کہ بعض خاص الفاظ، یا کسی خاص قاعدے کے متعلّق اُس کی الگ ایک راے تھی؛ تو اِس صورت میں، اُس کے کلام میں اُس کے پسندیدہ طرز کی پابندی کی جائے گی۔ مثلاً غالبؔ نے ایک خط میں لکھا ہے:

(حاشیۂ صفحۂ گذشتہ) "گھانس" بہ پھانس کے وزن پر... اور جو اِس لُغت کو بعد الف کے نونِ غنّہ کے ساتھ نہیں بولتے، یا نہیں لکھتے؛ مؤلّفِ ہیچ مداں کے نزدیک اُن کی غلطی ہے"۔

(سرمایۂ زبانِ اردو) [1] (موعظۂ حسنہ، اشاعتِ مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور۔)

[2] علمی نقوش، ص ۱۴۵۔

" " ننگے پاؤں " داد کے ضمّے کو اشباع کیسا ؟ یہ تو ترجمہ " یا بم " کا ہے ۔ اور
پھر " پاؤں " کی یہ املا غلط ہے ؛ " پانو " ، " گانو " ، " چھانو " "
(خطوطِ غالب ، ص ۱۱۸)

اِس سے معلوم ہوا کہ غالبؔ کے نزدیک اِس لفظ کا املا " پانو " صحیح تھا۔
اُن کے دیوان میں ایک غزل واؤ کی ردیف میں ہے ، جس کا مطلع یہ ہے :

دھوتا ہوں جب میں پینے کو ، اُس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے ، کھینچ کے باہر لگن کے پانو

اِس سے مزید تصدیق ہوئی ۔ اب غالبؔ کے کلام میں جہاں بھی یہ لفظ
آئے گا ، اِس کا یہی املا اختیار کیا جائے گا ۔ اِسی طرح ایک لفظ ہے :
خورشید ۔ غالبؔ اِس کو واوِ معدولہ کے بغیر مرجّح سمجھتے تھے ، یعنی :
خرشید ۔ البتہ اِس کے مخفف کو التزام کے ساتھ مع واوِ معدولہ یعنی
" خور[1] " لکھتے تھے ۔ دیوانِ غالب کے ایک حالیہ مطبوعہ نسخے میں یہ دو شعر
اِس طرح نظر آتے ہیں :

---

[1] غالبؔ نے ایک خط (بہ نامِ میر مہدی مجروحؔ) میں لکھا ہے :
" وہ پارسیِ قدیم جو ہوشنگ و جمشید و کیخسرو کے عہد میں مروّج تھی ، اُس میں
" خُر " بہ خاے مضموم ، " نورِ قاہر " کو کہتے ہیں ۔ اور چوں کہ پارسیوں کی دید و دانست
میں بعد خدا کے آفتاب سے زیادہ کوئی بزرگ نہیں ہے ، اِس واسطے آفتاب
کو " خُر " لکھا اور " شید " کا لفظ بڑھا دیا ۔ " شید " بہ شینِ مکسور و یاے
معروف ، بروزنِ عید ، " روشنی " کو کہتے ہیں ..... فقیر " خُر " جہاں بے اضافۂ لفظِ
" شید " لکھتا ہے ، موافقِ قانونِ عظماے عرب ، بہ واوِ معدولہ لکھتا ہے ، یعنی
(بقیہ حاشیہ ص ۶۵۶ پر)

"چھوڑا مہِ نخشب کی طرح ، دستِ قضا نے خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا"

"دے تو لوں ، سوتے میں ، اُس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے ، وہ ظالم بدگماں ہو جائے گا"

صاف ظاہر ہے کہ اِن اشعار میں "خورشید" اور "پاؤں" غلط املا ہے ، خواہ یہ بجائے خود غلط نہ ہو ۔ لطیفہ یہ ہے کہ اِس دیوان کے مرتّب نے مذکورۂ بالا غزل کو واؤ ہی کی ردیف میں رکھا ہے ۔ اِس کے برخلاف ، اِسی زمین میں آتش کی ایک غزل[1] ہے ، اور وہ نون کی ردیف میں ہے ۔ کلیاتِ آتش کے پہلے اڈیشن کی تصحیح خود آتش نے کی تھی ، اِس لیے یہ سمجھا جائے گا کہ آتش کے نزدیک اِس لفظ کا یہی املا صحیح تھا ، اور اِس بنا پر ، کلامِ آتش

"خور" ۔ اور جہاں بہ اضافۂ لفظِ "شید" لکھتا ہے ، وہاں بہ پیرویِ بزرگانِ پارسی ، سر بہ سر لفظِ "خور" کو بے واو لکھتا ہے ، یعنی "خرشید" ۔ "خور" کا قافیہ "در" اور "بر" کے ساتھ جائز اور روا ہے ۔ خود میں نے دو چار جگہ باندھا ہوگا ۔ وہاں میں بے واو کیوں لکھوں ؟ رہا "خورشید" ، چاہو بے واو لکھو ، چاہو مع الواو لکھو ۔ میں بے واو لکھتا ہوں ، مگر مع الواو کو غلط نہیں جانتا ۔ اور "خُر" کو کبھی بے واو نہ لکھوں گا ۔ قافیہ ہو یا نہ ہو "۔

(خطوطِ غالب ، مرتّبۂ منشی مہیش پرشاد (مرحوم) ، ص ۲۸۸)

[1] مطلع یہ ہے :
باہر نہ پائچے سے ہوں اُس گل بدن کے پاؤں پھیریں چھری ، نہ پنجۂ قصاب بن کے ، پاؤں

میں اِسی املا کو اختیار کیا جائے گا۔(لکھنؤ کے اکثر شاعروں کے یہاں اِس لفظ کا یہی املا (پاؤں) ملتا ہے)۔ فارسی میں ذال کے ہونے نہ ہونے کی بحث کا اس سے پہلے ذکر آچکا ہے۔ صحیح صورت کیا ہے، یہ الگ بات ہے؛ چوں کہ غالب اصول کے طور پر مانتے تھے کہ فارسی میں ذال کا وجود نہیں، اِس لیے اُن کے کلام میں، اُن کی رائے کے مطابق، ایسے الفاظ کو ز سے لکھا جائے گا۔

(۲) کسی مصنف کی خود نوشت تحریر موجود ہو اور اُس میں کسی لفظ یا الفاظ کو ہر جگہ ایک خاص طرح لکھا گیا ہو، (بہ شرطے کہ اُس طرح کی غلطی نہ ہو، جس کا ذکر کیا جا چکا ہے) تو ایسے الفاظ کے اُس املا کو، اُس مصنف کا املا مانا جائے گا، اور اُس کے کلام میں اُس کو محفوظ رکھا جائے گا۔ جیسے میرامن کے خود نوشت نسخۂ گنجِ خوبی میں (مخزونہ، رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن۔ اِس کا عکس پیشِ نظر ہے) ہر جگہ "دونو" اور "ما" نونِ غنّہ کے بغیر ملتے ہیں۔ اُس زمانے کی اور تحریروں میں بھی اِن دونوں لفظوں کا یہ املا ملتا ہے۔ اب اِن دونوں لفظوں کو متفقہ طور پر مع نونِ غنّہ (دونوں، ماں) لکھا جاتا ہے، مگر میرامن کی کتابوں میں (باغ و بہار۔ گنجِ خوبی) اِن لفظوں کا وہی املا برقرار رکھا جائے گا اور مقدمے میں اِس کی صراحت کی جائے گی۔ اُس عہد کے اور مصنفین کے متعلق یہ تفتیش کرنا ہوگی کہ

لہ مثلاً صبا کی ایک غزل نون کی ردیف میں ہے، جس کا مطلع ہے:

دیکھ کر خوش رنگ اُس گل پیرہن کے ہاتھ پاؤں ۔ پھول جاتے ہیں جوانانِ چمن کے ہاتھ پاؤں

(غنچۂ آرزو، ص ۱۹۵)

اُن کا طرزِ عمل کیا تھا۔ اور اگر یہ نہ معلوم ہو سکے، تو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اُس زمانے میں عمومی طرزِ عمل کیا تھا۔ اُس زمانے کی اور تحریروں کو دیکھا جائے گا، اور لغات سے بھی مدد لی جائے گی۔

گنجِ خوبی کے اِسی مخطوطے میں "پودھا"، "تھانبنا"، "لوں" (لو) اور "جاگہ" بھی ملتے ہیں۔ آج اِن لفظوں کی صورتیں بدل چکی ہیں، مگر ایک زمانے میں یہ اِس طرح مستعمل تھے۔ بل کہ بعد تک کی تحریروں میں اِن کی یہ صورت مل جاتی ہے۔ یہ لفظ، اُس املا کے ساتھ اپنے زمانے کی نمایندگی بھی کرتے ہیں، اور میر امن کے طرزِ نگارش کے بھی آئینہ دار ہیں۔ اُس زمانے کی تحریروں کو مرتب کرتے وقت اِن الفاظ کا، اور ایسے اور الفاظ کا املا اُسی عہد کے استعمالات کی روشنی میں متعین کیا جائے گا۔

صحیح لفظ "تپش" ہے، اِسی طرح "تپاں" بھی ت سے صحیح ہے، مگر اِن لفظوں کو ط سے بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ اِس طرح کے عام الفاظ (جیسے: "طوطا، طشت، طپیدن، طوطیا" وغیرہ) کو تو اب صحت کے ساتھ لکھا جائے گا (یعنی: توتا، تشت، تپیدن، توتیا وغیرہ)، مگر خاص مقامات پر اِس اصول سے انحراف کو روا رکھا جائے گا، بل کہ ضروری سمجھا جائے گا۔ جیسے نسّاخ نے اپنے تذکرے سخنِ شعرا میں، طپاں کے ترجمے میں لکھا ہے:

> "طپاں تخلص، مرزا احمد بیگ خاں ..... مرزا احمد بیگ خاں اپنا تخلص حرفِ طاءِ مہملہ سے لکھتے تھے"۔ (ص ۳۰۲)

اِسی طرح طپش کے ترجمے میں لکھا ہے:

> "طپش تخلص، مرزا محمد اسمٰعیل، عرف مرزا جان ..... مرزا جان طپش کے

ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلوں میں تخلص اُن کا طاءِ مہملہ[1] سے لکھا تھا، اِس لیے میں نے بھی تاے فوقانی سے نہیں لکھا"۔ (۳۰۳)

نسّاخ نے صحیح طریقہ اختیار کیا ہے، اور اِس صراحت کی بنا پر، یہ دونوں تخلص لازماً ط سے لکھے جائیں گے۔ یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا ایسے اور مقامات پر بھی جہاں کوئی خاص لفظ یا کوئی نام معرضِ بحث میں آتا ہو۔

(۳) نونِ غنّہ اور ہاے مخلوط کا مسئلہ بہت اُلجھا ہوا ہے۔ بہت سے لفظ ہیں جن میں کہیں اِن کا وجود ملتا ہے اور کہیں نہیں، ایک ہی مصنّف کے یہاں دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً میر امّن کے اِسی نسخہ گنجِ خوبی میں ٹھٹھا اور ٹھٹّا، جھوٹھ اور جھوٹ، ہاتھ اور ہات، پھینکا اور پھیکا، جونہیں اور جوہیں، میںنے اور میں نے، ملتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اُس زمانے کی، بلکہ اُس کے بعد تک کی تحریروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ کہیں

---

[1] رسالہ نقوش (لاہور) کے ایک خاص نمبر (بابت ستمبر ۱۹۶۷ء) میں "بیاضِ مرزا جان طپش" کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں مرزا جان طپش کی ایک بیاض کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اُس میں مضمون نگار نے لکھا ہے:

"مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ نے اپنے تذکرے سخنِ شعرا میں لکھا ہے کہ مرزا جان نے اپنی غزلیات میں خود اپنے قلم سے اپنا تخلص "طپش" لکھا ہے۔ بیاض میں بھی ہر جگہ (جہاں جہاں تخلص آیا ہے) "طپش" ہی ملتا ہے، "تپش" کہیں نہیں ملتا، جیسا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے"۔

"ڈھونڈھنا" ملے گا اور کہیں "ڈھونڈنا"، کہیں "جھنجھلانا" اور کہیں "جھنجلانا" سوچنا اور سونچنا، گھاس اور گھانس، ڈاکا اور ڈانکا وغیرہ)۔ اِس کے برعکس بعض لفظ ایسے بھی ہیں جن میں ہائے مخلوط کو زیادہ تر شامل رکھا گیا ہے، جیسے: تڑپھنا، کہ پُرانی تحریروں میں اکثر یہی صورت ملتی ہے۔ کبھی علاقائی اثرات بھی اِس کے پیچھے ہوتے ہیں جیسے "بارہ" کو "بارنہ" بولنا اور لکھنا۔

اِس سلسلے میں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ جن مصنّفین کی خود نوشت تحریریں موجود ہوں، اُن کا جائزہ لے کر اِس کا تعین کرنا چاہیے کہ کن صورتوں کو زیادہ استعمال کیا گیا ہے، یا آخرِ عُمر کی تحریروں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اِس جائزے کے مطابق متن میں انھی صورتوں کو مرجّح سمجھا جائے گا، جن کو مصنّف نے زیادہ استعمال کیا ہو۔ مقدّمے میں تفصیلات کو درج کیا جائے گا اور ایسے الفاظ کی فہرست پیش کی جائے گی۔

جن مصنّفوں کی خود نوشت تحریریں موجود نہیں، اُن کے لیے وہی عام طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ اُس عہد کے استعمالات کا جائزہ لیا جائے، اور مختلف تحریروں سے بھی مدد لی جائے، ارتقائے زبان کے مباحث کو سامنے رکھا جائے۔ قواعد اور لغت کی بعض کتابیں بھی اِس میں معاون ہو سکتی ہیں۔

مثلاً غالب کے متعلق معلوم ہے کہ وہ "تڑپھنا" کو صحیح سمجھتے تھے:

> "تڑپھنا، ترجمہ تپیدن کا املا یوں ہے، نہ "تڑپنا"۔ بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے"۔

(خطوطِ غالب، ص ۱۲۱)

اِس لیے کلامِ غالب میں ہر جگہ "تڑپھنا" لکھا جائے گا۔ سوداؔ کی خود نوشت تحریر دست یاب نہیں ہوتی، مگر کلیاتِ سوداؔ کے نسخۂ جانسن میں، جس کی کتابت لازماً سوداؔ کے آخری زمانے میں ہوئی ہے، اور اُس زمانے کی کچھ اور تحریروں میں بھی، اِس لفظ کا یہی املا ملتا ہے۔ مثلاً نسخۂ جانسن (اس کا عکس پیشِ نظر ہے) کا یہ شعر:

"ناوک ترے نے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپھے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں"

اِن قیاسات کی مدد سے، کلامِ سوداؔ میں اِس لفظ کے اِسی املا کو مرجح قرار دیا جائے گا۔

بعض الفاظ کو اِس طرح بھی استعمال کیا گیا ہے کہ کوئی لفظی یا معنوی صنعت اُن سے وابستہ ہے اور اُس صنعت یا مناسبت کا انحصار، اُس لفظ کے املا پر ہے۔ دو مثالوں سے اِس کی وضاحت ہو سکے گی۔

کمخواب اور کمخاب، اِس لفظ کے یہ دونوں املا ملتے ہیں۔ لغات سے بھی قطعی فیصلہ کرنے میں مدد نہیں ملتی۔ انشا نے اِس لفظ کو کئی جگہ استعمال کیا ہے، ایک شعر یہ بھی ہے:

قصہ خواں! نیند جو تھوڑی سی بھی آ جائے، تو دوں
جوڑی سونے کے کڑوں کی، تجھے کمخواب پہ رکھ
(کلامِ انشا، ص ۱۹۰)

اِس شعر میں "نیند" اور "سونے" کی مناسبت سے "کم خواب" ہونا چاہیے۔ اگر اِس کو "کمخاب" لکھا جائے، تو ایہام کا لطف باقی نہیں رہتا؛ اِس بنا پر اِس شعر میں اِس لفظ کا املا لازماً "کمخواب" ہوگا۔ (حاشیہ ص ۶۶۲ پر)

اور اِس سے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ انشاؔ اِس لفظ کی اِسی صورت کو صحیح سمجھتے تھے۔ اِس بنیاد پر، جب تک اِس کے خلاف کوئی پہلو پیدا نہ ہو، کلامِ انشاؔ میں ہر جگہ اِس لفظ کے اِسی املا کو مرجّح قرار دیا جائے گا، اور اِس سے اِس لفظ کے عام املا کے متعلّق بھی ایک راے قائم کی جاسکتی ہے۔

"رضائی" اور "رزائی" کی بحث اِس سے پہلے کسی باب میں آچکی ہے۔ اِس لفظ کے ذیل میں، لُغات میں یہ شعر بھی ملتے ہیں:

روا تھی، رداے شکیب و توکّل رضاے خدا تھی، رضائی علی کی

رشک (نوراللغات)

زتشریفِ حکمت نگر دیم عریاں چو بیدلؔ بود پوششِ ما رضائی

بیدلؔ (بہارِ عجم)

اِن اشعار میں یہ لفظ جس انداز سے آیا ہے، اُس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اِس لفظ کا املا "رضائی" ہونا چاہیے، کیوں کہ اِس کے بغیر، مناسبتِ لفظی کا حُسن برقرار نہیں رہے گا؛ اِس استعمال سے اِس لفظ کے املا کے متعلّق راے قائم کی جاسکتی ہے۔ اِس سے ذرا مختلف صورت کی بھی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ دریاے لطافت میں "ضلع کی مثال، جس میں دریا کے مناسبات جمع کیے گئے ہیں" کے ذیل میں ایک طویل عبارت

لہ کلامِ انشا (شائع کردۂ ہندستانی اکیڈمی، الہ آباد) میں اِس شعر میں "کمخاب" چھپا ہوا ہے۔ جیسا کہ لکھا گیا ہے، اِس صورت میں مناسبتِ لفظی کا حُسن جاتا رہتا ہے، اور اِس شعر کی بنیاد محض اُس مناسبت پر ہے۔

لکھی گئی ہے، اُس کا شروع کا حصہ یہ ہے:

"آپ کا 'بحرا' کچھ آج کھل گیا ہے۔ واللہ، تمھاری بات 'پانی' بہت مشکل ہے۔ ہمیں کل 'سوتا' چھوڑ گئے۔ ہرچند ضعف 'تالی' کی تو بھی رتھ میں جگہ 'ندی'۔ ایک 'بادلی' رنڈی کے کہنے سے، ہماری 'چاہ' دل سے اٹھا دی"۔ (ترجمۂ دریاے لطافت، ص ۳۷۹)

اِس عبارت میں اگر "ندی" کو قاعدے کے مطابق "نہ دی" لکھا جائے تو اگرچہ حالیہ روشِ املا کی پابندی کا فائدہ حاصل ہو جائے گا، مگر ایہام کا لطف جاتا رہے گا، جو یہاں پر اصل مقصود ہے۔ اِس لیے، اِس عبارت میں اُس قدیم اندازِ نگارش ہی کو برقرار رکھا جائے گا، کیوں کہ اِس لفظ (ندی) کے املا پر، صنعت کا مدار ہے ـــــ اِس سے ایک اصول ہاتھ آیا کہ ایسے سارے مقامات پر قدیم املا کو لازماً برقرار رکھا جائے گا۔ بہ ہرصورت، زیرِ ترتیب متن کے ایسے الفاظ کی فہرست بنا کر، مختلف طریقوں کی مدد سے، املا کا تعین کرنا چاہیے۔ اِس اہتمام کے بغیر، صحتِ املا کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اور دوسرے لفظوں میں، ترتیبِ متن کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ جن عام الفاظ کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ معلوم نہ ہو سکے، تو اُن کا املا، اردو کے مسلّمہ املا کے مطابق ہی اختیار کیا جائے گا اور اِس کو قاعدے کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھا جائے گا۔

(۴) اِس سلسلے میں دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے: ایک دبستانی اختلافات، اور دوسرے علاقائی خصوصیات۔ جس طرح تذکیر و تانیث میں دہلی و لکھنؤ کے اختلافات ہیں، اُسی طرح بعض الفاظ کے املا میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں اِس سلسلے میں ایک مثال پیش کرنے پر

اکتفا کروں گا: اربابِ دہلی کی تحریروں میں (خطّی ہوں یا مطبوعہ) عام طور پر "مصالح" ملتا ہے۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی اِس لفظ کو اور اِس کے جملہ مرکّبات کو اِسی طرح لکھا گیا ہے۔ اِس کے برخلاف، امیر مینائی نے ایک خط میں لکھا ہے کہ اِس لفظ کا صحیح املا "مسالا" ہے۔ اِسی خط کی بنیاد پر، صاحبِ نور اللغات نے اِس لفظ کو اور اِس کے جملہ مرکّبات کو اِسی طرح لکھا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ اب اِس لفظ کا یہی املا (مسالا) عام طور پر مستعمل ہے، مگر صاحبِ آصفیہ کے زمانے تک اربابِ دہلی "مصالح" ہی لکھا کرتے تھے۔

اِس لفظ کے املا میں جو اختلاف ہے، وہ دہلی و لکھنؤ سے متعلق ہے اور اِس بنا پر یہ لازم سمجھا جائے گا کہ اربابِ دہلی کی پُرانی تحریروں میں "مصالح" اور اربابِ لکھنؤ کی عام تحریروں میں "مسالا" لکھا جائے۔ اِس کے خلاف نہیں کیا جائے گا۔ ہاں حالیہ تحریروں میں "مسالا" کو مرجّح سمجھا جائے گا۔

علاقائی لسانی اختلافات کی بھی بہت اہمیّت ہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ کسی تحریر کا تعلق کسی خاص علاقے سے ہے، جہاں لسانی سطح پر بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں، تو ظاہر ہے کہ اُس علاقے کی تحریروں میں اُن کی نمود ضرور ہوگی۔ مثلاً جس علاقے میں ڑ کی جگہ ڈ کا چلن زیادہ ہو، وہاں کی تحریروں

لہ مرقّعِ ادب (مولفہ صفدر مرزاپوری) میں ریاض خیرآبادی کا ایک خط ہے، جس میں اُنھوں نے اِس لفظ کا املا "مسالہ" (م، س، ا، ل، ہ) بتایا ہے۔ یہ غلط ہے۔ آخری حرف الف ہے۔ وہ جو ہ اور الف میں خلطِ مبحث کی عام وبا تھی، ریاض نے اُسی کے تحت یہاں ہ مختفی کو داخل کیا ہے۔

میں اِس کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ مثلاً "بوڈھا" اور "گڈھا"، بوڑھے اور گڑھے میں تبدیل نہ ہو جائیں۔ یہ ضروری ہوگا کہ ایسے علاقائی امتیازات کو برقرار رکھا جائے۔ اِس میں دکنی زبان خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ دکنیات کا ذخیرہ بہت ہے اور اُس کو اردو سے نسبتِ خاص ہے۔ دکنی زبان سے مکمل واقفیت کے بغیر، اُس کی ادبیات میں دخل نہیں دینا چاہیے۔ میں خود دکنی سے ناواقفِ محض ہوں، اِس لیے اِس سلسلے میں مزید کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ بہت سے الفاظ کا املا غلط ہو سکتا ہے اگر مرتب دکنی زبان سے اور اُس کے قاعدوں سے کماحقہٗ واقف نہیں۔

یہ بہ خوبی ممکن ہے کہ مصنّف ایک علاقے سے تعلق رکھتا ہو، اور ایک خاص کاتب کسی دوسرے علاقے کا ہو، ایسا علاقہ جہاں مصنّف کے علاقے کے مقابلے میں بعض لسانی امتیازات پائے جاتے ہوں؛ اِس کا امکان ہے کہ اِس صورت میں، نقل میں بعض مقامات پر یہ اثرات شامل ہو جائیں۔ ایسا غلط فہمی کی بنا پر بھی ہو سکتا ہے، اِس خیال سے بھی ہو سکتا ہے کہ ناقل اپنے خیال میں "غلطیوں" کی تصحیح کر رہا ہو، اور غیر شعوری طور پر ایسا ہو سکتا ہے۔ زبان اور قلم پر بعض علاقائی اثرات اِس طرح حادی ہو جاتے ہیں کہ غیر معلوم طور پر وہ معرضِ اظہار میں آ جایا کرتے ہیں، اور یہ بات مشاہدے میں آتی رہتی ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے، اردو کی ایک قدیم تصنیف فقہِ ہندی (یہ عہدِ عالم گیر کی تصنیف ہے) کے دو نسخوں کا تعارف کراتے

لہ شیرانی صاحب نے پنجاب میں اردو میں اِس کا تعارف کرایا ہے۔ اِس کے ایک نسخے کا تعارف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے بھی کرایا ہے (نقوشِ سلیمانی)۔ اِس کا ایک خطّی نسخہ راقم الحروف کے پاس ہے۔

ہوئے لکھا ہے :

میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فقہِ ہندی کے اِن نسخوں کی زبان پر بہاری زبان کا صاف اثر ہے ۔ اِس کی شہادت بعد میں پیش کروں گا ...... مختلف ناقلوں نے مقامی زبان کا لحاظ کرتے ہوئے فقہِ ہندی کی نقل کی اور قدرے ردّ و بدل کیا ، کیوں کہ مقصود عوام کو مسائل سمجھانا تھا ۔ مصنّف کا نام عبدؔی ہی رہا (تھوڑے تغیّر کے ساتھ ، عبدؔی ، عبدؔ یا عبدؔو) کیوں کہ مسائلِ مذہبی اُسی سے منقول تھے ۔ ذمّے داری اور ساکھ اُسی کی تھی ۔

فقہِ ہندی کے مختلف نسخوں میں جس حد تک پنجابی اثر موجود ہے ، وہ اِس بات کی دلیل ہے کہ عہدِ عالم گیر میں ہی ، یا اُس کے قریب ترین زمانے میں فقہِ ہندی کے اوّلین نسخے اودھ ، بہاؔر اور گجراؔت میں منقول ہو گئے تھے ، ورنہ بعد کے زمانے میں بہاؔر کے نسخوں میں وہ پنجابی اثر ہرگز نہ ہوتا ، کیوں کہ بہاری اردو سے پنجابی اثر ، اواخرِ عہدِ مغلیہ میں بالکل ختم ہو گیا تھا ۔

بہاری نسخوں میں بہاری زبان کے اثرات ملتے ہیں ۔ مثلاً "سب" کے بجائے "سبھہ" ، "بیچ" کے بجائے "بیچھہ" ، "ہات" کے بجائے "ہاتہہ" ، "دین" کے بجائے "دینہہ" ، "جاونا" کے بجائے "جاونہہ" ، "پانچ" یا "پنج" کے بجائے "پانچہ" ، "پیچھے" کے بجائے "پچھیں" وغیرہ وغیرہ ۔ یہ اِس امر کا ثبوت ہے کہ فقہِ ہندی کے بہاری نسخے میں مقامی زبان کا لحاظ رکھتے ہوئے ، تھوڑی تبدیلی کی گئی ہے ۔ ہ کی آواز کا اعلان ، بہاری بولی میں مبالغے کے ساتھ دیر تک ہوتا رہا ؛ پنجابی نسخے میں ہ کی آواز گر گئی ہے ؛ لیکن فقہِ ہندی کے پانچوں

نسخوں کی زبان کا عام ڈول اور ڈھانچا، کھری بولی (کذا) ہندستانی کا ہے"۔

(معاصر، پٹنہ، اگست ۱۹۵۷ء)

ایسی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایسی صورتوں میں، کاتب کے املا کو مصنّف کا املا نہیں کہا جاسکتا، اور نہ اُس کی پابندی لازم ہوگی۔ اصل کی طرف (امکان بھر) رجوع کیا جائے گا اور اختلافات کو حواشی اور مقدّمے کے حوالے کیا جائے گا۔ اکثر مخطوطوں کا حال یہ ہے کہ کاتب کا نام تک معلوم نہیں، نام معلوم ہے تو احوال معلوم نہیں۔ بہت سے مخطوطوں کا زمانۂ کتابت متعیّن نہیں۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کاتب کس علاقے کا تھا۔ اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن میں رہے کہ بہت سے مخطوطوں میں ایسی غلط نگاریاں ملتی ہیں جن سے کاتب کی کم سوادی مسلّم ہو جاتی ہے؛ ظاہر ہے کہ اِن اغلاط کو نہ مصنّف کے دامن میں ڈالا جاسکتا ہے اور نہ اُس عہد کے اندازِ کتابت سے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔ ایسے مقامات پر مسلّمہ صحیح املا کی پابندی کی جائے گی، اور جیسا کہ لکھا جاچکا ہے؛ اِس طرزِ عمل کو، اصول کی حیثیت سے اختیار کیا جائے گا۔

تصحیحِ متن میں کچھ اضافے روا رکھے جائیں گے، بل کہ ٹھیک لفظوں میں یوں کہیے کہ اِن اضافوں کو ضروری سمجھا جائے گا۔ یہ سب اضافے ایسے ہوں گے کہ اُن سے اصل متن پر کچھ اثر نہیں پڑے گا، صرف پڑھنے والوں کو آسانی کا فائدہ حاصل ہو سکے گا، پڑھنے میں بھی اور سمجھنے میں بھی۔ اِن اضافوں کا مقدّمے میں لازمی طور پر ذکر کیا جائے گا۔

(۱) عبارت کو، روشِ حال کے مطابق، مناسب طور پر پیراگرافوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ (۲) توقیف نگاری کا اہتمام کیا جائے گا ـــ خاص طور پر کاما کو ضروری مقامات پر نہایت پابندی کے ساتھ لگایا جائے گا۔ (۳) اضافت کے زیر بھی لازمی طور پر لگائے جائیں گے۔ اسی طرح مشدّد حروف پر تشدید بھی لگائی جائے گی، اور ہائے ملفوظِ متّصل کے نیچے شوشہ بھی لگایا جائے گا۔ نیز مد نہ ہونے کی صورت میں، الفِ ممدودہ پر مد کا اضافہ کیا جائے گا۔ (۴) غیر معروف، کم مستعمل یا شک میں ڈالنے والے الفاظ پر ضروری اعراب بھی لگائے جا سکتے ہیں، خاص طور پر قدیم متروک الفاظ پر۔ (۵) پُرانی علامتوں کی جگہ، نئی علامتیں استعمال کی جائیں گی۔ (علامتوں کی تفصیل اِس سے پہلے آ چکی ہے)۔ اِسی طرح ناموں پر خط کھینچا جائے گا اور تخلّص پر، اُس کا مقرّرہ نشان (ــــ) بنایا جائے گا۔ (۶) مشکوک مقامات پر علامتِ استفہام یا "کذا" کا استعمال کیا جائے گا۔

پُرانی عبارتوں کو صحیح پڑھنا، خاصا مشکل کام ہے۔ کچھ لوگ تو اِس سے بہ خوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، مگر عام لوگوں سے اِس کی توقّع نہیں کرنا چاہیے، اور کتابیں سب لوگوں کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ اِس بنا پر، جس طرح یہ ضروری ہوگا کہ یائے معروف و مجہول کا تعیّن کیا جائے اور کاف و گاف میں امتیاز کو نمایاں کیا جائے، اُسی طرح یہ بھی ضروری ہوگا کہ کاما، فل اسٹاپ، اضافت کے زیر وغیرہ کا اضافہ کیا جائے۔ اِس میں شک نہیں کہ اِس التزام سے بہت بڑی ذمّے داری مدوّن کے سر آتی ہے، مگر اچھے مدوّن کو اِس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ اضافت کے زیر اور کاما، اگر صحیح طور پر لگائے جائیں تو بہت سی بہ ظاہر پیچیدہ

عبارتیں، آسان ہو جاتی ہیں۔ خاص طور پر قدیم شعرا کا کلام، جس میں تعقیدِ لفظی و معنوی اور مختلف مناسبتوں کی وجہ سے، عبارت میں خاصا الجھاو نظر آتا ہے۔ شاعر اگر غالبؔ کی طرح مشکل پسند یا مومنؔ کی طرح ابہام پسند ہو، تب تو اِس مشکل میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ سوداؔ کے قصیدے ہوں، یا نو طرزِ مرصّع کی نثر، سب کا یہی حال ہے۔ محترمی مولانا امتیاز علی خاں عرشی (زاد مجدہ) نے، مقدمۂ دیوانِ غالبؔ میں لکھا ہے:

"یوں تو اِس نسخے میں وقف کی کئی علامتیں استعمال کی ہیں، مگر ان میں کامے کو حدِ افراط تک برتا گیا ہے۔ چوں کہ غالبؔ جیسے تعقید پسند اُستاد کے کلام کا مطلب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایسا کرنا ناگزیر تھا، اِس لیے اُمید ہے کہ دیدہ ور نقاد اِس سے درگذر فرمائیں گے"۔

(دیباچۂ دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی، ص ۱۱۹)

بہت سے لوگ اِس الجھن میں ڈالنے والی ذمّے داری سے بچنا چاہتے ہیں، اور کاما اور اضافت کے زیر لگانے کا اہتمام نہیں کرتے، اور نقل مطابقِ اصل کے نام پر، متن کو نقل کرا دیا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اصولِ تدوین

لہ اور یہ نقل بھی اکثر صورتوں میں، معمولی طالب علموں سے تیّار کرائی جاتی ہے، کیوں کہ آسانی کے ساتھ اُنھی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اور پھر مقابلے کا کام بھی ایسے ہی طلبہ کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ اِسی کو کہتے کہ کریلا اور نیم چڑھا۔ اِس سلسلے میں مخدومی قاضی عبدالودود صاحب کی مثال ہمارے مرتّبین کے سامنے رہنا چاہیے۔ قاطعِ برہان و رسائلِ متعلّقہ (اِس کا ذکر پہلے آچکا ہے) کا مکمل مسوّدہ قاضی صاحب نے اپنے قلم سے لکھا تھا (باقی حاشیہ ص ... پر)

کے لحاظ سے ناقابلِ قبول ہے، یہ آسان پسندی ہے، جس کو تحقیق سے کوئی نسبت نہیں۔ بات یہ ہے کہ اِس اہتمام کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اچھا خاصا وقت صرف کیا جائے متن پر بھی اور اس کے متعلّقات پر بھی،

اور یہ کہ تدوین کا کام کرنے والا، ضروری باتوں سے، قواعدِ زبان و بیان سے اور اُن کے متعلّقات سے بہ خوبی واقفیّت رکھتا ہو، اور قدیم فارسی سے بھی اُس کو اچھی واقفیّت ہو۔ اِن سب سے پیچھا چھڑانے اور معصوم عَنِ الخطا رہنے کے لیے، اِن نہایت ضروری امور سے قطعِ نظر کو روا رکھا جاتا ہے۔ یہ بے حد غلط طرزِ عمل ہے، اور اِس طرزِ عمل کی لازمی طور پر مذمّت کی جانا چاہیے، تاکہ اِس بے راہ روی، آسان پسندی اور غلط اندیشی کا خاتمہ ہو سکے۔ اور خیر، خاتمہ تو کیا ہوگا، مگر یہ تو ہو کہ ایسے کارناموں کو ناقابلِ اعتبار سمجھا جانے لگے

یہ تو مسلّمات میں سے ہے کہ متن کو منشاے مصنّف کے عین مطابق پیش کرنا لازم ہے، مگر اِس ضمن میں اِس کڑوی سچّائی کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکثر صورتوں میں، قطعیّت کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ متن کی جو صورت پیش کی جا رہی ہے، وہ سو فی صدی منشاے مصنّف کے مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِس کے امکانات کم اور بہت کم ہیں۔ ایسی تحریریں

اور اِس مسوّدے سے کتابت کی گئی تھی۔ جس متن کو مرتّب کیا جائے، اُس کا مسوّدہ مرتّب کو اپنے قلم سے تیار کرنا چاہیے، ورنہ زبان اور املا کے مشخّصات پوری طرح برقرار نہیں رہ پائیں گے۔ اور اِس اہتمام کو لازم سمجھنا چاہیے۔

کم تر ہیں جن کے متعلق یقین کے ساتھ کہا جا سکے کہ وہ مصنّف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ اور کسی تحریر کے متعلق یہ فیصلہ کرنا کہ وہ مصنّف کی آخری پسندیدہ صورت ہے؛ اِس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ زیادہ تحریریں ایسی ملتی ہیں جو بالواسطہ ہم تک پہنچی ہیں۔ اِن تحریروں کے سلسلے میں، اکثر صورتوں میں اِس کا بھی تعین نہیں ہو پاتا کہ کتنے واسطوں سے یہ ہم تک آئی ہیں۔ یعنی جو نسخہ ہمارے سامنے ہے، وہ کس نسخے کی نقل ہے؛ نسخۂ مصنّف کی نقل ہے یا کسی اور نقل کی نقل ہے؛ عموماً نقل در نقل کا معاملہ ہوتا ہے، اور اِس میں زیادہ تر مجہولُ الاحوال ناقلوں کے قدم اور قلم درمیان ہوتے ہیں۔ یہ کاتب الگ الگ علاقوں کے، الگ الگ مزاج کے اور مختلف استعداد کے ہوتے ہیں۔ اِن میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نقل کرتے وقت، پیشِ نظر تحریر کے املا اور انشا دونوں میں، اُن مقامات پر اصلاحیں کرنا مناسب اور بعض صورتوں میں کارِ ثواب سمجھتے ہیں، جن مقامات پر اُن کے خیال میں "غلطی" کا ارتکاب ہو گیا ہے۔

اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کبھی عبارت کے لحاظ سے اور کبھی املا کے اعتبار سے، اصل تحریر بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔ چوں کہ صحیح طور پر یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ پیشِ نظر تحریر کتنے نقل کرنے والوں کے درمیان سے گزر کر ہم تک پہنچی ہے، اِس لیے یہ طے کرنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ اِن تبدیلیوں کا عالم اور اوسط کیا ہوگا، اور یہ کہ کون سی تبدیلی کس زمانے سے تعلق رکھتی ہے، اور کس لفظ کا خاص املا کس سے تعلق رکھتا ہے، مصنّف سے، کاتبِ اوّل سے، یا بعد کے نقل کرنے والوں سے۔

یہ پریشان کُن صورت ہے اور اِس سے کم و بیش ہر مدوّن کو دوچار ہونا

پڑتا ہے، اور اِسی لیے املا کے تعیّن میں زیادہ دقّتیں پیش آیا کرتی ہیں۔
ایک صورت یہ بھی ہے کہ املا کی حد تک عادت، اپنے اثرات کو ضرور نمایاں کیا کرتی ہے۔ جس تحریر کو نقل کیا جارہا ہے، اُس میں ایک لفظ ایک خاص طرح لکھا ہوا ہے اور اُسی لفظ کو نقل کرنے والا ایک اور طرح سے لکھنے کا عادی ہے، تو اکثر صورتوں میں ایسے مواقع پر قلم کی جنبش، عادت کے تابع ہو جاتی ہے اور قلم سے وہی شکل بنتی ہے جس سے نگاہ مانوس ہوتی ہے اور قلم آشنا ہوتا ہے۔ اِس طرح املا کے بہت سے اختلافات، محض نقل کرنے والے کی عادت کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں اور اُس نقل کرنے والے کو، واقعتاً بہت سے مقامات پر اِس کا علم نہیں ہو پاتا کہ اُس کے قلم نے نقل مطابقِ اصل کا حق ادا نہیں کیا۔ اِس سے زیادہ مصیبت کی بات یہ ہے کہ اِس اختلاف کو قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا۔
مطبوعہ کتابوں کی بھی یہی صورت ہے۔ مصنّف کہیں ہے، کتابت کہیں ہوئی ہے، تصحیح کرنے والا کوئی اور ہے، اور اِن میں سے ہر ایک کا اپنا اندازِ نگارش ہے۔ طباعت کے بعد، بہت سے مقامات کو دیکھ کر مصنّف سٹرپیٹ لیتا ہے۔ مرحوم مصنّفین کی جو تحریریں چھپ کر سامنے آتی ہیں، وہ بڑی حد تک کاتب اور مصحّح کے مختارات کا مجموعہ ہوتی ہیں۔

---

[1] اِس سلسلے میں ایک مثال پیش کرنا کافی ہوگا۔ مطبعِ احمدی کے چھاپے ہوئے دیوان کے سلسلے میں: غالب نے ایک خط میں لکھا ہے:

"دیوانِ اردو چھپ چکا۔ ہائے .... دلّی پر اور اُس کے پانی پر اور اُس کے چھاپے پر لعنت۔ صاحبِ دیوان کو اِس طرح یاد کرنا جیسے کوئی کتّے کو آواز دے۔ ہر [illegible]

اِن حقائق کے پیشِ نظر، مدوّن کی مشکل بہت بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ اُس کے لیے یہ طے کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ کس لفظ کا املا، دراصل کس کے قلم سے تعلق رکھتا ہے؟ مجبوری یہ ہے کہ اِن سب مشکلوں کا کوئی متعیّن یا قطعی حل معلوم نہیں، اور اِسی لیے مدوّن کی مشکلات میں اضافے ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اچھے مرتّب کو اِن سب مشکلوں سے دوچار ہونے کے لیے تیّار رہنا چاہیے اور کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ اِس دھندلکے میں اُس کی نگاہیں صحیح راستے کو دیکھ لیں۔ ذہن رسا ہو، طبیعت میں استقامت ہو، معلومات کا ذخیرہ پاس ہو اور آسان پسندی سے طبیعت بیزار ہو؛ تو اِس کا امکان ہوسکتا ہے کہ بعض صورتوں میں بالکل صحیح راستے پر چل کر منزل پر پہنچا جا سکے۔ یا کم سے کم "قریب بہ صحّت" کا شرف تو حاصل ہوسکتا ہے، اور یہ بھی کچھ کم نہیں۔

وہ اور تھا۔ اب جو دیوان چھپ چکے، حق التّصنیف ایک مجھ کو ملا۔ غور کرتا ہوں تو وہ الفاظِ غلط جوں کے توں ہیں۔ یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔ ناچار غلط نامہ لکھا؛ وہ چھپا۔ بہ ہرحال خوش و ناخوش کئی جلدیں مول لوں گا"۔

(بہ نامِ میر مہدی مجروحؔ۔ خطوطِ غالب، مرتبۂ منشی مہیش پرشاد مرحوم، ص ۲۷۳)

لُغت اور املا

لفظوں کے اجزاے ترکیبی، اُن اجزا کی ترتیب، معانی و مفاہیم، محلِ استعمال؛ یہ ساری معلومات لُغت سے حاصل ہونا چاہیے۔ ایک جامع لغت میں لفظ کی سرگذشت بھی محفوظ ہونا چاہیے؛ یعنی یہ کہ مختلف ادوار میں، صورت اور معنی میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ لُغت، استناد کا اہم ترین ذریعہ ہوتا ہے۔ اختلافِ رائے کی صورت میں بھی آخر کار لُغت ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے؛ اِس بنا پر اُس میں ایسی تفصیلات کا محفوظ ہونا ازبس ضروری ہے۔

اِن مذکورہ باتوں میں اوّلین حیثیت، لفظ کے اجزاے ترکیبی کی ہے؛ اور اُن اجزا کی ترتیب، اِس حیثیت کا جُز ہے۔ اِس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ صحیح طور پر اجزاے ترکیبی کے تعیّن و ترتیب کے بغیر، الفاظ کی صحیح صورت اور الفاظ کی ترتیب معرضِ تحریر میں نہیں آسکتی۔ لغت میں الفاظ کو حروفِ تہجّی کی ترتیب سے درج کیا جاتا ہے؛ اگر لفظوں کے اجزا کا صحیح طور پر اور قطعی طور پر تعیّن نہیں کیا جائے گا، تو الفاظ کو صحیح مقام پر جگہ بھی

نہیں دی جا سکتی ۔ مثلاً ، ایک لفظ ہے : منہگا ؛ اِس لفظ کو کہاں پر درج کیا جائے گا ، میم مع نون کی فصل میں ، یا میم مع ہ کی فصل میں (منہگا مہنگا) ؛ یا مثلاً " آیندہ " لکھا جائے گا ، یا " آئندہ " ؛ " لیے " لکھا جائے گا ، یا " لئے " ؛ اور اسی تعین پر اِس کا انحصار ہوگا کہ اِن لفظوں کو " الف مع ی " کی فصل میں لکھا جائے گا یا " الف مع ہمزہ " کے ذیل میں لایا جائے گا۔

اُردو میں اِس سلسلے میں یہ عجیب صورت پائی جاتی ہے کہ لُغات میں عام طور پر لفظوں کے معانی و مفاہیم اور محلِّ استعمال کا مفصّل بیان ہوتا ہے ، اسناد بھی اچھّی خاصی تعداد میں ملتی ہیں مگر املا کے متعلّق اِس قدر اہتمام نظر نہیں آتا ؛ یعنی قدیم و جدید ، متروک و مستعمل ، مرجّح و غیر مرجّح اور صحیح و غلط املائی صورتوں کی تفصیل نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے ۔ چوں کہ اِس کا اہتمام نہیں کیا گیا کہ عہد بہ عہد کے اختلافات کو صحیح طور پر محفوظ کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ کون سا لفظ بہ لحاظِ صورت کن کن مرحلوں سے گزرا ہے ؛ اِس وجہ سے بھی بہت سے لفظوں کے املا کا صحیح طور پر تعین نہیں ہو پایا ، اور اکثر لفظوں کے متعلّق صراحت کے ساتھ یہ بات نہیں معلوم ہو پاتی کہ اُن کا کون سا املا قدیم ، متروک یا مستعمل ہے ۔ اور یہ بھی کہ ایک لفظ کی اگر ایک سے زیادہ صورتیں ہیں ، تو اُن میں سے اب مرجّح صورت کون سی ہے ۔ اور یہ کہ جو اختلافات پائے جاتے ہیں ، اُن کی نوعیت کیا ہے ؛ وہ علاقائی یا دبستانی اختلافات کی حیثیت رکھتے ہیں ، یا ارتقاے زبان کے مختلف مرحلوں کی نشان دہی کرتے ہیں ، یا محض بعض افراد کے مختارات کی آئینہ داری کرتے ہیں ، یا صرف ناقلوں کی کم سوادی یا لغزشِ قلم نے اُن کو جنم دیا ہے ۔ اِس تفصیل کے بغیر ، ظاہر ہے کہ دو یا زیادہ صورتوں میں سے مرجّح صورت کا صحیح طور پر تعین کیا

ہی نہیں جا سکتا۔ اور مرجّح (یا مستعمل) صورت کی تعیین کے بغیر، املا کی یک سانی اور معیار بندی مجروح ہوتی رہے گی، اور یہ ہوتا رہے گا کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک طرح لکھے، دوسرا شخص دوسری طرح اور تیسرا شخص ایک اور صورت کو منتخب کرے، اور سب کا خیال یہ ہو کہ صحیح صورت وہی ہے جو ہمارے قلم نے بنائی ہے۔ مزید یہ کہ بحث کی صورت میں ہر ایک کو کسی نہ کسی لُغت یا مطبوعہ یا خطّی کتاب سے سند بھی مل جائے۔ بہت سے لفظوں میں جس قسم کی املائی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، اور جن کی وجہ سے غلط صحیح کئی طرح کی صورتیں معرضِ وجود میں آئی ہیں؛ اُس کی سب سے بڑی بل کہ بنیادی وجہ، لُغات میں املا کا عدمِ تعیّن ہے۔

اِن خامیوں کی دو بڑی وجہیں ہیں: پہلی بات تو یہ ہے کہ املا کو مستقل موضوع کی حیثیت سے نہیں دیکھا گیا، اِس لیے اُس کے مفصّل ضابطے بھی منضبط نہیں ہو پائے اور اِس کا اثر پڑنا لازم تھا۔ پرانے زمانے میں املا کو اِس نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا، اور وہ چھوٹی چھوٹی باتیں، جن کو آج ہم اہمیّت دیتے ہیں، اُس زمانے میں اہمیّت رکھتی ہی نہیں تھیں۔ نقطے ہوں یا نہ ہوں، گاف پر ایک مرکز ہو یا دو، (ہ دو چشمی ہو یا کہنی دار وغیرہ) اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا تھا۔ اٹکل سے سب کچھ پڑھ لیا جاتا تھا، اور دوسروں سے بھی اِسی کی توقع کی جاتی تھی۔ پھر مختلف خطوں کی وجہ سے بھی نگاہیں رنگا رنگی کی خوگر ہو جاتی تھیں۔ آخر میں خطِ شکستہ کی زود نگاری نے اور اُس کی پیچ و خم کھائی ہوئی کششوں نے رہی سہی کسر کو بھی پورا کر دیا۔ اِن سب کا اثر یہ ہوا کہ کاغذ پر الفاظ خواہ کسی طرح لکھے گئے ہوں، نگاہیں اُن کو پڑھ لیا کرتی تھیں اور زبان اُن کو دُہرا دیا کرتی تھی۔

ایک زمانے کے بعد، جب اِس طرف توجہ کی گئی تو ...

باتیں نگاہوں کے سامنے رہیں، جیسے: یائے معروف و مجہول کا فرق، ہ اور ھ کا فرق، کِ، گ کا فرق (وغیرہ)؛ اِنھی امور کو ملحوظ رکھنا کافی سمجھا گیا۔ یہ عام انداز تھا، اور لُغت نویس بھی اِس حصار کو پوری طرح نہیں توڑ پائے۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ لغت نگار کی ساری توجّہ اِس طرف مرکوز رہتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ محاورے جمع کیے جائیں، اُن کی سندیں تلاش کی جائیں، اور یہ بتایا جائے کہ اہلِ زبان کس محاورے (یا لفظ) کو کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ لُغت ایک طرح سے اہلِ زبان کے مختارات کی دستاویز ہوا کرتا تھا۔ لفظ کی صورت ثانوی حیثیت رکھتی تھی، اوّلین حیثیت، معانی اور محلِّ استعمال کی تھی۔ یہ اُلٹی بات تھی، مگر اِس کو کیا کیا جائے کہ معیار یہی تھا۔ اِس بات کی اہمیّت کم تھی کہ مثلاً "پانو" کا املا کیا ہے: پانو، پاؤں، پانوں، پانوٗں؟ اصل اہمیت اِس کی تھی کہ اِس لفظ سے کتنے مرکّبات اور محاورات بنتے ہیں اور اُن کی اسناد کہاں ہیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ پُرانی کتابیں اصولِ تدوین کے تحت مرتب نہیں ہو پائیں۔ مختلف مطبعوں[1] نے جس طرح چاہا، چھاپ دیا اور وہی مطبوعہ نسخے، استناد

---

[1] اِس کا اعتراف ضروری ہے کہ اِن مطبعوں نے بجائے خود اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اکثر کتابیں اُنھی کی بدولت ہماری دسترس میں ہیں۔ اِس کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ اُس زمانے کے معیار اور تقاضوں کے مطابق، چند معروف مطبعوں نے صحتِ متن کا بھی اہتمام کیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اِن مطبعوں کے پاس جس پایے کے مصحّح تھے، آج بہت سے مرتّب بھی اُس درجے سے فروتر ہیں۔ مصحّح ہی نہیں، اُس زمانے کے کاتبوں میں امیر اللہ تسلیم جیسے لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ بعض مطبعوں کے مالکوں نے کوشش

کے کام آئے ، اُنھی سے بہت سے الفاظ کی صورتوں کو نقل کیا گیا ، اِس کا اندازہ کیے بغیر کہ کسی خاص لفظ کا ایک خاص املا ، مصنّف ، ناقل ، کاتب یا مصحّح ؛ کس کے قلم کا زائیدہ ہے ۔ مطبوعات کی یہی صورت آج بھی ہے ۔ آج جب کہ تحقیق کا دور دورہ ہے ، اب بھی یہ صورت ہے کہ صرف دو چار کتابوں کو چھوڑ کر باقی سارے متنوں کا حال خراب ہے ۔ جس بے دردی ، بے پروائی اور بے حسی کے ساتھ قدیم متنوں کو آج چھاپا جا رہا ہے ، اُس کی مثال پچھلے زمانے کے کچھ گھٹیا مطبعوں کی مطبوعات کے سوا ، شاید ہی کہیں مل سکے ۔ لُغت کے لیے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے مختلف کتابوں سے ، اگر متن صحیح نہیں ، تو ظاہر ہے کہ استناد بھی صحیح نہیں ہوگا ۔ اِس لیے لُغت کے نقطۂ نظر سے املا کا مسئلہ بہت پریشان کن ہے ۔ یہاں پر اِس کی بھی تکرار کی جاتی ہے کہ خود مصنّفین (قدیم ہوں کہ جدید) کسی ایک روش کے پابند نہیں تھے ۔ ایک ہی شخص ایک ہی لفظ کو ایک جگہ ایک

کرکے ، اچھے سے اچھے لوگ اپنے یہاں جمع کیے تھے ، اور جس طرح اُن لوگوں کی ناز برداریاں کی جاتی تھیں ، آج شاید اُن پر قصّے کہانی کا گمان ہوگا ۔ اُن لوگوں نے اپنے طور پر اعلا درجے کا کام کیا تھا ۔ اُن پر کچھ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ اُس زمانے کے آداب و معیار کے لحاظ سے اُن کی کوششیں قابلِ تعریف تھیں ۔

وہ دور دراصل خوش خطی کا تھا ۔ ایک تو املا کے قواعد کا منضبط نہ ہونا ، اور دوسرے خوش خطی کا فروغ ؛ اِن دو باتوں نے املا کے مسائل کو اُبھرنے نہیں دیا ۔ نیز تدوین کے جن آداب کا آج ہم مطالبہ اور مطالعہ کرتے ہیں ، وہ اُس زمانے میں اِس طرح معرضِ بحث میں نہیں آسکے تھے ۔

طرح لکھتا ہے اور دوسری جگہ مختلف انداز سے لکھتا ہے اور کہیں بالکل غلط صورت اُس کے قلم سے بنتی تھی۔ اِن سب صورتوں کو درجِ لغت کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ غلط اندیشی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

موجودہ حالات میں یہ سوچنا تو بے کارِ محض ہے کہ پہلے سارے اہم متن مدوّن ہو جائیں اور پھر اُن کی مدد سے لغت تیار ہو۔ اب تو یہ صورت ہے کہ پہلے ایک مفصّل لغت مرتّب ہو جائے تاکہ اُس سے کام کرنے والوں کو مدد ملے اور قدیم متنوں کو مرتّب کرتے وقت بہتر طور پر املائی مسائل کو سمجھ سکیں۔ زبان، قواعد اور لسانیات پر اِتنا تو کام ہو ہی چکا ہے کہ اُس کی مدد سے، ایسا ایک لُغت تیار کیا جا سکتا ہے۔ اِس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ املا کے سلسلے میں خلفشار کو ختم کرنے میں مدد ملے گی اور لفظوں کی مختلف صورتوں کے متعلق حقیقی وغیر حقیقی اختلاف، دیگر اختلافات اور ترجیحی صورتوں کے تعیّن میں آسانی ہوگی۔ فرہنگِ آصفیہ، نور اللغات یا فیلن و پلیٹس کے لغات پر چار حرفوں کا اضافہ کافی نہیں، یہ کام تو نئے سرے سے، نئے انداز سے کرنے کا ہے۔ ابھی ہمارے یہاں ایسے بزرگ موجود ہیں جو زبان اور قواعد سے باخبر ہیں۔ ایک دو لسانیات اور صوتیات کے جاننے والے بھی موجود ہیں۔ عربی فارسی جاننے والوں کا بھی قحط نہیں، علاقائی زبانیں جاننے والے بھی مل سکتے ہیں، لُغت نگاری کے آداب کا علم عام ہو چکا ہے اور دوسری زبانوں کے اچھے لُغات ہر جگہ ملتے ہیں۔ قدیم متنوں کے اچھے نسخے اگرچہ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں، مگر علم میں ہیں، اور اُن سے استفادہ مشکل سہی، ناممکن نہیں۔ اِس سروسامان کے ہوتے ہوئے، لغت کے کام کو شروع ضرور کیا جا سکتا ہے (شرط یہ ہے کہ علمی سطح پر جو بے ایمانی اور بدکرداری اِس وقت عام ہو چکی ہے، وہ اِس سے دور رہے)۔

اِس سلسلے میں یہ ضروری ہوگا کہ حقیقی اور غیر حقیقی اختلافِ املا کا تعین کیا جائے اور اُن میں حدِ فاصل قائم کی جائے۔ صرف حقیقی اختلافات کو لغت میں شامل کیا جائے اور غیر حقیقی اختلافات کو کالعدم قرار دیا جائے۔ حقیقی اختلاف وہ ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے لفظ میں واقعتاً رونما ہوا ہو۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ لفظ کی صورت کسی طرح کی تبدیلی سے دوچار ہوئی ہو، جیسے مسالا اور مصالح، تڑپنا اور تڑپھنا، رزائی اور رضائی، اعلا اور اعلیٰ؛ کہ اِن سب لفظوں میں کسی نہ کسی عنوان سے واقعتاً تبدیلی ہوئی ہے۔ یا جیسے، گذشتن اور گزشتن، کہ فارسی میں ذال کے ہونے اور نہ ہونے کے سوال پر اِس دو رنگی کی نمود ہوئی ہے (وغیرہ)

غیر حقیقی اختلاف وہ ہے کہ لفظ میں اصلاً کسی طرح کی تبدیلی نہ ہوئی ہو، محض کم علمی یا غلط فہمی یا لغزشِ قلم اُس کی ذمّے دار ہو، جیسے: کربل کتھا کے واحد خطّی نسخے کے کاتب نے "ڈھارث"، "اثّی"، "ثات" (بجائے ڈھارس، اسّی، سات) لکھا ہے؛ یہ حقیقی اختلاف نہیں، محض کم سوادی کا نتیجہ ہے۔ یا جیسے غالب نے "باالکل" اور "باالفعل" لکھا ہے؛ اِسے غلط فہمی کہیے یا کم توجہی۔ یا جیسے مخطوطۂ گنجِ خوبی میں میرامّن نے "ایذا" کو "ایزا" لکھا ہے؛ بہ ظاہر اِس کو لغزشِ قلم قرار دیا جائے گا۔ اِس طرح کے سارے اختلافات، غیر حقیقی اختلافِ املا کے ذیل میں آتے ہیں۔ یا جیسے کوئی شخص "صحنک" کو "سحنک" لکھ دے۔

اِسی ذیل میں وہ اختلافات بھی آتے ہیں جن کو عدمِ تعیّن نے پھیلایا ہے، جیسے لیے اور لئے، آزمایش اور آزمائش (وغیرہ)۔ یہ بھی غیر ضروری اختلافات ہیں۔ ایسے اختلافات کو کسی بھی سطح پر قابلِ قبول نہیں سمجھا جائے گا اور یہ کسی بھی حیثیت سے لغت میں بار نہیں پائیں گے۔ سفیل اور فصیل، دو صورتیں ہیں ایک لفظ کی، یا جیسے جمعرات اور جمیرات، ہونٹھ اور ہونٹ (وغیرہ)؛ ایسے

سب لفظوں میں اُن تبدیلیوں کا ذکر کیا جائے گا جو مختلف ادوار میں واقع ہوئی ہیں اور اگر متروک املا کا مسئلہ ہے تو لازمی طور پر مرجّح صورت کا تعیّن کیا جائے گا ۔ عطائی اور اتائی ، قفس اور قفص ، آیینہ اور آئینہ ، لمبر اور نمبر، کوپل اور کونپل (وغیرہ) اِس طرح کے سب لفظوں میں اُن تفصیلات کا ذکر کیا جائے گا ، جنھوں نے صورت کے اختلاف کو پیدا کیا ہے اور اِس کے بعد، مروّج اور مرجّح شکل کا بھی حوالہ دیا جائے گا ۔ یہ تفصیل سے بتانا ہوگا کہ اگر واقعی اختلافِ املا ہے تو اُس کی حیثیت کیا ہے ، دبستانی اختلاف ہے ، علاقائی اثرات ہیں، ارتقاے زبان کی کرشمہ کاری ہے ، مختلف زبانوں (عربی ، فارسی وغیرہ) کے اثرات ہیں (جیسے : آیینہ اور آئینہ) یا اور کوئی صورت ہے ۔ اور اِس تفصیل نگاری کو لازم سمجھا جائے گا ۔ اردو میں املا کا جو خلفشار ہے ، اُس کے پیشِ نظر، اِس سے اتّفاق کیا جائے گا کہ اُردو کے مفصّل لُغت میں ایسی تفصیلات از بس ضروری ہیں ۔

پاکستان میں اردو کا مفصّل لُغت مرتّب کیا جا رہا ہے ، اُس کے اجزا اردو نامے میں چھپتے رہے ہیں ؛ اُن اجزا کو دیکھ کر ، اِس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حقیقی اور غیر حقیقی اختلافِ املا پر نظر نہ رکھنے سے کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے ۔ میں نے اب سے چند سال پہلے اِس سلسلے میں ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا ؛ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے بعض اجزا کو (ضروری ترمیم کے ساتھ) اِس آخری باب کا جزوِ آخر بنا دیا جائے ؛ اِس سے کئی مسائل واضح طور پر سامنے آ جائیں گے ؛

بہت سے لفظ مطبوعہ اور خطّی نسخوں میں معمولی یا غیر معمولی اختلافِ املا

کے ساتھ ملتے ہیں ۔کچھ صورتوں میں یہ اختلاف محض ناقل یا کاتب کی کارگزاری کا کرشمہ ہوتا ہے ، مصنّف سے اُس کو تعلّق نہیں ہوتا اور اُن لفظوں میں حقیقتاً اختلافِ املا ہوتا بھی نہیں ۔اِس لیے ایسے مقامات پر، جب تک اِس کا یقین نہ کرلیا جائے کہ کسی لفظ کی فی الواقع دو صورتیں ہیں ؛ اُس اختلافِ املا کو قبول نہیں کرنا چاہیے ۔ نیز ، جب تک صحیح طور پر اِس کا تعیّن نہ ہوجائے کہ کسی لفظ کی کوئی خاص صورت ، واقعتاً مصنّف کی اختیار کی ہوئی ہے ؛ اُس وقت تک اُس صورت کو مصنّف سے منسوب نہیں کرنا چاہیے ۔

آج کل یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ مخطوطات میں لکھے ہوئے الفاظ کے املا سے. ت کے عہد کی زبان ، بل کہ خود مصنّف کے مختارات پر استدلال کیا جاتا ہے ، جب کہ اکثر صورتوں میں اِن میں سے کوئی بات صحیح نہیں ہوتی — نہ اُن مخطوطات کا زمانۂ کتابت متعیّن ہوتا ہے ، نہ کاتب کی شخصیت اور اہلیت کا علم ہوتا ہے ۔ اور اگر یہ سب ہو بھی ، تو اِس کا علم نہیں ہوتا کہ کیا یہ مصنّف کا اپنا املا تھا ۔ اور اِس طرح بہت سی غیر مستند باتیں معرضِ اظہار میں آجاتی ہیں ۔ اور اُن امور کا انتساب مصنّفین سے روا رکھا جاتا ہے جن کے متعلّق یہ علم نہیں ہوتا کہ مصنّفین کو اُن امور سے کسی نوع کا تعلّق بھی تھا ۔اِس طرح غلط فہمی کا سلسلہ دراز ہوتا رہتا ہے ۔ اور مثلاً سو برس بعد کے کسی کاتب یا کمپوزیٹر کی کارگزاری ، اُس سے سو برس پہلے کے مصنّف سے منسوب ہوکر ، تقدّمِ زمانی کی سند حاصل کرلیتی ہے ۔

بہت سے قدیم مخطوطوں کی یہ صورت ہے کہ مخطوطے کا کاتب خوش خط ہے ، لیکن غلط نویس بھی ہے ، اور وہ الفاظ کو عجیب عجیب طرح لکھ جاتا ہے ۔ مثلاً کربل کتھا کا واحد مخطوطہ ، اب تک کے علم کے مطابق ، جو ذخیرۂ اشپرنگر

ٹیوبن گن ۔جرمنی) میں محفوظ ہے ، اِس کی عمدہ مثال ہے ۔اِس مخطوطے کا عکس پیشِ نظر ہے ۔ کاتب کا خط پختہ اور روشن ہے ، لیکن اُس نے مندرجۂ ذیل الفاظ کو اِس طرح لکھا ہے :

کتاب خانی (کتاب خوانی) ، ثات (سات) ، خانہ دان (خاندان) ، مثیں (مسین) ، ڈھارث (ڈھارس) ، سکھینہ (سکینہ) ، توباہ (توبہ) پیٹ تا رپیٹتا) خواوند (خاوند) ، استطلاحات (اصطلاحات) ۔

یہ چند مثالیں ہیں ، اِن میں بہت کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے ۔اب یہ کہنا کہ اِن الفاظ کا یہ املا مصنّف کا پسندیدہ املا ہے ، یا یہ کہ یہ اُس عہد کی روش ہے ؛ محض مفروضہ ہوگا ۔ کاتب کی کم سوادی کو ، کسی عہد سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ، اور تصدیق کے بغیر مصنّف سے بھی اُس کو منسوب نہیں کیا جا سکتا ، اور نہ ایسی صورتوں کو حقیقی اختلافِ املا کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے ـــــ یہی صورت بہت سی مطبوعہ کتابوں کی ہے ، کہ اُن میں کچھ لفظ کاتب یا کمپوزیٹر کی استعداد یا اُس کی پسندیدہ روایت کے مطابق صورت پذیر ہوئے ہیں ، نہ اُن کو مصنّف سے واسطہ ہے ، اور نہ حقیقی اختلافِ املا سے ربط ہے ؛ اب اگر ایسے الفاظ کے املا کو مطلقاً قبول کر لیا جائے اور لغت میں اختلافِ املا کے ذیل میں بہ طورِ سند پیش کیا جائے ، اور اُس اختلاف کی بنا پر ، ایسے لفظوں کی دو یا دو سے زیادہ مستقل شکلیں تسلیم کر لی جائیں ؛ تو یہ طرزِ عمل ، کم احتیاطی سے قریں ہوگا اور صحت سے دور ۔

متن کی ترتیب کا یہ عام طریقۂ کار ہے کہ مختلف نسخوں کے قابلِ ذکر یا نسبتاً قابلِ ذکر اختلافِ املا کو بھی حواشی میں ظاہر کر دیا جاتا ہے ۔ یہ اظہار ، لازماً اِس پر مبنی نہیں ہوتا کہ وہ ساری صورتیں درست بھی ہیں ۔ یہ عمل ، محض

اختلافِ نسخ کے اظہار کا معمولی طریقۂ کار ہوتا ہے ۔ متن میں الفاظ کی صورت نویسی ، ترتیبِ متن کے مقررہ اصولوں کے تحت عمل میں آتی ہے ۔ ضبطِ اختلافات کے ذیل میں ، کاتبوں کی غلط نویسی سے لے کر ، واقعی اختلافاتِ املا تک کی بہت سی صورتیں آجاتی ہیں ؛ لیکن اِس سے یہ غلط فہمی کسی کو نہیں ہوتی (یا نہیں ہونا چاہیے) کہ وہ سب صورتیں لفظوں کی واقعی مختلف صورتیں ہوں گی ۔ لیکن لغت کی نوعیت اِس سے مختلف ہے ۔ لغت میں بھی سند کے اشعار یا جملے ، مختلف خطّی اور مطبوعہ نسخوں سے منقول ہوتے ہیں ؛ لیکن لغت میں املا کی یہ رنگا رنگی جگہ نہیں پا سکتی ۔ اُس میں صرف اُن صورتوں کو جگہ مل سکتی ہے جن کا وجود متحقّق ہو ۔ اور اگر کسی مصنّف سے اُس اختلاف کو منسوب کیا جائے تو اِس کے لیے یہ لازم ہوگا کہ قطعیّت کے ساتھ اُس لفظ کی وہ مختلف صورت ، اُس مصنّف کی اختیار کردہ ثابت ہو چکی ہو ۔ اِس کے بغیر، اُس اختلافِ املا کو مصنّف سے منسوب نہیں کیا جا سکتا ـــــ مختلف کاتبوں، ناقلوں اور کمپوزیٹروں نے کم سوادی ، لاعلمی یا کسی طرح کی غلط فہمی کی بنا پر، یا کسی غلط روِش کی پیروی کے طور پر ، اگر کسی لفظ کو مسلّمہ صورت کے خلاف لکھ دیا ہے ؛ تو وہ اختلاف ، لغت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا ۔

اردو نامہ شمارہ ۲۷ کے حصّۂ لغت میں لفظ " اچبھا " کی ایک صورت " اچھنبا " بھی درج ہے ۔ (یہ خیال رہے کہ " اچبھا " کو " اچنبھا " بھی لکھا جاتا تھا اور کچھ لوگ اب بھی لکھ دیا کرتے ہیں) ، اور اِس " اچھنبا " کو ، " اچنبھا " کی قدیم صورت بتایا گیا ہے ، اور اِس کی تین سندیں پیش کی گئی ہیں ؛ من جملہ اُن کے ، ایک سند میر امّن کی کتاب گنجِ خوبی سے بھی لائی گئی ہے : " اُس کے کنگورے کے اونچے ہونے کا اچھنبا نہیں ۔ "

اب تک کی معلومات کے مطابق گنجِ خوبی کو اردو رسمِ خط میں پہلی بار ۱۸۴۶ء میں مطبعِ احمدی کلکتہ نے ، ٹائپ میں چھاپا تھا - یہ اڈیشن میرے سامنے ہے - رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے ذخیرۂ CODRINGTON میں اِس کا وہ مخطوطہ محفوظ ہے جو میر امّن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے ؛ اِس مخطوطے کا عکس بھی پیشِ نظر ہے - اِن دونوں نسخوں میں اِس مقام پر " اچنبھا " ہے ، نہ کہ " اچھنبا " یہی نہیں ، اِس کتاب میں بعض اور مقامات پر بھی یہ لفظ ملتا ہے ، مثلاً : " اے یارو اچنبھا نہ کرو " (نسخۂ مطبوعہ ، ص ۱۴۶) - یہاں بھی اِس لفظ کا وہی املا ہے جو پہلے آچکا ہے - میرے علم میں اِس کا ایک اور مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۸۷۵ء میں بمبئی کے مطبعِ محبوبِ ہر دیار میں چھپا تھا ، لیکن یہ میری نظر سے نہیں گزرا - میں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ اردو نامے میں جو جملہ نقل کیا گیا ہے ، وہ اِسی نسخۂ بمبئی سے ماخوذ ہوگا - اب اگر ۱۸۷۵ء کے اِس نسخے میں کوئی لفظ کسی خاص طرح چھپا ہوا ہے ، تو وہ اُس مصنّف کا یا اُس کے عہد کا املا کیسے ہوسکتا ہے ؟

اِس لغت نامے کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ مثال کے ساتھ ساتھ ، مصنّف یا تصنیف کا زمانہ بھی لکھ دیا جاتا ہے - گنجِ خوبی کی اِس مثال کے ذیل میں ، اُس کا سالِ تالیف ۱۸۰۲ء لکھا ہوا ہے ؛ اِس کا واضح طور پر مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۰۲ء میں اِس لفظ کا ایک یہ املا بھی مستعمل تھا ، اور یہ کہ میر امّن نے اِس لفظ کو اِس طرح لکھا تھا ، جب کہ صورتِ حال اِس سے مختلف ہے -

دوسری مثال میر سوز کے ایک خطّی نسخۂ دیوان سے پیش کی گئی ہے - سوز کا شعر یہ ہے :

" ولیکن اچھنبا بڑا مجھ کو یہ ہے ۔۔۔ کہ ٹک سوز کا گرم بازار دیکھا "

دیوانِ میرسوز کے دو خطی نسخے میں نے دیکھے ہیں ، اور اُن دونوں میں اِس لفظ کا وہ املا نہیں ، جس کی سند میں اِس شعر کو پیش کیا گیا ہے ۔ کلامِ سوز کے پندرہ بیس مخطوطے اِدھر اُدھر سے جمع کیے جا سکتے ہیں ، اور بہت سے لفظ اُن میں الگ الگ انداز سے مل سکتے ہیں ۔ ایک ایک لفظ ، دو دو ، تین تین طرح لکھا ہوا مل جائے گا ۔ واضح تعیّنات کے بغیر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ خود سوز نے کس لفظ کا املا کیا لکھا تھا ۔ اگر دیوانِ میرسوز کے کسی مخطوطے میں " اچمبا " لکھا ہوا ہے ، کسی میں " اچنبھا " ہے ، اور تیسرے مخطوطے میں " اچمبھا " موجود ہے ؛ تو اِس صورت میں یہ کیسے طے ہوگا کہ میرسوز کا پسندیدہ املا کیا تھا ؟

تیسری مثال قطب مشتری سے پیش کی گئی ہے ۔ قطب مشتری کا متن جن دو نسخوں پر مبنی ہے ، اِس مثنوی کے مرتّب نے ، اُن میں سے کسی ایک نسخے کے متعلق یہ نہیں بتایا کہ وہ کس عہد کا نوشتہ ہے ۔ اِس صورت میں کسی لفظ کے املا کا انتساب لازمی طور پر نہ مصنّف سے کیا جا سکتا ہے ، نہ اُس کے عہد سے ۔ اِس سلسلے میں قطب مشتری کے مرتّب کی یہ عبارت بھی قابلِ توجہ ہے :

" ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہے کہ اِس کا رسمِ خط عجیب قسم کا ہے ۔ خط ، نسخ ہے ، لیکن الفاظ میں اکثر حروفِ علّت کا کام اعراب سے لیا ہے ، خصوصاً اُن حروفِ علّت کے لیے جو لفظ کے آخر میں آتے ہیں ۔ مثلاً اِس مصرعے کو : " جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس " ، یوں لکھا ہے : " جو بِ ربط بولِ توں بیتاں پچیس " ۔ (مقدمہ ص ۱۹)

اب اگر اصل کی رعایت ملحوظ ہو تو " بے ربط " کو " بِ ربط " اور " بولے " کو " بولِ " لکھا جانا چاہیے اور اِس کو کوئی نہیں مانے گا ۔ اِس بنا پر کہ ایک

مخطوطے میں "ب ربط" اور "بولِ" لکھا ہوا ہے؛ اِن الفاظ کا یہ املا، اختلافِ املا کے ذیل میں قبول کرکے، لغت میں اِس اختلاف کا اظہار کیا جا سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اِس کا جواب نفی میں ہوگا۔ یہی صورت اِس "اچھنبا" کی ہے۔ معلوم نہیں لکھنے والا کون تھا اور کس اہلیت کا تھا۔ یہ دراصل غیر حقیقی اختلافِ املا تھا جس کو غلط طور پر، حقیقی اختلافِ املا کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ یہی صورت اور بہت سے اختلافاتِ املا کی ہے۔

خوش نویسی ایک فنِ شریف تھا، جس کو سیکھنا اور اُس میں امتیاز پیدا کرنا، اُس زمانے میں من جملۂ مظاہرِ تہذیب تھا۔ لیکن پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ، جب یہ منصب مل جاتا تھا کم سواد حضرات کو، تو پھر غلط نویسی کی کوئی حد قائم نہیں رہ پاتی تھی۔ یوں بھی اُس زمانے میں صحتِ املا کا تصور وہ نہیں تھا، جو آج ہمارے ذہن میں ہے، اور اچھے اچھے لوگوں کی تحریروں میں فاش، اغلاط نظر آتی ہیں۔ مگر کم سواد خوش نویس اِس سلسلے میں صنعتِ غلط نگاری کے سارے کمالات کا حق ادا کر دیا کرتے تھے۔ پھر بات یہیں تک محدود نہیں، بہت سے مخطوطے ایسے ہیں جن کی کتابت اُن لوگوں نے کی ہے جو کم سواد بھی تھے اور اِس فنِ شریف سے بھی بے گانہ تھے؛ اُن کی کرشمہ کاریاں دیدنی ہیں۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ ایسی صورت میں کسی لفظ میں حقیقی اختلافِ املا کا تعین، خاصی بحث و نظر کا متقاضی ہے۔

اگر مصنف کسی اور علاقے کا ہے، اور کاتب کسی اور علاقے سے تعلق رکھتا ہے؛ اِس صورت میں بعض الفاظ کے املا میں کاتب کی معصومیت کے علاوہ، بعض علاقائی اثرات کی کارفرمائی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً جن علاقوں میں حروفِ علت کو ساقط کر دینے اور حرفوں کو مشدد بولنے کا رجحان ہے؛

اُن علاقوں کے کاتب صاحبان کے لکھے ہوئے بعض مخطوطوں میں اِس رجحان کی جلوہ گری بھی ہوسکتی ہے۔

اہم مطبوعہ کتابوں کے نسخے جو مصنّف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوں، اگر دست یاب ہوجائیں، تو مقابلہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے مقامات پر مطبوعہ نسخے میں جو املا پایا جاتا ہے، اُس کو مصنّف کے املا سے تعلق نہیں۔ یعنی اس کا تعلّق محض کاتب یا مصحّح سے ہے۔ اِس کی سب سے اچھی مثال یہی کتاب گنجِ خوبی ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اِس کا مخطوطہ بہ خطِّ میر امّن موجود ہے۔ یہ کتاب معرضِ وجود میں آنے کے تقریباً ۴۲، ۴۳ سال بعد، ٹائپ میں چھپی تھی۔ اِن دونوں نسخوں کو آمنے سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے لفظ مطبوعہ نسخے میں جس طرح نظر آتے ہیں، مخطوطے میں وہ اُس سے مختلف صورت میں محفوظ ہیں۔ ذیل میں اِس کتاب کے ایسے کچھ لفظ نقل کیے جاتے ہیں۔ اِس مختصر سی فہرست میں دو طرح کے لفظ شامل ہیں: (۱) ایسے لفظ جن کا املا مطبوعہ نسخے میں، مروّجہ حال املا سے مختلف نظر آتا ہے اور اِس لحاظ سے گویا اُن کو اختلافِ املا کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے؛ لیکن مخطوطے میں اُن کا وہی املا ہے جو آج کل رائج ہے۔ (۲) ایسے لفظ جو مطبوعہ نسخے میں اُس طرح چھپے ہوئے ہیں جس طرح وہ آج کل رائج ہیں، مگر مخطوطے میں اُن کی صورت مختلف ہے:

گنجِ خوبی/ نسخۂ مطبوعہ ۱۸۴۶ء		مخطوطۂ گنجِ خوبی ۱۸۰۴ء
جستوجو	ص ۱۷۱	جست جو
سامنے	ص ۱۲	سامھنے (مخطوطے میں اِس لفظ کا ہر جگہ یہی املا ہے)
دونوں	ص ۲۹	دونو

شان گمان	ص ۳۶	سان گمان
ڈھڑا	ص ۳۸	ڈبرا
بھینچے	ص ۴۹	بھیچے (بغیر نونِ غنّہ)
بینچو	ص ۶۵	بیچو (" " ")
بیٹھایا	ص ۱۲۸	بٹھایا
پروا	ص ۲۶۱	پرواہ (مخطوطے میں ہر جگہ اِس لفظ کا یہی املا ہے)
بے پروائی	ص ۴۰۷	بے پرواہی
قضاق	ص ۳۳۲	قزاک
بھوکھ	ص ۳۵۷	بھوک
وتناہی	ص ۳۵۰	اتنا ہی
تماش بینوں	ص ۲۵۸	تماشہ بینوں
خاطر جمعی	ص ۲۶۲	خاطر جمع
جھونپڑی	ص ۲۸۳	جھوپڑی

مخطوطات میں کچھ الفاظ کا وہ املا ملتا ہے جس کو اختلاف کے بجائے، غلط نگاری کہنا چاہیے۔ اِس غلط نگاری کے شکار عام کاتب ہی نہیں، اچھے خاصے مصنّف بھی ہوئے ہیں۔ اِس میں کبھی تو لغزشِ قلم کو دخل ہوتا ہے، کبھی کم توجّہی کو اور کبھی ناواقفیّت کو۔ ایسے الفاظ کی اِن صورتوں کو، لغت کی حد تک، اختلافِ املا کے ذیل میں شامل نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً میر امّن کے لکھے ہوئے اِسی مخطوطہ گنجِ خوبی کے اِن الفاظ کو دیکھیے:

ایزا، پرششش، اللہ واکبر، ذکات، سرکا، تیش، سوانحہ، رزالت۔

ظاہر ہے کہ اِن الفاظ میں اختلافِ املا نہیں، یہ غلط نگاری کا شکار ہوئے ہیں۔

ایسے اختلافات مرتّبِ متن کے کام کے تو ہو سکتے ہیں، کہ وہ اُن کو مقدّمے یا حواشی میں ظاہر کرے گا، مگر لغت کے لیے یہ کسی بھی اعتبار سے نہ قابلِ قبول ہو سکتے ہیں، نہ قابلِ ذکر؛ اِس بنا پر کہ ایسے مقامات پر اصلاً لفظ کی صورت میں حقیقی تغیّر راہ نہیں پاتا۔

اِس بات کو بہ طورِ اصول مانا جائے گا کہ جن الفاظ کا املا متعیّن رہا ہے، اور آج بھی اُسی طرح متعیّن ہے، لیکن کسی نہ کسی وجہ سے لوگ اُن کو کسی اور طرح لکھ جاتے ہیں، یا لکھ گئے ہیں؛ ایسے الفاظ خواہ کسی مخطوطے میں ہوں یا مطبوعہ نسخے میں، اُن کا شمار بھی لغت کے نقطۂ نظر سے، اختلافِ املا کے ذیل میں نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ مخطوطہ کتنا ہی اہم ہو، اور وہ چھپی ہوئی کتاب کتنی ہی پرانی ہو۔ یہ بات بھی بہ طورِ اصول مانی جائے گی کہ محض کسی کاتب یا ناقل کی سند پر، لفظوں کے حقیقی اختلافِ املا کو مصنّف سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ خاص صورتوں کے علاوہ، جن میں قطعی شہادت کی اصل اہمیّت ہے؛ عام صورتوں میں، ممکن حد تک، عہد کا تعیّن کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اُس اختلاف کو عہد سے منسوب کیا جائے گا۔

یہ بات بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ املا کی حد تک لفظوں کی صورتوں میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہ عموماً اور اکثر ارتقاے زبان کے مختلف مراحل کی نشان دہی کرتی ہیں، اور اُن کو اِسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ اِسی طرح علاقائی اثرات کا بھی اِسی لحاظ سے تعیّن کیا جانا چاہیے۔ دکنی، پنجابی، برج وغیرہ کے واقعی جاننے والوں کی مدد سے، اِن زبانوں کے قواعد اور لسانی تغیّرات کے جائزے کی مدد سے، الفاظ کی مختلف صورتوں کا تعیّن کیا جانا چاہیے۔ اِس کو پھر یاد دلایا جائے کہ اِن سب صورتوں میں

غیرحقیقی اختلافِ املا کو قابلِ لحاظ اور قابلِ بحث نہیں سمجھا جائے گا۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ اکثر غیرحقیقی اختلافِ املا کی صورت گری، کم سواد ناقلوں کی کارگزاری ہے؛ اِس لیے محض کاغذ پر مبنی ہوئی مختلف صورتوں کو سند کا درجہ نہیں دیا جائے گا۔ قواعد، ارتقاے زبان، لسانیات اور دوسرے ذرائع کی مدد سے اِس کا تعیّن کیا جائے گا کہ وہ اختلاف واقعتاً اختلاف ہے۔ اگر اِس کی صحیح طور پر تصدیق نہیں کی جاسکے گی، تو اُن صورتوں کو، محض قیاس کی سند پر، لغت میں داخل نہیں کیا جائے گا۔ لغت میں اختلافِ املا کو صرف اُسی صورت میں بار ملے گا جب قطعی طور پر یہ طے کر لیا جائے گا کہ فلاں لفظ، فلاں زمانے میں اِس طرح لکھا جاتا رہا ہے، اور یہ نگارش قابلِ قبول بھی ہے۔

• بعض رجحانات ایک زمانے میں کارفرما رہے ہیں؛ اُن کی کارفرمائی کا دائرہ شروع شروع میں ہجے تک محدود رہا، اور بعد میں نگارش میں بھی کہیں کہیں اُن کے اثرات جھلکنے لگے۔ مثلاً بعض علاقوں میں یہ رجحان بھی رہا ہے کہ بعض لفظوں میں نونِ غنّہ کی آواز شامل ہو جاتی ہے، جیسے: پونچھنا، (پوچھنا) سونچنا (سوچنا)، ڈانکا (ڈاکا)، (وغیرہ) یا بارنہ (بارہ کی جگہ)۔ اِس کے برخلاف کبھی غنّہ آواز ساقط ہو جاتی ہے، جیسے: "دونو" (دونوں)، "ما" (ماں)، "مینے" (میں نے) وغیرہ۔ یہی صورت ہاے مخلوط کے عدم و وجود کی ہے، جیسے: بارہ اور بارا، ہونٹ اور ہونٹھ، جانگ اور جانگھ۔ یا مثلاً درمیانِ لفظ میں ہ کا ے سے بدل جانا، جیسے: ٹھہرنا اور ٹھیرنا، پھرہرا اور پھریرا وغیرہ۔ اور ایسے کئی رجحان۔ اِن رجحانات کا تعیّن کچھ مشکل نہیں۔ لسانیات کی مدد سے اِن کا بہ آسانی تعیّن کیا جاسکتا ہے، اور

ایسے الفاظ کے متعلق صحیح طور پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اِن میں اختلاف کی کیا صورت ہے اور اُس بنیاد پر مختلف تحریروں سے ایسے الفاظ کی سند لائی جا سکتی ہے۔ چوں کہ لسانیاتی سطح پر پہلے تعینات ہو چکے ہوں گے، اِس لیے اُس ذیل میں اہم تحریروں سے استناد صحیح ہوگا۔ لغت میں ایسی سب صورتوں کا لازماً ذکر کیا جائے گا، مگر ساتھ ساتھ یہ بھی واضح طور پر بتایا جائے گا کہ اب مسلّم اور مروّج صورت کیا ہے، یا بعض صورتوں میں اِس کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ دو یا زیادہ صورتوں میں سے مرجّح صورت کیا ہے، اور اُس مرجّح صورت کی حیثیت، مروّج صورت کی مانی جائے گی۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھی جائے گی کہ کہاں پر صرف املا کا اختلاف ہے، یعنی محض اندازِ نگارش کا فرق ہے، اور کہاں پر لفظ کی صورت میں تبدیلی ہوئی ہے۔ مثلاً "لچنبھا"، "اچنبھا"، "اچھنبا"؛ یہ سب اندازِ نگارش کی پیدا کی ہوئی صورتیں ہیں۔ اور مثلاً ایتا اور اتنا، جتنا، جیتا، جتّا؛ یہ سب صورتیں لفظی تبدیلی کے ذیل میں آتی ہیں۔ یہ اب مستقل مختلف الفاظ کے حکم میں شامل ہیں۔ اختلافِ نگارش اور اختلافِ لفظ کے فرق کو بہ ہر طور ملحوظ رکھا جائے گا۔

بہت سی مطبوعہ کتابوں کا اگر مستند خطّی نسخوں سے مقابلہ کیا جائے تو عجیب عجیب طرح کے اختلافات سامنے آئیں گے۔ یہ اختلافات بعض اوقات لفظ کی ساخت کے لحاظ سے اور بعض اوقات املا کے لحاظ سے اہم ہوتے ہیں۔ میں اثباتِ مدعا کے لیے گنجِ خوبی کے مذکورہ خطّی نسخے اور اُس کے مذکورہ مطبوعہ نسخے (کلکتہ ۱۸۴۶ء) سے ایسی دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں:

(۱) " جو آپ ڈر سے غنیم کو لکھتے تھے " (نسخۂ مطبوعہ، ص ۱۹۴)۔ مخطوطے میں اِس کی صورت یہ ہے: " جو اپڈر سے غنیم کو لکھے تھے "۔ صحیح لفظ " ایڈر " ہے، بہ معنیِ خوف؛ اُس کی صورت مسخ ہوکر " آپ ڈر " بن گئی ہے ــــ (۲) " سورما چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا " (نسخۂ مطبوعہ، ص ۲۴۱) " اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا " (مخطوطہ)۔
(۳) " دروغ گوئی کی بدبو سے مغز اُن کا پراگندہ کرے " (نسخۂ مطبوعہ، ص ۵۱)، مخطوطہ: " دروغ کی بدبوئی سے مغز اُن کا پراگندہ کرے "۔ میر امن نے " بدبوئی " اور " خوش بوئی " کو (بجائے بدبو اور خوش بو) کئی جگہ استعمال کیا ہے ــــ غالباً مصحح نے اِسے مصنف کی غلط فہمی قرار دے کر، بہ زعمِ خویش تصحیح فرمائی ہے۔
(۴) " بندی خانے میں قید رہا " (نسخۂ مطبوعہ، ص ۴۵۵)۔ مخطوطے میں، " بندی خانہ " کی جگہ " پنڈت خانہ " ہے: " پنڈت خانے میں قید رہا "۔ اِس کتاب میں بھی اور باغ و بہار میں بھی، میر امن نے کئی جگہ لفظ " پنڈت خانہ " استعمال کیا ہے ــــ (۵) " تو قضاق اور چور کے کاٹ ہاتھ " (نسخۂ مطبوعہ ص ۳۲۳)۔ " قضاق " بہ ظاہر ایک نئی صورت معلوم ہوتی ہے، مگر مخطوطے میں اِس کی جگہ " قزاک " ہے، اور یہ واقعی اِس لفظ کی ایک مختلف صورت ہے۔ یہاں ق کی جگہ ک غالباً اُسی طرح آگیا ہے جس طرح مثلاً " چاقو " کی ایک صورت " چاکو " بھی ہے، یا جیسے " بقرعید " نے " بکرعید " (تلفظ: بکریِد) کی صورت میں بھی اپنے کو نمایاں کیا ہے۔ " قزاک " واقعی اختلافِ صورت ہے اور درج لغت ہونے کا مستحق ہے، مگر محض مطبوعہ کتاب کی سند پر " قضاق " قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ یہ غلطیِ کتابت کے ذیل میں آئے گا۔
ق اور ک کا ابدال زبان کی ایک خصوصیت ہے؛ اِس بنا پر " قزاک "، قابلِ قبول، مختلف

ذرائع سے (ارتقائے زبان، قواعد، لسانیات وغیرہ) پہلے اِس کی تصدیق کی جائے گی کہ اُس اختلاف کی نوعیت کیا ہے، اور پھر چھان بنان کے بعد، اُس کو قبول کیا جاسکے گا۔

صحیح لفظ "دونوں" ہے، اِس میں بھی شک نہیں کہ اِس کی ایک صورت "دونو" بھی مستعمل رہی ہے۔ یہی صورت لفظ "ماں" کی ہے، کہ اِس کو "ما" بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ گنجِ خوبی کے اِس مخطوطے میں بھی اِن لفظوں کا ہر جگہ یہی املا ملتا ہے، یعنی "دونو" اور "ما"۔ کربل کتھا کے مخطوطے میں بھی "دونو" ملتا ہے، اور اُس میں تو "تینوں" بھی نون کے بغیر ہے، یعنی: "تینو"۔ آج "دونو" اور "تینو" کو صحیح نہیں سمجھا جاتا، اور یہ بجائے خود درست ہے، مگر مختلف ذرائع سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ لفظ نونِ آخر کے بغیر ایک زمانے تک مستعمل رہے ہیں، گویا اِن میں ناقل کی کم سوادی کو دخل نہیں؛ اِس صورت میں، یعنی اِس تصدیق کے بعد، اِن الفاظ میں اختلافِ صورت کو لغت کی سطح پر قابلِ قبول سمجھا جائے گا اور قدیم صورتوں کی حیثیت سے، اِن کو درجِ لغت کیا جائے گا اور ضروری وضاحت بھی کی جائے گی، اور یہ وضاحت لازم ہوگی۔

کچھ ایسے لفظ ہیں جن کا املا ابھی تک طے نہیں ہوا ہے، یعنی سیّال حالت میں ہے۔ کوئی ایک طرح لکھتا ہے اور کوئی دوسری طرح۔ اِن میں سے کچھ لفظ نو آمدہ ہیں، جیسے: اڈیٹر اور ایڈیٹر، تغییر اور تغیر، جرأت اور جرات اڈیشن اور ایڈیشن، نراین اور نرائن وغیرہ؛ یہ ضروری ہے کہ ایسے الفاظ کی مکمل فہرست بنائی جائے اور ایک بار ایسے الفاظ کے متعلق قطعی طور پر فیصلہ کر لیا جائے اور اُسی فیصلے کے مطابق اُن کو درجِ لغت کیا جائے۔

یعنی اِس نئے لغت کو رنگا رنگی اور انتشار کا آئینہ خانہ نہ بننے دیا جائے ۔ ایک بار لغت میں ایک طے شدہ صورت محفوظ ہو گئی، تو پھر اُس کا رواج ہو جائے گا اور استناد کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

مختصر یہ کہ لغت میں اختلافِ املا کا اظہار بہت احتیاط کا طلب گار ہے۔ قدیم متنوں کی ترتیب میں جو طریقہ کبھی کبھی اختیار کیا جاتا ہے کہ بہت سے املائی اختلافات کو حاشیے میں ظاہر کر دیا جاتا ہے؛ اِس طرزِ عمل کو لغت سے کچھ مناسبت نہیں۔ لغت میں صرف اُن اختلافات کو جگہ ملنا چاہیے جو ہر حیثیت سے مستند ہوں، اور یہ کہ جس مصنّف کی تحریر سے اُس اختلاف کی سند پیش کی جائے، اُس مصنّف سے اُس خاص املا کے انتساب کی قطعی طور پر تصدیق بھی ضروری ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو (اور اِس کا امکان ہے بھی کم) تو پھر عام طور پر عہد یا علاقے کا تعیّن کیا جائے۔ کاتبوں اور ناقلوں نے لفظوں کو جس جس طرح لکھا ہے، اگر اُن سب کو قابلِ قبول مان لیا جائے؛ تو اچھا خاصا دفتر تیار ہو جائے گا اور اُس کا بیش تر حصّہ بے معنی ہوگا۔ جس طرح کسی مخطوطے کے املا سے، دوسرے شواہد کے بغیر، اُس کے مصنّف کی زبان پر گفتگو کرنا درست نہیں؛ اُسی طرح اُس مصنّف سے اُن الفاظ کا املا منسوب کرنا بھی صحیح نہیں ہوگا۔

بعض صورتوں میں املا کے بعض مسائل، لغت کی حد تک، املا کے عام مسائل سے ذرا مختلف ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اردو انگلش یا اردو ہندی لغت میں بعض خاص قسم کے مسائل سامنے آئیں گے، جیسے اُن زبانوں کے

مختلف حروف کے لیے (یا آوازوں کے لیے) متبادل حروف کا تعین اور بعض علامتوں کی تشکیل۔ اِس قسم کے مسائل مخصوص حیثیت رکھتے ہیں اور ایسے لغات کے مرتبین کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ اِس سلسلے میں مناسب فیصلے کریں۔ اردو عبارتوں کو ہندی اور رومن خطوں میں لکھنے میں کچھ دقتیں پیش آیا کرتی ہیں؛ اُن لغات اور اُن کے طے کردہ اصولوں کے تحت، اِن دقتوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اِن معاملات کا تعین ایسے لغات کے مرتبین کے دائرۂ کار سے تعلق رکھتا ہے اور وہی اِن کا فیصلہ بھی کریں گے۔ اردو املا کے عام مسائل میں اِن خاص مسائل کو آمیز نہیں کرنا چاہیے، اور نہ اِس کی فرمایش کرنا چاہیے۔ یہ دو مختلف دائرے ہیں۔ اور اِس میں ہندی، انگریزی کی کچھ تخصیص نہیں؛ ہر زبان کی یہی صورت ہے، مثلاً اردو روسی یا اردو جرمن یا اردو جاپانی لغات مرتب کیے جائیں، تو اُن زبانوں کی مناسبت سے، کچھ اور علامتوں اور اضافوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ غرض یہ دو مختلف مسائل ہیں اور اِن کو اِسی نظر سے دیکھنا چاہیے۔ لغت نگار مستشرقین نے اِس سلسلے میں بہت کچھ کیا ہے، اور اُن کے اُس کام سے آج بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

اشاریہ

اِس اشاریے میں خاص خاص الفاظ ہی کو شامل کیا گیا ہے ۔ (الف) عربی فارسی کے علاوہ اور زبانوں کے ایسے لفظ جن کے آخر میں الف آنا چاہیے (جیسے: کتھا، پتا وغیرہ) ایسے لفظ کتاب میں ص ۹۰ سے ص ۱۰۰ تک بہ ترتیبِ حروفِ تہجّی لکھے گئے ہیں؛ اِن کو وہاں دیکھا جاسکتا ہے ۔ ص ۹۰ سے ص ۹۸ تک مفرد لفظ ہیں، اور ص ۹۹ سے ص ۱۰۰ تک مختلف قسم کے مرکّبات ہیں (جیسے: دومحلا، تمنزلا وغیرہ)۔ (ب) عربی کے ایسے لفظ جن کے آخر میں ہمزہ نہیں لکھا جائے گا (جیسے: علما، ابتدا وغیرہ)، ص ۳۶۳ پر لکھے گئے ہیں۔ (ج) ص ۳۶۷، ۳۶۸ پر ایسے الفاظ کی فہرست ملے گی، جن کے آخر میں واو ہے اور اُس پر ہمزہ نہیں آئے گا (جیسے: الاو، ناو وغیرہ)۔ (د) ایسے الفاظ جن میں درمیان میں آنے والے واو پر ہمزہ نہیں لکھا جائے گا، (جیسے: باوْلا، سُور، بچھوے، بچھووں وغیرہ)؛ اُن کی فہرست ص ۳۶۷ پر دیکھی جا سکتی ہے ۔ (ہ) جن لفظوں میں ایک ہاے مخلوط لکھنا چاہیے، (جیسے: ڈھونڈنا وغیرہ)، اور ایسے الفاظ جن میں دو ہاے مخلوط آئیں گی؛ ان کی فہرستیں ص ۳۳۰، ۳۳۲ پر ملیں گی ۔ فہرست مضامین میں عام قاعدوں کی اکثر تفصیلات آگئی ہیں؛ بہت سے الفاظ کو اُن عنوانات کے توسّط سے دیکھا جاسکتا ہے ۔

[1] ط پر زبر ہے۔ اگر کتاب میں کہیں ط پر پیش لگا ہوا ہو تو اس کو غلط سمجھا جائے۔